حقیقت تصوف و تقویٰ

خطبات و ملفوظات نمبر ۱۱

ادْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ (القرآن)

حقیقتِ تصوّف و تقویٰ

از افاضات

حکیم الاُمّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب

مفتی عبد الرحمٰن

سلسلۂ مواعظ اشرفیہ نمبر ۱۱

اشاعتِ اوّل ○ ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء

تعداد ---------------- ۱۱۰۰

قیمت ---------------- تیرہ روپے پچاس پیسے

مطبع ---------------- امروز پرنٹنگ پریس ملتان

ناشر

مکتبہ رشیدیہ

۳۲-اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

حکیم الامت کے مواعظ کو موجودہ کتابی شکل میں مرتب و مدون کرنے کا کام محترم منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد پر شروع کیا تھا۔ اس کی دس جلدیں چھپ کر شائقین کے پاس پہنچ چکی ہیں۔ منشی صاحب ترتیب و تدوین، تصنیف و تدوین کے سلسلے میں عمدہ ذوق اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھتے ہیں لیکن گوناگوں مصروفیتوں میں بہت منہمک رہتے ہیں۔ شائقین علم و ادب متمنی ہیں کہ انھیں اپنے آپ کو اسی کام کے لیے فارغ کر لینا چاہیے ——— سعادت مند اولاد والدین کے نقش قدم پر چلتی ہے۔ صاحبزادہ محترم مولانا عبیداللہ صاحب حضرت مفتی صاحب کے لگائے ہوئے گلستان جامعہ اشرفیہ کی حسن و خوبی کے ساتھ نگہداشت کر رہے ہیں انہی کی تحریک و تعاون سے منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب ناظم ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ ملتان نے مواعظ اشرفیہ کی نشر و اشاعت کا اہتمام مکتبہ رشیدیہ لاہور کو دے دیا ہے ادارہ ہر دو حضرات کا تہ دل سے ممنون ہے اور قارئین کو مواعظ اشرفیہ کی گیارہویں جلد پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے انشاء اللہ بارہویں جلد جلد اور بہتر صورت میں پیش کریں گے اور یہ مبارک سلسلہ تیس جلدوں تک پہنچ جائے گا۔ مسودات تقریباً تیار ہیں۔ آپ حضرات اس کی توسیع اشاعت میں تعاون فرمائیں تاکہ ہم جلد اس سلسلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر اس طرح کا کوئی اور کام شروع کریں۔

عبدالرشید ارشد

تفصیل

اوج قنوج

دستور سہارنپور

وہ ذرا سی بات جو تصوّف کا حاصل ہے،
یہ ہے کہ جس طاعت میں سستی ہو، سستی کا مقابلہ
کر کے اس طاعت کو کرے، اور جب گناہ کا تقاضا
ہو، تقاضے کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے، جس
کو یہ بات حاصل ہو گئی اس کو پھر کچھ بھی ضرورت
نہیں کیونکہ یہی بات تعلق مع اللہ پیدا کرنے والی
ہے، یہی اس کی محافظ ہے اور یہی اس کو بڑھانے
والی ہے۔

التقویٰ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہٖ و نتوکّل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیّئاتِ اعمالنا من یّھدہ اللہ فلا مضلّ لہ و من یّضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لَّا الٰہ الّا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ و نشھد انّ سیّدنا و مولانا محمّدًا عبدہٗ و رسولہ۔ صلّی اللہ علیہ و سلّم و علٰی اٰلہٖ و اصحابہٖ و بارک و سلّم۔ امّا بعد فاعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیمؕ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم۔ فاتّقوا اللہ ، ما استطعتم و اسمعوا و اطیعوا و انفقوا خیرًا لّانفسکم و من یّوق شحّ نفسہٖ فاُولٰٓئک ھم المفلحون ٥ (تغابن)

(ترجمہ) سو ڈرو اللہ سے جہاں تک ہو سکے اور سنو اور مانو اور خرچ کرو اپنے بھلے کو اور جس کو بچا دیا اپنے جی کے لالچ سے سو وہ لوگ وہی مراد کو پہنچے۔

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

تمہید

یہ ایک آیت ہے۔ سورۂ تغابن کی جس کو اس وقت بیان کے لئے قصداً نہیں اختیار کیا گیا بلکہ ایک اتفاقی امر ایسا پیش آیا جس سے اس کو اختیار کیا گیا وہ یہ کہ کل میں سیولی تھا۔ وہاں کے بیان میں تین آیتیں پڑھی گئی تھیں۔ ایک یہ اور ایک اس کے قبل کی اور ایک اس کے بعد کی۔ سیولی میں تو قبل کی آیت کو بیان کیا گیا بوجہ مناسبت وہاں کے حالات کے اب یہ اُن تینوں میں کی دوسری آیت ہے۔ مناسب معلوم ہوا کہ چونکہ سفر ایک ہے اس لئے اس سفر میں اوّل ان ہی آیتوں کو بیان کیا جاوے۔ چنانچہ اسوقت اس آیت کو اختیار کیا گیا اور عجب نہیں کہ کل آئندہ کے بیان میں اس کے بعد کی آیت کا بیان ہو۔ اس طرح سے یہ آیت سلسلۂ بیان میں آگئی مگر اب یہاں اسباب خارجیہ سے اس کے بیان میں آنے کے ساتھ یہ مناسب حال بھی ہے اور اگر خاص مناسبت بھی نہ ہوتی تب بھی اس لئے مناسب ہے کہ قرآن مجید میں ہر مضمون ضروری ہے۔ یہ بھی قرآن ہی کی ایک آیت ہے۔ اس بنا پر اس میں کسی خاص ترجیح کے بیان کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ قرآن ایک مطبِ روحانی ہے اور ہم مریض ہیں تو ہر آیت تمام امراض کا علاج ہے۔ اور اسی وجہ سے قرآن مجید کی عجیب ترتیب ہے کہ اس میں ابواب وفصول نہیں بلکہ ہر مضمون میں ایسی جامعیت کا لحاظ ہے کہ جو آیت بھی لی جاوے وہ ہر مرض کے علاج کے لئے کافی وافی ہے۔ گو ہر مقام پر ظاہر نظر میں کسی خاص مرض کا علاج معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تعمق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر مرض کا علاج ہے۔

قرآن اور تصنیف

یہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن مجید کا طرز مصنفین کے کتب کے طرز پر کیوں نہیں ہے۔ یعنی طبائع اس بات کی خوگر ہیں کہ ہر باب میں جدا مضمون ہو۔ نماز کا الگ۔ زکوٰۃ کا الگ۔ علیٰ ھذا فنونِ عقلیہ میں بھی یہی بات ہے۔ چنانچہ مولانا نے مثنوی میں کسی معترض کا یہی قول نقل بھی کیا ہے کہ اس نے کہا تھا کہ اس

ہیں دیگر کتب تصوف کے طور پر علیحدہ علیحدہ ہر چیز کا بیان نہیں بلکہ مخلوط طور پر ہے تو مولانا نے اس کا جواب دیا ہے۔ کہ یہ نادانی ہے۔ یہ طرز تو قرآن کا بھی ہے اور اس وقت یہ جواب کافی تھا کہ قرآن کا کوئی منکر نہ تھا۔ مگر اس زمانہ میں تو حدیث اور قرآن کو بھی نہیں چھوڑتے ہیں گو صاف انکار تو نہیں کرتے مگر شبہات لاتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ قرآن میں مسلمانوں کو وسوسہ کا گذر بھی نہ تھا اس میں کاوش نہ ہوتی تھی وجہ یہ ہے کہ قلب میں جس کی عظمت ہوتی ہے اس میں کبھی شبہ نہیں ہوتا چنانچہ جن لوگوں کے دلوں میں سلطنت کی عظمت ہے اس کے احکام میں کبھی چون و چرا نہیں کرتے خاص کر پرانی وضع کے لوگ کہ ان کا مذہب ہی یہ ہے کہ ع

رموز مصلحتِ ملک خسرواں دانند تو نکتہ چینی کا کبھی موقع نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو زبان تک نہیں آتا کہ بغاوت نہ ہو جاوے تو قانونِ سلطنت میں تو نہیں آتا لیکن قرآن کو ایسا تختۂ مشق بنایا ہے کہ الف بے سے کی تمیز نہیں ہے اور قرآن پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ استعداد علمی کی بھی ضرورت نہیں تو اس وقت تو مولانا کا وہ جواب کافی تھا مگر اب یہ دوسرا سوال پیدا ہو گا۔ کہ قرآن میں یہ کیوں طرز ہے۔ اس لئے میں اس کا جواب دیتا ہوں کہ اس کا سبب ظاہر ہے مگر اسی کے لئے جس کو تعلق بین اللہ وبین العبد معلوم ہے سو اول وہ تعلق سمجھئے کہ کیا ہے سو وہ تعلق ہے شفقت ذاتی کا۔ اس لئے کہ خدا کو کوئی غرض نہیں اور جو ایسی شفقت ہو گی وہ نہایت کامل ہو گی۔ ایک مقدمہ تو یہ ہے دوسرا یہ کہ کامل شفقت کا اثر تعلیم میں کیا ہے۔ مثلاً باپ ہے تو جس کو خدا نے باپ ہونے کی دولت عطا فرمائی ہے اس کو تو خوب معلوم ہے۔ لیکن اگر کوئی بیٹا ہے تو اس کو بھی یاد ہو گا کہ باوجود باپ کی شفقت کے اس قدر کامل نہ ہونے کے پھر اس کا ایک خاص قسم کا برتاؤ ہوتا ہے کہ اس کی نصیحت میں کوئی خاص ترتیب نہیں ہوتی جس طرح سے مصنّف کی کتاب ہوتی ہے۔ کہ مبوب و مفصل ہوتی ہے۔

اس طرح سے باپ کا طرز نہیں ہوتا مثلاً وہ تمیز سکھانے بیٹھا کہ بڑوں کا ادب کیا کرتے ہیں اور اس کو سلام کیا کرتے ہیں۔ عین اس موقع پر بیٹے نے کھانے کا بڑا لقمہ لے لیا۔ باپ نے فوراً کہا کہ بیٹیا لقمہ چھوٹا لو تو اگر کوئی کہے کہ باپ کا کلام بے جوڑ ہے تو بھائی تم کو اس لئے بے جوڑ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو شفقت کی اطلاع نہیں جس کو شفقت ہوتی ہے اُس کو ربط کے انتظار کی ضرورت نہیں اور اگر باوجود اس کے بھی وہ کلام مرتب اور مربوط ہو تو غایت بلاغت ہے لیکن اگر اس میں ترتیب نہ بھی ہوتی تب بھی غایت درجہ کی حسن و خوبی تھی اور افسوس ہے کہ آج یہی بات جو شفقت کی ایک بالغ دلیل ہے لوگوں کے نزدیک موجب نقص ہے تو وجہ یہ ہے کہ خدا سے تعلق نہیں۔ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کو بھی اجنبیوں کا سا تعلق ہو جو قرآن کے اجزا میں ربط کو لازم سمجھتے ہیں۔ گو واقع ہے مگر لزوم نہیں ہے۔ تو صاحبو! وہ خدا ہیں آپ چاہے اُن سے خدا نہ ہونے کا برتاؤ چاہیں۔ مگر وہ تو خدا ہی ہونے کا برتاؤ کریں گے چنانچہ اس کا اثر ہے جو فرماتے ہیں۔ افنضرب عنکم الذکر صفحا ان کنتم قوما مسرفین یعنی ہم تم کو ہمیشہ سمجھا دیں گے خواہ تم نہ مانو بخلاف غیر شفیق کے کہ جب مخاطب نہیں مانتا وہ تفہیم چھوڑ دیتا ہے۔ غرض خدا کے کلام کا یہ طرز ہے سو اس کا مقتضا یہ تھا کہ اگر اس میں کوئی ترتیب بھی نہ ہوتی تب بھی وہ خوبی ہی تھی اور اب تو ربط بھی ہے۔ جس سے حُسن دوبالا ہو گیا تو حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ربط صریح نہ ہونے کا سبب شفقت ہے اس لئے ہر جگہ جامعیت کی شان ہے کہ ہر مقام پر ہر مضمون سے تعرض ہے یہ دوسری بات ہے کہ کوئی مضمون مدلول بعبارۃ النص ہے اور کوئی مدلول بدلالۃ النص وغیرہ۔ لیکن یہ بات کہ کسی مقام پر صرف ایک ہی مضمون کا بیان ہو یہ نہیں ہے اور اس لئے مجھے کسی خاص آیت کے انتخاب کی ضرورت نہیں ہوئی اور اسی تخصیص کے ضروری نہ ہونے کے سبب میرا

یہ معمول ہے کہ لوگوں کے کہنے سُننے سے کسی خاص مضمون کا بیان نہیں کرتا۔ گو مشورہ سُن لیتا ہوں مگر عامل اس پر ہوں کہ ؎

سن لاکھ کوئی تجھے سنا دے
کیجو وہی جو سمجھ میں آ دے

نیز اس کا اثر بھی اچھا نہیں ہوتا اور اصل بات تو یہ ہے کہ جب کلام جامع ہے تو اس کی ضرورت ہی کیا ہے جب ہر آیت ہمارے امراض کا علاج ہے تو جس مقام سے چاہا آیت پڑھ دی تو مرجح کی ضرورت ہی نہیں لیکن اس وقت یہ ایک اتفاقی مرجح بھی ہے کہ یہ آیت ترتیب میں آگئی۔ خیر یہ تو وجہ ترجیح تھی۔

اجرِ عظیم اب اصل مضمون سنئے کہ اس کے قبل فرمایا تھا۔ واللّٰہ عندہ اجر عظیم اس سے یہ آیت مرتبط ہے اور ضرورت ارتباط یہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں (ف) ہے جس کا ترجمہ ہے پس اور لفظ پس یا لفظ تو ایسے مقام پر آتا ہے کہ مرتبط ہو ماقبل سے اور یہاں ماقبل میں ربط کے لئے تو سب سے سہل جز واللّٰہ عندہ اجر عظیم ہے۔ یعنی جب اللّٰہ کے یہاں بہت بڑا اجر ہے۔ تو تم کو چاہیئے کہ اس پر نظر کر کے خدا سے ڈرا کرو کیونکہ اس کا مالک اجرِ عظیم ہونا مقتضی اس کا ہے کہ تم وہ برتاؤ کرو کہ اس اجر کے مستحق ہو جاؤ یعنی استحقاق بسبب وعدۂ خداوندی کے نہ اس لئے کہ اس کے ذمہ کسی کا حق واجب ہے اور کیونکر کسی کا حق ہو سکتا ہے اگر حق ہوتا عمل کے سبب ہوتا اور عمل کی کیفیت یہ ہے کہ وہ محض بظاہر آپ کی طرف منسوب ہے ورنہ حقیقت میں وہ آپ کا عمل ہی نہیں کیونکہ تمام آلات ہاتھ پیر جن سے عمل ہوتا ہے سب اسی کے دیئے ہوئے ہیں۔

؎ نیاوردم از خانہ چیزے نخست — تو دادی ہمہ چیز من چیز تست۔

میں اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں جو اس کے قبل میرے ذہن میں بھی نہیں تھی کہ آپ
کا ایک باورچی ہے اس نے کھانا پکایا تو کیا اس کو حق ہے کہ اس کو اپنا کھانا بتا دے۔ ہرگز
نہیں کیونکہ سب چیزیں آپ کی ہیں اور ہاتھ پیر جو باورچی کے ہیں تو ان کے تصرف وفعل
کو جس سے کھانا پکا ہے۔ ہم نے خرید لیا ہے۔ کیونکہ اجارہ کا خلاصہ مبادلۃ المال بالمنافع
ہے تو اس باورچی کی کیا چیز ہوئی۔ کچھ بھی نہیں تو اگر وہ ایسا دعوےٰ کرے تو اُس کی
تحمیق کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کی کوئی چیز نہیں تو پھر اس مجموعی سامان کا نتیجہ حاصلہ
اس کی ملک کیونکر ہو گا پس ایسا ہی آپ کی نماز کا حال ہے۔ کہ اعضاء اُس کے دیئے ہوئے
ارادہ اس کا دیا ہوا سب کچھ تو اسی کا ہے تو آپ کی کونسی چیز ہے جس سے یہ دعوےٰ
ہو کہ میری نماز ہے۔ تو جیسا اُس باورچی کا دعویٰ غلط ہے ایسا ہی ہمارا دعویٰ بھی تو
اس حالت میں ہمارا کیا استحقاق ہوا بلکہ اتنا فرق ہے کہ باورچی کے منافع تو اصل میں
اسی کے تھے جس کے سبب معاوضہ کی ضرورت ہوئی اور یہاں تو شروع ہی سے سب اسی کے
پیدا کردہ ہیں معتزلہ نے بڑی غلطی کی کہ خدا تعالیٰ کے ذمہ بندہ کا حق بتلایا۔ اہل سنت نے اس
کو سمجھکر حقیقت کو ظاہر فرمادیا۔ معتزلہ کو دھوکہ ہوا لہ حق علینا وغیرہ نصوص سے لیکن حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حقیقت کو ایسے مضامین سے ظاہر فرمادیا کہ اگر اللہ تعالیٰ تمام
مخلوق کو بے وجہ عذاب دینے لگے تب بھی وہ ظالم نہیں اور آپ کا فرمانا بالکل خدا کا فرمانا
ہے۔ ع گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود۔ تو گویا خدا تعالیٰ نے ہی فرمادیا کہ ہم پر کسی کا حق واجب نہیں
اور یہ جو فرمایا گیا ہے حقا علینا نصر المومنین ونحوہ تو انہوں نے سمجھا نہیں یہ ایسا ہے جیسے
بچہ سے کہدیں کہ یہ کھٹولا تیرا ہے تو خدا تعالیٰ چونکہ صادق الوعدہ ہیں اس لئے فرمادیا کہ ہم
اُس کو ایسا پورا کرتے ہیں کہ گویا وہ بندے کے حقوق ہمارے ذمہ ہیں تو شریعت کے سب

پہلوؤں کو سمجھنا چاہیئے سو اس کو اہل سنت نے سمجھا تو میرے کلام میں جو استغنا کا لفظ
ہے یہ وہ استغنا نہیں جو معتزلہ نے سمجھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو تفصیلاً مستحق اجر
ہونا ہے تو خدا سے ڈرو جس سے دوسرے احکام کا امتثال بھی لازم ہے تو حاصل یہ ہوا
کہ تم امتثال کرو یہ حاصل ہے مقام کا اور یہاں چند صیغے امر کے فرمائے ہیں اور تقریر
ربط سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان میں ہر مامور بہ ضروری ہے کیونکہ ان کو اجرِ عظیم کا مدار قرار
دیا ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنے کو اجر سے مستغنی نہیں کہہ سکتا اس لئے ان کا
ضروری ہونا بھی ظاہر ہوگیا۔ اگر کوئی استغنا کا دعوے کرے تو اس قسم کے دعوے دو
وجہ سے پیدا ہوتے ہیں یا تو اس لئے کہ دین کی طرف توجہ نہیں یا توجہ ہے مگر اپنی احتیاج
کی خبر نہیں۔

اشتیاقِ منافع

واقعی اکثر لوگوں کو ویسا اشتیاق جنت کی نعمتوں کا نہیں جیسا کہ
دنیا کے منافع کا اشتیاق ہے اس کو تو گھنٹوں سوچتے ہیں کہ فلاں
جگہ سے مال لادیں گے اور اس میں اس طرح نفع حاصل کریں گے۔ غرض ایک شوق کے
ساتھ حدیث النفس ہوتا ہے اور ایک ارمان ہوتا ہے اور حوصلہ ہوتا ہے لیکن سچ بتلایئے
کہ کبھی یہ بھی حوصلہ ہوا ہے کہ خدا ہم کو توفیق دے کہ عمل کریں اور جنت میں جاویں اور
وہاں اس طرح کھاویں گے۔ اس طرح پئیں گے۔ اس طرح حوروں سے باتیں کریں گے۔
اس طرح اللہ تعالیٰ کا دیدار دیکھیں گے۔ سو اس کا حدیث النفس ہرگز نہیں ہوتا۔ ہاں
کبھی کسی سے سن لیا تو تھوڑی دیر سرسری توجہ ہوگئی پھر کچھ نہیں اور میں کسی اور کو
کیا کہوں اپنے ہی کو کہتا ہوں کہ بہت کم ایسی تمنا اور آرزو ہوتی ہوگی صاحبو! اجر
کی احتیاج وہ چیز ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر دوسرے انبیاء بھی نہیں ہیں

لیکن احتیاج اجر کے باب میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی نسبت یہ ارشاد ہے کہ حدیث میں ہے کہ ایک مقام پر حضورؐ سفر میں تھے اور اونٹ کم تھے اور سوار زیادہ تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باری مقرر کر دی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی دو آدمی مقرر ہوئے اللہ اکبر غور کیجیے کہ حضور نے کیا مساوات کو عمل میں لا کر دکھلایا ہے۔ آج دعوے تو بہت ہیں جن کو سن کر معلوم ہوتا ہے کہ جنید اور شبلی یہی ہیں لیکن کام کے وقت سب کے پیچھے ہیں صاحبو! ہمارے بزرگوں نے ہمیشہ کام کیا ہے نام نہیں کیا اور آج نام ہی نام مقصود ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کیا ہے اور سلف نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور ابھی پچیس۲۵ تیس۳۰ برس پہلے لوگ کام کرتے تھے لیکن یہ نام والقاب سکرٹیری وغیرہ کہیں نہ تھے میں ان لفظوں پر اعتراض نہیں کرتا لیکن اگر عمل نہ ہو تو بیشک اعتراض ہے پہلے لوگ جو کچھ کر گئے وہ آج نظر بھی نہیں آتا ہم لوگ آج محض ضابطہ کے مولوی ہیں اور پہلے بے ضابطہ کے مولوی ہوتے تھے لیکن ان کی استعدادوں کا آج عشر عشیر بھی نہیں دیکھا جاتا ہم نے اپنے بزرگوں کے متعلق سنا ہے کہ بازار سے پتے اٹھا کر لاتے تھے ان کو پکا کر کھاتے تھے اور بخاری شریف کو لکھ لکھ کر پڑھتے تھے اور آج تو کتاب میں ایک غلطی نکل آئے تو وہ بھی نہیں بنائی جاتی وجہ یہی ہے کہ وہاں خلوص تھا اور یہاں ضابطہ ہے۔ سو ضابطہ میں خلوص کہاں نام تو سب سے بڑا اور کام کے وقت سب سے پیچھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے کبھی نہیں جتلایا کہ ہم تم کو اپنے برابر سمجھتے ہیں لیکن کر کے دکھا دیا۔ اب کرتے ہیں تو کم ہیں مگر ظاہر بہت زیادہ کرتے ہیں کیونکہ کام کرتے ہیں محض مخلوق میں نام پیدا کرنے کو اور نام کہنے سے زیادہ ہو گا غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کر کے دکھلا دیا کہ آپ کے اونٹ میں دو اور شریک تھے

حضورؐ نے اس پر یہ عمل کیا کہ تھوڑی دیر خود سوار ہوئے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر اترے اور ان سے فرمایا کہ اب تم سوار ہو۔ انہوں نے عذر کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ بھائی تم ہمت میں مجھ سے زیادہ نہیں اور میں اجر سے مستغنی نہیں ہوں کہ تم تو ثواب لوٹو اور میں ثواب نہ لوں۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے۔

عبدیت کاملہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا کمال یہی عبدیت کاملہ ہے۔ خوب کہا ہے۔ ایک شخص نے ایک نصرانی سے کہا کہ تم جو خدا کہتے ہو عیسیٰ علیہ السلام کو تو ناقص خدا کہو گے اور ہم کہتے ہیں بندۂ کامل تو تم ہی انصاف کر لو کہ کمال کی نسبت کرنا بہتر ہے یا کہ نقص کی نسبت کرنا تو ہم ساری دنیا کے سامنے کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا کمال، کمالِ عبدیت ہے۔ ہم کسی درجہ میں بھی آپ کے لئے الوہیت ثابت نہیں کرتے تو اس عبدیت کاملہ کے سبب آپ اس پر قانع نہیں ہوئے بلکہ بوجہ اس کے کہ اتنے غیر تناہی کمالات میں اگر ایک چھوٹا سا عمل تناوب رکوب کا کمال نہ ہوا تو کیا حرج ہے۔ حضورؐ کو عشقِ کامل ہے۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ اس لئے آپ سے کوئی ایک جزو بھی حکم کا ترک نہیں ہو سکا ہم لوگ بے حس ہیں کیونکہ عشق نہیں اس لئے حس بھی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی اختیار فرمایا اور ہماری یہ حالت ہے کہ جتنا جانتے جاویں چاہیئے کہ اجر کی رغبت بڑھتی مگر بالعکس ہم کو تو نیہ میں نفل کی تعریف پڑھنے سے کہ کرتے سے ثواب اور نہ کرنے میں گناہ نہیں یہ بات حاصل ہوئی تھی کہ اس روز سے نفلیں چھوٹ گئیں تو وجہ یہ ہے کہ ہم کو کامل محبت نہیں اور حضورؐ کو محبت کامل ہے تو اس لئے آپ کا دل ایک ذرا سا درجہ چھوڑنے کو بھی نہیں چاہا یہ کام کہ اپنے ساتھی کو سوار کر دینا

بالکل معمولی بات ہے ہم تو اگر سفر میں اپنے کسی شاگرد کے ساتھ ہوں تو باوجودیکہ ہمارے ذمہ بھی ہے کہ اس کو بھی راحت دیں مگر سب سے اوّل اپنے ہی کو کہتا ہوں کہ اس کو پوچھیں بھی نہیں اور یہ واقعی بات ہے اللہ اکبر کیا چیز ہم میں سے کم ہوگئی۔ ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ملاحظہ فرمایئے اگر ہم ہوتے تو فوراً چڑھ بیٹھتے اور شاید ساتھی سے کہتے بھی نہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت کی یہ حالت تھی کہ اتنے بڑے تو کامل اور تعظیم کے معمولی الفاظ کی نسبت بھی فرماتے ہیں کہ ایسا نہ کہو باقی ہماری ہدایت کے لئے اپنے کمالات بھی ظاہر فرماتے ہیں۔

فطری مذاق یہ دوسری بات ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فطری مذاق یہی ہے کہ آپ نے کبھی مخدوم ہونیکا دعوےٰ نہیں کیا اور ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے کہ ذرا سی بات میں زبان پر یہ لفظ آتا ہے کہ تم ہم کو نہیں جانتے ہم کون ہیں اس کے جواب میں ایک حکایت یاد آگئی کہ ایک شخص نے ایک بزرگ سے ان کی ایک نصیحت پر کہا تھا کہ اما تعرفنی کہ تم مجھ کو نہیں جانتے اور انہوں نے کہا کہ جانتا ہوں اولک نطفۃ مذرۃ ٭ وآخرک جیفۃ قذرۃ ٭ وانت بین ذلک تحمل العذرۃ یعنی اوّل تیرا ایک نطفہ ہے اور انتہا ایک گندی لاش ہے اور درمیان حالت یہ ہے کہ پیٹ میں پاخانہ لئے پھرتا ہے تو میں اوّل سے آخر تک تمہارے پر پرزوں کو جانتا ہوں تو جب کسی کے دل میں ایسا وسوسہ آوے تو خود ہی جواب دے لے خوب کہا ہے۔ ؎

زخاک آفریدت خداوند پاک ‏ ‏ ‏ پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

اور واقعی ہمارے پاس فخر کی ہے ہی کیا چیز ہم کو اگر شرافت نسب پر دعوےٰ ہے

تو اول تو اس کا ثابت ہونا ہی مشکل ہے۔ پھر بعد ثبوت ذرا تاریخ اٹھا کر دیکھئے کہ جن کی طرف منسوب ہیں ان میں سے بہت کی نسبت اہل تاریخ نے کس قدر اختلاف کیا ہے اور اگر سب اجزا ثابت بھی ہو جاویں تو یہ کیا فخر ہے کہ ہم فلاں کی اولاد ہیں جبکہ ہم ویسے نہ ہوں ؎

لئن فخرت بآباء ذوی نسب لقد صدقت ولکن بئس ما ولدوا

تو ایسے شخص کو تو کبھی کہنا ہی نہ چاہئیے کیونکہ یہ ناخلف ہونے کا دعوےٰ ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شریف النسب ہونا کوئی چیز نہیں۔ ضرور ہے آج بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ اس کو مٹاتے ہیں تو یہ بھی غلطی ہے لیکن کہتا یہ ہوں کہ یہ فخر کی چیز نہیں۔ ہاں ایک نعمت ہے۔ اس پر خدا کا شکر کرو لیکن غریبوں پر فخر اور انکی تحقیر نہ کرو۔ اسی طرح تمام مفاخر کو سمجھ لو۔ غرض ہم کیا دعوےٰ کر سکتے ہیں کہ ہم ایسے ہیں مگر یہ وہ بلا ہے کہ ہم میں سے شاید کوئی اس سے خالی ہو۔ حتیٰ کہ تواضع جو کہ فخر کی ضد ہے ہم اس میں بھی فخر کے مرتکب ہو رہے ہیں اور یہ بات آپ کو نئی معلوم ہو گی لیکن بہت پرانی ہے۔ یعنی یہ کہ ہماری تواضع بھی تکبر ہے چنانچہ اگر کوئی شخص تعریف کرے تو کہتے ہیں کہ صاحب میں تو محض نالائق ہوں مگر دل سے وہ ہرگز ایسا نہیں سمجھتا چنانچہ جو شخص یہ کہے وہ غور کر کے دیکھ لے کہ دل سے کہتا ہے یا زبان سے۔ اگر محض زبان سے ہے تب تو ظاہر ہے کہ تکبر ہے اور اگر دل سے ہے تو امتحان یہ ہے کہ وہ تعریف کرنے والا ذرا پلٹ کر کہدے کہ ہاں جناب آپ بڑے نالائق ہیں مجھ کو معلوم نہ تھا اس لئے تعریف کرتا تھا۔ بس اب دیکھئے ان کی حالت کیا ہوتی ہے۔ حضرت گولی مارنے کو تیار ہو جاویں گے اور عمر بھر کو آپس میں بغض ہو جاوے گا۔ پس جب ہماری تواضع بھی تکبر ہے تو تکبر تو کیا کچھ ہو گا۔ سو ہماری تو یہ حالت ہے اور حضور

صلی اللہ علیہ وسلم میں باوجودیکہ کونسی خوبی نہ تھی ؎

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری | آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپ کی یہ کیفیت ہے کہ ہر چیز میں افتقار کا اظہار فرماتے ہیں چنانچہ سواری میں دیکھئے کیا فرمایا اور خیر یہ تو اجر آخرت کی بات ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک اپنے افتقار کو ظاہر فرمایا ہے کہ بعد کھانے کے فرمایا کرتے کہ غیر مودع وغیر مستغنی عنہ ربنا کہ اے اللہ ہم اگلے وقت بھی اس سے مستغنی نہیں تو کھانا جو بہت ہی سرسری چیز ہے آپ اس کو بھی نعمت عظمیٰ سمجھتے ہیں اور اس کی طرف بہت احتیاج ظاہر فرماتے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مجبور کر کے سوار کیا۔

صحابہ کا ذوق

ادھر صحابہ کا مذاق یہ تھا کہ وہ اصلی عاشق تھے جب انہوں نے دیکھا کہ حضورؐ کو اسی میں راحت ہے بس وہ بھی سوار ہو گئے اور ہماری حالت بزرگوں کے ساتھ یہ ہے کہ ایسے موقع پر اصرار کے ساتھ ان کی مخالفت کرتے ہیں اور غضب تو یہ ہے کہ بعضے بزرگوں کی بھی یہ حالت ہے کہ وہ جو اپنے چھوٹوں کے ساتھ تواضع کرتے ہیں تو وہ بھی دل سے نہیں ہوتی اگر دل سے ہو تو اس میں اثر ایسا ہوتا ہے کہ اکثر تو فوراً ہی مان لیا جاوے اور بعض جگہ چھوٹے تکلف کرتے ہیں۔ میں ایک بزرگ کے پاس گیا وہ پائنتی بیٹھے ہوئے اور مجھے سرہانے بٹھانا چاہا۔ میں نے عذر کیا آخر انہوں نے تندی سے فرمایا۔ میں بیٹھ گیا اس کے بعد انہوں نے غالباً فرمایا کہ میاں آؤ ہم تم کو ایک حکایت سنادیں پھر عالمگیر اور داراشکوہ کا قصہ سنایا کہ یہ دونوں عطائے سلطنت کی دعا کرانے کے لئے ایک دوسرے کی بے خبری میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان بزرگ نے ان کی شہزادگی کے ادب سے سرہانہ چھوڑ کر ان کو بٹھانا چاہا۔ دارا

شکوہ نے تو تکلف کیا پھر جب اس نے درخواست کی تو ان بزرگ نے فرمایا کہ میں تو تخت پر بٹھلانا تھا مگر تم نے نہ مانا۔ عالمگیر کو جب بٹھلانا چاہا یہ فوراً سرہانے بیٹھ گئے پھر جب درخواست کی تو انہوں نے فرمایا تم تو تخت ہی پر بیٹھے ہو تو دارا شکوہ کا ادب تو ظاہری تھا اور باطناً بے ادبی یعنی مخالفت اور عالمگیر کا ادب ظاہری تو نہ تھا لیکن باطنی تھا یعنی اطاعت پھر مجھ سے ان بزرگ نے فرمایا کہ جو کچھ اپنا بزرگ کہے اس میں کوئی راز ہوتا ہے لیکن یہ موافقت اس وقت ہے جب کہ دل سے ہو۔ بناوٹ سے نہ ہو۔ غرض بزرگوں کا ادب یہ ہے کہ جب وہ دل سے کہیں مان لے مگر ہم نے تو یہ سبق پڑھا ہی نہیں اِلا ماشاء اللہ ہم اپنے استاد مولانا صاحب کے آنے سے تعظیماً کھڑے ہو جاتے لیکن جب معلوم ہوا کہ ان کو بار ہوتا ہے تو اس کو ترک کر دیا محبت تو یہ ہے کہ جس سے ان کو راحت ہو ہمارے استاد ابتدائی کتابوں کے تھانہ بھون کی جامع مسجد سے جوتہ اپنا لیکر چلے ایک معتقد صاحب آئے اور جوتہ لینے لگے انہوں نے تواضع سے انکار فرمایا معتقد صاحب نے جھٹکا دے کر چھین لیا اس میں تو ادب وہی ہے کہ جو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے سیکھا کہ جو فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بس بہت اچھا۔ سبحان اللہ عجیب و غریب شان تھی عاشق اسی کو کہتے ہیں۔

مجھے ایک بزرگ کی حکایت یاد آئی کہ ان کے ایک شاگرد آئے دیکھا کہ شیخ پر فاقہ ہے وہ فوراً اٹھے اور گھر سے کھانا لائے شیخ نے فرمایا کہ کھانے کی مجھ کو حاجت تو ہے مگر قبول سے ایک امر مانع ہے وہ یہ ہے کہ جب تم اٹھکر چلے تو مجھ کو خطرہ ہوا کہ تم کھانا لینے جاتے ہو اور اس سبب سے نفس کو انتظار رہا اور حدیث میں قبول ہدیہ کی شرط فرمائی گئی ہے۔ ما اتاک من غیر اشراف نفس فخذہ اور مجھ کو اشراف ہو گیا۔ وہ شاگرد معاً

کھانا اٹھا کر واپس چل دیئے جب نظر سے غائب ہو گئے پھر لوٹ کر آگئے اور عرض کیا کہ حضرت اب تو نا امیدی ہو گئی ہے۔ اشراف نہ رہا تھا اب لے لیجئے۔ شیخ اور شاگرد دونوں متبع سنت تھے۔ حضرت یہ ہے اتباع سنت ایک ہم ہیں کہ ہم نے سنت میں بھی انتخاب کر رکھا ہے کہ معاشرت میں کہیں اس کا نام ہی نہیں صاحبو! سنت تو یہ ہے کہ ہر چیز میں اتباع ہو چنانچہ ان بزرگ کا اتباع دیکھئے ہم ہوتے تو شاید فرض بھی یاد نہ آتا اور سنت تو درکنار مگر انہوں نے کہا کہ اس وقت لینا سنت کے خلاف ہے کیونکہ اشراف نفس ہے اور ان سے بڑھکر ان کے شاگرد کا ادب اور اتباع سنت دیکھئے کہ پھر اصرار نہ کیا ہم سے واں ہوتے تو ہاتھ پکڑتے منت کرتے۔ غرض جس طرح ہوتا ان کے سر کرکے آتے لیکن ان کا ادب دیکھئے کہ عرض کیا کہ حضرت بہت اچھا اٹھا کر سینی گھر چلدیئے۔ آپ کہتے ہوں گے کہ عجب بے مروّت تھے لیکن ؎ کار پاکاں را قیاس از خود مگیر۔ اس ادب اور خدمت کے جمع کرنے پر ان کو جوش اٹھا اور سینہ سے لگا لیا اور فرمایا کہ واقعی جب کوئی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اُس کی ہزاروں صورتیں ہیں ایک ہم ہیں کہ نشاکر خدمت کرتے ہیں صحابہ کا طرز یہ تھا کہ وہ آپ کی مرضی کو دیکھتے تھے حتیٰ کہ جس وقت ہنسی کا موقع دیکھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک صحابی کی کوکھ میں انگلی چبھو دی انہوں نے کہا کہ مَیں بدلہ لوں گا آپ نے اجازت دی انہوں نے کہا کہ میرے بدن پر تو کرتہ نہ تھا۔ آپ نے کرتہ اٹھا دیا۔ وہ دوڑ کر لپٹ گئے اور بوسہ دیا اور عرض کیا کہ میرا تو یہ مطلب تھا۔ تو صحابہ کی حالت یہ تھی اتنے بے تکلف تھے اور ایک قصہ ہے کہ صحابہ میں ایک شخص تھے۔ فارس کے رہنے والے وہ شوربہ اچھا پکاتے تھے۔ ایک بار وہ حضور کی دعوت کرنے آئے۔ آپ نے حضرت عائشہ کے لئے بھی اجازت چاہی انہوں نے انکار کر دیا۔ آپ نے دعوت سے انکار کر دیا۔

وہ چلے گئے پھر لوٹے اور اسی طرح دو تین بار ہوا۔ تیسری مرتبہ میں حضرت عائشہ کو بھی اجازت دی تو آپ نے اتنا بے تکلف کر رکھا تھا اور اس قدر آپ نے ایک خاص حکمت سے بے تکلف فرمایا تھا اس حکمت کو مَیں نے کہیں کتاب میں نہیں دیکھا لیکن اب خواب میں اُس کا القا ہوا مَیں نے انگلستان کی ایک شہزادی کو خواب میں دیکھا کہ اسلام پر شبہ کرتی ہے مَیں نے کہا کہ وہ کیا شبہ ہے۔ کہا کہ حضورؐ مزاح فرماتے تھے۔ اور یہ متانت کے خلاف ہے اور نبوت کے لئے متانت لازم ہے مَیں نے کہا کہ یہ شبہ جب ہو سکتا ہے کہ جب آپ مزاح اور ہنسی کو مقصود سمجھتے ہوں وہ تو ایک حکمت کی وجہ سے تھی کہ آپ کو خدا تعالےٰ نے ایک رعب عطا فرمایا تھا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت مشہور ہے اس حالت میں ممکن نہ تھا کہ لوگ دین کی باتیں پورے طور پر بے تکلف دریافت کریں اس لئے مزاح کے واسطے سے آپ لوگوں کو بے تکلف بناتے تھے تو اس کی تسلی ہوگئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو یہ حکمت تھی کہ ہماری اس بے تکلفی سے محبوب راضی ہوں صحابہ کا مشرب یہ تھا کہ ؎

جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو
زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو

وہ ہر چیز میں حضورؐ کی مرضی کو دیکھتے تھے انہوں نے اپنے ارادوں کو فنا کر دیا تھا تو صحابہ نے دیکھا کہ حضورؐ اس پر راضی ہیں کہ ہم سوار ہوں تو سوار ہو گئے تو حضورؐ میں اتنی تواضع بڑھی ہوئی تھی کہ اتنے اجر کی ضرورت کو بھی ظاہر فرما دیا۔

توکل کے معنی تو ہم کو بھی اجر کی ضرورت ہے تو اس کی بہتر تدبیر کر دیجیے کہ روٹیوں کے لئے تدبیر ہے ہمارے بھائیوں کو روٹیوں کے لئے تو یہ شعر یاد ہے کہ ؎ شرط عقل ست جستن از درہا۔

لیکن آخرت کی روٹیوں کے لئے کچھ بھی یاد نہیں حالانکہ خدا نے یہاں کی روٹیوں کے لئے تو یہ فرمایا ہے وما من دابۃ الا علی اللہ رزقہا اور وہاں کے لئے ارشاد ہے من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فعلیہا تو یہاں کے لئے تو اس قدر ذکر اور وہاں کے لئے متوکل تو اگر ایسا بڑا توکل ہے تو دنیا کے لئے توکل کیجئے تو یہ الٹا توکل کے ساتھ ہے اور پھر یہ توکل بھی تو نہیں کہ عمل کو چھوڑ بیٹھے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھے رہے توکل کی حقیقت وہی ہے جو توکیل کی ہے تو جب آپ کسی کو وکیل بناتے ہیں تو کیا آپ بے فکر ہو جاتے ہیں۔ اب اگر وکیل کہے کہ شاہد لاؤ اور آپ کہیں کہ جناب اب مجھ سے کیا واسطہ جبکہ میں آپ کو وکیل بنا چکا تو ہر شخص آپ کو نادان کہے گا۔ تو وکیل بنانے کا خلاصہ یہ ہے کہ جس کام کو یہ نہیں سمجھ سکتا اس کو دوسرے کے سپرد کر دیا ہے کہ اس کے بتلانے کے موافق کرتا رہے پس توکل بھی یہی ہے کہ خدا کے سپرد کام کر کے تدبیر کرو اور وہ جو بتلاتا جاوے کرتے جاؤ اب توکل اس کو سمجھا ہے کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہیں۔ غرض توکل یہ ہے کہ جو خدا نے بتلایا ہے وہ اس کے بتلانے سے کرو مثلاً یہ بتلایا ہے کہ جو نماز پڑھے گا وہ جنت میں جاوے گا تو نماز پڑھو خلاصہ یہ ہے کہ اجر کی سب کو ضرورت ہے تو اس کی بتلائی ہوئی تدبیر اختیار کریں اور وہ تدبیر اور طریقہ وہ ہے جو اس مقام پر ذکر فرمایا ہے۔

فاتقوا اللہ ما استطعتم الخ پس اس میں ایک امر تو یہ ہے کہ خدا سے ڈرو جتنا تم سے ہو سکے دوسرا امر فرمایا ہے کہ سنو اور تیسرا امر ہے اطاعت کرو اور چوتھا یہ ہے کہ خرچ کرو تمہارے لئے بہتر ہو گا اور یہ یا تو اخیر کے ساتھ ہے یا سب کے ساتھ ہے پس یہ چار امر ہیں اور ظاہر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اوامر سب الگ الگ ہیں تو اگر ایسا ہوتا بھی تو بھی مضائقہ نہ تھا لیکن واقع میں اس میں ربط بھی ہے اور اس سب مجموعہ

سے مقصود ایک ہی چیز ہے جو کہ اصل ہے یعنی اطاعت اور یہ دوسرے اوامر اس کے طرق ہیں۔

آجکل کا تقویٰ

تفصیل اطاعت کی یہ ہے کہ اوّل دیکھا جاوے کہ ہماری ترکیب کتنے اجزا سے ہے تو انسان میں دو چیزیں ہیں ایک جوارح ایک قلب یا ایک ظاہر اور ایک باطن تو خدا نے اس اطاعت کی تفصیل فرمائی کہ اوّل اتقوا اللہ فرمایا ہے یہ تو قلب کے متعلق ہے نہ جیسا کہ آجکل ہمارے بھائیوں نے تقویٰ کو خاص پانی کی احتیاط میں لیا ہے نفس بھی بڑا سمجھدار ہے کہ پانی میں تقوے تجویز کیا کیونکہ پانی سستا ہے اسی واسطے ہمارے بھائیوں نے کبھی کھانے میں تقوے نہیں تجویز کیا۔ پانی کی دو قسمیں کیں طاہر و نجس۔ لیکن کھانے کی ایک قسم ہے کہ سب حلال ہے۔ بہن کا رکھ لو وہ بھی حلال ہے چندہ کا روپیہ کھاجاؤ وہ بھی حلال ہے البتہ اگر اس میں گھی نہ ہو تو وہ حرام ہے۔ چنانچہ رُڑکی میں ایک واعظ صاحب گئے ایک شخص نے اُن کی دعوت کی۔ کہنے لگے کہ بھائی میں تو ایک خاص قسم کا کھانا کھایا کرتا ہوں اور اس کو ہماری ماما پکا سکتی ہے اس لئے میں دوسری جگہ نہیں جا سکتا نقد دید و مگر اس نے کھانے ہی پر اصرار کیا۔ آخر کھانا بھیجنے کی اجازت دی گئی وہ کھانا لایا تو واعظ صاحب نے اس کو مسجد میں رکھ کر اور کھول کر سب نمازیوں کو دکھلایا کہ دیکھو بھائی یہ دعوت کا کھانا۔ گھی کتنا کم ہے۔ بوٹیاں پلاؤ میں بھی نہیں ہیں۔ غرض وہ رسوا کیا کہ خدا کی پناہ۔ وہاں سب لوگوں نے مولویوں کو برا بھلا کہا مگر واقع میں وہ مولوی نہ تھے یعنی وہ صاحب علم نہ تھے کیونکہ علم کے ساتھ اگر تقویٰ بھی نہ ہو۔ تاہم وہ ایک کمال ہے اور صاحب کمال میں خواہ وہ کمال کیسا ہی ادنیٰ درجہ

کا ہو ایک طرح کی انسانیت اور غیرت ہوتی ہے حتیٰ کہ ایک بڑھئی جو کہ ادنیٰ درجہ کا ہے اس میں بھی ایک شان استغنار کی ہوتی ہے تو جب بڑھئی کے پیشہ میں یہ شان ہے تو کیا علم دین میں کچھ بھی نہ ہوگا باقی اسکا کچھ علاج ہی نہیں کہ کوئی راہ نجات دیکھ کر واعظ ہو جاوے اور جہلاء اُس کو عالم سمجھنے لگیں اس کا علاج صرف یہ ہے کہ آپ کسی مولوی کا وعظ اس وقت سنیں جب اس کے پاس کسی مسلّم عالم کی سند دیکھ لیں اور مَیں اس مشورہ سے ان کی روزی نہیں مارتا۔ وعظ سننے سے منع کرتا ہوں باقی خالی لینا دینا تو تم ان کو پہلے دیدیا کرو تو غرض یہ ہے کہ یہ لوگ مولوی نہیں اور مَیں تو کہا کرتا ہوں کہ لوگوں نے مولویوں کو دیکھا نہیں کیونکہ آپ نے ان کے دروازوں پر جانا چھوڑ دیا۔ انہوں نے آپ کے دروازوں پر آنا چھوڑ دیا اور نام کے مولویوں کا تو یہ حال ہے کہ مَیں کیا بتاؤں کہ ایک جگہ دیکھا کہ کرایہ پر ایک مولوی صاحب جھگڑ رہے تھے کہ اتنا کرایہ دو اور بلانے والے حساب کتاب بتلا رہے تھے۔ غرض ایسے پیشہ ور لوگوں کی نظر اس پر ہے کہ کھانا کیسا تھا۔ اور ہمارے لینے کو اسٹیشن پر آئے تھے یا نہیں تو غرض جب لکھے پڑھوں کی یہ حالت ہے تو عوام الناس اور دنیا داروں کی شکایت کیا اُن کو زیادہ حق ہے کہ حلال ہونیکا معیار صرف یہ سمجھیں کہ اس میں گھی ہو البتہ پانی کا تقوےٰ سہل تھا اس کو اختیار کر لیا اور وہ بھی ہندوستان میں ہے مَیں نے حج کے سفر میں دیکھا کہ ایک صاحب نے جو کہ یہاں بڑے متقی تھے وہاں پانی سے استنجا بھی چھوڑ دیا تھا تو آدمی حد سے زیادہ نہ بڑھے۔ شریعت نے اعتدال سکھایا ہے۔ غرض پانی میں اسلئے تقویٰ ہوتا ہے کہ وہ بہت ہے اور کھانا بہت کہاں اور پھر حلال کہاں اس لئے اس میں حلال و حرام کے قصہ ہی کو حذف کر دیا اور خواہشوں کو خوب وسعت دیدی حتیٰ کہ ہمارے بھائی بعض ایسے بھی ہیں کہ وہ بغیر گوشت کے کھانا ہی نہیں

کھاتے مگر صاحبو! دنیا کی لذات سب ہیچ ہیں خواہ وہ کھانے کی ہوں یا لگاہ کی یا ہاتھ کی لوگ ان کو خفیف سمجھتے ہیں خصوص تمتعات شہوانیہ کو لیکن ان کے بارہ میں کسی نے خوب کہا ہے

لب بر لب دلبران مہوش کردن آہنگ سر زلف مشوش کردن
امروز خوش ست لیک فردا خوش نیست خود را چو خسے طعمۂ آتش کردن

یعنی کل کو جہنم میں جھکنا اچھا نہ لگے گا۔

ایک بزرگ کو کسی بادشاہ نے لکھا کہ ہم مرغ کھاتے ہیں اور تم خشک روٹی۔ ہم حریر پہنتے ہیں اور تم گدڑی تو تم سخت مصیبت میں ہو۔ ہمارے پاس آجاؤ ہم خوب خدمت کریں گے۔ انہوں نے جواب میں لکھا ہے ؎

خوردن تو مرغ مسمے دمے طعمۂ ما نانک جویں ما
پوشش تو اطلس و دیبا حریر بخیہ زدہ خرقۂ پشمین ما

آخر میں فرماتے ہیں کہ ؎

نیک ہمین ست کہ مے بگذرد راحت تو محنت دوشین ما
باش کہ تا طبل قیامت زنند آں تو نیک آید و یا این ما

یعنی اس روز معلوم ہوگا کہ وہ حالت اچھی تھی یا یہ۔ حضرت! نہ تو تمام عمر کباب پیٹ میں رہتا ہے نہ سوکھے ٹکڑے تو انجام پر نظر کیجیئے تو تقوے تو اس میں زیادہ ہونا چاہیئے نیز پانی میں تو وسعت بھی ہے۔ اگر کہیں حنفیہ کے ہاں تنگی ہے تو شافعی مالک کے ہاں وسعت ہے بخلاف کھانے کے کہ مثلاً رشوت چاروں ہی مذہب میں ممنوع ہے۔ تو جہاں وسعت تھی وہاں تو یہ تنگی اور جہاں تنگی تھی وہاں یہ وسعت۔

تقویٰ کی حقیقت

سو تقویٰ حقیقت میں یہ نہیں جس کو لوگوں نے تجویز کیا ہے۔ تقویٰ وہ ہے کہ جو حدیث میں ہے الا ان التقوی ھٰھنا و اشار الی صدرہ۔ ہاں ظاہری درستی بھی اس پر مرتب ہوتی ہے تو اصل لغت میں اس کی حقیقت ہے ڈرنا اور شریعت میں ایک مضاف الیہ کی تخصیص ہے کہ خدا سے ڈرنا پس تقویٰ تو افعال قلوب سے ہے تو فاتقوا اللّٰہ میں تو یہ فرمایا کہ قلب کو درست کرو جو کہ قلب کی اطاعت ہے اس کے بعد فرمایا ہے واسمعوا یہ جوارح کا فعل اور اس کی اطاعت ہے بس حاصل یہ ہوا کہ تم ظاہر اور باطن دونوں کو اطاعت میں مشغول کرو۔ یہ ہے اصلاح مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض نے تو صرف ظاہر کی درستی پر اکتفا کیا ہے کہ داڑھی اور پاجامہ درست کر لیا اور دوسروں پر ہزاروں طعن کریں گے اگرچہ قلب کی حالت کیسی ہی ہو۔ حدیث میں ہے کہ ایک قوم ہو گی کہ یلبسون جلود الضان والسنتھم احلی من السکر و قلوبھم امر من الذیاب اور یلبسون کے یا تو یہ معنی ہیں کہ فقیرانہ لباس پہنیں گے یا یہ کہ ظاہر میں ایسے نرم بنیں گے مگر قلوب اُن کے گرگ سے سخت ہوں گے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل
واندروں قہر خدا عزوجل

کہ ظاہر تو ایسا اور باطن ایسا خبیث تو ایک طبقہ ایسا ہو گیا اور دوسرا ایک طبقہ ان کا مقابل ہو کہ ؎

در عمل کوش ہر چہ خواہی پوش

لیکن کبھی انھوں نے زنانے کپڑے نہیں پہنے۔ صاحبو! اس مقابل کے دعوے میں دو جزو ہیں۔ ایک تو یہ کہ ظاہر میں کیا رکھا ہے تو اس کی تو نصوص سے تغلیط ہو گئی دوسرا

جز یہ کہ باطن ٹھیک ہونا چاہیئے تو یہ درست مگر یہ غلط کہ ان کا باطن درست ہے کیونکہ ظاہر تابع باطن کے ہوتا ہے اگر باطن درست ہوتا تو ظاہر جو کہ تابع ہے وہ کیسے نہ درست ہوتا اگر آپ کسی حاکم کے سامنے جاویں اور آپ سلام بھی نہ کریں اور جب باز پرس ہو تو آپ کہیں کہ جناب میرا قلب آپ کی محبت و عظمت سے پُر ہے تو وہ حاکم کہے گا کہ ہرگز نہیں ممکن نہیں کہ قلب میں محبت و عظمت ہو اور پھر گردن نہ جُھک جاوے تو اگر ظاہر خراب ہے تو یہ دلیل ہو سکتی ہے اس کی کہ باطن ہرگز درست نہیں۔ مرزا قتیل کی ایک حکایت یاد آئی کہ یہ نہایت آزاد تھے لیکن صوفی المشرب اور کلام بھی صوفیانہ مذاق کا ہوتا ہے کسی ایرانی کو ان کے کلام سے دھوکہ ہوا کہ یہ شخص صاحب حال ہے اور مرزا سے ملاقات کا شوق ہوا آخر وہ دہلی آئے اور آکر اس حالت میں دیکھا کہ بیٹھے ریش تراش رہے ہیں اس ایرانی نے کہا کہ آغا ریش می تراشی مرزا قتیل نے جواب دیا کہ بلے ریش می تراشم لیکن دل کسے نمی خراشم۔ آجکل یہ بہت زبان زد ہے کہ بس کسی کو آزار مت دو یہی سب کچھ ہے اور یہ شعر سب نے یاد کر رکھا ہے ؎

مباش در پئے آزار ہرچہ خواہی کن   کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

اُس مسافر نے فی البدیہہ یہ جواب دیا کہ آرے دل رسول اللہؐ می خراشی۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ہفتہ میں دو مرتبہ آپ پر اعمال پیش ہوتے ہیں اس سے مرزا قتیل پر ایک حالت طاری ہوئی اور آنکھیں سی کھل گئیں ہوش آیا تو بزبانِ حال کہا کہ ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی   مرا با جان جاں ہمراز کردی

اب سمجھ میں آگیا ہو گا کہ مباش در پئے آزار ہرچہ خواہی کن :: کا کیا مطلب ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہ ستاؤ تو مطلب یہ ہو گا کہ خلاف شریعت نہ کرو پس یہ

بالکل غلط ہے کہ ظاہر میں کیا رکھا ہے اور اگر غور کرو تو اس کے معنے تو یہ نکلتے ہیں کہ ہمارا قلب تو عبد ہے اور جوارح عبد نہیں۔ یہ تو ایسی مثال ہے کہ آدھا عملہ درست ہو اور آدھا درست نہ ہو تو خدا تعالےٰ نے ہم کو دو عملے دیئے ہیں۔ ایک ظاہر ایک باطن تو اطاعت میں سب ہی مقید ہیں چنانچہ خداوند جل جلالہٗ نے اتقوا کے ساتھ اسمعوا فرماکر ظاہر فرما دیا کہ دونوں ہی درست ہوں اور اسی میں مقابلہ کے طور پر سارے جوارح ہے لئے کیونکہ جارحۂ سمع و دیگر جوارح میں کوئی وجہ فرق کی نہیں پھر اس کے بعد اطیعوا فرما دیا کہ کوئی کسی خاص عمل کی تخصیص نہ سمجھ جاوے اور اطیعوا میں ایک بات ہے طالب علموں کے سمجھنے کی وہ یہ کہ اطاعت مشتق طوع سے ہے اور طوع کہتے ہیں رغبت کو تو ترجمہ اس کا یہ ہے کہ خوشی سے کہنا مانو اور خوشی قلب میں ہوتی ہے اور کہنا ماننا جوارح کو بھی عام ہے پس اس میں بھی جمع بین الظاہر و الباطن ہو گیا۔

اطاعت کی اقسام

آگے ارشاد ہے انفقوا خیرا لانفسکم اس میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ طاعات دو قسم کی ہیں ایک مالی ایک بدنی ہر چند کہ اطیعوا میں سب آگئے ہیں لیکن چونکہ حرص ہم میں غالب ہے چنانچہ اکثر کا مذاق یہ ہے کہ

گر جاں طلبی مضائقہ نیست — ور زر طلبی سخن دریں است

اللہ میاں سے لوگوں کو ایسی محبت ہے جیسے ایک بخیل کو اپنے دوست سے تھی کہ مانگنے پر بھی انگوٹھی نہ دی اور اس کی اس مصلحت کے جواب میں کہ اس کو دیکھ کر تمہیں یاد کیا کروں گا یہ کہا کہ جب اپنا ہاتھ خالی دیکھنا یاد کر لیا کرنا کہ ہم نے انگوٹھی مانگی تھی نہیں دی تو ایسی ہی محبت اللہ میاں سے بھی آج کل مسلمانوں کو ہے۔ مجھے یاد آگیا کہ بہت لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے بیہودہ موقع پر دس ہزار روپیہ دیا اور ایک دینی موقع پر سو روپیہ دیا حالانکہ وہ موقع

ایسا تھا کہ سارا گھر دیدیں لیکن خیر کچھ تو دیں اور انفاق فی سبیل اللہ کی ایک ایسی صورت ہے کہ کچھ بار ہی نہیں پڑتا جس کو میں نے اٹاوہ میں لکھا تھا کہ تمہارے گھر میں بہت سی چیزیں بیکار ہوں گی تو تم فی سبیل اللہ دیدو اس میں تمہارا کیا حرج ہے۔ بحمد اللہ اس پر لوگوں نے عمل کیا اور لکھا تھا کہ ٹھیلے کے ٹھیلے آتے ہیں اور اس میں ایک ذرا اور توسیع کر لو اس طرح ایک تو وہ چیزیں ہیں کہ ناکارہ ہیں ان کے متعلق تو تجویز پیش کر ہی چکا اور ایک وہ ہیں کہ ہیں تو کام کی اُن کی سال سال بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً میز۔ کرسی۔ پلنگ حتیٰ کہ بعض ایسی چیزیں بھی ہیں کہ ان کا ہونا معلوم بھی نہیں کہ آیا ہمارے گھر میں ہے بھی یا نہیں تو اگر ایسی چیزیں نکل جاویں تو کیا حرج ہے ایسی اشیاء کی نسبت خوب کہا ہے۔

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش   انچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

تو ان کو بھی دیدیا جاوے اس میں کیا مشکل ہے غرض عبادت مالیہ میں چونکہ غلبۂ حرص سے ہمارا یہ مذاق ہے اور اس میں ہمت کم ہے اس لئے عبادتِ مالی کو علیحدہ بھی ذکر فرمایا اور اس پر وعدہ فرمایا خیر کا اور ایک بات میری سمجھ میں آئی کہ خداوند کریم کا کلام طب کامل ہے طب میں ایک تو دوا ہوتی ہے اور ایک پرہیز۔ قرآن شریف میں ہر جگہ اس کی رعایت کی ہے یہاں وہ اسطرح ہے ہمارے اکثر امراض کا سبب ہے حب دنیا یہ وقت زیادہ نہیں ہے ورنہ میں اس کو مفصل ذکر کرتا اور دنیا میں بھی سب سے زیادہ محبوب ہے مال کہ اکثر گناہوں کا ذمہ دار یہی ہے تو خدا تعالیٰ نے اتقوا سے پرہیز بتلایا ہے کہ یہ پرہیز کرو ورنہ اطاعت کہ دوا ہے اس کے اثر کی گاڑی چلے گی نہیں چنانچہ مشاہدہ ہے کہ ہم میں جب تک مال ہے اس وقت تک ہم اطاعت شروع کرتے ہیں لیکن چلتی نہیں جیسے ٹھیلی ہوئی گاڑی کہ جہاں چھوڑ دی وہاں ہی رک گئی تو اب تو ہم اپنے کو ٹھیل رہے ہیں کہ

گھسیٹ کر اٹھایا تو تہجد کے لئے اٹھے اور نہ اٹھایا تو نہ اٹھے دل میں شوق نہیں ہے اور واقعی اکثر کام شوق ہی سے ہوتے ہیں اسی کو کہتے ہیں ؎

صنم رہ قلندر سزد ار بمن نمائی — کہ دراز دور دیدم رہ و رسم پارسائی

تو نری پارسائی بدون شوق کے چلتی نہیں بلکہ وہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد — کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند — تو برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

تو یہ حالت ہے ہمارے اعمال کی جب قلب میں کوئی حصہ محبت کا نہ ہوا اور وہ اس وقت آتا ہے کہ غیر کی محبت نکلے۔ ایک بزرگ کا قول ہے۔

حب حق ہو دل میں یا حب پسر — جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر

آجکل کا تصوف

اکثر طبائع میں یہ حب غیر برنگ حب مال زیادہ ظاہر ہوا ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے ایک لطیف طریقہ بتلایا ہے اس کے نکلنے کا کہ خرچ کیا کرو واللہ العظیم کوئی بتلا نہیں سکتا کیا خبر ہو سکتی ہے کسی کو معانی کے خواص کی۔ صاحبو! حکماء صرف خواص اجسام کو دریافت کر سکے مگر انبیاء علیہم السلام نے خدا کے بتلانے سے معانی کے خواص کو بتلایا ہے مثلاً حب مال کے خاصہ کو دیکھ کر اس کا علاج بتلایا ہے کہ خرچ کیا کرو اور علاج بھی کیسا آسان کہ جس میں نہ محنت ہو نہ مشقت ہر شخص کر سکے وہ تعلیم نہیں جو غیر محقق کی ہوتی ہے کہ اس میں ایسی سخت شرطیں لگاتے ہیں کہ خدا کی پناہ ایسے لوگوں کی تعلیم پر یہ یاد آتا ہے کہ ؎

خستگاں را چوں طلب باشد و قوت نبود — گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

اس کے معنے تو یہ ہوئے کہ اس کا ایک بندہ ایسا بھی ہے جو اس تک پہونچنے کے قابل

نہیں حالانکہ وہاں سفرۂ عام ہے اور اس میں اس کی پوری رعایت ہے کہ

طفل راگرناں دہی بر جائے شیر | طفل مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر
چار پارا قدر طاقت بار نہ | بر ضعیفاں قدر قوت کار نہ

تو مشائخ غیر محقق ہیں ان کے ہاں محض روٹیاں ہیں دودھ نہیں وہ بچہ کو بھی روٹی کھلاتے ہیں۔ اور قرآن وسنت میں تو سب کچھ ہے یہ غضب نہیں کہ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا جاوے تصوف یہ ہے جو آج گم ہے کیونکہ اب تو ہر شخص کو ایک ہی لکڑی ہانکتے ہیں کہ بیوی کو چھوڑ دو اور اولاد کو عاق کر دو گو بعض ایسے بھی ہیں جو ان تعلقات سے مجبور رکھے جاتے ہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں کہ نوکری بھی کریں اور صوفی بھی نہیں۔ میں نے اس کو خاص طور سے اس لئے ذکر کیا کہ آجکل لوگ اپنے کو تحصیل کمالات باطن سے اس بنا پر بہت معذور سمجھتے ہیں کہ نہ تو ہم سے نوکری چھوڑی جاوے گی نہ بیوی چھوڑی جاوے گی سو بے فکر رہو یہ چیزیں نہیں چھڑائی جاویں گی ہاں یہ ضرور ہے کہ رشوت سے روکا جاویگا۔ نیز آپ پر محنت شاقہ ڈالی جاوے گی جتنی قوت ہو اتنا ہی بتلایا جاوے گا۔ چنانچہ جو محقق ہیں وہ دماغی قوت اور فرصت کو دیکھ کر تعلیم کرتے ہیں اور سب کو الگ الگ بتلاتے ہیں اور اسی وجہ سے تصوّف کی تعلیم مخفی ہے کہ ہر ایک کا حال جدا ہے تو علانیہ تعلیم میں احتمال ہے کہ ایک طالب براہ ہوس دوسرے کی تعلیم پر بلا اجازت عمل کرنے لگے یہ وجہ ہے اس کے مخفی تعلیم کرنے کی نہ اس وجہ سے جو کہ مشہور ہے کہ تصوف کے مسائل سینہ بسینہ علاوہ شریعت کے چلے آتے ہیں دوسری اس میں یہ حکمت ہے کہ خلوت کی بات خصوصیت کی سمجھی جاتی ہے اور اوس کی قدر زیادہ ہوتی ہے تو بہر حال محققین کے یہاں ہر شخص کو اوس کی حالت کے موافق تعلیم دی جاتی ہے قوی کو اوسکے

موافق ضعیف کو اس کے موافق جب اس میں اسقدر سہولت ہے تو یہ دولت اصلاح باطن ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ حب دنیا کو نکالنے کے لئے ظاہراً کیسی مشکل پیش آئی تھی مگر خدا تعالیٰ نے اس کا بھی کیسا آسان طریقہ بتلا دیا کہ خرچ کیا کرو تو اب کیسی جامع تعلیم ہو گئی کہ مرض بتلایا دوا بتلائی پرہیز بتلا دیا اس لئے ان کو اس جگہ جمع کر دیا گیا اور ہر ایک میں مناسب مناسب اور مفید رعایتیں فرمائیں۔ میں ہر ایک کو مفصل ذکر کرتا مگر وقت گذر گیا ہے اور مجملاً ذکر بھی ہو گیا ہے اس لئے میں سب کا قدرے قدرے بیان کرتا ہوں پس اتقوا اللہ میں یہ قید لگائی کہ ما استطعتم جس سے معلوم ہوا کہ ہم کو اسی قدر کا مکلف کیا گیا ہے کہ جس قدر طاقت ہو اگر اس پر کوئی کہنے لگے کہ ہم کو تو صرف ایک ہی وقت کی نماز کی طاقت ہے تو جواب یہ ہے کہ تم نے صرف اسی کو دیکھا ہے دوسرے مقام کو نہیں دیکھا کہ حق تعالےٰ نے پانچ وقت کی نماز کا مکلف فرمایا اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا اس سے صاف معلوم ہوا کہ جتنے کا مکلف فرمایا ہے اس کی طاقت ضرور ہے پس اب جو یہاں فرمایا ما استطعتم تو مطلب یہ ہوا کہ جتنا تم کو بتلایا سب کرو اور یہ عنوان دل بڑھانے کے لئے فرما دیا جیسے کوئی نوکر سے کہے کہ تم سے یہ کام تو ہو سکتا ہے تو جو ہو سکتا ہے وہ تو کرو تو گویا تصریحاً متنبہ کیا کہ تم سے تو ہو سکتا ہے تو یہ شبہ تو دفع ہو گیا۔

عدم توجہی

اب ایک اور شبہ رہا کہ یہ تو مشاہدہ ہے کہ نہیں ہو سکتا تو یہ دعویٰ مشاہدہ کا بالکل غلط ہے بات یہ ہے کہ آپ ہمت نہیں کرتے اس لئے کچھ ثقل معلوم ہوتا ہے جس کو آپ نے سمجھ لیا کہ نہیں ہو سکتا اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ کو رات کے وقت خفیف ترشح میں پیاس لگے مگر سردی کی وجہ سے آپ کو باہر جانا ایسا دشوار ہوا کہ یوں سمجھے کہ ہم جا ہی نہیں سکتے لیکن رات کو دو بجے کے وقت ایک سوار آیا اور

پروانہ دیا کہ کلکٹر صاحب نے بلایا ہے پس آپ نے معاً حکم دیا کہ گھوڑا کسوا اور بارانی پہنکر دو میل چلے گئے اور راستہ میں رعد و برق بھی ہوا سب کچھ ہوا مگر گئے ضرور تو اگر اس وقت پانی پینے کے لئے باہر نکلنا مشکل تھا تو اسی وقت ۲ میل چلنا کیسے آسان ہو گیا تو بات یہ ہے کہ فرق فقط ہمت کا ہے کہ اوّل پیاس کے وقت عزم و ارادہ نہ کیا تھا اور اب ارادہ کیا ہے تو جتنے کاموں کو آپ کہہ رہے ہیں کہ نہیں ہو سکتا ان سب میں آپ نے ارادہ ہی نہیں کیا بس یہ ہے وجہ۔ حضرت مولانا اُستاذنا کی حکایت یاد آئی کہ نماز کے بارہ میں ایک حدیث ہے کہ ایسی نماز ہو کہ جس میں حدیث النفس وسوسہ نہ لاوے وہ حدیث سبق میں آئی ایک طالبعلم نے کہا کہ حضرت کیا ایسی نماز ہو سکتی ہے۔ مولانا نے کہا خوب فرمایا کیا کبھی ارادہ کیا تھا کہ نہیں ہوئی یا ویسے ہی سمجھ لیا کہ نہیں ہو سکتی کر کے تو دیکھا ہوتا خلاصہ یہ ہوا کہ تمام اعمال میں پورا تقویٰ اختیار کرو اور وہ سب استطاعت میں ہے مگر شرط ارادہ آگے فرمایا ہے واسمعوا اس سے ایک مسئلہ مستنبط کرتا ہوں کہ احکام کا سننا بھی ایک بہت بڑا مقصود ہے ہم میں جو زیادہ کمی ہوئی ہے اس کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ علم حاصل کرنے کی طرف توجہ نہیں اور ہے بھی تو صرف علم معاش کی طرف اور میں معاش سے منع نہیں کرتا لیکن یہ شکایت ضرور ہے کہ باوجودیکہ معاد غیر محدود غیر منقطع ہے اور معاش محدود و فانی ہے پھر غضب ہے کہ غیر محدود تو آپ کی نظر میں وقعت نہ رکھے اور محدود وقعت رکھے حتیٰ کہ احکام کو معلوم بھی نہ کیا جاوے میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر عمل کی بھی نیت نہ ہو تب بھی علم حاصل کرو چاہیئے تو عمل بھی کرنا لیکن اخیر بات ہے کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تب بھی علم حاصل کیجئے بہت بڑی بڑی خرابیاں دور ہو جاویں گی۔ مثلاً عقائد کی کیونکہ ان میں تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا دوسرے اعمال پر یہ اثر ہو گا کہ کبھی توفیق ہوئی عمل کی تو

راہ تو معلوم ہو گا مثلاً کسی کو خارش ہو اور وہ علاج کرنا نہ چاہے تب بھی نسخہ تو ضرور ہی حاصل کرے۔ تیسرے یہ نفع ہے کہ اب تو گناہ کرتے ہیں مگر گناہ نہیں سمجھتے جس میں ایمان جانیکا اندیشہ ہے اور بعد حصول علم گناہ تو سمجھے گا تو اس سے جرم قدرے خفیف ہو جاوے گا اور جرم کا خفیف ہو جانا گو برأت نہ ہو خود یہ بھی ایسا مقصود ہے کہ اگر کسی مقدمہ میں پیروی کرنے سے جرم سے بری ہونے کی تو توقع نہ ہو مگر خفیف ہو جانے کی امید ہو تب بھی اپیل کریں گے تو معلوم ہوا کہ خفیف ہونا بھی مقاصد میں سے ہے پس علم سے یہ فوائد ہیں اور میں یہ نہیں کہتا کہ سب مولوی بنیں بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ سب لوگ مولوی نہ بنیں لوگ مولویوں کو ناحق ..... ہی بدنام کرتے ہیں کہ یہ سب کو مولوی بنانے کی فکر میں ہیں مگر یاد رکھو کہ ہم سب کو مولوی نہ ہونے دیں گے کیونکہ مولوی بننے کے معنے ہیں مقتدا بننا اور اس کے لئے ہر شخص اہل نہیں بلکہ اس کے لئے چند شرطیں ہیں کہ اُس میں مثلاً تحمل اور وقار بھی ہو اُس میں شان استغنا بھی خاص طور سے ہو اور یہ سب سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ اُس کی حالت طبیب کی سی ہے کہ جس کے لئے یہ امر مضر ہے کہ وہ دوائیوں کی دوکان بھی رکھے کہ اس سے شبہ خود غرضی کا ہوتا ہے ہم لوگوں میں کثرت سے تملق اور حرص ہے تو اگر ایسا شخص مقتدا ہو جاوے تو قوم کے لئے بُرا نمونہ ہو جاوے گا اس کی وہ حالت ہو گی کہ .

زباں میکند مرد تفسیر داں — کہ علم و عمل می فروشد بہ ناں

ایسا شخص اگر کہیں سفر میں ہو اور اس کو روپیہ کی ضرورت ہوئی تو وہ ضرور وعظ کہکر مانگ لیگا بخلاف صاحب استغنا کے کہ گو حاجت اس کو بھی ہوتی ہے لیکن اس کی غیرت اس کو ظاہر نہیں ہونے دیگی مجھے اس پر ایک شہزادہ کا قصہ یاد آگیا جو ایک

شخص نے بیان کیا تھا کہ ایک والی ملک لکھنؤ میں تھے ایک جلاوطن شدہ شہزادہ ایران سے دوچار ہوگئے شہزادہ نے نواب صاحب کی دعوت کی نواب صاحب نے درخواست کی کہ کبھی ہماری ریاست میں آیئے چنانچہ اتفاق سے یہ شہزادہ ایک سفر میں بالکل مفلس ہوگیا اور اسوقت نواب صاحب کی وہ درخواست یاد آئی اور اس ریاست میں بحال خستہ پہونچے۔ نواب صاحب نے ان کی یہ حالت دیکھ کر براہ ترحم یہ شعر پڑھا ؎

آنکہ شیراں راکند روبہ مزاج　　　احتیاج ست احتیاج ست احتیاج

وہ شہزادہ مارے غیرت کے آگ بن گیا اور فی البدیہہ نہایت تندی کے ساتھ جواب دیا ؎

شیرِ نرکے می شود روبہ مزاج　　　میزند بر کفش خود صد احتیاج

اور فوراً واپس ہوگیا نواب صاحب دوڑے کہ خدا کے لئے ذرا ٹھہریئے مگر نہیں ٹھہرا حضرت غیرت علمی تو اس سے بڑھ کر ہوتی ہے اور ایک شرط مقتدا ہونے کی یہ ہے کہ اس کو حق میں خوف کسی سے نہ ہو اُس کی یہ شان ہو کہ ؎

موحد چہ برپائے ریزی زرش　　　چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد زکس　　　ہمیں ست بنیاد توحید و بس

تو کیا ہم میں ہر شخص ایسا ہے جو ان شرائط کا جامع ہو ہرگز نہیں جب ہر شخص ایسا نہیں تو آپ ڈریں نہیں کہ ہم سب کو مولوی بناتے ہیں۔

حصولِ علم ہاں سب کو عالم ضرور بنانا چاہتے ہیں لیکن عالم ہونے کے لئے عربی پڑھنا ضروری نہیں بلکہ احکام کا دریافت کرنا کافی ہے

پس اتنا سب کے لئے بیشک ضروری ہے کہ احکام کو معلوم کریں اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو
لوگ پڑھ سکتے ہیں وہ تو یہ کریں کہ ایک نصاب مقرر کرکے اس کو روزانہ سبقاً سبقاً کسی
عالم سے پڑھ لیں اور جو لوگ لکھے پڑھے نہیں ہیں وہ یہ کریں کہ ہفتہ میں دو مرتبہ ایک
ایک آدمی پچاس پچاس آدمیوں کو لیکر بیٹھ گیا اور آدھ گھنٹہ کوئی دینی کتاب سنا دی اب
رہی عورتیں سو یا تو ان کو مرد پڑھا دیں یا ان کو کتاب سنا دیا کریں اور عمر بھر اسی طرح
شغل رکھیں بتلایئے کیا مشکل کام ہے یہ تو روزمرّہ مسائل سننے کا طریقہ ہے دوسرے یہ
کام کیجئے کہ جو کام کرنا ہو علماء سے دریافت کرکے کیجئے اگر کوئی مل جاوے تو وہاں دریافت
کیجئے یا مراسلت کے ذریعہ سے۔ اس سے احکام معلوم ہوتے رہیں گے پس اس طریقہ سے
علم حاصل ہو جانا کتنا آسان ہے اس طریقہ سے دو برس میں ہر شخص عمل کے لئے مولوی
ہو سکتا ہے لیکن وعظ نہ کہنا چاہیئے کہ یہ نازک کام ہے اس کے لئے اتنی معلومات کافی
نہیں اس لئے وعظ تو وہی کہیں جو باقاعدہ علوم حاصل کئے ہوئے ہوں تو اسمعوا سے
یہ مسئلہ مستنبط ہوا اور میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اس کے بقا کی بھی ضرورت ہے کیونکہ یہ
سب طرق علم کے وجود پر موقوف ہیں تو اگر اس کا سامان بقا نہ ہو تو یہ سلسلہ بھی گم
ہو جاوے گا اور اس کا کوئی طریقہ سوائے اس کے نہیں کہ ہر شہر میں ایک مدرسہ ہو
جس میں نصاب عربی کی تکمیل ہو خیر اگر اس کی ہمت نہ ہو تو کم از کم ہر شہر میں ایک عالم
ہی رہے گو اس وقت آپ ان سے فائدہ نہ اٹھا دیں لیکن تب بھی رہنا ضروری ہے
اور ان عالم سے ایک کام تو یہ لیں کہ چھوٹے بچوں کو ان کے سپرد کریں دوسرے یہ کہ ان
سے مسائل پوچھیں اور محلہ در محلہ ان سے ضروری وعظ کہلا دیں اطیعوا کے متعلق
اتنا کہنا ضروری ہے کہ جب اس کے معنے خوشی سے ماننے کے ہیں تو آپ پر واجب

ہوا کہ آپ خوشی سے مانیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ محبت دل میں پیدا کرو تاکہ کہنا ماننا
خوشی سے ہو اور اس کے پیدا ہونیکا طریقہ یہ ہے کہ عمل شروع کردیں اوّل تکلف ہو گا
پھر اس کی برکت سے محبت بڑھنے لگے گی اور راز اس میں یہ ہے کہ سہولت ہو گی ظاہر
سے بھی باطن میں مدد ملتی ہے دیکھو اسی ظاہر کی برکت ہے کہ اس سے شدہ شدہ ایسی
محبت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہماری نماز گو کوئی نماز نہیں مگر باوجود اس کے یہ حالت ہے کہ
اگر کوئی پکا نمازی ہو اور وہ غریب ہو اور اس سے کہا جاوے کہ سو روپیہ دیں گے
آج کی نماز قضا کردو تو ہرگز نہ راضی ہو گا تو دیکھئے عمل کی ظاہری پابندی سے بھی قلب
میں محبت پیدا ہو گئی تو سب اعمال کو تکلف کیا کیجئے اس سے محبت پیدا ہو گی اور اس
محبت کے قائم رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کیجئے زیادہ نہ ہو تو کم
از کم ہفتہ میں ایک ہی بار یا مہینہ میں ایک بار یا کسی اہل اللہ کے پاس بیٹھئے اس میں
خاصیت ہے کہ اس کے اندر جو چیز ہے وہ شدہ شدہ آپ کے اندر بھی آوے گی اور میں
آپ سے دنیا کے کام نہیں چھڑاتا اپنی فرصت کے وقت جا کر ان کے پاس رہیئے اور اگر
یہ بھی ممکن نہ ہو تو ان کے ملفوظات ہی پڑھیئے لیکن محض تذکرہ اور فن کی کتابوں کی طرح
نہ دیکھئے گا۔ اس طریقہ سے محبت قائم رہتی ہے اور بڑھتی بھی ہے تیسری چیز جس سے
محبت بالخاصہ بڑھتی ہے وہ ذکر اللہ ہے گو تھوڑی ہی دیر اللہ اللہ کرے اور اسی میں
سے کچھ وقت نکال کر نفس کا محاسبہ کیا کیجئے کہ تو نے یہ نافرمانی کی ہے ایک وقت تجھ کو
خدا کے سامنے جانا ہے پھر خدا کے عذاب کو یاد کرے اور توبہ کرے کہ مجھے نافرمانی
سے بچا لیجئے یہ وہ طریقہ ہے کہ اس میں نہ نوکری چھوٹے نہ تجارت اور اپنی اولاد کے
لئے بھی یہی کیجئے ۔

صحبت علماء

بلکہ ان کے لئے اور بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ آپ نے پھر بھی بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں اس لئے آپ میں زندقہ تو نہیں ہے اور ان نوعمروں میں زندقہ ہے کہ تمسخر کرتے ہیں مگر اس میں اوّل خطا ماں باپ کی ہے مجھے ایک لڑکا ملا بریلی میں کہ اس کے دادا نے اس غرض سے پیش کیا کہ اس کو نماز کی فہمائش کر دیں میں نے نرمی سے پوچھا کہ جب خدا تعالیٰ کا حکم ہے پھر تم کیوں نہیں پڑھتے اُس نے بیدھڑک کہا کہ صاحب مجھ کو خود خدا ہی کے وجود میں شک تھا میں نے اس کے دادا سے کہا کہ تم نماز کو لئے پھرتے ہو اس کو تو ابھی مسلمان بنانے کی ضرورت ہے اس کے بعد وہ آبدیدہ ہوا اور کہا کہ یہ سب وبال باپ پر ہو گا کہ مجھ کو فلاں کالج میں بھرتی کیا اور میں کیا بتلاؤں کہ وہ کہاں پڑھتا تھا۔ ایک اسلامی کالج میں پڑھتا تھا اسی لئے کہا کرتا ہوں کہ گورنمنٹ اسکول میں پڑھنے سے اس قدر بے دینی نہیں ہوتی جسقدر وہاں ہوتی ہے غرض یہ حالت ہو گئی ہے۔ نئی تعلیم کی سو یہ ماں باپ کے ذمہ ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ان بچوں کو زیادہ ضروری سمجھ کر علم دین پڑھایئے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کیجئے کہ سال میں کم سے کم ہفتہ دو ہفتہ کسی اہل اللہ کے پاس ان کو ضرور رکھیئے وہاں یہ حالت ہوتی ہے۔

گر تو سنگ خارہ مرمر شوی ۔۔۔ چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

صحبتِ نیکاں اگر یک ساعت ست ۔۔۔ بہتر از صد سالہ زہد و طاعت ست

ہر کہ خواہد ہمنشینی باخدا ۔۔۔ گو نشیند در حضورِ اولیا

اور اس کے مقابل کی صحبت میں اسکا مقابل دوسرا اثر ہے۔

تا توانی دور شو از یار بد ۔۔۔ یار بد بدتر بود از مار بد

خصوص جہاں تمام عمر کی صحبت ہو یعنی تعلق نکاح اور آجکل اسی میں زیادہ بے احتیاطی ہے ایک بار بعض انگریزی خواں عمیری اس بات پر خفا ہو گئے کہ میں نے یہ بیان کیا تھا کہ لڑکی کے پیغام کے وقت یہ بھی تو تحقیق کر لیا کرو کہ لڑکا مسلمان بھی ہے یا نہیں کیونکہ ان نوعمروں میں ایسی بلیا کی ہے کہ بعض اوقات ان کے بعض کلمات سے کسی طرح ایمان نہیں رہ سکتا ان بچوں کے لئے بہت ہی ضروری ہے کہ کسی کے پاس رہیں یہ ایسی مفید چیز ہے کہ اگر اعمال میں بھی کوتاہی ہو تب بھی وہ مسلمان تو ہو گا چنانچہ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ عمل میں آزاد اور عقیدے میں نہایت پختہ تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ کسی مولوی کی صحبت میں رہے ہیں تو صحبت سے عقائد درست رہتے ہیں حضرت عمل دوسری چیز ہے لیکن اصل دین وہ ہے جو قلب میں رچ جائے سو یہ صحبت پر موقوف ہے تو بچوں کے لئے آپ ضرور ایسا کیجئے ورنہ کل کو آپ پچھتائیں گے اور روئیں گے جب ان کی حالت تباہ دیکھیں گے چنانچہ ایک صاحب بیرسٹری پاس کر کے آئے اور نماز کی تاکید پر باپ کو یہ جواب دیا کہ کس کی نماز پڑھوں باپ نے کہا کہ جس نے تم کو پیدا کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ مجھ کو تو تم نے اور میری ماں نے پیدا کیا باپ روئے اور کہا کہ میں نے چالیس ہزار روپیہ میں جہنم خریدا ہے اور اگر آج نہ روئے تو کل قیامت میں رونا پڑے گا۔ جب دیکھا جاوے گا کہ لڑکا کندۂ جہنم ہے میں انگریزی کو منع نہیں کرتا بلکہ میں تو اس وقت نماز روزہ کو بھی نہیں کہتا صرف یہ کہتا ہوں کہ کسی اہل اللہ کی صحبت میں رہنے کا اہتمام کچھ کر لو بس یہ ہے حاصل مجموعہ ذرائع محبت کا جس سے حقیقت اطاعت کی میسر ہو گی یعنی تکلف عمل کرنا اور صحبت اہل اللہ کی اختیار کرنا میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس وقت آپ خوشی سے قبول کریں گے۔ پھر نماز کا قضا ہو

جانا آپ کو ایسا گراں ہوگا کہ جیسے بیٹا مرگیا اور یہی تو وجہ ہے کہ سلف کی اگر تکبیرِ اولیٰ قضا ہو جاتی تھی تو لوگ تعزیت کرتے تھے تو آپ کی بھی یہ حالت ہو جاوے گی کہ ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود ۔ گر ز باغِ دل خلالے کم بود

اب بتلائیے اس میں کونسی دشواری ہے ہم تو بتوفیق اللہ بحکم الیسیر پر عمل کرکے طریق کی تعلیم کرتے ہیں لیکن اب بھی اگر کوئی نہ کرے تو ہم کہیں گے کہ ؎

اُس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر ۔ تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

یہ اطیعوا کے متعلق ہے

حبِ مال

انفقوا کے متعلق میں اتنا کہتا ہوں کہ اکثر خرابیاں جتنی ہیں وہ مال ہی سے ہوتی ہیں چنانچہ اسراف بھی حبِ مال سے ہوتا ہے اور اس کا عکس بھی ہوتا ہے اور بخل بھی اسی سے ہوتا ہے اس کا خصوص کے ساتھ علاج ہونا چاہیے آگے فرماتے ہیں ومن یوق شح نفسہ فاولٰئک ھم المفلحون یہ خاص متعلق مال ہی کے ہے کہ جو شخص بخلِ نفس سے بچا لیا جاوے اُس کی فلاح ہوگی حرص و بخل سے بچنے کی خاص کرکے ترغیب دینے کی وجہ یہ ہے کہ اسی سے زیادہ مفسدہ ہوتا ہے اور اس میں ایک نکتہ بھی ہے کہ شح نفسہ فرمایا ہے الشح نہیں فرمایا وہ نکتہ اسی مجلس میں ذہن میں آیا ہے وہ یہ کہ نفس کا لفظ جو بڑھا دیا گیا ہے اُس میں یہ امر بتلا دیا کہ حرص ایک تو یہ ہے کہ اس کی ذات میں ہو دوسری یہ ہے کہ حاجت کی وجہ سے ہو تو روپیہ تو کسی کو برا نہیں لگتا اور اگر کہو کہ بعض کو روپیہ بھی برا لگتا ہے تو وجہ یہ ہے کہ اول سے بڑی چیز مل گئی مثلاً دنیا کی جاہ یا آخرت کی نعمت سو جب دیکھتے ہیں کہ اس جگہ مال لینے سے دین ضائع ہوتا ہے یا محسن کی ذلت ہوتی ہے تو وہاں مال مبغوض ہوتا ہے ورنہ فی نفسہ مال مرغوب ہے پس اگر

نفس کا لفظ نہ ہوتا تو لوگ مر جاتے کیونکہ سب میں کم وبیش حرص ضرور ہے تو نفسہ بڑھا کر بتلا دیا کہ اگر حاجت کے موافق حرص رہے تو وہ ذات میں نہیں ہے اس لئے اس سے بچنا ضروری نہیں ہاں حاجت سے قطع نظر خود جب ذات ہی میں اُسکی محبت ہو تو وہ حالت خطرناک ہے اور اس تحقیق سے ایک بڑے جھگڑے کا فیصلہ ہو گیا کہ علماء میں اور اہل دنیا میں بڑا جھگڑا ہے ترقی کی بابت کہ ترقی کریں یا نہ کریں پس فیصلہ یہ ہوا کہ حاجت کی قدر تو جائز لیکن اس کو خود مقصود سمجھنا ناجائز جس کا حاصل دوسرے عنوان میں یہ ہے کہ طلب دنیا یعنی دنیا کمانا تو بُرا نہیں ہے لیکن حبّ دنیا بُرا ہے ہمارے حضرت نے اس کی ایک مثال دی ہے کہ مال مثل پانی کے ہے اور قلب مثل کشتی کے اور ؎

آب در کشتی ہلاک کشتی ست — آب اندر زیر کشتی پشتی ست

یعنی کہ پانی کشتی کا معین بھی ہے اور اس کو ڈبونے والا بھی ہے اس طرح کہ کشتی سے باہر رہے تو معین ورنہ مہلک اسی طرح مال ہے کہ اگر مال قلب سے باہر صرف ہاتھ میں ہے تو معین اور اگر قلب کے اندر اس کی محبت ہے تو مہلک اور اسی کو کہا ہے ؎

مال را کز بہر دیں باشی حمول — نعم مال صالح گفت آں رسول

حدیث میں ہے نعم المال الصالح للرجل الصالح ایسی حالت میں وہ لوگ مال اقارب کو دیں گے چندہ دیں گے تو حاصل فیصلہ کا یہ ہوا کہ علماء حبِ دنیا کو منع کرتے ہیں کسب دنیا کو منع نہیں کرتے تو شح حاجت کا مضائقہ نہیں شح نفس بُرا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس راز کو خوب سمجھا کہ جب فارس کا خزانہ آپ کے سامنے آیا تو آپ نے آیت زین للناس حب الشھوات پڑھی اور فرمایا کہ اے اللہ اس سے معلوم ہوا کہ ہم میں اس کی رغبت تو پیدا کی گئی ہے تو اس کا ازالہ تو نہیں چاہیئے

مگر یہ دُعا ہے کہ یہ محبت آپ کی محبت میں معین ہو جاوے۔ غرض گرنا پڑنا اور قبلہ بنانا درست نہیں اب مَیں ختم کرتا ہوں دیکھئے خدا تعالیٰ نے کن کن شفقتوں سے ہمارا علاج فرمایا ہے کہ ظاہر و باطن سب کی درستی ہو جاوے اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم سب مِل کر ہمت کریں اور علم و عمل کا اہتمام کریں اور یہ سب تدابیر ہیں لیکن تدابیر کا نافع ہونا خدا کی مدد سے ہوتا ہے تو دعا کیجئے کہ وہ اس کی توفیق دے اور ہماری مدد فرما دے آمین ثم آمین وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ وسیّدنا وحبیبنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

المرابطہ

علم و عمل کے متعلق یہ وعظ ۲۹ جمادی الاول ۱۳۴۸ھ بروز شنبہ صبح ۸ بجے بر مکان اہلیہ صغریٰ حضرت موصوف نے کرسی پر بیٹھ کر فرمایا۔ جو پونے چار گھنٹہ میں ختم ہوا۔ تعداد سامعین، مرد قریباً ۶۰ مستورات کثیر در پردہ تھیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ عاشورہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ
شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا
ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا
وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ
وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ
الرَّحِیْمِ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ
تُفْلِحُوْنَ ۝

تمہید اس بیان کا سبب بجز مہمانوں کی درخواست کے کچھ نہیں ہے پہلے سے قصد نہ تھا اور درخواست کے بعد بھی اسواسطے قصد نہ تھا کہ مضمون ذہن میں کوئی حاضر نہ تھا مگر توکلاً علی اللہ اس شرط کے ساتھ وعدہ کر لیا تھا کہ اگر مضمون ذہن میں آگیا تو بیان کر دوں گا اسکے بعد میں نے بہت سوچا مگر کوئی مضمون نہ آیا پھر رات کو خود ہی فضل ہوا کہ مضمون ذہن میں آگیا اور یہ کوئی نیا مضمون نہیں بلکہ وہ مضمون ہے جس کا تذکرہ قریب قریب ہر جلسہ میں مختلف عنوانوں سے آجکل ہوتا تھا عنوان اس کا عمل ہے بزرگوں نے اس کا بہت اہتمام فرمایا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں جا بجا ارشاد ہے ؎

کارکن کار بگذر از گفتار　　　کاندریں راہ کار باید کار

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جس وقت خلیفہ ہوئے اور پہلے پہل خطبہ پڑھنے کھڑے ہوئے تو مضمون کی آمد نہ ہوئی تو آپ نے کچھ دیر سوچا جب سوچنے سے بھی آمد نہ ہوئی تو فرمایا۔ اَنْتُمْ اِلٰی اِمَامٍ فَعَّالٍ اَحْوَجُ مِنْکُمْ اِلٰی اِمَامٍ قَوَّالٍ وَسَتَاْتِیْکُمُ الْخُطَبُ بَعْدُ قُوْمُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ تَکُمْ رَحِمَکُمُ اللہُ کہ تم کو کام کرنے والے امام کی ضرورت ہے باتیں بنانے والے کی ضرورت نہیں مطلب یہ تھا کہ میں انشاء اللہ کام کرکے دکھلاؤں گا خالی باتیں نہ بناؤں گا تو حضرت عثمان نے بھی اس ارشاد میں عمل کی اہمیت پر تنبیہ فرمائی ہے۔ حضرت عثمان میں حیا و خجلت کا مادہ زیادہ تھا جیسا حدیث پڑھنے والوں پر مخفی نہیں اور حیا کثرت کلام سے مانع ہے اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بوجہ غلبہ حیا کے خطبہ طویلہ بیان نہ کر سکے۔

کثرتِ کلام آجکل لوگ کثرتِ کلام کو ہنر سمجھتے ہیں لیکن حدیثوں سے اس کی مذمت معلوم ہوتی ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے ان اللّٰہ یبغض البلیغ من الرجال اللہ تعالیٰ بلیغ لوگوں کو پسند نہیں فرماتے بلیغ سے مراد وہ نہیں جو اہل معانی کی اصطلاح میں ہے بلکہ بلیغ سے مراد وہ شخص ہے جو بے تکلف بولتا چلا جائے کیونکہ مذموم یہ ہی ہے اور بلاغت مصطلحہ مذموم نہیں (بلکہ محمود ہے لقولہ تعالیٰ وَقُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِیْغًا ۱۲) بہرحال کثرتِ کلام مذموم ہے حضرت شیخ فرید عطار فرماتے ہیں ؎

دِل زِ پُر گفتن بمیرد در بدن ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ گرچہ گفتارش بود در عدن

حضرات عارفین کو اس کا مشاہدہ شب و روز ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک کلمہ سے قلب سیاہ ہو جاتا ہے اسکے متعلق تجربہ یہ ہے اور میں اس لفظ سے بھی شرماتا ہوں کیونکہ درپردہ اس میں اپنے عارف ہونیکا دعویٰ ہے اور میں تو ان کی خاک پا بھی نہیں ہوں بس یوں کہیئے کہ تجربہ کاروں سے سنا ہے کہ ضروری گفتگو دن بھر ہوتی رہے تو اس سے قلب پر ظلمت کا اثر نہیں ہوتا چنانچہ ایک کنجڑا دن بھر لیلوا مردو پکارتا پھرے تو ذرہ برابر اس سے قلب میں ظلمت نہ آئیگی کیونکہ بضرورت ہے اور بیضرورت ایک جملہ بھی زبان سے نکل جائے تو دل سیاہ ہو جاتا ہے پس شیخ فرید عطار کے قول کا مطلب یہ ہوا کہ بیضرورت باتیں کرنے سے دل سیاہ ہو جاتا ہے اور یہی مراد بلیغ سے حدیث میں ہے جو بیضرورت زیادہ باتیں کرے اور بے تکلف بے سوچے گفتگو کرے کیونکہ ایسا وہی شخص کر سکتا ہے جو بے فکر ہو اور جس کے دل کو فکر لگا ہوا ہو وہ بے تکلف گفتگو نہیں کر سکتا میں دیکھتا ہوں کہ جس قدر علوم میں ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر کلام کی روانی کم ہوتی جاتی ہے اور اگر کبھی روانی زیادہ ہوتی ہے تو وہ مخاطبین کا فیض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخاطب کو

فائدہ پہونچانا چاہتے ہیں انکے افادہ کیلئے قلب میں مضامین مفیدہ کثرت سے وارد ہوجاتے ہیں پس شیوخ نازنہ کریں کہ ہم نے بڑے بڑے علوم واسرار بیان کردیئے کیونکہ کبھی سامعین کی برکت سے بھی مضامین کا ورود ہوتا ہے اور اس وقت اس کی مثال قیف جیسی ہوتی ہے کہ وہ محض واسطہ ہے بوتل میں تیل پہنچانے کا اب اگر قیف ناز کرنے لگے کہ میں نے تیل پہنچایا ہے اسکی حماقت ہے بلکہ اس کو بوتل کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اسکی برکت سے اس کو بھی تیل سے کسی قدر تعلق ہوگیا۔ ایک عالم کی حکایت ہے کہ انکے وعظ میں ایک عارف موجود تھے جو ان کی طرف متوجہ تھے ان کی توجہ کا یہ اثر ہوا کہ وعظ میں عجیب عجیب علوم بیان ہوئے درمیان میں واعظ کو عجب ہوا کہ آج تو میں نے بڑے علوم بیان کئے ہیں عارف کو اس خطرہ کا کشف ہوگیا تو انہوں نے اپنی توجہ ان کی طرف سے ہٹالی توجہ کا ہٹانا تھا کہ واعظ کو آمد بند ہوگئی اس لئے کسی وقت روانی بیان نہیں ہوا ور علوم عجیبہ ہوجائیں تو اس کو سامعین کا فیض سمجھنا چاہیے غرض کثرت کلام خود مقصود نہیں بلکہ افادہ واستفادہ کے لئے ذریعہ ہے اور مقصود عمل ہے۔

عمل کی حقیقت

بزرگان دین کی یہ ہی وصیت ہے شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

قدم باید اندر طریقت نہ دم ۔ کہ اصلے ندارد دمے بے قدم

قدم سے مراد عمل ہے اہل طریقت تو یہاں تک مشاہدہ کرتے ہیں کہ جس کام کو وہ خود نہیں کرتے اسکی نصیحت بھی دوسروں پر موثر نہیں ہوتی اور جس کام کو خود کرتے ہیں اسکی نصیحت بھی موثر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ بزرگوں نے وصیت کی ہے کہ عارف کو بھی خلوت کی ضرورت ہے گو وہ اس درجہ پر پہنچ چکا ہو کہ

خلوت وچلہ بروِ لازم نماند

مگر دوسروں کے افادہ کے لیے اس کو خلوت لازم سمجھنا چاہیئے تاکہ جلوت میں جو علوم کا افادہ ہوچکا ہے ان کے علاوہ خلوت میں نئے علوم مجتمع ہوجائیں اور چشمہ بند نہ ہو بلکہ پانی کی آمد برابر ہوتی رہے چونکہ آجکل لوگوں کو عمل کی طرف توجہ نہیں عوام تو عوام خواص کو بھی زیادہ توجہ اسرار و ذوقیات ہی کی طرف ہے اس لیے بھی یہ مضمون زیادہ ضروری ہوگیا اور خواص کو عمل کی طرف توجہ ہے اس لیئے کم ہے کہ عمل میں ابتداً لذت نہیں ہوتی اور ذوقیات میں سراسر لذت ہے عمل کی مثال ابتدا میں مثل دوا کے ہے اور انتہا میں مثل غذا کے ہے منتہی کو عمل میں زیادہ لذت ہوتی ہے چنانچہ حدیث میں ہے جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ اب جو سالکین یہ شکایت کرتے ہیں کہ ذکر میں اور نماز و روزہ میں مزہ نہیں آتا ان پر ہنسی آتی ہے کہ انہوں نے طبیب سے کبھی یہ شکایت کی کہ دوا میں مزا نہیں آتا پھر یہاں اس شکایت کے کیا معنی صاحب تم کو جو ذکر و اوراد تبلائے گئے ہیں بطور دوا کے تبلائے گئے ہیں پھر دوا میں لذت کی طلب کیسی ہاں اس کی عادت کرلو تو پھر مثل غذا کے اس میں بھی لذت آنے لگے گی کیونکہ عادت کے بعد دوا بھی غذا بن جاتی ہے جیسے افیون اور تمباکو کہ حقیقت میں یہ چیزیں دوا ہیں مگر عادت کے بعد غذا سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتے ہیں پس عمل میں لذت اور سہولت کا طالب ہونا غلطی ہے۔ اور اگر شیخ ایسا طریقہ تبلادے جس سے عمل میں سہولت ہوجائے تو یہ اسکا فرض منصبی نہیں محض تبرع ہے چنانچہ حکیم کا فرض منصبی صرف نسخہ لکھدینا اور دوا تبلادینا ہے مریض کو یہ حق نہیں کہ طبیب سے الائچی اور پان کا مطالبہ کرنے لگے اگر وہ نسخہ تبلاکر

الائچی اور پان بھی کھلا دے تو یہ اسکا احسان ہے جیسا بعض اطباء شفقت کے طور پر مریضوں کو بدپرہیزی کی اجازت دیدیتے ہیں مولانا حکیم معین الدین صاحب مرحوم کی حکایت سنی ہے کہ وہ اپنے سامنے مریض سے پرہیز نہ کراتے تھے اور کہتے تھے کہ میرے سامنے جس چیز کو دل چاہے کھالو کیونکہ وہ نسخہ میں اسکی رعایت کرلیتے تھے مگر پیچھے اس کی اجازت نہ تھی تو یہ محض انکی شفقت تھی مریض کو اسکی درخواست کا حق نہ تھا۔

شیوخ و مُریدین

شیوخ چونکہ مربی ہیں اور بدپرہیزی کرانا تربیت کے خلاف ہے اس لئے ان سے بھی بدپرہیزی کی اجازت مانگنے کا کسی کو حق نہیں اور لذت وسہولت کی طلب بھی ایک درجہ میں بدپرہیزی کی طلب ہے کیونکہ معالجہ باطن کا مدار مجاہدہ پر ہے اور مجاہدہ میں لذت کہاں اگر مجاہدہ میں لذت ہو تو مجاہدہ نہ رہیگا اس لئے بعض دفعہ شیوخ قصداً بھی سہولت ویسر کا طریقہ نہیں تبلاتے ہاں بعض دفعہ کسی کو شفقت کے طور سے ایسے طریقے تبلا دیتے ہیں جن سے عمل میں سہولت ہوجائے وہ بھی اسی وقت تک جب تک خود سالک درخواست نہ کرے اور اگر ان سے درخواست کی تو اس وقت اس کی رائے بدل جاتی ہے کہ تجھ کو تو سہولت کے راہ سے نہ پہنچایا جائے گا بلکہ ناک رگڑ کے ہی عمل کرایا جائے گا خلاصہ یہ ہوا کہ طالب کو سہولت ولذت کی درخواست کا حق نہیں بلکہ اس کو لازم ہے کہ خاموشی اختیار کرے شیخ جو طریق مناسب سمجھے گا خود اختیار کرلیگا مگر ایسی خاموشی بھی جائز نہیں کہ حالات سے بھی شیخ کو مطلع نہ کرے کیونکہ شیوخ عالم الغیب نہیں ہاں عالم العیب (بالمہملہ) تو ہیں بشرطیکہ وہ عیب غیب نہ رہے بلکہ احوال سے اس کو برابر اطلاع دی جائے تو وہ سالک کے امراض وعیوب پر مطلع ہو جاتا ہے اسی

لئے میں نے آداب سلوک کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان کیا ہے اطلاع واتباع قافیہ کا تو مجھے خبط ہے کیونکہ قافیہ سے کلام موزوں اور خوش نما ہو جاتا ہے نیز اس کا یاد رکھنا بھی آسان ہو جاتا ہے اسی طرح دو لفظ اور ہیں، اعتقاد و انقیاد کہ سالک کو شیخ سے اوّل اعتقاد ہونا چاہیئے پھر اس کے احکام کی اطاعت کرنا چاہیئے کبھی اعتقاد کی بجائے اعتماد کہدیتا ہوں کیونکہ اعتقاد وہی معتبر ہے جو اعتماد کے ساتھ ہو یہ حاصل ہے معاملہ شیوخ و مریدین کا۔ مگر آجکل یہ حقوق پامال کئے جا رہے ہیں کہ ہر سالک اپنی رائے کو شیخ کی رائے میں شامل کرنا چاہتا ہے سو اس طرح کامیابی دشوار ہے طب ظاہر میں بھی ایسا مریض شفایاب نہیں ہو سکتا جو معالج کی رائے میں اپنی رائے کو داخل کرے میرے پھوپھی زاد حکیم مصباح الحق بڑے قابل حکیم تھے ایک بار وہ خود مریض ہوئے اور حکیم عبدالمجید خانصاحب کے پاس علاج کے لئے گئے تو ان کی حالت یہ تھی کہ حکیم صاحب کے ہر نسخہ میں ترمیم کرتے تھے کیونکہ خود بھی حکیم تھے مگر نتیجہ یہ ہوا کہ جب حکیم عبدالمجید خانصاحب کو اس کی اطلاع ہوئی صاف فرما دیا کہ یہ اس مرض سے جانبر نہ ہونگے کیونکہ انکو کسی طبیب پر اعتماد نہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ جانبر نہ ہوئے۔

اسرار و ذوقیات اسرار و ذوقیات کے نعمت ہونے میں شک نہیں اگر بدون طلب کے حاصل ہو جائیں تو شکر کرنا چاہیئے مگر چونکہ مقصود مطلوب نہیں ہیں اس لئے انکے درپے نہ ہونا چاہیئے۔ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کا ارشاد ہے کہ ذوق و شوق وانس وغیرہ حجب نورانیہ ہیں اور حجب نورانیہ حجب ظلمانیہ سے اشد ہیں کیونکہ حجب ظلمانیہ کی طرف سالک متوجہ نہیں ہوتا ان کو خود دفع کرنا چاہتا ہے اور حجب نورانیہ کی طرف متوجہ ہو جاتا اور التفات کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے

تو جو مقصود ہے ہٹ جاتی ہے اس لئے حاجی صاحب نے فرمایا کہ یہ تو تھے کہ اگر کسی وقت
انوار و اسرار و ذوقیات کی طرف توجہ ہونے لگے تو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے لا سے انکی بھی
نفی کرنا چاہیے کیونکہ مقصود وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے ؎

ای برادر بے نہایت درگہیست ہر چہ بروے میرسی بروے مایست

اور اگر کسی وقت ذوقیات و احوال سے اپنے کو خالی پائے اس وقت یہ خیال کرے ؎

روز ہا گر رفت گو رو باک نیست تو بمان اے آنکہ چوں تو پاک نیست

روز ہا سے مراد احوال و کیفیات ہیں کہ اگر کسی وقت یہ نہ رہیں تو دلگیر نہ ہو بلکہ یہ
سمجھے کہ خدا تو ہے پھر اس کے ہوتے ہوئے کسی شے کے نہ ہونے کا کیا غم محبوب کو تو محبوب ہی
سے کام ہے اغیار سے کیا کام ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائی

محبت یہ ہے کہ محبوب فیرنی کھلائے تو اس پر راضی رہے بینگن کا بھرتا پکا ہوا کھلائے تو
اس پر راضی رہے ابلوا کھلائے تو اس پر بھی راضی رہے حضور کو تو یہ شان ہونا چاہیئے
سے بندہ گر بکشی و گر بخشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

سرمد مجذوب اس مضمون کو ذرا اضافہ بیان کرتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد یا قطع نظر ز یار می باید کرد

کیا خوب فیصلہ ہے کہ اگر یہ خدا پسند نہیں تو کوئی دوسرا خدا تجویز کرلو جو تم کو ہمیشہ
لذت ہی میں رکھے اور اگر یہی خدا پسند ہے تو وہ تمہاری مرضی کے تابع تو ہوگا نہیں
بلکہ اپنی مرضی کے مطابق حکم کرے گا پھر شکایت کے کیا معنی؟ اگر تم کو خدا سے محبت

ہے تو محبوب کی ہر ادا محبوب ہونا چاہیئے اس کی ایک موٹی مثال ہے اگر کوئی عاشق وصالِ محبوب کے لیے تڑپتا پھرتا ہو پھر اتفاق سے محبوب اس کو پیچھے سے آکر بغل میں دبا لے اور ایسا دبائے کہ پسلیاں ٹوٹنے لگیں اور وہ عاشق یوں کہے کہ اگر تجھ کو اس سے تکلیف ہوتی ہو تو چھوڑ دوں اور رقیب کو بغل میں لے لوں کہ وہ بھی اس کا مشتاق ہے تو بتلائیے عاشق کیا کہیگا؟ یقیناً یوں کہیگا ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت — سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

افسوس ہے ایسی مخلوق کی کہ ہر ادا محبوب ہو جو کہ اپنے ہی مثل ہے کہ جنس نوع میں سے ہے اور جس کو سمجھے کہ محبوب ہے اس میں زیادہ کمالات ہوں عقل و فہم و ہنر وغیرہ مگر اس کا ہر حرف پسندیدہ نہیں ہے خواہ صحیح ہے یا غلط کیونکہ اس میں مذاق کا اختلاف ہے بعض کو صباحت پسند ہے بعض کو ملاحت غرض صرف اتنی سی بات کی وجہ سے اس کی ہر ادا پر جان فدا کرنے کو تیار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں حالانکہ حقیقی کمال اور حقیقی حسن و جمال انہی میں ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود — گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

سعدی فرماتے ہیں ؎

ترا عشق ہمچو خودے ز آب و گل — رباید ہمہ صبر و آرام دل

چو در چشم شاہد نیاید زرت — زر و خاک یکساں نماید برت

عجب داری از سالکانِ طریق — کہ ہستند در بحرِ معنیٰ غریق

دمادم شرابِ الم در کشند — وگر تلخ بینند دم در کشند

اور اس سے بڑھکر ان خشک لوگوں پر افسوس ہے جو محبتِ حق ہی کا انکار کرتے ہیں

کہ اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں ہو سکتی ہے بس محبت حق کے معنی یہی ہیں کہ احکام پر چلتے رہو افسوس ان لوگوں کو اپنے حرمان پر تو افسوس نہ ہوا الٹا اہل محبت کی دولت ہی کا انکار کرنے لگے ۔ صاحبو وہ تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کی محبت نہیں ہو سکتی کیونکہ اسکو دیکھا نہیں ۔

محبت مخلوق میں یہ کہتا ہوں کہ غیر حق کی محبت نہیں ہو سکتی جس کو میں دلیل سے ثابت کر سکتا ہوں اور ان کے پاس کوئی دلیل نہیں میرے دعوے کی دلیل یہ ہے کہ محبتِ مخلوق کا سبب ذات محبوب نہیں کیونکہ ذات من حیث ہی ذات تو بچپن میں بھی موجود ہے اور بڑھاپے میں بھی پھر اسکی کیا وجہ ہے کہ محبوب سے محبت جوانی میں یا دوسرے بعض حالات میں ہوئی بلکہ محبت کے اسباب چار ہیں کمال ۔ جمال ۔ نوال ۔ قرابت کمال کی وجہ سے جو محبت ہوتی ہے وہ دیدار پر موقوف نہیں کیونکہ بہت سے اہل کمال ایسے ہیں جن کو ہم نے نہیں دیکھا مگر ہم کو ان سے محبت ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب مسلمانوں کو محبت ہے اور جملہ انبیاء سے محبت ہے اور ایسی محبت ہے کہ اولاد و والدین سے زیادہ ۔ چنانچہ مسلمان اپنے والدین کی شان میں گستاخانہ کلمات سنکر صبر کر سکتے ہیں مگر حضرات انبیاء کی شان میں گستاخی ہوتے ہوئے دیکھ کر صبر نہیں کر سکتے یہ تو دینی محبت کی مثال ہے اور دنیوی محبت کی مثال یہ ہے کہ شاہنامہ پڑھنے والوں کو رستم سے محبت ہو جاتی ہے مجھے خود اپنا واقعہ بچپن کا یاد ہے کہ جب میں شاہنامہ پڑھتا تھا تو ہر لڑائی کا بیان شروع کرتے ہوئے یہ تمنا ہوتی تھی کہ رستم ہی غالب ہو اس پر دوسرا کوئی نہ غالب ہو ۔ دوسرا سبب جمال ہے یعنی حسن سو اسکی عارضی ہونے کی یہ حالت ہے کہ مخلوق میں

کسی کا حسن بھی ذاتی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا دیا ہوا ہے چند روز میں موت اگر سارے حسن کا خاتمہ کر دیتی ہے اور زندگی میں بھی اگر عورت کا سر مونڈ دیا جائے تو سارا حسن جاتا رہتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق بامرادہ نباشد پائدار | عشق را باحی و باقیوم دار
عشق ہائے کز پئے رنگے بود | عشق نبود عاقبت ننگے بود

پس مخلوق کی حالت دیکھ کر یہ حقیقت عیاں ہے کہ ان کا حسن کسی دوسرے کا پیدا کیا ہوا ہے اور وہ خدا کے سوا کوئی نہیں تو اب جو شخص کسی مخلوق پر عاشق ہے وہ حقیقت میں خدا پر عاشق ہے کیونکہ جس کمال و جمال پر وہ فریفتہ ہے وہ خدا کا پیدا کیا ہوا اس کا عطا کیا ہوا ہے مکان کی تعریف کرنیوالا حقیقت میں معمار کی مدح کر رہا ہے خوشخط تحریر پر فریفتہ ہونیوالا دراصل کاتب پر فریفتہ ہو رہا ہے گو اس کو خبر نہیں اسی طرح یہاں سمجھو تیسرا سبب نوال ہے وہ بھی حقیقت صفت حق تعالیٰ ہی کی ہے جیسا ابھی جمال کی تقریر میں مذکور ہوا اب رہ گئی قرابت سو قرابت متعارفہ تو اللہ تعالیٰ کے لئے محال ہے البتہ اس کی حقیقت یعنی دو شخصوں میں اوروں سے زیادہ ایک نسبت یہ حق تعالیٰ کے ساتھ ایسی حاصل ہے جو کسی کے ساتھ بھی نہیں اس کی تفصیل احیاء میں مبسوط ہے اب تو میرا یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ غیر حق کی محبت نہیں ہو سکتی بلکہ محبت جب ہو گی خدا ہی سے ہو گی اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ | پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ

محبتِ خالق

اگر اب یہ سوال پیدا ہو کہ خدا تعالیٰ کی درگاہ تک ہم کیونکر پہنچیں اور ان کی محبت کس طرح حاصل کریں تو مولانا اس مقام پر اس

کو بھی تبلاتے ہیں مولانا کا کلام جامع ہوتا ہے وہ سب پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہیں
چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست
بر کریماں کارہا دشوار نیست

لفظ بر کریماں میں اس طرف اشارہ ہے کہ وصول الی اللہ تمہاری سعی سے نہ ہوگا بلکہ
ان کے کرم سے ہوگا میں اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ جیسے شیر خوار بچہ کو آپ اپنے
پاس بلانا چاہیں جو کھڑا تو ہو جاتا ہے مگر چل نہیں سکتا آپ اس کو بلاتے ہیں کہ یہاں
آؤ حالانکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ آ نہیں سکتا مگر کسی مصلحت سے آپ اس کے منتظر
ہوتے ہیں کہ یہ ذرا چلے اور گر پڑے تو گود میں لے لیں بس یہاں بھی ایسی ہی ضرورت
ہے کہ ذرا چلو اور گر پڑو پھر وہ خود ہی اٹھالیں گے ورنہ خود آپ اس راستہ کو طے
نہیں کر سکتے ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود این راہ چوں تاک از بریدنہا

اور عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

ما بداں مقصد عالی نتوانیم رسید
ہاں مگر لطف شما پیش نہد گامے چند

جب محبوب حقیقی حق تعالیٰ شانہ ہیں جیسا ابھی ثابت ہوا تو کیا محبت کا یہی خون ہے کہ
بسط ہو تو قبض کی تمنا ہے اور قبض ہو تو بسط کی تمنا ہے ارے تم کو تو خاموش چلنا چاہیے
کہ ؎ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

قبض کے اندر بعض دفعہ سخت حالت ہو جاتی ہے کہ بعض نے اس وقت خودکشی تک
کا ارادہ کر لیا مگر محبت کا مقتضا وہ ہے جس کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش
بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

اے درانده بنده زنقش از پریشانی مناں ۔ مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

اور اگر کوئی قبض کی تدبیر کر کے بسط حاصل کر لے اور اس پر نازاں ہو تو اس کے متعلق فرماتے ہیں ؎

تکیہ بر تقوی و دانش در طریقت کافریست ۔ راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

غرض محبت کا مقتضی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سب تصرفات پر راضی رہے اور ساری تجویزوں کو فنا کر دے دل لگنے یا نہ لگنے کا طالب نہ ہو لذت و ذوق کی ہوس نہ کرے بلکہ کام میں لگا رہے ؎

بس زبوں وسوسہ باشی ولا ۔ گر طرب را باز دانی از بلا

عارف فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ۔ کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائی

بعض سالکین کی عمر گذر گئی کہ ان کو ذوق حاصل نہیں ہوا پھر بعض تو خالی رہے اور بعض نشتروں کے زخموں سے بھرے ہوئے ہیں مگر وہ اس پر بھی راضی ہیں ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست ۔ حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

یہ بھی تجویز ہے کہ قبض کی دعا کرنے لگے کیونکہ وعظ میں سن لیا تھا کہ قبض نافع ہے یہ بھی غلطی ہے بلکہ تفویض کلی لازم ہے اپنی طرف سے نہ لذت کی طلب کرے نہ عدم لذت کی نہ قبض نہ بسط کی۔

دُعائے عافیت

حضرت سمنون محب کا واقعہ پیش نظر رکھئے ان پر ایک حالت غالب ہو گئی تھی اس وقت ان کے منہ سے یہ شعر نکلا ؎

وَلَيْسَ لِيْ فِيْ سِوَاكَ حَظٌّ ۔ فَكَيْفَ مَا شِئْتَ فَاخْتَبِرْنِيْ

کہ مجھے جسطرح چاہو آزمالو۔ مجھے آپ کے سوا کسی چیز میں حظ نہیں یہ سخت بات تھی جس پر غیب سے امتحان شروع ہو گیا کہ ان کا پیشاب بند ہو گیا اسی واسطے حدیث میں ایسی دعا سے ممانعت ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو مرضِ شدید میں مبتلا دیکھا پوچھا کیا تم نے کوئی دعا کی ہے کہا ہاں میں نے یہ دعا کی ہے کہ اے اللہ جس قدر عذاب آخرت میں مجھے ہونیوالا ہو سب دنیا میں ہو جائے حضورؐ نے فرمایا سَلُوا اللّٰہَ العَافِیَۃَ کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا کرنا چاہیئے کہ دنیا و آخرت دونوں میں عافیت عطا ہو۔ غرض حضرت سمنون کا پیشاب بند ہو گیا اور اب دعا بھی نہیں کرتے کیونکہ دعا کرتے ہوئے شرماتے تھے یہ بھی ایک حال تھا مگر اس سے کامل تر حال یہ تھا کہ دعا کرتے اور کہتے کہ مجھ سے خطا ہوئی میں توبہ کرتا ہوں مجھے آپ کے امتحان کا تحمل نہیں مگر مغلوب کو کوئی رائے نہیں دی جاسکتی پھر حق تعالیٰ نے ان کے صبر پر رحم فرما کر دعا کی اجازت دینا چاہی مگر صاف طور سے نہیں کہ ان پر الہام ہو جاتا کیونکہ جب خود اللہ تعالیٰ سے نہیں بولتے تو وہ ان سے کیوں کلام کریں بلکہ اجازت کی یہ صورت ہوئی کہ ایک فرشتہ کو بھیجا گیا کہ سمنون کی آواز میں زور زور سے دعا کرے یہ بھی ایک عجیب انداز تھا۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

فرشتہ نے اس زور سے دعا کی کہ خانقاہ میں سب مریدوں نے سنا صبح کو ایک خادم نے عرض کیا کہ رات کو کیا آپ نے دعا کی تھی ہم نے تو رات بھر آپ کی دعا کی آواز سنی ہے سمجھ گئے اور خوش ہوئے کہ الحمدللہ کہ مجھے دعا کی اجازت ہوئی پھر اس کی یہ صورت اختیار کی کہ مکتب کے بچوں کے پاس جاتے اور ان سے فرماتے اُدْعُوْا لِعَمِّکُمُ الْکَذَّابِ کہ اے بچو! تم اپنے جھوٹے چچا کے لئے دعا کرو۔ کذاب اس لئے

کہا کہ دعوے پر جمے نہ رہے امتحان کا تحمل نہ کر سکے۔ سبحان اللہ کیسا اچھا علاج کیا اپنے کو بچوں کا محتاج بنایا۔

امتِ محمدیہ امتِ محمدیہ کے بچے بھی مشائخ کی امداد کے قابل ہیں امتِ محمدیہ کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک بدویہ نے اپنی اولاد کی تعریف میں کہا تھا ھُم کالحلقۃ المفرغۃ لا یُدرٰی این طرفاھا کہ میری اولاد ڈھلے ہوئے حلقے کے مشابہ ہے کہ کسی کو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ اس کا کنارہ کدھر ہے یعنی سب برابر ہیں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں غضب کی تشبیہ ہے جو اس بدویہ کو سوجھی یہی حال امتِ محمدیہ کا ہے کہ اس کے بچے بھی مقبول بڑے بھی مقبول۔ بعض اوقات بچے بڑوں کے محتاج ہیں اور ایک وقت میں بڑے بچوں کے محتاج ہیں طالبین مشائخ کے محتاج اور بعض اوقات مشائخ طالبین کے محتاج ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں	آب ہم جوید بعالم تشنگاں
بانگ مے آید کہ اے طالب بیا	جود محتاج گدایان چوں گدا

ایک پیغمبر کی حکایت حدیث میں ہے کہ وہ استسقا کو جا رہے تھے راستہ میں چیونٹی کو دیکھا کہ ہاتھ اٹھائے دعا کر رہی ہے آپ نے ساتھیوں سے فرمایا کہ لوٹ چلو اللہ تعالیٰ نے چیونٹی کی دعا قبول فرمائی ہے جب چیونٹی کی دعا بھی قبول ہوتی ہے تو مسلمانوں کے بچے تو اس سے بدرجہا افضل ہیں انکی دعا کیوں نہ قبول ہو گی نیز حدیث میں ہے کہ عالم کے لئے مچھلیاں اور چیونٹیاں دعا کرتی ہیں۔

لیڈر اور علماء گو آجکل لیڈروں کے نزدیک علماء عضو معطل اور بیکار ہیں مگر حیوانات ان کے واسطے دعا کرتے ہیں کیوں؟ دو وجہ سے ایک۔

تو یہ کہ خدا تعالیٰ نے ان کو اسی کام میں لگا دیا ہے کہ علماء کے واسطے دعا کریں دوسرے اس واسطے کہ حیوانات کی خیر بھی بقاء علماء ہی کی وجہ سے ہے کیونکہ بقاء عالم علماء کی وجہ سے ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یُقَالُ فِی الْاَرْضِ اللہُ اللہُ (اَوْکَمَا قَالَ) کہ زمین میں جب تک خدا کا نام لیا جاتا رہے اس وقت تک قیامت نہ آئے گی اور مشاہدہ ہے کہ دنیا میں اللہ کے نام کی بقاء علماء کی وجہ سے ہے۔ پس علماء کا وجود بقاء عالم کا ذمہ دار ہے مگر افسوس لیڈر ان کو نکما سمجھتے ہیں اور سنا ہے کہ آجکل ایک جماعت علماء کے استیصال کی فکر میں ہے طرح طرح کی تدبیروں سے ان کے اثر مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے بُرا بھلا بھی ان کو کہا جارہا ہے۔ مگر علماء اس بارہ میں خاموش ہیں اور بہت احتیاط کرتے ہیں وہ کسی کو بلا ضرورت بُرا نہیں کہتے مگر اب ضرورت ہے کہ ان لوگوں کی رعایت نہ کی جائے جبکہ وہ ہماری رعایت نہیں کرتے اور وہ ضرورت یہ ہے کہ عوام ان کی باتوں سے گمراہ ہورہے ہیں یہ لیڈر دین کے احکام میں دخل دیتے اور اپنی رائے سے جسطرح چاہتے ہیں احکام میں تحریف کر دیتے ہیں اور عوام انکو مولوی مولانا سمجھے ہوئے ہیں اس لئے میں صاف کہتا ہوں کہ یہ لوگ گمراہ ہیں مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں کیونکہ دین کا مدار اعتقاد پر ہے کہ مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتقاد ہو اور رسول پر اعتقاد جبھی ہو گا جبکہ حاملانِ شریعت سے اعتقاد ہو کیونکہ عوام کو رسولؐ کی معرفت علماء کے ذریعہ سے ہوتی ہے جس نے علماء کو نہیں پہچانا وہ رسولؐ کو نہیں پہچان سکتا پس جو لوگ علماء کی استیصال کی فکر میں ہیں وہ خود مسلمانوں کی بلکہ عالم کی استیصال کی فکر میں ہیں۔ میں ایک بات اور کہتا ہوں گو

کہنے کی تو نہیں وہ یہ کہ عالم اگر بدعمل بھی ہو جب بھی تم کو اس پر اعتراض کا حق نہیں کیونکہ وہ مدعی علم ہے نہ کہ عمل کا اس کی بدعملی سے علم تو غلط نہیں ہو گیا طبیب اگر بدپرہیز ہو تو مریض کا کیا نقصان ہے وہ مریض کو تو صحت ہی کا طریقہ بتلائے گا اسی طرح عالم بےعمل تم کو فتوے تو صحیح دیگا مسائل تو غلط نہ بتلائیگا اور یہ لیڈر جاہل تو احکام غلط بتلاتے ہیں دیکھئے کیمیاگر خود ننگا ہو تو تمہارا کیا نقصان ہے اور بڑے بڑے رؤسا اس کے پیچھے کیوں پھرتے ہیں محض اس وجہ سے کہ وہ دوسروں کو ننگا نہیں کرتا اور اس کے پاس ایسی چیز ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے یہ مضمون طویل ہو گیا گفتگو اس پر چلی تھی کہ جب چیونٹیوں اور مچھلیوں کی دعا قبول ہوتی ہے تو مسلمانوں کے بچوں کی دعا کیوں قبول نہ ہو گی اسی لئے حضرت سمنون بچوں سے دعا کراتے تھے یہاں سے معلوم ہوا کہ بچوں کی دعا قبول ہوتی ہے مگر بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ بچوں کی دعا قبول نہیں ہوتی چنانچہ مشہور ہے کہ ایک میانجی استسقا کے لئے بچوں کو لیجارہے تھے کسی ظریف نے کہا اگر بچوں کی دعا قبول ہوا کرتی تو میاں جی سب سے پہلے تم مرتے کیونکہ بچے روزانہ تم کو کوستے ہیں مگر یہ حکایت صحیح بھی ہو تو بہت سے بہت یہ کہا جائیگا کہ بچوں کی بددعا قبول نہیں ہوتی اس سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ دعا بھی قبول نہیں ہوتی اور حضرت سمنون تو دعا کے واسطے بچوں کے پاس گئے تھے بددعا کے واسطے نہیں گئے تھے اس لئے حکایت پر کوئی اشکال نہیں۔

اہتمامِ عمل

یہ حکایت میں نے اس پر بیان کی تھی کہ اپنی طرف سے نہ قبض طلب کرے نہ بسط کی نہ بلا کی نہ امتحان کی بلکہ تفویض کلی اختیار کرے اس پر شاید یہ شبہ ہو کہ بلا میں گرفتار ہو جائے تو کیا اس کے ازالہ کی بھی دعا

نہ کرے اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں سلوا اللہ العافیہ وارد ہے جس میں دعا کی اجازت ہے بلکہ امر ہے اس لئے یہ دعا جائز و مامور بہ ہے خلاصہ یہ کہ مواجید واذواق کے درپے نہ ہونا چاہیئے بلکہ عمل کا اہتمام کرنا چاہیئے مگر آجکل خواص بھی اس میں کوتاہی کر رہے ہیں اس لئے میں نے اس آیت کا بیان اختیار کیا ہے جس میں عمل کی تاکید ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں بھی صبر کرو۔ دو لفظ اسواسطے اختیار کئے گئے کہ صبر کبھی لازم ہوتا ہے کبھی متعدی یعنی جس حالت پر صبر کیا جاوے کبھی اسکا تعلق صرف اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے جیسے مرض وغیرہ کبھی دوسروں سے تعلق ہوتا ہے جیسے محاربہ وغیرہ تو دونوں حالتوں میں صبر کا امر ہے اس کے بعد ارشاد ہے۔ وَرَابِطُوْا اور اس وقت مجھے زیادہ تر اسی جملہ کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا اس کی تمہید ہے اور وَاتَّقُوا اللّٰہَ تکمیل ہے اور لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ تتمیم ہے جیسا آئندہ واضح ہو جائیگا۔ اب رَابِطُوْا کے معنی سنیئے۔ بیضاوی نے اس کی تفسیر دَاوِمُوْا اور وَاظِبُوْا کی ہے یعنی عمل پر مداومت اختیار کرو کیونکہ ربط کے معنی لغت میں باندھنا ہے اور مواظبت و دوام میں بھی نفس کو باندھنا ہے اور اسی واسطے بعض نے اس کی تفسیر مُرَابِطَۃ الْخَیْلِ[عـہ] سے بھی کی ہے کیونکہ اس سورت کے زیادہ حصہ میں محاجہ باللسان کا ذکر ہے اس کے مناسب رباط الخیل ہی ہے تو اس لفظ کی تفسیر میں دو احتمال ہو گئے مگر کسی مقصود کے لئے ایک تفسیر کا اختیار کر لینا جائز ہے اس لئے میں نے اس وقت بیضاوی تفسیر پر تقریر اختیار کی ہے شاید اس پر طلبہ کو اشکال ہو کیونکہ انکو شبہات

عـہ گھوڑوں کا باندھنا مراد جہاد کے لئے تیار رکھنا۔

بہت پیدا ہوتے ہیں حتیٰ کہ ایک طالب علم نے تیلی کے بیل کو بھی شبہات کی تعلیم دی تھی وہ تیلی سے تیل لینے گئے تو دیکھا کہ بیل کی آنکھوں پر پٹی ہے اور گلے میں گھنٹی پڑی ہے اور وہ چکر لگا رہا ہے پوچھا یہ گھنٹی اس کے گلے میں کیوں ڈالی ہے کہا اسواسطے کہ ہم ہر وقت اس کے ساتھ نہیں رہ سکتے بلکہ اپنے دوسرے کام میں بھی لگ جاتے ہیں تو اسی گھنٹی کے بجنے سے معلوم ہوتا رہتا ہے کہ بیل چل رہا ہے۔ طالب علم نے کہا یہ تو کوئی دلیل نہیں کیونکہ ممکن ہے کسی وقت ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے سر ہلاتا رہے۔ تیلی نے کہا مولانا میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی تم یہاں سے چلد و اگر میرے بیل نے یہ منطق باتیں سن لیں تو ہم تو پریشان ہو جائیں گے تم تیل بھی کسی اور سے لے لینا۔ اس تیلی نے الزامی جواب دیا کہ میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی ورنہ تحقیقی جواب یہ تھا کہ مولانا چلنے کی آوازمیں اور ایک جگہ کھڑے ہو کر سر ہلانے کی آواز میں بڑا فرق ہے اس لئے یہ شبہ لغو ہے غرض طلبہ کو احتمالات بہت پیدا ہوتے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ یہاں بھی کسی کو یہ شبہ ہو کہ استدلال کو احتمال مضر ہے پھر دو تفسیروں کے ہوتے ہوئے ایک سے استدلال کیونکر صحیح ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ احتمال استدلال کو مضر اسوقت ہے جبکہ اسی آیت پر مقصود کا مدار ہوتا اور یہاں ایسا نہیں بلکہ دوسری نصوص اس مقصود میں صریح موجود ہیں مگر اسوقت اس آیت کی تلاوت بطور عمود کلام کے کر دی گئی ہے اس پر مدار مقصود نہیں۔ غرض عمل میں مواظبت کی ضرورت ہے ورنہ بدون مواظبت کے تو اس عمل کی وہ مثال ہوگی جیسے ایک طالب علم نے ایک گاؤں کے سب بے نمازیوں کو نمازی بنا دیا تھا قصہ یہ ہوا کہ اس طالب علم نے گاؤں میں جا کر وعظ کہا اور بے نمازیوں کی مذمت کی اور انکو سور سے بدتر کہا واعظ

کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ بلا ضرورت خشن گفتگو نہ کرے اور نہ درشت ہو۔ تو تو جائز ہے جیسے میں نے ابھی لیڈروں کو ضال[1] و مضل[2] کہا تھا کیونکہ انہوں نے علماء کو برا بھلا کہا ہے اور اس میں اہل اسلام کا ضرر ہے مگر حضرات علماء نے اس بارہ میں بہت احتیاط کی ہے کہ وہ انکو بھی برا نہیں کہتے اور ان سے زیادہ صوفیہ نے احتیاط کی ہے کہ صوفیہ تو اجماعی برے کو بھی برا نہیں کہتے چنانچہ ایک بزرگ سے کسی نے یزید کے بارہ میں سوال کیا کہ یزید کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں فرمایا شاعر بہت اچھا تھا مگر کسی نے ان سے یہ سوال نہیں کیا کہ شیطان کے بارہ میں کیا فرماتے ہیں سو اس میں ان کی وکالت میں کرتا ہوں کہ مظہر مضل اعلیٰ درجہ کا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہادی ہے اس کے مظاہر تو حضرات انبیاء ہیں اور سب سے اکمل ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ایک صفت مضل ہے اس کا مظہر کامل شیطان ہے اور خدا کی صفت اضلال کا مظہر ہونا بھی ایک صفتِ کمال ہے گو نقص ہی کا کمال ہے۔

محبت کا اثر

اسی طرح حضرت رابعہ بصریہ کے سامنے بعض زاہدین دنیا کی مذمت کر رہے تھے۔ قُوْمُوْا عَنِّیْ فَاِنَّکُمْ تُحِبُّوْنَ الدُّنْیَا ان کو دنیا کی مذمت بھی ناگوار تھی اس لئے فرمایا میرے پاس سے اٹھ جاؤ کہ تم کو دنیا سے محبت معلوم ہوتی ہے اہل مجلس نے کہا کہ ہم تو اسکی مذمت کر رہے ہیں پھر محب کدھر سے ہوئے فرمایا مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ کہ تذکرہ بھی محبت کی دلیل ہے یہ ایک مجمل کلام ہے ایک مجذوبہ کا جس کی شرح کی ضرورت ہے میں نے ثواب کے لئے ان دیوانوں کی وکالت اختیار کی ہے اس لئے میں اس کی شرح کرتا ہوں کہ ذکر

---

۱ گمراہ ۲ دوسرے کو گمراہ کرنے والا۔

مذمت بھی بعض دفعہ عظمت کی دلیل ہوتا ہے دیکھو اگر ایک چمار سے تمہارا مقابلہ ہو اور غلبہ تم ہی کو حاصل ہوا ہو جب بھی تم اس کے تذکرہ سے شرماتے ہو اور اگر کسی جرنیل سے مقابلہ ہوا ہو اور تم غالب آگئے ہو تو اسکو ہر جلسہ میں ذکر کرتے ہو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ چمار کی تمہارے قلب میں عظمت نہیں اس لئے مذمت کے ساتھ بھی اس کا ذکر نہیں کرتے جرنیل کی عظمت ہے اس لئے اس کا ذکر کرتے ہو تو دنیا کا ذکر مذمت بھی ہمیشہ خبر نہیں بلکہ کبھی عظمت سے ناشی ہوتا ہے یعنی ایسی عظیم الشان چیز سے ہم رغبت نہیں رکھتے سو حضرت رابعہ کو قرائن سے معلوم ہو گیا کہ ان کا ذکر دنیا گو مذمت کے ساتھ ہے مگر عظمت سے ناشی ہے کیونکہ ان کا مقصود اس مذمت سے مخاطبین کے دلوں سے عظمت دنیا نکالنا نہ تھا کیونکہ مخاطب سب زاہد تھے بلکہ صرف اپنا کمال ظاہر کرنا تھا کہ ہم نے دنیا پر لات مار دی ہے اور حضرات انبیاء کے کلام میں جو دنیا کی مذمت وارد ہے وہ عظمت سے ناشی نہیں کیونکہ ان کا مقصود مخاطبین کے قلوب سے اس کی عظمت و محبت نکالنا ہے لیجئے باولی کا کلام بھی راولا ہو گیا۔ مگر میں ہر جگہ ان باولوں کی وکالت نہیں کرتا صرف ضرورت کے موقعہ پر کرتا ہوں اور جہاں ضرورت نہ ہو وہاں وکالت نہیں کرتا مثلاً حضرت رابعہ ایک دفعہ حج کو تشریف لے گئیں اور حج سے فارغ ہو کر دعا کی کہ اے اللہ مجھے اجر دیجئے اور آپ کو اجر دینا ہو گا کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو میرا حج قبول ہو گیا ہے تو اسی صورت میں تو حج مبرور پر اجر کا وعدہ آپ نے فرمایا ہی ہے یا قبول نہیں ہوا تو یہ بہت بڑی مصیبت ہے، کہ محبوب کے در سے محروم جاوے

از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم ... ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم

اور مصیبت پر بھی آپ کا وعدہ ہے کہ مصیبت زدوں کو ثواب دیا جائیگا پس میرا

ثواب ہر حال میں ثابت ہو گیا۔ تو اس کلام پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر جہنمی بھی اس مقدمہ سے ثواب کا استحقاق ثابت کرنے لگیں گے کہ ہم سے زیادہ مصیبت میں کون ہے اور اہل مصیبتؑ کے لئے اجر کا وعدہ ہے تو ہم کو بھی ثواب دیا جائے۔ مگر یہاں میں وکالت نہیں کرتا کیونکہ مقصود مانگنا ہے سو ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس طرح دل چاہے مانگے خواہ ناز کے طریقہ سے مانگے یا نیاز کے طریقہ سے میں یہ کہہ رہا تھا کہ صوفیہ نے تو بروں کو بھی برا نہیں کہا کیونکہ انکو محبوب کی یاد سے ہی فرصت نہیں کہ اغیار میں مشغول ہوں ایک عارف نے کسی صوفی کو ایک جاہل سے جھگڑا کرتے دیکھا تو کہا ؎

گرایں مدعی دوست بشناختے　　　به پیکار دشمن نه پرداختے

احتیاطِ خطاب

کاندھلہ میں ایک بار مولویوں کے مجمع میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ کافر کو کافر کہنا کیسا ہے ایک جماعت یہ کہہ رہی تھی کہ تہذیب کے خلاف ہے اور ایک جماعت کہہ رہی تھی کہ جائز ہے کیونکہ قرآن میں بکثرت کافر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے پہلی جماعت نے اس کا یہ جواب دیا کہ قرآن میں خطاب کے موقعہ میں کافروں کو کافر نہیں کہا گیا (بلکہ یاایہا الناس سے خطاب کیا گیا ہے) اور گفتگو اس میں ہے کہ کافر کو کافر کہکر خطاب کرنا کیسا ہے پھر ایک مولوی صاحب کو حکم بنایا گیا کہ اس اختلاف کا فیصلہ کریں انہوں نے کہا کہ قرآن میں خطاب کے موقعہ پر بھی کافروں کو کافر

ؑ اگر حضرت رابعہ کے کلام میں اہل مصیبت کو مسلم تبلی کیسا تھ خاص کیا جائے تو یہ اشکال نہ ہوگا اور مصیبت پر اجر کا وعدہ مسلمانوں سے ہی ہے نہ کفار سے ۱۲ ظ مگر خود وہ وعدہ ہر مصیبت پر نہیں مصیبت غیر اختیاریہ پر ہے اور ردِ عمل مصیبت اختیاریہ ہے جیسے خودکشی مصیبت ہے مگر اسپر بجائے اجر کے عقوبت ہوگی کیونکہ وہ مصیبت مکتسبہ ہے اسطرح کسی عمل کا قبول نہ ہونا کسی اختیاری کوتاہی کے سبب ہے ۱۲۔ اشرف علی

کہا گیا ہے قُل یآ اَیُّھَا الکَافِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ مگر میں اس محاکمہ کا بھی محاکمہ کرتا ہوں
کہ قرآن میں کفار کو کافر کہکر بلا ضرورت خطاب نہیں کیا گیا اور جہاں اس لفظ سے
خطاب کیا گیا ہے وہاں ضرورت تھی وہ یہ کہ ان ظالموں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم
سے ایک بیڈھنگی درخواست کی تھی کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کر
لیا کریں ایک سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کر لیا کریں گے اس کے جواب میں یہ
سورت نازل ہوئی کہ ان سے فرما دیجیے کہ اے کافرو! میں تمہارے معبودوں کی
پرستش نہ کرونگا نہ تم میرے معبود کی عبادت کروگے نہ اب نہ آیندہ تو یہاں ان
لوگوں کی امیدیں قطع کرنے کے لئے سختی کے ساتھ کافر کہکر انکو خطاب کیا گیا ہے باقی
آیات میں اس لفظ سے خطاب نہیں کیا گیا کیونکہ ضرورت نہ تھی پس فیصلہ یہ ہوا کہ
نخش خطاب بلا ضرورت نہ کرنا چاہیئے ہاں ضرورت سے ہو تو جائز ہے ۔

تفسیری نکتہ

ایک بات استطراداً یہاں اور سمجھ لیجیئے وہ یہ کہ اس سورت کے متعلق
بعض لوگوں نے ایک غلطی کی ہے کہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کا
مطلب یہ سمجھا ہے کہ تمہارے واسطے تمہارا دین ہے ہمارے واسطے ہمارا دین ہے اور
یہ تفسیر کرکے اسی آیت کے حکم کو باقی سمجھا ہے چنانچہ بعض صوفیہ نے اسی کو اپنا
معمول بنا لیا اور صلح کل اپنا مذہب بنا لیا کہ موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود کسی سے
لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں مگر یہ استدلال اس لئے غلط ہے کہ اول تو یہاں دین
بمعنی مذہب ہونا مسلم نہیں بلکہ بمعنی جزا ہونا محتمل ہے یعنی جیسا تم کروگے ویسا بھروگے
پس لَکُمْ دِیْنُکُمْ ایسا ہے جیسا محاورہ میں کہتے ہیں کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ اور اس صورت
منسوخ ماننے کی بھی ضرورت نہ ہوگی اور اگر یہی تفسیر کی جاوے تو اس صورت میں

یہ آیت منسوخ ہوگی بہر حال اس سے صلح کل کی تائید نہیں ہوتی ہے اب تو آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن سے استدلال بدون معرفت غریب کے جائز نہیں ہے اس لئے محض ترجمہ ڈپٹیہ مہارت علوم شرعیہ کیلئے پڑھ لینا کافی نہیں ہے ؎

نہ کہ چہرہ برافروخت دلبری داند — نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریکتر ز مو ایں جاست — نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

لوگ اس ترجمہ کی زبان کی تعریف کرتے ہیں مگر زبان بھی کچھ عمدہ نہیں چنانچہ یَعمَھُونَ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ٹامک ٹوئیاں مارا کریں فصحاء دہلی و لکھنؤ کی زبان سے ٹامک ٹوئیاں کبھی نہیں سنا گیا یہ محض بازاری زبان ہے اسی طرح اِنَّا ذَھَبنَا نَستَبِقُ ع۹ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ہم کبڈی کھیل رہے تھے یہ بالکل غلط تفسیر ہے کیونکہ استباق کے معنی باہم دوڑنے کے ہیں کہ ایک شخص دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرے اور کبڈی میں ایسا نہیں ہوتا دوسرے کبڈی کا لفظ فصیح نہیں تیسرے کبڈی میں موضع لعب سے غیبت نہیں ہوتی پھر یہ برادران یوسف کا عذر کیونکر بن سکتا ہے بلکہ عذر کے موقع ...... پر وہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے دوڑ رہے تھے اور یوسف علیہ السلام سامان پر تھے ہماری نگاہ سے اوجھل ہو گئے کہ بھیڑیا کھا گیا اور ہم کو خبر نہ ہوئی - بہر حال کبڈی کے ساتھ تفسیر کرنا عقل کے بھی خلاف لغت کے بھی خلاف فصاحت کے بھی خلاف ہے مگر لوگ ہیں کہ اس ترجمہ پر لٹو ہیں بہر حال اس سورت میں ضرورت کی وجہ سے کفار کو کفار کہا گیا ہے ورنہ بلا ضرورت مخاطب کو سخت الفاظ سے خطاب کرنا ممنوع

؎۹ یعنی شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ کردہ قرآن مجید ع۵ ترجمہ وہ عقل کے اندھے ہیں ع۹ سورۃ یوسف

ہے تو ان مولوی صاحب نے دیہات کے بے نمازیوں کو بلاضرورت سُور اور کتا بنایا تھا اس پر وہ بگڑ گئے اور ان پر مارنے کو چڑھ آئے میزبان نے یہ رنگ دیکھ کر مولوی صاحب کو اطلاع کی پوچھا آخر میں نے کیا قصور کیا؟ کہا تم نے بے نمازیوں کو سور اور کتا کہا ہے کہا پھر تم کو تو نہیں کہا دیہاتی بولے کہ ہم بھی تو بے نمازی ہیں کہا تم کدھر سے بے نمازی ہو گیا تم نے کبھی عید بقرعید کی بھی نماز نہیں پڑھی گاؤں والوں نے کہا ہاں عید بقرعید کی تو پڑھ لیتے ہیں کہا پھر تم تو نمازی ہو اب کیا تھا اب خوش ہو گئے اور لگے دعوتیں کرنے تو بدون مواظبت کے جو عمل ہو گا تو وہ ایسا ہو گا جیسا یہ دیہات والے نمازی تھے تو کیا ان کو کوئی نمازی کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں اسی طرح بدون مواظبت ذکر کے آدمی ذاکر نہیں ہو سکتا بدون مواظبت صبر کے صابر نہیں ہو سکتا ہے وعلیٰ ہذا القیاس مگر مداومت و مواظبت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر وقت اسی

مداومتِ نماز

میں لگا رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو وقت جس عمل کا مقرر ہے اُسی وقت میں وہ عمل بجالائے ورنہ نماز پر مواظبت دشوار ہو جائے گی کیونکہ نماز ہر وقت جائز نہیں اور یہی غلطی بعض صوفیہ کو پیش آئی ہے کہ صورت صلوٰۃ کی ضرورت کے منکر ہو گئے اور دلیل یہ بیان کی کہ سورۂ معارج میں ہے اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلوٰتِھِمْ دَآئِمُوْنَ ؏ ۵ اور صورت صلوٰۃ کا دوام ہو نہیں سکتا اس سے معلوم ہوا کہ مراد روح صلوٰۃ ہے جس پر دوام ہو سکتا ہے مگر دلیل غلط ہے کیونکہ انہوں نے دوام کے معنی نہیں سمجھے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو حضورؐ کا ارشاد ہے اَلْمَرْءُ فِی الصَّلٰوۃِ دَامَ یَنْتَظِرُ الصَّلٰوۃَ فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ فذلکم۔ یعنی نماز کے انتظار میں رہنا بھی حکماً نماز ہی میں رہنا ہے جس شخص نے صبح کی نماز پڑھ لی اور نیت یہ ہے کہ

ظہر کی نماز بھی پڑھونگا وہ اسی وقت سے منتظر صلوٰۃ ہے اس پر شاید کہ کسی کو شبہ ہو کہ صبح کی نماز پڑھ کر تو ہم بہت سے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں کوئی تجارت وزراعت میں مشغول ہوتا ہے کوئی کھانے پکانے کے سامان میں اور قاعدہ ہے اَلنَّفْسُ لَاتَتَوَجَّہُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ آنٍ وَّاحِدٍ کہ نفس ایک آن میں دو طرف توجہ نہیں کر سکتا تو صبح سے ظہر تک انتظار کا تحقق کہاں ہوا جبکہ درمیان میں بہت سا وقت اس حالت میں گذرا ہے کہ ظہر کی نماز کا خیال بھی نہیں آیا اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ آنِ واحد میں دو چیزوں کی طرف توجہ محال نہیں محال عقلی نہیں گو مستبعد ہو۔

علم سے مس

مگر آجکل یہ بھی ایک حماقت ہے کہ محال عادی کو محال عقلی سمجھتے ہیں۔ رامپور میں ایک صاحب سے معراج کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی وہ کہنے لگے کہ معراج کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا یہ تو محال ہے میں نے کہا آپ اس کے استحالہ پر دلیل قائم کیجئے کہنے لگے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی میں نے کہا عدم نظیر سے استحالہ پر استدلال نہیں ہو سکتا بہت سے بہت عدم وقوع پر استدلال ہوگا اور عدم وقوع سے استحالہ ثابت نہیں ہو سکتا اور اگر نظیر بتلادی جائے تو وہ بھی ایک واقعہ ہوگا اگر وہ محتاج دلیل نہیں تو معراج ہی کے واقعہ کو بلا دلیل مان لیجئے اور اگر وہ بھی محتاج دلیل ہے تو تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے اس لئے نظیر کا مطالبہ فضول ہے آجکل یہ بھی ایک غلطی ہے کہ نظیر کو دلیل سمجھتے ہیں لوگوں کو علم سے مس ہی نہیں رہا کہ دلیل کو تو دلیل نہیں سمجھتے غیر دلیل کو دلیل کہتے ہیں چنانچہ میرے اس جواب پر وہ صاحب کہنے لگے کہ تسلی نہیں ہوئی میں نے کہا آپ کی تسلی تو جب ہو کہ میں یہاں سے اڑوں اور آپ کے سامنے آسمان جاؤں مگر شاید اسوقت

بھی تسلی نہ ہوتی بلکہ خود انکو معراج ہوتی تو تسلی ہوتی اور ممکن ہے اس وقت بھی تردد رہتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی بابت فرمایا ہے "ولو فتحنا علیھم بابا من السماء فظلوا فیہ یعرجون لقالوا انما سکرت ابصارنا بل نحن قوم مسحورون" کہ اگر یہ لوگ آسمان کے دروازوں میں بھی چڑھ جائیں جب بھی ان کو اپنے اوپر نظر بندی یا سحر کا شبہ ہوتا غرض مجھے اوّل تو اس قاعدہ ہی میں کلام ہے میں ایک آن میں دو طرف توجہ ہونے کو محال عقلی نہیں سمجھتا چنانچہ مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی کی نسبت سنا گیا ہے کہ وہ ایک وقت میں تین کام کرتے تھے درس بھی دیتے شطرنج بھی کھیلتے اور تصنیف بھی کرتے رہتے حالت یہ تھی کہ جب تک طالب علم پڑھتا رہتا تصنیف کرتے رہتے اور اسی درمیان میں شطرنج کا مہرہ بدل دیتے اور جب وہ عبارت سے فارغ ہوتا تصنیف بند کرکے اس کی تقریر کر دیتے شاید کوئی یہ کہے کہ یہ تو ایک آن میں تین کام نہ ہوئے بلکہ ایک آن میں ایک کام ہوا تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ گو ظہور عمل کا جدا آن میں ہوا مگر یہ کام ایسے ہیں کہ ایک آن کی توجہ میں نہیں ہو سکتے اس لیے لازم ہے کہ ان کی توجہ تینوں کاموں پر ساتھ رہتی تھی اور یہ محال کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نماز کے اندر دکان کا حساب بھی کرتے ہیں تو جیسے یہ ہو سکتا ہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ تجارت کی حالت میں آپ نماز میں لگے رہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ آپ کو نماز تجارت سے مشغول نہیں کرتی انکو تجارت نماز اور ذکر اللہ سے مشغول نہیں کرتی۔ مگر شاید آپ یہ کہیں کہ یہ تو وہ کر سکتا ہے جو ایسا ذاکر شاغل ہو کہ

ذکر اللہ اسکے دل میں سرایت کر گیا ہو عوام سے تو ایسا نہیں ہو سکتا گویا ان کے نزدیک عوام انتظار صلوٰۃ سے اور دوام فی الصلوٰۃ کی فضیلت سے محروم ہیں مگر یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔

حقیقتِ ایمان

الحمد للہ اس اشکال کو رفع کرنا اللہ تعالیٰ نے مجھے سمجھا دیا اسطرح کہ اول یہ مقدمہ سمجھ لو کہ ایمان ہر وقت فرض ہے اور مومن ہر وقت مومن ہے اس کی کوئی ساعت ایمان سے خالی نہیں حالانکہ ایمان کی حقیقت تصدیق بالقلب ہے اب اگر دوام ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس تصدیق کا ہر وقت استحضار رہے تو ظاہر ہے کہ ہر وقت اس کا استحضار نہیں ہوتا معلوم ہوا کہ دوام کے کوئی اور معنی بھی ہیں پس سمجھو کہ دوام ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ایک بار تصدیق کا استحضار کر کے پھر اس کی ضد کا استحضار نہ ہو جب تک ضد کا استحضار نہ ہوگا اسوقت تک اس استحضار کو باقی سمجھا جائے گا اور یہ شخص ہر ساعت میں مومن ہے یہ تو شرعی مثال ہے جس سے دوام کے یہ معنی معلوم ہوئے اور محسوسات میں بھی اس کی چند مثالیں ہیں مثلاً مشی فعل اختیاری ہے اور ہر قدم کا اٹھانا فعل اختیاری ہے اور فعل اختیاری مسبوق بالقصد ہوتا ہے مگر کیا ہر قصد جدید ہوتا ہے ہرگز نہیں اگر ایسا ہو تو مشی دشوار ہو جائے لامحالہ یہی کہا جائے گا کہ ابتدا میں جو ایک بار قصد کیا ہے وہی آخیر تک مستمر ہے۔

علی ہذا ستار بجانیوالے کا ہر نقرہ فعل اختیاری ہے اور فعل اختیاری مسبوق بالقصد ہے مگر یہاں بھی ہر نقرہ پر قصدِ جدید نہیں ہو سکتا ورنہ ستار بجانا دشوار ہو جائے گا اور یقیناً خراب بجے گا پس یہاں بھی یہی کہا جائیگا کہ ایک ہی قصد آخیر

تک مستمر ہے غرض شرعیات سے اور محسوسات سے ہر طریقہ سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ ایک ہی مستمر ہو سکتا ہے اب سمجھئے کہ جس شخص نے صبح کی نماز پڑھی ہے اور اسوقت دل میں ارادہ ہے کہ ظہر بھی پڑھوں گا تو اس کا یہ قصد مستمر کیوں نہ ہو گا گو درمیان میں استحضار نہ رہے اب صوفی صاحب سُن لیں کہ دوام صلوٰۃ صورت صلوٰۃ میں بھی ہو سکتا ہے یعنی صلوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں۔

گوشہ نشینی

اب انصاف کیجئے کہ جو لوگ محض ترجمہ قرآن پڑھ کر اپنے کو مجتہد سمجھتے ہیں انکی حماقت ہے یا نہیں اب تو آپ کو معلوم ہوا ہو گا کہ دین کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ؎

ہزار نکتہ باریکتر ز مو ایں جاست نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

آجکل جو لیڈر دین کے رہنما بنے ہوئے ہیں انکی مثال ایسی ہے کہ ؎

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

اور جو لوگ کام کے ہیں وہ حجرہ میں گمنام پڑے ہوئے ہیں اور خدا سے ان ظالموں کے ظلم کی جو وہ دین پر کر رہے ہیں فریاد کرتے ہیں ؎

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

بعض لوگ ان حجرہ نشینوں سے کہتے ہیں کہ تم بھی میدان میں نکلو حجرہ میں کیوں بیٹھے ہو مگر ان سے کوئی پوچھے کہ حجرہ والوں کو میدان میں آنے کون دیتا ہے ان سے کام کون لیتا ہے؟ اگر یہ میدان میں نکلیں گے تو شریعت کے اتباع کا حکم کریں گے جو آجکل لوگوں کے نزدیک تعصب اور تنگ خیالی ہے پھر تم خود ہی یہ کہو گے کہ یہ مولوی ہمارے کام میں روڑے اٹکاتے ہیں ان کو حلال و حرام و جائز و ناجائز ہی کی پڑی

رہتی ہے۔ اب میدان میں نکلکر نہ ان سے میدان کا کام ہو گا نہ خلوت کا دونوں سے گئے گذرے ہوئے اس سے تو ان کا خلوت ہی میں رہنا اچھا۔ اور تم کو خبر بھی ہے جو لوگ میدان میں نکلے ہوئے ہیں وہ حجرہ نشینوں ہی کی برکت سے کام کر رہے ہیں بلکہ حجرہ والے ہر وقت مسلمانوں کی کامیابی اور صلاح و فلاح کی دعا کرتے رہتے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید ۔۔۔ ہم بعون ہمت مردان رسید

صاحبو! دین کا سمجھنا ان لیڈروں کا کام نہیں ہے بلکہ یہ انہی لوگوں کا کام ہے جنھوں نے حجرہ میں بیٹھکر چراغوں کا دھواں پھانکا ہے اور پانی کی جگہ تیل پی لیا ہے بعض طلبہ کو ایسا پیش آیا ہے کہ مذاق میں کسی نے انکو پانی کی جگہ تیل دے دیا اور وہ مطالعہ میں ایسے مصروف تھے کہ انکو اصلاً اسکی خبر نہ ہوئی۔ ایک طالب علم کی حکایت کتابوں میں لکھی ہے کہ ایک رات انکے گھر میں تیل نہ تھا بڑے پریشان ہوئے اتفاق سے بادشاہ کا جلوس سامنے سے گزرا جس کے ساتھ مشعلیں تھیں یہ اس کے ساتھ ہو لئے اور کتاب ہاتھ میں لیکر مطالعہ کرتے چلے گئے یہاں تک کہ جلوس محل شاہی میں داخل ہوا یہ بھی ساتھ ساتھ چلے گئے بادشاہ کی نظر ان پر پڑ گئی تھی اس نے خدام کو کہدیا تھا کہ ان کو نہ روکا جائے یہاں تک کہ جلوس خاص خلوت گاہ میں پہنچا یہ بھی وہیں پہنچ گئے اور برابر مطالعہ میں مشغول رہے بادشاہ ان کو دیکھتا رہا مگر انکو کچھ خبر نہ ہوئی جب مطالعہ سے فارغ ہوئے اور اپنے کو خاص خلوت گاہ شاہی میں دیکھا تو قرائن سے سمجھ گئے کہ میں شاہی محل کے اندر ہوں اب یہ ڈرنے لگے بادشاہ نے تسلی دی کہ ڈرو نہیں مجھے تم سے بہت محبت ہو گئی ہے اور

اب مَیں چاہتا ہوں کہ تمہارے لئے کافی وظیفہ مقرر کردوں تاکہ تم فراغ قلب سے تحصیل علم میں مشغول رہو کہا حضور یہ تو جھگڑا ہے میں تنخواہ لینے وغیرہ کا پابند نہیں ہو سکتا [redacted] پڑتا ہے واقعی ؎

آ [redacted] کند فرزند و عیال و خانماں راچہ کند

ہاں اگر آپ مجھے راحت دینا چاہتے ہیں تو کسی بنئے سے کہدیجئے کہ مجھے تیل دیدیا کرے اور ماہوار آپکو حساب دکھلا کر تیل کے دام آپ سے لے لیا کرے مجھ سے کچھ نہ مانگا کرے چنانچہ بادشاہ نے ان کے واسطے تیل کا انتظام کر دیا۔ تو تحقیق احکام اور تدقیق ان علماء کا کام ہے لیڈروں کا کام نہیں غضب یہ کہ لیڈر علماء کا کلام بھی تو نقل نہیں کرتے بلکہ اپنا کلام بیان کرتے ہیں اور اپنے کلام سے علماء کے کلام کو رد کرتے ہیں حالانکہ وہ اس بات کی بھی لیاقت نہیں رکھتے کہ علماء کے کلام کو سمجھ بھی سکیں اس پر ان کا حوصلہ یہ ہے کہ علماء کو میدان میں نکلنے کی تاکید کرتے اور ان کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ صاحبو! میرے نزدیک تو اس وقت میدان میں نکلنے کا وقت نہیں کیونکہ حدیث میں ہے اِذَا رَاَیْتَ شُحًّا مُّطَاعًا وَّدُنْیَا مُّؤْثَرَۃً وَّھَوًی مُّتَّبَعًا وَّاِعْجَابَ کُلِّ ذِیْ رَاْیٍ بِرَاْیِہٖ فَعَلَیْکَ نَجَاصَّتِہٖ نَفْسَکَ وَدَعْ عَنْکَ اَمْرَ الْعَامَّۃِ اور میرے نزدیک آجکل یہ سب علامات موجود ہیں اس لئے آجکل گوشہ نشینی لازم ہے مگر مَیں اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا اگر کسی عالی ہمّت کے نزدیک ابھی ان علامات کے ظہور کا وقت نہ ہو تو بسم اللہ وہ میدان میں نکلیں مگر اپاہجوں کو کیوں اپنے ساتھ کھینچتے ہیں آخر ایک کام یہ بھی تو ہے کہ خدا سے دُعا کریں تو انکو اس کام کے واسطے رہنے دیں ایک جماعت اس کے واسطے بھی تو

ہونا چاہیئے یہ تقسیم عمل اچھی ہے مگر افسوس آجکل دعا کو لوگ عمل ہی نہیں سمجھتے اب میں مقصود کو عرض کرتا ہوں یہ گفتگو درمیان میں اس بات پر آگئی تھی کہ میں نے دوام عمل کے معنی کی تحقیق کر کے عرض کیا تھا کہ یہ علوم محض ترجمہ قرآن پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے جیسا آجکل بعض لوگ اسی قدر علم سے [illegible] کا دعویٰ کرتے ہیں

[illegible] بہرحال یہاں صبر و مصابرت و [illegible] اس

صبر و عمل

کی تکمیل ہے۔ صبر کے معنی ہیں حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰی مَا تَکْرَہُ یعنی نفس کو ناگوار امور پر جمانا اور مصابرت کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ناگوار امور پر نفس کو ثابت قدم رکھنا اور مرابطت کے معنی یہ ہیں کہ صبر و مصابرت پر مواظبت کی جائے۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ عمل ان سب میں مشترک ہے مطلب یہ ہوا کہ عمل میں مستعد رہو اور اسی میں برابر لگے رہو اب بعض اعمال تو اپنے کرنے سے ہیں جیسے نماز، روزہ زکوٰۃ وغیرہ انکو دیانات کہا جاتا ہے ان پر جمنا تو صبر ہے اور بعض اعمال میں دوسروں سے واسطہ ہے جیسے نکاح و بیع و جہاد وغیرہ یہ معاملات ہیں ان میں احکام شرعیہ پر جما رہنا مصابرت ہے۔ پھر دیانات میں تو صبر سہل ہے کیونکہ ان میں حظ نفس بھی ہے زکوٰۃ میں حظ یہ ہے کہ دوسروں پر احسان ہے حج میں حظ یہ ہے کہ سیر و تفریح ہوتی ہے (نماز میں حظ یہ ہے کہ اس سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے جو موجب راحت ہے روزہ میں طبیعت ہلکی ہلکی رہتی ہے اس سے بھی راحت حاصل ہوتی ہے ۱۲) مگر معاملات میں صبر دشوار ہے اس لئے وہاں بھی صاف طور سے مصابرت کا امر کیا گیا کہ نفس کو معاملات میں بھی شریعت کے موافق عمل کرنے پر مجبور کر دو اور

یہ حکم صبر و مصابرت اعمال باطنیہ کو بھی شامل ہے کیونکہ وہ بھی اعمال کی ایک قسم ہیں عمل کہتے ہیں فعل اختیاری کو اس لئے اعمال باطنیہ بھی عمل میں داخل ہیں چنانچہ ایمان کو نصوص میں عمل کہا گیا ہے پھر جس طرح نماز روزہ کا شریعت میں امر ہے اسی طرح محبت و شکر وغیرہ کا امر ہے اور جیسے چوری زنا وغیرہ سے منع کیا گیا ہے اسی طرح ریا و حسد و کبر سے ممانعت ہے۔ پھر جس طرح اعمال ظاہرہ میں بعض اعمال اپنے متعلق ہیں بعض میں دوسروں سے واسطہ ہے اسی طرح اعمال باطنہ بھی دو قسم کے ہیں بعض اپنے کرنے کے ہیں بعض میں دوسروں سے واسطہ ہے پس وہاں بھی صبر و مصابرت دونوں کا امر ہے بلکہ اعمالِ باطن میں صبر و مصابرت کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ باطن میں بعض دفعہ ایسے مصائب و مصاعب پیش آتے ہیں جن کا تحمّل اہل ظاہر ہرگز نہیں کرسکتے ۔

دشنام محبت

بعض دفعہ قبض میں سالک یوں سمجھتا ہے کہ فرعون مجھ سے افضل ہے گو وہ کافر تھا مگر اس کو تو ایک دفعہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے سے نجات ہو جاتی ہے اور مجھے ہزار دفعہ بھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے سے اس مصیبت سے نجات نہیں ہوتی چنانچہ بعض نے اس حالت میں خودکشی بھی کرلی ہے ان کو متہلکین کہا جاتا ہے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا ان کو عذاب ہوگا۔ فرمایا جا ظالم! وہ تو خدا کی محبت میں شمشیر عشق سے جان دے رہا ہے اور تجھے فتوے کی سوجھی ہے اس شعر میں اسی کا فیصلہ ہے ؎

گر خطا گوید ورا خاطی مگو — ور شود پر خون شہید او را مشو
خون شہیدان را ز آب اولیٰ ترست — ایں خطا از صد ثواب اولیٰ ترست

اس حالت میں جو شخص خود کشی سے مرجائے معذور ہے گو ماجور نہیں مگر ماذور بھی نہیں یہ تین لفظ بھی میں نے مقفی اختیار کئے ہیں تین حالات کے اعتبار سے یعنی اگر کوئی شخص حدود شرعیہ سے باختیار خود نکلے وہ تو ماذور ہے (گنہگار ہے) اگر بلا اختیار نکلے معذور اگر حدود کے اندر ہے ماجور ہے (اسکو ثواب ملے گا ترقی ہوگی) باطن کے مصائب میں سے ایک یہ صورت بھی ہے کہ ایک سالک کو اثناء ذکر میں آواز آئی۔ جو چاہے کر تو تو کافر ہو کر مرے گا" اس آواز سے وہ سہم گیا شیخ کے پاس گیا اور سارا حال عرض کیا سبحان اللہ شیخ بھی کیسی دولت ہے جس کو میسر ہو فرمایا گھبراؤ نہیں یہ دشنام محبت ہے محبوبوں کی عادت ہے کہ عشاق کو یوں ہی تنگ کیا کرتے ہیں اس پر سوال ہوتا ہے کہ یہ بات جھوٹ تھی اگر ایسا ہے تو معاذ اللہ حضرت حق کی طرف کذب کی نسبت لازم آتی ہے علماء ظاہر تو امکان کذب ہی میں آج تک لڑ رہے ہیں اس میں تو وقوع کذب لازم آگیا اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں کذب نہیں کیونکہ کافر باصطلاح صوفیہ بمعنی فانی ہے خسرو فرماتے ہیں ؎

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

اے فانی عشقم تو اس غیبی آذر کا مطلب یہ ہوا کہ جو چاہے عمل کر تو فانی ہو کر مرے گا اب یہ کلام ایسا ہو گیا جیسا حدیث میں آیا ہے لَعَلَّ اللّٰهَ اطَّلَعَ اِلٰى اَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ اعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ اور صوفیہ نے یہ اصطلاح لغت سے لی ہے کیونکہ لغت میں کفر بمعنی ستر ہے اور فانی بھی اپنی ہستی کا ساتر ہے صوفیہ کی اصطلاحات کہیں لغت سے ماخوذ ہیں کہیں عرف عام سے کہیں فلسفہ سے کہیں علم کلام سے کہیں کسی اور فن سے اور بہ خلط بحث انہوں نے اس لئے کیا ہے تاکہ

اسرار پر پردہ پڑا رہے نا اہل تک نہ پہنچ جائیں کیونکہ ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی
بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

اسی لئے ان علوم و اسرار کو برسر منبر بیان کرنے کی ممانعت ہے یعنی بلا ضرورت بیان نہ کرے اور میں اسوقت ضرورت سے بیان کر رہا ہوں۔ غرض یہ غیبی صدا صوفیہ کی اصطلاح میں تھی عام اصطلاح میں نہ تھی اور یہ عنوان مزاح کے لئے اختیار کیا گیا تاکہ ذرا تھوڑی دیر کو عاشق پریشان ہو جائے۔

حسن مزاح

مزاح حدیث سے بھی ثابت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض دفعہ فرمایا ہے چنانچہ ایک بڑھیا نے حضورؐ سے دعا کی درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں پہنچا دے حضورؐ نے فرمایا لَا تَدْخُلُ الْعَجُوزُ الْجَنَّۃَ کہ بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی وہ لگی رونے تب آپ نے یہ آیت پڑھی اِنَّا اَنْشَأْنٰھُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰھُنَّ اَبْکَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا لِّاَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ مطلب یہ تھا کہ بوڑھی عورت بڑھیا ہو کر جنت میں نہ جائے گی ایک بار حضرت ابوذر نے ایک مسئلہ کے متعلق بار بار سوال کیا آپ نے ہر دفعہ جواب دیا پھر آخیر میں فرمایا وَاِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِیْ ذَرٍّ کہ ہاں یہی جواب ہے اگرچہ ابوذر کی ناک رگڑ جائے یہ مزاح ہی تو تھا گو برنگ عتاب تھا مگر عاشق کو اس میں ایسا لطف آتا ہے کہ حضرت ابوذر جب اس حدیث کو بیان کرتے تو آخیر میں یہ بھی کہتے وَاِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِیْ ذَرٍّ وَاِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِیْ ذَرٍّ کیونکہ ان کو اس میں حظ آتا تھا۔ حضرت شیخ ابوالمعالی رحؒ کا ایک مرید حج کو گیا تو آپ نے اس کے ہاتھ روضہ اقدس پر سلام کہلا کر بھیجا جب مرید نے شیخ کا سلام پہنچایا تو روضہ

اقدس ؐ سے آواز آئی اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہدینا۔ شیخ کو یہ واقعہ منکشوف ہو گیا جب مرید واپس آیا اس سے پوچھا کہو تم نے ہمارا سلام پہنچایا تھا کہا ہاں حضور پہنچادیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آپ کو سلام فرمایا ہے۔ فرمایا انہی لفظوں سے کہو جو حضورؐ نے فرمائے ہیں۔ کہا جب آپ کو وہ الفاظ معلوم ہیں تو مجھے آپ کیوں بے ادب بناتے ہیں فرمایا اس میں بے ادبی کیسی سوقت تمہاری زبان سے وہ الفاظ ادا نہ ہوں گے بلکہ تمہاری زبان حضورؐ کی زبان ہو گی تم تو محض سفیر ہو غرض اس نے وہی الفاظ کہے کہ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہنا" یہ سنتے ہی شیخ پر وجد طاری ہو گیا اور یہ شعر پڑھا ؎

بدم گفتی وخورسندم ؑخاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

یہی راز تھا حضرت ابوذر کے بار بار رغم انف ابی ذرؓ کہنے میں ایک بزرگ فرماتے ہیں اگر یکبار بگوید بندۂ من از عرش بگذرد خندۂ من۔ (وہ اگر کہدے مجھے اپنا غلام۔ سب سے پیارا نام ہو میرا بھی ۱۲) بلکہ حدیث سے حق تعالیٰ کا مزاح فرمانا بھی ثابت ہے کہ جہنم سے جو مسلمان نکالے جائیں گے انکا لقب جہنمین ہو گا کیونکہ انکو اسی میں خط ہو گا جس کی مثال اوپر گذر چکی ہے ان میں ایک شخص جو سب سے اخیر میں نکالا جائے گا حق تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ مانگ کیا مانگتا ہے وہ عرض کرے گا کہ میرا منہ جہنم کی طرف سے پھیر دیا جائے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ بس اس کے بعد تو کچھ نہ مانگے گا وہ کہے گا نہیں اور کچھ نہ مانگوں گا چنانچہ جہنم کی طرف سے اس کا منہ پھیر دیا جائے گا اسوقت اس کو جنت کا ایک درخت نظر آئے گا عرض کرے گا اس درخت کے نیچے

مجھ کو پہنچا دے۔ ارشاد ہوگا کہ تو نے تو ابھی وعدہ کیا تھا کہ اور کچھ نہ مانگوں گا وہ معذرت کرنے لگا کہ بس یہ درخواست اور پوری کر دیجئے پھر کچھ نہ مانگوں گا غرض اسی طرح رفتہ رفتہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا تو یہ بھی مزاح ہی ہے کہ مقصود تو اس کو جنت میں پہنچانا تھا مگر اس طرح رگڑ رگڑ کر پہنچایا جائے گا لہٰذا اب اس حکایت پر کوئی اشکال نہیں کیونکہ مزاح کا ثبوت احادیث میں بھی ہے۔

قرآن فہمی دوسرے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کافر سے مراد صدائے غیبی میں کافر باللہ نہ تھا بلکہ کافر بالطاغوت ہے اور یہ استعمال نص میں بھی وارد ہے فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى غرض باطن میں ایسے ایسے مصائب و مصاعب پیش آتے ہیں کہ اگر امداد نہ ہو تو انسان تو انسان پہاڑ بھی پاش پاش ہو جائے وحی میں اس قدر ثقل تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ گو انبیاء کے ساتھ حق تعالیٰ کی امداد ہوتی ہے وہ اس کے متحمل ہوتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن حضورؐ کے قلب پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ قلب معانی کا ادراک کرتا ہے اور الفاظ کا ادراک سمع کو ہوتا ہے پس اس سے لازم آتا ہے کہ منزل مِّنَ اللّٰہ صرف معانی ہوں الفاظ منزل من اللہ نہ ہوں اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سے بہت سے بہت معانی کا منزل ہونا معلوم ہوا الفاظ کا منزل نہ ہونا کیسے معلوم ہوا کیونکہ عدم ذکر دلیل ذکر عدم نہیں ہے انکا منزل ہونا دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا،

عربیاً اور عربی ہونا صفت الفاظ ہی کی ہے مگر اس جواب سے عوام کو شفا نہیں ہوتی دوسرا جواب قاضی ثناء اللہ صاحب نے دیا ہے اور یہ جواب ان کے سوا کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا وہ فرماتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ زبان داں کو اپنی مادری زبان میں گفتگو سنتے ہوئے اول التفات معانی کی طرف ہوتا ہے اور الفاظ کی طرف بعد میں التفات ہوتا ہے اور غیر مادری زبان میں اول التفات الفاظ کی طرف ہوتا ہے ثانیاً معانی کی طرف۔ جیسا آپ لوگ اسوقت میرا بیان سن رہے ہیں چونکہ میں آپ کی مادری زبان میں بول رہا ہوں اس لئے معانی کی طرف آپ کو اوّل التفات ہوتا ہے اور الفاظ کی طرف اگر ہوتا ہے تو ثانیاً پس قرآن مجید چونکہ آپ کی زبان میں ہے اس لئے وحی کے استماع کے وقت اول التفات آپ کو معانی کی طرف ہوتا پھر الفاظ کی طرف اس لحاظ سے قرآن کو منزل علی القلب کہہ دیا گیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ الفاظ منزل نہیں اب میں وہ جملہ پھر دہراتا ہوں کہ فقط ترجمہ پڑھنے سے قرآن فہمی حاصل نہیں ہو سکتی ذرا ترجمہ پڑھنے والے تو یہ علوم بیان کریں اور وہ تو ان اشکالات کو حل کریں یقیناً اقرار کریں گے کہ یہ علوم انکو حاصل نہیں ہو سکتے اسی لئے میں بھی کہا کرتا ہوں کہ بعض لوگوں کو ترجمۂ قرآن دیکھنا حرام ہے کانپور میں ایک موذن میرے پاس قرآن کا ترجمہ لایا کہ آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وضو میں پیروں کا دھونا فرض نہیں بلکہ مسح کافی ہے کیونکہ ترجمہ میں وُجُوھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ ـــــــ کا ترجمہ یوں لکھا تھا دھوؤ اپنے مونھوں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور ملو اپنے سروں کو اور پیروں کو ٹخنوں تک تو اس کو

یہ ترجمہ کہ ملو اپنے سروں کو اور پیروں کو دیکھ کر شبہ ہوا کہ پیروں کا بھی ملنا فرض ہے دھونا فرض نہیں میں بڑا پریشان ہوا کہ اس کو کس طرح سمجھاؤں کہ اَرْجُلَکُمْ کا عطف رُءُوْسِکُمْ پر نہیں بلکہ وَجُوْهَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ پر ہے کیونکہ وہ عطف و معطوف کو کیا جانے تو میں نے اس کو دوسری طرح سمجھایا کہ اس سے پوچھا تم کو قرآن کا کلام الہٰی ہونا کیسے معلوم ہوا کہا علماء کے کہنے سے میں نے کہا کیا تیرے نزدیک علماء ایسے دیندار ہیں کہ جس کلام کو وہ اللہ کا کلام کہدیں تم اس کا یقین کر لو گے کہا جی ہاں علماء دیندار نہ ہوں گے تو اور کون ہوگا میں نے کہا کہ پھر انہی علماء کا یہ قول بھی ہے کہ وضو میں پیروں کا دھونا فرض ہے مسح جائز نہیں تو کیا وہ اس فتوے میں بے ایمان ہیں پس انکی اس بات کو نہ ماننے کی کیا وجہ ۔ اور خبردار جو تم نے آئندہ ترجمہ دیکھا اس طرح ایک اہل مد بوڑھے میاں مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا قرآن پڑھتے ہوئے رَاعِنَا نہ پڑھا کروں اس لفظ کو چھوڑ دیا کروں میں نے پوچھا یہ کیوں ؟ کہا ترجمہ میں لکھا ہے کہ اے ایمان والو راعنا مت کہو۔ وہ اس کا یہ مطلب سمجھے کہ تلاوت کے وقت بھی نہ کہو۔ میں نے کہا کہ تلاوت کے وقت راعنا ضرور کہو اور تم کو ترجمہ دیکھنا حرام بس تم اہل مد ہو اپنی مدوں کا حساب کیا کرو اور میں جو ایسے لوگوں کے لئے ترجمہ دیکھنا حرام کہتا ہوں تو اس میں ترجمہ قرآن کی (معاذ اللہ) توہین نہیں بلکہ مقصود ان لوگوں کی اہانت ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو یہ تو ایسا ہے جیسے کہا جائے کہ حسین عورت کا دیکھنا نامحرم کو حرام ہے تو کیا اس سے حسین عورتوں کی توہین ہوگئی ؟ جن میں حضرت عائشہ حضرت سارہ اور حضرت رابعہ بھی داخل ہیں تو کیا کوئی اس جملہ سے ان بزرگ

عورتوں کی توہین نکال سکتا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہی کہا جائے گا کہ مقصود ان ناظرین کے دین کی حفاظت ہے اسی طرح یہاں سمجھو نیز اگر یوں کہا جائے کہ آشوب چشم والے کو آفتاب کی طرف دیکھنا حرام ہے کیونکہ اندھا ہونیکا اندیشہ ہے تو کیا اس سے آفتاب کی توہین مفہوم ہوسکتی ہے ہرگز نہیں۔

محکمۂ تکفیر

اگر بریلوی اس جملہ کو سن لیں تو شاید کفر کا فتویٰ فوراً لگادیں کیونکہ ان کے یہاں تکفیر کے لئے اسکی بھی ضرورت نہیں کہ معنی کفر کا قصد کیا جائے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ اس سے کفر لازم آسکتا ہے اس لئے متکلم کافر ہے گو وہ معنی جو انہوں نے سمجھے متکلم کے باپ دادوں نے بھی نہ سمجھے ہوں بس ان کی تکفیر کی ایسی مثال ہے جیسے کانے نے سامنے سے ایک شخص کو آتا ہوا دیکھ کر دور ہی سے کہنا شروع کیا تو حرامزادہ تیرا باپ حرامزادہ۔ اس نے کہا بھائی میں نے کیا قصور کیا جو مجھے حرامزادہ بناتا ہے کہا مثل مشہور ہے کانا حرامزادہ تو تم نے مجھے دیکھکر اپنے دل میں ضرور مجھے حرامزادہ کہا ہو گا اس لئے میں نے بدلہ لے لیا۔ خواہ اس غریب نے کہا ہو یا نہ کہا ہو مگر انکو بدلہ لینا ضرور تھا۔ یہی حال بریلی کے تکفیریوں کا ہے کہ اپنی طرف سے کلام کے ایک معنی تراش کر متکلم کی تکفیر کرنے لگتے ہیں گو اس کے وہم میں بھی یہ معنی نہ آئے ہوں۔ مگر یہ تکفیر کا محکمہ ہمارے یہاں نہیں ہے یہ انہی کو مبارک ہو ہمارے بزرگ تو ایسے تھے کہ میں نے مولانا محمد یعقوب صاحب رحؒ سے ایک صوفی کا مقولہ جو ایک رسالہ میں تازہ دیکھا تھا بیان کیا کہ شیخ نے اس سے پوچھا تو خدا کو جانتا ہے کہا میں خدا کو کیا جانوں میں تو آپ کو جانتا ہوں" یہ مقولہ بیان کرتا ہوں میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ

لوگ کیسے بیباک ہوتے ہیں کہ ایسا سخت کفر کا کلمہ کہدیا مولانا ہنسنے لگے اور فرمایا اس میں کفر کی کیا بات ہے۔ اچھا تم بتلاؤ کیا تم خدا کو جانتے ہو؟ بتلاؤ اللہ میاں کیسے ہیں بس یہ سوال کرنا تھا کہ میں حقیقت کو سمجھ گیا کہ صوفی کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت بلا واسطہ مجھ کو نہیں ہے بلکہ مجھے شیخ کے ذریعہ سے حاصل ہوئی اس سے زیادہ میں نہیں جانتا تو دیکھئے مولانا نے ایسے سخت کلمہ کو کتنا ہلکا کر دیا یہ کلام ضمنی آگیا تھا اصل میں اس کو بیان کر رہا تھا کہ باطن میں بھی صبر و مصابرت کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں بڑے بڑے مصاعب واقع ہوتے ہیں اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا میں اسی کا حکم ہے۔

قصد اور عمل

اب یہاں ایک سوال متحمل ہے وہ یہ کہ مقصود بیان تو ضرورت عمل ہے اور آیت میں ضرورت صبر کا ذکر ہے تو یہ مقصود پر کیسے منطبق ہوگی جواب یہ ہے کہ مقصود کی تمہید ہے اور مقصود رابطوا ہے جس کی ایک تفسیر عمل ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اب اس کے تمہید ہونے کو سمجھئے وہ یہ ہے کہ صبر ایک ایسا عمل ہے جسکے فوت ہونے سے ہمارے سب اعمال خراب ہو رہے ہیں چنانچہ نماز بھی اسی کے فوت ہونیسے گراں ہے ورنہ مظاہر میں نماز بالکل معمولی چیز معلوم ہوتی ہے مگر پھر بھی مشاہدہ ہے کہ وہ گراں ہے اور ایسی گراں ہے کہ حق تعالیٰ بھی اسکو گراں بتلا رہے ہیں وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ جس چیز کو اللہ تعالیٰ گراں فرمائیں خود سمجھ لو وہ کیسی گراں ہوگی سو اس گرانی کی وجہ وہی عدم الصبر ہے جسکو قرآن مجید میں اس عنوان سے ارشاد فرمایا ہے کہ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ جس سے معلوم ہوا کہ نماز کی گرانی کا سبب ترک خشوع ہے مگر

اس دلالت کے لئے خشوع کے معنی معلوم ہونے کی ضرورت ہے اور اس سے قطع نظر اس لئے بھی اس کے معلوم ہونے کی ضرورت ہے کہ اسکے معلوم نہ ہونے سے بہت لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ خشوع کو دشوار سمجھتے ہیں پھر اسکے ساتھ یہ مقدمہ اور ملا لیا کہ نماز بدون خشوع کے بیکار ہے اور اس کی تائید میں یہ یہ شعر یاد کر لیا ؎

برزبان تسبیح و در دل گاؤخر   ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

اسلئے وہ نماز ہی چھوڑ بیٹھے مگر میں نے اس شعر کا رد کیا ہے کیونکہ یہ شعر مثنوی رومی کا نہیں ہے بلکہ نان و حلوا کا شعر ہے میں نے اسکے جواب میں کہا ہے ؎
ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر مگر اسکی ساتھ ایک شرط ہے وہ یہ کہ نماز پڑھتے ہوئے یہ ارادہ ہو کہ ہم نماز اسواسطے پڑھتے ہیں تاکہ عبدیت پیدا ہو ذکر اللہ اسواسطے کرتے ہیں تاکہ محبت حق پیدا ہو تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ قصد اثر سے جو عمل کیا جائیگا وہ ضرور موثر و نافع ہوگا خواہ اس میں یکسوئی حاصل ہو یا نہ ہو دل لگے یا نہ لگے وساوس آئیں یا نہ آئیں البتہ اگر اثر کا قصد بھی نہ ہو تو پھر نان و حلوا کا شعر صحیح ہے افسوس یہ ہے کہ ہم لوگ عمل کرتے ہوئے اثر کا قصد بھی نہیں کرتے۔

نماز کی گرانی

بہر حال خشوع کی حقیقت یہ نہیں کہ وسوسہ بالکل نہ آئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے قصد سے نہ لاوے غرض آمدن مضر نہیں آوردن مضر ہے مگر آنا لانا ایسا نہ ہو کہ لاتے کو آنا سمجھتا رہے جیسا ایک نیم ٹر واعظ کی حکایت ہے کہ اسکے گھر میں کسی کی مرغی آگئی بیوی نے نکالنا چاہا

کہا نکالو نہیں بلکہ تین بار آواز دیکر پوچھ لو کس کی ہے مگر مرغی آہستہ کہنا کسکی ہے زور سے کہنا جب تین بار اسطرح پکار دیا گیا تو کہا اسکو ذبح کر لو لقطہ ہے جب وہ پک کر تیار ہوئی تو بیوی سے کہا کہ بوٹیاں مت نکالنا کیونکہ وہ تو مشتبہ مال ہے شوربا نکال لینا کیونکہ اس میں تو پانی مصالحہ گھی وغیرہ سب ہمارا مال ہے (حالانکہ بوٹیوں کا ست بھی اُسی میں تھا جو کہ مشتبہ کیا بلکہ حرام تھا ۱۲) بیوی نے چمچہ لیکر شوربا نکالنا چاہا واعظ صاحب بولے یوں نہیں بلکہ دیگچی سے انڈیل کر نکال لو بیوی نے کہا اسطرح تو بوٹیاں بھی آئیں گی کہا جو اپنی خوشی سے آئے اس کو آنے دو تم مت لاؤ تو جس طرح اس جاہل نے لانے کو آنا سمجھا تھا ایسے ہی بعض لوگ نماز میں خود خیالات لاتے ہیں مگر اس دھوکہ میں رہتے ہیں کہ یہ تو خود آرہے ہیں۔ پس از خود خیالات نہ لاؤ تو خشوع حاصل ہو جائیگا اور یہ فعل اختیاری ہے مگر ہر ایک کو آسان نہیں بلکہ اسی کو آسان ہے جو خیالات کے مجتمع رکھنے کا عادی ہے راز اس کا یہ ہے کہ نماز کی گرانی کا سبب قید ہے تو جو شخص قید کا پہلے سے عادی ہو اسکو نماز گراں نہیں اور جو آزادی کا عادی ہے اسکو گراں ہے اور یہی قید صبر ہے پس نماز بھی صبر کے فوت ہونے ہی سے گراں ہوئی اگر صبر کی عادت ہو جائے جسکی حقیقت حبس و قید نفس ہے تو نماز پھولوں ہلکی ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ آزادی کا طالب ہونا الحاد و زندقہ ہے دین تو نام ہی قید کا ہے چنانچہ نماز میں قیود ہیں روزہ میں قیود ہیں ہر کام میں قیود ہیں مگر خاشعین کے واسطے قیود ایسی ہیں ؎

اسیرت نخواہد رہائی ز بند
شکارت نجوید خلاص از کمند

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم | غیر زلفِ آں نگارِ مقبلم

حضرات انبیاء علیہم السلام کے جو مراتب بلند ہیں اس کی تو وجہ ہے کہ انہوں نے سب سے زیادہ قیود و حد کا حق ادا کیا ہے ان پر وہ بلائیں گذری ہیں جن کو دوسرا برداشت نہیں کرسکتا ہے ؎

زاں بلا ہا کا بنیا بر داشتند | سر بہ چرخ ہفتمیں افراشتند

اور جب دین کا نام ہی قید کا ہے تو یہ ضروری بات ہے کہ اوّل اوّل جی نہ لگے گا کیونکہ نفس ابھی قید کا عادی نہیں ہے۔

حقیقتِ صبر اس جواب کا تو حاصل یہ تھا کہ صبر عمل کی تمہید ہے اور ترقی کرکے یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ دین کا ہر عمل صبر ہی ہے کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ ہر عمل میں حدود و قیود ہیں اور صبر کی حقیقت بھی قید ہی ہے اس سے بھی وہ شبہ بالکل مرتفع ہوگیا کہ مقصود تو ضرورت عمل ہے اور آیت میں صبر کا امر ہے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اعمال شرعیہ کو اللہ تعالیٰ نے صبر کے عنوان سے بیان فرمایا ہے تاکہ سنتے ہی مخاطب کو معلوم ہو جائے کہ اس میں ہمت کی ضرورت ہوئی پس اب سالکین کو جی نہ لگنے کی شکایت کرنا فضول ہے کیونکہ تم کو تو صبر ہی کا امر ہے اور ہر عمل کی حقیقت صبر ہی ہے اور صبر میں جی لگنا کیسا؟ بلکہ جی نہ لگنے کی صورت میں زیادہ خوش ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ثواب زیادہ دینا چاہتے ہیں اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ پھر تو کاملین سے ہم ہی اچھے ہیں کہ ہم کو ثواب زیادہ ملتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں اچھے وہی ہیں کیونکہ

انہوں نے اس قدر محنت کی ہے کہ اب ان کو قید میں بھی حظ آنے لگا تو صبر بھی ان ہی کا بڑھا ہوا ہے اور تم اس میں بھی ان کے برابر نہیں مگر جتنا صبر بھی تم سے ممکن ہے اختیار کرو کہ تمہارے اختیار میں بھی ہے لذت کی طلب چھوڑ دو جسکو وصول سمجھا جاتا ہے کہ وہ تمہارے اختیار میں نہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رح کا ارشاد ہے کہ مقصود طلب ہے وصول مقصود نہیں کیونکہ وصول تمہارے اختیار میں نہیں بلکہ اُن کے اختیار میں ہے تم سے تو مطلوب صرف وہ کام ہے جو تمہارے اختیار میں ہے اور وہ طلب وسعی کے سوا کچھ نہیں پس تم اپنا کام کرو اللہ میاں کے کام میں کیوں دخل دیتے ہو ؎

کہ خود کن کار بیگانہ مکن۔ ہاں اتنی اجازت ہے کہ وصول کی دعا کرلیا کرو مگر اسکے درپے نہ ہو مولانا فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست

مولانا بڑے محقق ہیں فرماتے ہیں کہ پانی کی تلاش نہ کرو بلکہ پیاس پیدا کرو پانی خود بخود آجائیگا ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

جب پیاس ہو گی پانی بھی پاس آجائیگا یعنی تم طالب سے مطلوب ہو جاؤ گے آگے اس مضمون کو ذرا وضاحت سے بیان فرماتے ہیں ؎

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں کو بہ نسبت ہست ہم ایں و ہم آں

مگر اتنا فرق ہے کہ عاشق کا عشق ببانگ دہل ہوتا ہے اور محبوب کا عشق مخفی ہوتا ہے ؎

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر　　عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر

وحدۃ الوجود

یہی حقیقت ہے تصوف کی کہ طلب پیدا کرے اور عمل کا اہتمام کرے تصوف کوئی دشوار چیز نہیں متقدمین نے صوفی کی تفسیر عالم باعمل سے کی ہے۔ مگر آجکل لوگوں نے اسکو ہوا بلکہ بدنام بنا دیا ہے یہاں تک کہ ایک عیسائی انگریز بھی کہنے لگا کہ ہم تو تین ہی خدا کے قائل ہیں اور تمہارا ٹوپی (صوفی) تو ہر چیز کو خدا کہتا ہے۔ یہ وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو لگاڑا ہے اور غضب ہے کہ بہت سے جہلاء وحدۃ الوجود کے معنی یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ ہر چیز خدا ہے حتیٰ کہ میں نے فرنگی محل میں ایک مولوی صاحب کو درس میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ نعوذ باللہ واجب الوجود کلی طبعی ہے جزئی نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ کلی طبعی کا وجود جداگانہ نہیں ہوتا بلکہ افراد کے ضمن میں ہوتا ہے تو نعوذ باللہ خدا کا وجود مستقل کوئی نہیں بلکہ موجودات کے ضمن ہی میں ہے یہ وحدۃ الوجود نہیں بلکہ کفر صریح ہے وحدۃ الوجود تو یہ ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا کر خدا کی ہستی کا مشاہدہ کرے نہ یہ کہ خدا کی ہستی کو مٹا کر اپنی ہستی کا مشاہدہ کرے۔ ایک بزرگ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ منصور نے بھی اَنَا الْحَق کہا اور فرعون نے بھی اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلیٰ کہا جس کا حاصل انا الحق ہی ہے پھر وہ مقبول ہوئے یہ مردود ہوا اسکی کیا وجہ الہام ہوا کہ منصور نے اپنے کو مٹانے کے لئے انا الحق کہا تھا اور فرعون نے ہم کو مٹانے کے لئے انا الحق کہا تھا اس لئے وہ مقبول ہوا یہ مردود ہوا مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

گفت منصورے انا الحق گشت مست | گفت فرعونے انا الحق گشت پست
رحمۃ اللہ آں انا را در وفا | لعنت اللہ ایں انا را در قفا

احوال و اعمال غرض متقدین نے صوفی کی تفسیر عالم باعمل کی ہے جس سے تصوف کی حقیقت علم باعمل حاصل ہوئی متقدین کے علوم بڑے پختہ ہیں انہی سے تمسک کرنا چاہیئے کیونکہ وہ اہل صحو تھے اور متاخرین میں اہل سکر زیادہ ہیں رہا یہ کہ جب تصوف کی حقیقت علم مع العمل ہے تو خشک عالم کون ہوئے اسکا جواب یہ ہے کہ خشک عالم وہ ہے جو عمل کو ظاہر کے ساتھ خاص کرتا ہے اور عمل باطن کا اہتمام نہیں کرتا اور جسکو علم کے ساتھ عمل ظاہر و عمل باطن دونوں کا اہتمام ہے وہ عالم تر ہے پھر جو عالم باعمل ہوگا اور اعمال ظاہرہ باطنہ کا جامع ہوگا اللہ تعالیٰ اس کو بعض خاص نعمتیں عطا فرماتے ہیں پھر وہ نعمتیں دو قسم کی ہیں ایک موعود وہ تو رضا رحق اور جنت ہے بس اور غیر موعود کیفیات باطنیہ ذوق شوق و احوال و مواجید اور اسرار وغیرہ ہیں انکی ایسی مثال ہے جیسے باغ میں پانی تو دیتے ہیں درختوں کی پرورش کے لئے مگر پانی دینے سے گھاس بھی نکل آتی ہے جو دیکھنے میں درختوں سے زیادہ خوشنما ہوتی ہے اور مالی کی تراش و خراش سے اس میں خوبصورتی زیادہ آ جاتی ہے اب جو لوگ احوال و کیفیات و اسرار کے طالب ہیں انکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص باغ میں گھاس ہی گھاس چاہے اسکی خدمت کرے حتیٰ کہ درختوں کی جڑ ڈال میں سے بھی گھاس کو صاف نہ کرے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہزاروں روپے کے قیمتی درخت برباد ہو جائیں گے۔ صرف گھاس رہ جائیگی جو ایک دو روپے سے زیادہ کی نہ ہوگی۔ عاقل وہ ہے جو درختوں کی خدمت

کرے ان کی نگہداشت کرے گھاس کا کیا ہے وہ تو خودرو ہے اپنے آپ ہی پیدا ہو جائے گی۔ پس سمجھ لو کہ اعمال کی مثال درختوں جیسی ہے اور احوال و اسرار کی مثال گھاس کی سی ہے ان کی طلب میں نہ پڑو اعمال کا اہتمام کرو یہ خود بخود بلا وعدہ کے اکثر عطا ہو جاتے ہیں اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ تصوف کی حقیقت علم مع العمل ہے اس میں علم سے مراد خاص مولویت نہیں بلکہ اس قدر علم جسکی عمل میں ضرورت ہے خواہ عربی پڑھکر حاصل ہو یا اردو کے رسائل سے یا علماء سے پوچھ پاچھکر کے بس بقدر ضرورت علم حاصل کر کے خلوت اختیار کرنا اور عمل کا اہتمام کرنا چاہیئے مگر ایسی خلوت ہو کہ جب کوئی اشکال پیش آئے تو خلوت کو توڑ کر محقق کے پاس جائے اور اشکال کو رفع کرے ورنہ بعض حالتوں میں شیطان اس کا ایمان تک سلب کر دیگا۔

اتباع وحی محققین لکھتے ہیں کہ شیطان بعض دفعہ اپنی قوتِ خیالیہ سے سالک کی نظر میں آسمان اور انوار پیدا کر دیتا ہے اور اسوقت شیاطین بصورت ملائکہ اس سے کلام کرتے ہیں اور ایسے موقعہ پر جاہل دھوکہ کھا جاتا ہے اسی لئے محققین نے فرمایا ہے کہ اگر ملائکہ بھی اس سے ہمکلام ہوں تو اسکو شریعت پر پیش کرے اگر شریعت کے موافق ہو قبول کرے ورنہ رد کر دے کیونکہ ملائکہ کا کلام بلا واسطہ نبی کے حجت نہیں بلکہ اگر اللہ تعالیٰ بھی اس سے کلام کریں تو کلام حق بھی بلا واسطہ نبی کے غیر نبی کے لئے حجت نہیں کیونکہ (اسکا اولاً کلام حق ہونا یقینی نہیں دوسرے) اللہ تعالیٰ کبھی امتحان کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ اس سے جو کلام ہو اُس سے امتحان مقصود ہو

اور نبی امتحان نہیں کرتا اس لئے کلام حق وہی حجت ہے جو بواسطہ رسول اللہ کے ہو کر اس میں امتحان وغیرہ کا احتمال نہیں تو خلوت میں بعض دفعہ سخت عقبات پیش آتے ہیں جنکو محقق ہی حل کر سکتا ہے اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

ہشدار و گوش را بہ پیام سروش دار　　در اعشق وسوسہ اہرمن بسے ست

پیام سروش سے مراد وحی ہے کہ وحی کا اتباع ہر وقت لازم ہے ورنہ شیطان ایمان تک سلب کر لیتا ہے اسی لئے جاہل کو خلوت محضہ جائز نہیں ہاں عالم محقق کو جائز ہے کیونکہ وہ اسرار کو صحیح طور سے سمجھے گا مگر ایک وقت اس پر بھی ترک خلوت لازم ہے یعنی افادہ کے لئے کیونکہ شیخ کے ذمہ طالبین کا افادہ فرض ہے اس کے ذمہ ضروری ہے کہ ایک وقت افادہ کے لئے بھی مقرر کرے عارف اسی کو فرماتے ہیں ؎

بکشائے لب کہ فریاد از مرد و زن برآمد　　بنمائے رخ کہ خلقے والہ شوند و حیراں

روحِ عمل

غرض بے وحدت کو تو وحدت جائز نہیں. باوحدت کو جائز ہے (بے وحدت[عـــہ] نہ معلوم کیسا لفظ ہے اور اسکے کیا معنی ہیں اسی طرح بیہودہ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لفظ مرکب ہے یا بسیط. مجھے لا ادری کہنے میں کچھ تامل نہیں بلکہ فخر ہے اور اپنے عدم علم کو اسلئے ظاہر کرتا ہوں کہ شاید کسی کو معلوم ہو تو ظاہر کردے) غرض تصوف کوئی نئی چیز نہیں بلکہ یہی نماز روزہ تصوف ہے اور یہی اعمال مقصود ہیں رہا یہ کہ پھر مجاہدہ وغیرہ

عـــہ شاید بدانتظام کو بے وحدت اسلئے کہتے ہیں کہ اسکے افعال میں شان اجتماع نہیں جو وحدت میں ہوتی ہے بلکہ انتشار و اختلال ہے جو کثرت کو لازم ہے واللہ اعلم ۱۲ ظ

کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نماز در روزہ کو نماز و روزہ بنانے کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ یہاں سے ان صوفیوں کی غلطی واضح ہو گئی جو عمل کو بیکار سمجھتے ہیں صرف روحِ عمل کو کافی سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر صورتِ عمل بیکار ہے تو بہت اچھا آج سے اگر تم پونڈا گنا مانگو گے تو تم کو گڑ دیا جائیگا اسوقت منہ نہ بنانا کیونکہ روح تو موجود ہے اسوقت یہ کیوں کہتے ہو کہ گڑ میں وہ بات کہاں جو پونڈے میں ہے پھر ہم کو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ نری روح میں وہ بات کہاں جو نماز میں ہے دوسرے اگر روح عمل ہی مقصود ہوتی تو وہ عالم ارواح میں بھی حاصل ہو سکتی تھی عالم اجسام میں ہم کو کیوں بھیجا گیا؟ یقیناً اس لئے کہ روحِ مجرد سے صورت اعمال کا تحقق نہ ہو سکتا تھا یہ صاف دلیل ہے اسکی کہ صورت بھی مطلوب ہے مگر نہ ایسی صورت جو روح سے خالی ہو بلکہ صورت اور روح دونوں کو جمع کرنا چاہیئے خلاصہ یہ کہ آدمی نہ تو ایسا خشک ہو کہ اعمال کی جان سے تعلق ہی نہ ہو نہ ایسا روح میں تر ہو کہ ڈوب ہی مرے۔ آجکل بعض جاہل صوفی محقق علماء کو عارضی جوش و خروش سے خالی دیکھ کر اسرار طریق سے بے خبر سمجھ کر یہ شعر پڑھ دیتے ہیں ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل ۔۔۔ کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحلہا

کہ یہ لوگ ہماری حالت کو کیا جانیں انکو خبر ہی نہیں کہ ہم پر کیا گذرتی ہے میں اس کا جواب دیا کرتا ہوں کہ ساحل دو ہیں ایک ادھر کا ایک اُدھر کا تو کجا دانند حالِ ما کا مصداق وہ شخص ہے جو ادھر کے ساحل پر ہے جس نے دریا میں قدم ہی نہیں ڈالا اور جو شخص اُدھر کے ساحل پر کھڑا ہے وہ ڈوبا

بھی ہے پھر کامیاب ہوکر یار ہوکر ہنس رہے ہیں جاہلوں کو ان کے تبسم سے یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ ان پر کچھ گذرا ہی نہیں ارے ان پر سب کچھ گذر چکا ہے وہ تمہاری حالت سے بھی واقف ہیں اور اس سے آگے کی حالت سے بھی واقف ہیں اور تم کو ان کے تبسم سے جو یہ دھوکہ ہو رہا ہے کہ ان کے دل میں کچھ نہیں یہ تمہاری حماقت ہے کہ دور ہی سے دیکھکر تم نے فیصلہ کرلیا ان کے پاس جاؤ پاس رہو تو معلوم ہوگا کہ ان کا ہنسنا ایسا ہے جیسا توا چھولے سے اتارنے کے بعد ہنسا کرتا ہے۔ ذرا اس پر ہاتھ رکھکر دیکھو کیسا جلا بھنتا ہے کہ تم کو بھی جلا پھونک دیگا اسی کو نواب صاحب شیفتہ فرماتے ہیں وہ نواب بھی تھے اور صوفی عارف بھی تھے کیونکہ تصوف کے لئے لنگوٹہ باندھنا شرط نہیں وہ فرماتے ہیں ؎

نوائے افسردہ دل زاہد کجے در بزم رنداں شو   کہ بینی خندہ بر لبہا و آتش پارہ در دلہا

ہاں یہ ضرور ہے کہ منتہی کو جوش و خراش نہیں ہوتا یعنی اکثر نہیں ہوتا مگر کبھی کبھی ہو ہی جاتا ہے۔

غلبۂ حال بلکہ میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ حضرات انبیاء پر بھی بعض دفعہ غلبہ حال ہو جاتا ہے چنانچہ جنگ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے غلبہ کے لئے بہت دیر تک دعا کی آخیر میں یہ بھی فرمایا اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِکْ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃَ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ الْیَوْمِ اے اللہ اگر یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو دنیا میں کوئی آپکا نام نہ لیگا بھلا اگر کوئی اللہ کا نام نہ لیتا تو خدا کا اس میں کیا نقصان تھا پس ظاہر میں یہ جملہ بہت سخت معلوم ہوتا ہے کہ

اللہ تعالیٰ کو یہ سنارہے ہیں کہ آپکو کوئی نہ پوچھے گا اسکی تاویل قریب بجز اس کے کچھ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسوقت خاص حالت کا غلبہ تھا اس لئے ناز میں یہ جملہ فرما دیا دوسرا واقعہ اسی غلبہ حال کا عبداللہ بن ابی منافق کی نماز پڑھنے کا ہے یہ شخص بڑا سخت منافق تھا مگر اسکے بیٹے مخلص مسلمان تھے انہوں نے حضور کو اپنے باپ کے مرنے کی اطلاع دی اور دعا کی درخواست کی چونکہ اسوقت تک منافقین کی نماز جنازہ سے صراحۃً ممانعت نازل نہ ہوئی تھی اس لئے حضور نے وعدہ فرمالیا کہ میں دعا کروں گا اور نماز بھی پڑھوں گا چنانچہ آپ نماز پڑھنے کو تیار ہوگئے اسوقت حضرت عمر رض نے آپکو نماز سے روکنا چاہا اور اسکے کلمات اور واقعات شمار کرنا شروع کئے کہ یا رسول اللہ یہ تو منافق تھا اس نے فلاں دن یوں کہا تھا فلاں وقت یوں کہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپکو ان کے لئے استغفار و دعا سے منع فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللهُ لَهُمْ حضور نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ خواہ استغفار کروں یا نہ کروں اور اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ستر دفعہ سے زیادہ استغفار کرنے پر اسکی مغفرت ہو جائے گی تو میں ستر سے زیادہ استغفار کرلونگا غرض آپ نے نماز پڑھادی نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ آیت نازل ہوئی وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ جس میں آئندہ کیلئے صاف طور سے منافقین کے جنازہ کی نماز سے اور ان کی قبر پر جانے سے منع کر دیا گیا جب حضرت عمر رض کو یہ معلوم

ہوا کہ آیت میری رائے کے موافق نازل ہوگئی تو ان پر بے انتہا خجلت کا غلبہ ہوا کہ یہ کیا ہوا کہ میری رائے کے موافق وحی نازل ہوئی اب انکو حضورؐ کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی تھی سبحان اللہ یہ ہے محبت اور ادب اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضورؐ کی رائے سے حضرت عمرؓ کی رائے افضل ہوگئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی رائے بھی حضورؐ ہی کی رائے تھی وہ بھی حضورؐ ہی کا فیض تھا کیونکہ کفار و منافقین پر غیظ اور ان سے نفرت حضرت عمرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے نصیب ہوئی ورنہ آپ کی صحبت سے پہلے تو وہ خود ہی خالی تھے اور قتل رسولؐ کا منصوبہ باندھ کر آئے تھے۔ حضور پر ایمان لانے کے بعد حق تعالیٰ نے انکو کفار و منافقین سے نفرا ور غیظ عطا فرمایا مگر حضرت عمرؓ صرف عمر ہی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم رسولؐ بھی تھے اور عمر بھی تھے بلکہ یوں کہو کہ آپ آدم بھی تھے نوح بھی تھے ابراہیم بھی تھے موسیٰ بھی تھے عیسیٰ بھی تھے ؎

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حضورؐ میں تمام شانیں جمع تھیں غیظ و غضب علی الکفار بھی آپ کے اندر تھا اور رحمت و رافت بھی اعلیٰ درجہ کی آپ میں تھی۔

غلبۂ رحمت

مگر آپ میں غلبہ رحمت ہی کا تھا اس لئے جب تک کوئی بہانہ بھی رحمت کا ملتا تھا آپ رحمت ہی کا برتاؤ کرتے تھے جب رحمت کا کوئی بہانہ نہ ہوتا اس وقت غضب فرماتے (عبداللہ بن ابی کو منافق تھا مگر کھلم کھلا کافر نہ تھا اور منافقوں کے احکام کفار معلنین کے

احکام سے جدا تھے انکے ساتھ احکام حیات یں وہی برتاؤ ہوتا جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور موت کے احکام ہنوز نازل نہ ہوئے تھے اس لئے بوجہ غلبۂ رحمت کے آپ نے احکام حیات پر قیاس کر کے اسکے ساتھ اموات مسلمین جیسا برتاؤ کیا اور حضرت عمر نے بوجہ غلبۂ غیظ و شدت کے احکام حیات کو ضرورت و مصلحت پر مبنی سمجھ کر احکام ممات یں منافقین کو کفار معلنین پر قیاس کیا اور یہ بھی حضور ہی کا فیض تھا اور یہ قیاس بھی آپ سے مخفی نہ تھا مگر حضور نے غلبۂ رحمت کی وجہ سے پہلے قیاس کو ترجیح دی کیونکہ جب تک آپ کو موقعہ ملتا تھا آپ رحمت ہی کے پہلو کو اختیار فرماتے تھے اور حضور کی یہ شان ہم مسلمانوں کیلئے بہت کچھ موجب تسلی ہے کیونکہ ؎

دوستاں را کجا کنی محروم　　　تو کہ با دشمناں نظر داری

اور ؎　　چہ غم دیوار امت را کہ باشد چوں تو پشتیبان

چہ باک از موج بحر آں را کہ دارد نوح کشتیبان　۱۲ جامع

اب اس مقام پر یں ایک سوال علماء ظاہر سے کرتا ہوں وہ یہ کہ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سے حضور نے تخییر کس طرح سمجھی یہ تردید تو تسویہ کیلئے ہے کہ انکے واسطے استغفار کرنا اور نہ کرنا برابر ہے۔ انکو دعاء استغفار سے کوئی نفع نہ ہو گا چنانچہ اہل عربیت پر یہ بات مخفی نہیں اسی طرح اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً یں عدد کا ذکر تحدید کیلئے تھوڑا ہی ہے اگر ستر دفعہ استغفار کروگے تو مغفرت نہ ہو گی اس سے زیادہ کرو تو ہو جائے گی بلکہ یہاں عدد کا ذکر ایسا ہے جیسا محاورہ یں کہا جاتا ہے کہ سو دفعہ بھی کہے گا جب بھی

نہ مانوں گا ہزار دفعہ کہے گا جب بھی کچھ نہ ہوگا اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہزار دفعہ سے زیادہ کہا جائے تو مان لیں گے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ بات ہرگز نہ مانی جائے گی اور عدد کا ذکر صرف بیان کثرت کیلئے ہوتا ہے نہ تحدید کے لئے پھر حضور نے خُیِّرْتُ فَاخْتَرْتُ وَسَأَزِیْدُ عَلَی السَّبْعِیْنَ کیسے فرمایا۔ علماء ظاہر اسکا شافی جواب نہیں دے سکتے اور جو لوگ محض ترجمہ قرآن پڑھکر اجتہاد کے مدعی ہیں تو وہ توکیا ہی جواب دیں گے لیجئے اب میں علماء باطن کا جواب عرض کرتا ہوں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسکا یہ جواب دیا ہے کہ حالت رحمت کے غلبہ کی وجہ سے اسوقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معانی کی طرف التفات نہیں فرمایا بلکہ محض نفس الفاظ سے تمسک فرمانے لگے اور نفس الفاظ میں تخییر وحصر کی گنجائش ضرور ہے گو محاورہ کے اعتبار سے گنجائش نہ ہو اس سے معلوم ہوا کہ غلبۂ حال کاملین پر بھی کبھی ہو جاتا ہے اب میں پھر مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ مقصود بیان تو اتنا طویل نہ تھا جتنا وقت گذر گیا مگر بات میں بات نکلتی آئی اسلئے زیادہ دیر ہوگئی اور یہ بلا ارادہ ہوا میرا ارادہ اتنی دیر بیان کرنے کا بھی نہ تھا مگر انشاء اللہ یہ تطویل بھی نافع ہی ہوئی کہ بہت سی کام کی باتیں کان میں پڑ گئیں۔

علم با عمل

مقصود بیان یہ ہے کہ میں عمل کی ترغیب دے رہا ہوں اور میں نے بتلا دیا ہے کہ تصوف کا خلاصہ صرف علم مع العمل ہے اور علم بھی صرف عمل کیلئے مطلوب ہے تو یوں کہیئے کہ اصل مقصود عمل ہے اور اس میں آجکل بہت کوتاہی ہو رہی ہے کہ لوگ عمل کا اہتمام نہیں کرتے

احوال و منفاہات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں حالانکہ اصل چیز نماز روزہ اور معاملات و معاشرات میں احکام شرعیہ کا تباع ہے اسی کا ذکر اس آیت میں ہے اِصبِرُوا وَ صَابِرُوا جو عمل کی تمہید ہے یا یہ بھی عمل کی تعبیر ہے آگے ارشاد ہے وَرَابِطُوا جسکے معنی وَاظِبُوا وَدَاوِمُوا علی الاعمال یعنی صرف بلکہ صبر و مصابرت یا صرف ایک دفعہ صبر و مصابرت کافی نہیں ہے بلکہ اسکے مقصود یا بدلوں پر کہ عمل ہے مواظبت کی ضرورت ہے۔

اقسام نفس

اب سمجھئے کہ مرابطہ کے انواع بہت ہیں جسکی وجہ ہے کہ نفس کی اقسام مختلف ہیں کسی کا نفس امارہ ہے کسی کا لوامہ کسی کا مطمئنہ۔ مگر صوفیہ نے مرابطہ کی تفصیل زیادہ تر نفس امارہ کے متعلق بیان کی ہے میں نے نفس مطمئنہ اور نفس لوامہ کے اعتبار سے اسمیں کچھ زیادات کی ہیں جن سے صوفیہ نے تعرض نہیں کیا۔ خلاصہ اسکا یہ ہے کہ مرابطہ کی صورت کبھی بہلانے پھسلانے کی شکل میں ہوتی ہے کبھی ڈانٹ ڈپٹ کی شکل میں۔ تو جو نفس مطمئنہ ہے اسکی ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کا برتاؤ نہیں کیا جاتا بلکہ اسکے ساتھ اجر و فضائل یاد دلاکر بہلانے پھسلانے کا معاملہ ہوتا ہے جسکا نام مواعدہ ہے کیونکہ نفس مطمئنہ تو خود ہی عمل کا طالب ہے اور مجاہدات سے اسکے اندر عمل کا شوق پیدا ہوگیا ہے مگر کبھی بشریت کی وجہ سے سستی کرنے لگتا ہے تو اسوقت اسکو ترغیب اور مواعدہ کی ضرورت ہوتی ہے اور نفس مطمئنہ کو کہا جاتا ہے اسکے یہ معنی نہیں کہ وہ آتش محبت خالی ہے بلکہ انکی حالت یہ ہوتی ہے کہ اندر اندر جلتے بھنتے رہتے ہیں گو ظاہر میں ہنستے

پھرتے ہیں ۔ نواب شیفتہ نے انکی حالت کو خوب بیان کیا ہے ؎

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو — کہ بینی خندہ بر لبہا و آتش پارہ در دلہا

اور ایک نفس لوامہ ہے جو کبھی برے کام بھی کرتا ہے مگر پچھتاتا بھی ہے اسکے ساتھ مسامحت کا معاملہ کیا جاتا ہے یعنی اسکو نرمی سے تنبیہ کی جاتی ہے ۔ کیونکہ وہ تو خود ہی حرکات پر نادم ہے اور توبہ کرکے عمل کر رہا ہے ۔ اور ایک نفس ہے امارہ جو گناہوں سے رکتا ہی نہیں اسکی سختی کا معاملہ کیا جاتا ہے صوفیہ نے اسی کے معاملہ کو زیادہ بیان کیا ہے پس نفس امارہ کو دوام عمل اور مواظبت کا عادی بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اول تو اس سے ہر دن صبح ہی کو شرطیں کر لو کہ تجھ کو آج اسطرح عمل کرنا پڑیگا اسکا نام ہے مشارطہ پھر دن بھر اسکی نگہداشت رکھو کہ شرط کے موافق عمل کر رہا ہے یا نہیں اس کا نام ہے ۔ مراقبہ پھر رات کو دن بھر کا اعمال کا حساب لو کہ آج کیا کیا کام کیے اور شرط پوری کی یا نہیں اسکا نام ہے محاسبہ اب حساب کرنے سے اگر یہ معلوم ہوا کہ شرط کی خلاف ورزی ہوئی ہے اُسکو کسی ایسی مشقت کی سزا دو جس سے اسکی اصلاح ہو ۔

اصلاحِ نفس

اس کا نام ہے معاقبہ پھر جو اسکی سُستی سے اس نے کوتاہی کی ہے اسکے تدارک کیلیئے اس پر کچھ جرمانہ مقرر کرو کبھی نفلیں زیادہ پڑھا دو کبھی روزہ لازم کردو کبھی صدقہ خیرات بڑھا دو اس کا نام ہے معاہدہ اسکے بعد اسکی نافرمانی پر اس پر ملامت کرو اور تدارک پر آمادہ کرو اسکا نام ہے معاتبہ اور اگر محاسبہ کے وقت یہ معلوم

ہو کہ نفس نے بد پرہیزی اور خلاف ورزی نہیں کی بلکہ شرائط کو پوری طرح ادا کر دیا تو اب اسکو شا باشی دو اسکا صوفیہ نے ذکر نہیں کیا نہ اس کا نام تجویز کیا سو میں انشاء اللہ اس کا نام بھی وعظ کے صاف ہونے کے وقت تجویز کر لونگا عقع خلاصہ یہ کہ ہمیشہ نفس کو بد پرہیزی سے بچانا چاہیئے کہ احکام الٰہیہ کی مخالفت نہ کرے اور صوفیہ نے یہ سب طریقے حدیثوں سے معلوم کر کے مقرر کئے ہیں مثلاً حدیث میں ہے حَاسِبُوا قَبْلَ اِنْ تحاسبُوا اسمیں محاسبہ کا ذکر ہے اور ایک حدیث میں ہے مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْکُمُ الباءَۃَ فلیتزوّج وَمَنْ لمْ یستطعْ فعلیہِ بالصّوم فانّہٗ لہٗ وجاءٌ"

اصلاح نفس بہ واسطۂ روزہ

جو شادی کر سکے وہ نکاح کرے اور جسکو اسکی وسعت نہ ہو وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ اسکی رگِ شہوت کو مل دیگا یہ مجاہدہ ہے اور ترک جمعہ پر تصدیق دینار کا امر ہے یہ معاقبہ ہے اسی طرح نصوص میں غور کرتے سے سب کی اصل مل سکتی ہے پس یہ باتیں گھڑی ہوئی نہیں ہیں۔ مگر اہل ظاہر کی نظر یہاں تک نہیں پہونچتی اسلئے انکو یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں ایک غیر مقلد عالم میرے پاس آئے اور کئی روز تک مجلس میں بیٹھے انکی یہ حالت تھی کہ جب کوئی مجھ سے سوال کرتا تو وہ خود جواب دینے لگتے کہ حدیث میں اسکے متعلق یہ آیا ہے میں خاموش رہتا۔ ایک دن ایک شخص نے یہ سوال کیا کہ مجھ پر شہوت کا غلبہ ہے وہ مولوی صاحب جلدی سے بولے کہ روزہ رکھو حدیث میں اس کا بھی

عقع مثلاً ملاطفت ۱۲ جامع عدم احیا العلوم میں مبسوطاً اور احقر کے مجموعہ خطب کے خطبہ سادس میں مختصر اسکا کافی بیان ہے۔ ۱۲ منہ

علاج ہے فَاِنَّ الصَّوْمَ لَہٗ وِجَآءٌ ۔ سائل نے کہا کہ میں نے روزہ بھی رکھا تھا مگر اس سے شہوت اور زیادہ ہو گئی اب وہ مولوی صاحب تو خاموش ہو گئے ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا میں نے بزرگوں کے طفیل سے اسکا بھی جواب دیا میں نے کہا کہ روزہ میں ابتداً شہوت کا غلبہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے طبیعت میں لطافت پیدا ہوتی ہے اور لطافت سے شہوت بڑھتی ہے مگر زیادہ روزے رکھنے سے پھر شہوت کم ہو جاتی ہے اور حدیث میں لزوم صوم کو علاج فرمایا ہے نہ کہ مطلق صوم کو اور لزوم مقتضی ہے اعتیاد و تکرار کو (کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جیسے زیادہ کثافت طبع سے شہوت کم ہوتی ہے اسی طرح زیادہ لطافت سے بھی کم ہو جاتی ہے رہا یہ سوال کہ پھر روزہ کی کیا ضرورت ہے بلکہ یہ طریقہ بتلانا چاہیئے کہ بہت پیٹ تن کے کھائے اناپ شناپ کھائے اس سے بھی شہوت کم ہو جائیگی تو یہ صورت خطرناک ہے کیونکہ بہت کھانے سے قسم قسم کے امراض پیدا ہو جائیں گے جن سے جان کا خطرہ ہے اور روزہ ان خطرات سے خالی ہے ۱۲) میں نے یہ حکایت اس لئے بیان کی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اہل ظاہر کی نظر حدیث میں وہاں تک نہیں پہونچتی جہاں تک اہل باطن کی پہونچتی ہے اسلئے صوفیہ پر ان کا یہ اعتراض لغو ہے کہ انہوں نے یہ طریقے کہاں سے گھڑ لئے تو خوب سمجھ لو کہ انہوں نے کہیں سے نہیں گھڑے بلکہ سب اصل حدیثوں میں موجود ہے گو آپکو معلوم نہ ہو اور حدیث من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تسہیل اعمال کے طریقے بھی بتلائے ہیں مگر یہ حضورؐ کے ذمہ لازم نہ تھا

یہ محض رحمت و تبرع ہے اسی طرح شیوخ کے ذمہ بھی یہ امور لازم نہیں اگر وہ بتلا دیں تو انکا احسان ہے اسلئے میں کبھی تو طرق تسہیل بتلا دیتا ہوں کبھی نہیں بتلاتا۔

غلبۂ غضب لبعض لوگ غلبۂ غضب کی شکایت کرتے ہیں تو ان سے یہ سوال کرتا ہوں کہ غضب اختیاری ہے یا غیر اختیاری وہ کہتے ہیں کہ غیر اختیاری ہے پھر سوال کرتا ہوں کہ اسکے مقتضا پر عمل کرنا اختیاری ہے یا غیر اختیاری وہ کہتے ہیں کہ اختیاری ہے اس پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ اختیاری ہے تو بس غضب کے مقتضا پر عمل نہ کرو یہاں تک تو تبلیغ ہے اور یہی شیخ کے ذمہ ہے آگے طالب کا کام ہے کہ ہمت کر کے غضب کے مقتضا پر عمل نہ کرے مگر شفقت کے طور پر بعض کو سہولت کا طریقہ بھی بتلا دیتا ہوں مثلاً یہ کہ اس جگہ سے خود ہٹ جائے یا مخاطب کو الگ کر دے اگر قدرت ہو۔ اگر قدرت نہ ہو تو خود ہی الگ ہو جائے۔ اور بعض طریقے غصہ کم کرنے کے حدیث میں بھی آئے ہیں مثلاً یہ کہ پانی پی لے وضو کر لے یا اعوذ باللہ پڑھ لے مگر یہ طریق لطیف ہیں جو لطیف طبائع کے مناسب ہیں آجکل طبائع کثیف ہیں اسلئے سخت تدابیر کی ضرورت ہے جن میں سے ایک تدبیر وہ ہے جو میں نے بیان کی کہ وہاں سے ہٹ جائے یا مخاطب کو الگ کر دے اور یہ زیادت علی الحدیث نہیں ہے بلکہ اسی سے مستنبط ہے کیونکہ ان سب تدابیر کا راز یہ ہے کہ غصہ کے وقت توجہ کو ہٹانا اور دوسری طرف متوجہ کر دینا غصہ کم کر دیتا ہے پس توجہ کے ہٹانے کی جو صورت بھی ہو گی وہ حدیث

ہی کے تحت میں ہوگی رہا صورتوں کا بدلنا یہ تبدیل علاج یہ تبدیل مزاج میں داخل ہے آجکل کی طبائع ایسی کثیف ہیں کہ اعوذ باللہ تو کیا سارا قرآن بھی پڑھو دو جب بھی اثر نہ ہو کیونکہ لوگ آجکل محض زبان سے اعوذ باللہ پڑھتے ہیں دل سے نہیں پڑھتے ہماری تو حالت یہ ہے ؎

اللہ اللہ می کنی بہر زبان بے طمع پیش آؤ اللہ را بخواں

اور اگر استحضار عظمت آلٰہیہ کے ساتھ دل سے اعوذ باللہ پڑھی جائے تو ضرور اثر ہو ہم نے عرب میں اس اثر کا مشاہدہ کیا ہے کہ دو جماعتیں آپس میں غصّہ کر رہی ہیں لڑنے کو آمادہ ہو گئے تلواریں نیام سے نکل آئی ہیں کہ ایک تیسرے شخص نے آکر کہدیا یا شیخ صَلِّ عَلَی النَّبِی یہ کہنا تھا کہ فریقین کا غصّہ ٹھنڈا ہو گیا اور دونوں درود پڑھنے میں مشغول ہو گئے اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ پھر ایک ادھر کو چلدیا ایک ادھر کو چلدیا۔ یہاں تو لاکھ دفعہ بھی صل علی النبیؐ کہو تو غصّہ ٹھنڈا نہ ہو اسلئے میں یہ بتلاتا ہوں کہ مخاطب کو سامنے سے الگ کر دو یا خود الگ ہو جاؤ تو توجہ ہٹ جاوے گی غصّہ جاتا رہیگا۔

خوف وحزن یہی صرف توجہ بڑا علاج ہے۔ غم کا جو وقت کسی کے یہاں موت ہو جاتی ہے تو میں یہی علاج بتلاتا ہوں کہ اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرو غم کو تازہ نہ کرو واقعہ کو سوچو نہیں اس سے بہت جلد غم زائل ہو جاتا ہے اور یہی مطلب ہے ؎ لَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ کا ورنہ بظاہر اس پر

؎ نہ ڈر نہ غم کر

اشکال وارد ہوتا ہے کہ خوف و حزن تو امر غیر اختیاری ہے اور امر و نواہی کا تعلق امور اختیاری سے ہوتا ہے پھر یہاں خوف و حزن سے نہی کیونکر متعلق ہو)۔ ترجمہ قرآن دیکھنے والے اس اشکال کا جواب دیں؟ یقیناً وہ اس کا جواب نہ دے سکیں گے اللہ تعالیٰ نے مجھے اسکا جواب سمجھایا ہے وہ یہ کہ خوف وحزن کی ایک ابتدا ہے ایک بقاء۔ ابتدا تو غیر اختیاری ہے اور بقاء میں انسان کے اختیار کو بھی دخل ہے کہ واقعہ کو سوچتا رہے اس کا تذکرہ کرتا رہے اس سے حزن بڑھ جاتا ہے پس ولا تحزنی کا مطلب یہ ہے کہ خوف و حزن کو ترقی مت دینا یعنی اس کا تذکرہ نہ کرنا نہ اسکی سوچ میں پڑ جانا اس طرح طبعی حزن بھی خود کمزور ہو جائیگا۔ مگر آجکل تو یہ حالت ہے کہ تعزیت کرنے جو آتا ہے وہ سارا قصہ پوچھتا ہے خصوص عورتیں غمزدہ عورت سے گلے ملکر روتی ہیں اب یہ غریب تو ایک ہے اور گلے لگنے والیاں سو ہیں اسکے دل پر تو سو دفعہ نشتر لگتا ہے اور آنے والیوں کے دل پر ایک ہی دفعہ لگتا ہے اگر بناوٹ نہ ہو اس لئے یہ طریقہ تعزیت کا واہیات ہے بس میں تو اس طرح تعزیت کرتا ہوں کہ بھائی جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا اب رونے دھونے سے مردہ تو زندہ ہونے سے رہا نہ اس کا اس میں کچھ نفع؟ تم وہ کام کرو کہ اسکو بھی نفع ہو اور تم کو بھی وہ یہ کہ قرآن لیکر بیٹھ جاؤ اور پڑھ پڑھ کر اسے بخشو نفلیں پڑھو اور ان کا ثواب اسکو بخشو اللہ اللہ کرو اور اس کا ثواب اسکو پہونچاؤ اس کے لئے دعائے مغفرت کرو اور یہ سوچو کہ وہ جنت میں گیا جہاں یہاں سے زیادہ راحت ہے اور کچھ دنوں میں ہم بھی وہیں پہونچکر اس سے مل لیں گے حدیثوں

میں یہی طریقہ بتلایا گیا ہے اور فقہاء نے بھی بے ضرورت تذکرہ کرنے سے منع کیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ تین دن کے بعد بستی والے تعزیت نہ کریں ہاں باہر سے آنے والوں کو اجازت ہے۔

اصلاحِ بدعت

اس کا راز وہی ہے کہ زیادہ تذکرہ سے غم بڑھتا ہے اسکے متعلق نظام الدین بیرسٹر کی حکایت بڑے مزہ کی ہے واقعی انہوں نے دانائی سے کام لیا کہ انکے والد کا انتقال ہوا تو اوّل تو انہوں نے اپنے معمولات کو ترک نہیں کیا جو کام جسوقت کرتے تھے سب اپنے اپنے وقت پر کرتے رہے جب کھانیکا وقت آیا باورچی سے کھانا منگایا اس نے کہا حضور میں نے تو یہ سوچکر کہ آج والد صاحب کا انتقال ہوا ہے آپ کھانا نہ کھائیں گے کچھ نہیں پکایا کہا سبحان اللہ! وہ تو اپنی موت سے مرے تو ہم کو زندہ مارنا چاہتا ہے کچھ مختصر سی سزا دی اور کھانا پکوایا اسکے بعد انھوں نے والد کی تعزیت کے لئے ایک مسل بنائی اور اسکے لئے ایک میعاد مقرر کی جو شخص اس میعاد میں تعزیت کو آتا رہا اسکی باتیں سنتے رہے اور مسل میں درج کرتے رہے انکے یہاں ہر بات کیلئے مسل تیار ہوتی تھی جب میعاد گزر گئی تو مسل داخل دفتر کر دی اسکے بعد کوئی شخص آیا اور تعزیت کے الفاظ شروع کئے اسکو پہلے ہی روک دیا کہ شاید آپ والد صاحب کی تعزیت کرنا چاہتے ہیں اس نے کہا ہاں! کہنے لگے کہ تعزیت کی مسل داخل دفتر ہو چکی ہے اب میں اسکو نہیں سننا چاہتا کوئی اور بات کیجئے وہ غریب اپنا سا منہ لیکر رہ گیا۔ خیر یہ طریقہ اچھا ہو یا نہ ہو مگر اسکا منشا ضرور اچھا تھا

کہ غم کا تذکرہ ہمیشہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ اسکے لئے میعاد مقرر ہونا چاہیئے۔ اور میعاد کے اندر بھی تعزیت اس طرح کرنا چاہیئے جس سے غمزدہ کو تسلی ہو نہ یہ کہ اور غم تازہ ہو مگر بدتہذیبی کے ساتھ بھی تعزیت نہ کرے جیسے ایک صاحب نے بیٹے کی وفات پر کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ خدا آپ کو نعم البدل دے اس نے یہی جملہ یاد کر لیا پھر کسی کا باپ مرا تو آپ نے اسکو بھی اسی جملہ سے تعزیت کی کہ اللہ تعالیٰ آپکو نعم البدل عطا فرمائے وہ جھلا گیا کہ میری ماں کو خصم کرانے آیا ہے اسی طرح ایک اہلکار کی ماں مرگئی اسکو بہت غم تھا ایک دیہاتی آیا لوگوں سے پوچھا آدمی کیوں جمع ہیں ایک مسخرہ تھا کہنے لگا امیروں کے چوچلے ہیں میاں کی اوٹنی مرگئی اسکا ایک بکھیڑ بنا لیا۔ کہنے لگا دیکھو میں ٹھیک کر دونگا آپ آئے اور اسطرح تعزیت کی کہ میاں سسری مرگئی مرگئی غم کا ہے کا تو جس طرح اس نے بے تحقیق بدتہذیبی کی۔ ایسی بدتہذیبی اچھی نہیں۔ غرض صوفیہ نے تمام امراض باطنہ کے علاج کا سہل طریقہ سے تجویز کیا ہے جو علم اخلاق کی کتابوں میں مدون ہے۔ اخلاق میں صوفیہ نے بہت کتابیں لکھی ہیں امام غزالی کی کتابیں سب سے زیادہ اسکی حامل ہیں مگر احیاء العلوم طویل بہت ہے اب الحمد للہ انہی علوم کے طفیل سے چھوٹے رسالے چھپ گئے ہیں وہ اسکے لئے کافی ہیں یہ تو رابطوا کے متعلق بیان تھا۔

تقویٰ شرعی

آگے ارشاد ہے وَاتَّقُوا اللّٰہَ یعنی خدا سے ڈرو یہ تکمیل ہے مضمون سابق کی کیونکہ اگر خدا کا خوف نہ ہو تو نہ

مرابطہ ہوگا نہ مشارطہ نہ معاینتہ نہ محاسبہ۔ ان سب کی بنیاد خدا کا خوف ہی ہے پس وَاتَّقُوا اللہَ اسلئے بڑھایا کہ مدار ان سب اعمال کا اسی پر ہے۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جب تقویٰ سب اعمال کی بنیاد ہے تو پھر وَاتَّقُوا اللہَ کو مقدم کرنا چاہیئے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تقویٰ شرعی مراد ہے اور تقویٰ شرعی وہ ہے کہ خوف خدا کے ساتھ عمل بھی ہو اگر عمل نہ ہو محض خوف ہی ہو وہ تقویٰ شرعی نہ ہوگا اور قاعدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ایسی عظمت ان اعمال ہی سے قلب میں پیدا ہوتی ہے پس یہ تقویٰ اعمال کا اثر ہوا اسلئے وَاتَّقُوا اللہَ کو مؤخر کیا گیا حاصل یہ ہوا کہ ان اعمال سے جو عظمت حق تمہارے قلب میں پیدا ہوگی اس کا استحضار رکھو تو یہ اعمال سہل ہو جائیں گے پس تقویٰ ان اعمال کا نتیجہ بھی ہے اور ان کو سہل کرنے والا بھی ہے اب میں یہاں بمناسبت مقام تقویٰ کے متعلق ایک اشکال کا جواب دینا چاہتا ہوں ترجمہ دیکھنے والے ذرا اس کا حل کریں وہ یہ کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں تو تحصیل حاصل ہے جو لوگ پہلے سے متقی ہیں ان کو تو ہدایت حاصل ہے پھر ان کے واسطے ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں تقویٰ لغوی مراد ہے یعنی قرآن ان لوگوں کے واسطے ہدایت ہے جن کے دل میں خدا کا خوف ہو دوسرا جواب یہ ہے کہ مان لیا کہ تقویٰ شرعی ہی مراد ہے اور یہی مدار تھا اشکال کا کہ تقویٰ شرعی کے بعد ہدایت کے کیا معنی ہدایت تو ایسے شخص کو پہلے ہی سے حاصل ہے پس اس معنی کو تسلیم کرکے دوسرا جواب دیا جا سکتا ہے ایک بار ہردوئی میں ایک مولوی صاحب کو

چنانچہ مضمون سے اس اعتراض کو بیان کیا تھا اور وہ اسکو تسلیم کر رہے تھے کہ مراد تقویٰ شرعی ہی ہے مگر اشکال کو حل نہ کر سکے تھے میں بھی اس جلسہ میں آگیا اور میں نے اسی کی تائید کی تاکہ مولوی صاحب کی بات نیچی نہ ہو مگر اس اشکال کو سہل عنوان سے حل کر دیا جس سے سامعین کا شبہ زائل ہو گیا وہ عنوان یہ تھا کہ میں نے ان سے کہا کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ایسا ہے جیسے آپ لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہ کورس بی اے کا ہے۔ تو آپ تبلایئے کہ اس قول کے کیا معنی ہیں کیا یہ مطلب ہے کہ اس کو وہ پڑھتا ہے جو بی اے ہو چکا کہنے لگے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ کورس ایسا ہے کہ جو اسکو پڑھ لیگا وہ بی اے ہو جائیگا میں نے کہا پس یہی مطلب اس کا ہے کہ یہ قرآن متقین کے واسطے ہدایت ہے یعنی جو اس پر عمل کرے گا وہ متقی بن جائیگا۔ اس تقریر سے وہ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ اس مضمون کی تعبیر کرنا چاہتے تھے مگر قادر نہ تھے میری تعبیر سن کر ان کی خوشی کی کچھ حد نہ رہی اور یہ جواب میرا گھڑا ہوا نہیں بلکہ منقول ہے جلالین میں اَلصَّائِرِیْنَ اِلَی التَّقْوٰی سے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے لوگ تقویٰ کے درجہ کو پہونچ جاتے ہیں مگر لوگ جلالین پڑھتے پڑھاتے تو ہیں سمجھتے نہیں ہیں۔

ترغیب فلاح

اسکے بعد ارشاد ہے لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ اس میں ترغیب ہے کیونکہ سہولت عمل میں دو ہی چیزوں کو زیادہ دخل ہے ایک ترہیب کو دوسرے ترغیب کو وَاتَّقُوا اللّٰہَ میں ترہیب تھی۔ اس جملہ میں ترغیب ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے تمام اعمال مذکورہ کو سہل فرما دیا ہے

اور اسکی اس واسطے ضرورت تھی کہ ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ سے دو طرح کا ہے ایک محکومیت کا ایک محبت کا محکومیت کا مقتضا تو یہ ہے کہ تسہیل اعمال کا طریقہ نہ بتلایا جائے کیونکہ خود محکوم ہونا وجوب امتثال کے لئے کافی ہے مگر محبت کا مقتضا یہ ہے کہ تسہیل کا طریقہ بھی بتلا دیا جائے کیونکہ محبت خاص رعایت کو مقتضی ہوتی ہے خواہ حاکم کی جانب میں محبت ہو خواہ محکوم کی جانب میں اور دونوں طرف ہو تو نورٌ علیٰ نور۔ پھر اسکی دو صورتیں تھیں ایک یہ کہ ترغیب کیلئے اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے کسی وصف کی طرف متوجہ فرماتے مثلاً یوں فرماتے کہ میں تم سے راضی ہو جاؤں گا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم کو ہمارے وصف کی طرف متوجہ کیا جائے یہاں اللہ تعالیٰ نے دوسری صورت اختیار فرمائی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف تو ہم سے غائب ہیں اور اپنے اوصاف کو ہم زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔

فلاح و ترقی

ترغیب کے موقعہ پر یہ فرمایا کہ تم کو ان اعمال سے یہ وصف حاصل ہو جائیگا۔ زیادہ مؤثر ہے اسلئے ارشاد فرماتے ہیں کہ امید ہے تم کو ان اعمال سے فلاح حاصل ہو جائیگی۔ اسکو ہم جلدی سمجھ لیں گے کیونکہ فلاح ہمارا وصف ہے۔ پھر یہاں فلاح مطلق ہے جو فلاح دنیا و آخرت دونوں کو شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی فلاح کا طریقہ بھی یہی ہے کہ اعمال شرعیہ کا اہتمام کیا جائے مگر آجکل لیڈروں نے فلاح دنیا کے طریقے کچھ اور سوچے ہیں یہ وہ صورت اختیار کرتے ہیں جو یورپ نے اور غیر اقوام نے اختیار کی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ تدبیریں

فلاح دنیا میں مؤثر نہیں مگر یہ ضرور کہونگا کہ مسلمانوں کے واسطے مفید نہیں کیونکہ مسلمانوں میں ان تدابیر کی تاثیر سے ایک مانع موجود ہے وہ کیا معصیت؟ خدا کی نافرمانی۔ اور یہ مانع کفار میں نہیں ہے کیونکہ وہ مکلف بالفروع نہیں وہ تو صرف ایمان کے مکلف ہیں انکو کفر ہی کا عذاب ایسا سخت ہوگا جس سے بڑھکر کوئی عذاب نہیں بقیہ اعمال کی بابت نہ اُن سے بازپرس ہے نہ ان پر کوئی سزا ہے اور مسلمانوں سے کفر کا عذاب تو ہٹا ہوا ہے کیونکہ بحمداللہ وہ دولت ایمان سے مشرف ہیں اسلئے ان کے اعمال پر بازپرس و گرفت ہوتی ہے جب یہ ایسے طریقے فلاح دنیا کے لئے اختیار کرتے ہیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہیں تو انکو کامیابی نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ ان تدابیر کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں تاکہ دنیا ہی میں مخالفت کی سزا بھگت لیں پس ان کی اور کفار کی ایسی مثال ہے جیسے ٹوپی اور جوتہ کی ٹوپی میں نجاست لگ جائے تو فوراً پھینک دی جاتی ہے اور اچھی طرح پاک کرنے کے بعد اسکو استعمال کیا جاتا ہے اور جوتہ میں ناپاکی لگ جائے تو اس کو پھینکتے نہیں ہیں بلکہ رگڑ کر کام میں لے آتے ہیں تو جسطرح ہر چیز کے پاک کرنیکا طریقہ مختلف ہے اسی طرح ہر قوم کی فلاح و ترقی کا طریقہ الگ ہے

اندھا دھند تقلید

یہ ضروری نہیں کہ جو طریقہ ایک قوم کو نافع ہو وہ سب کو نافع ہو۔ اور اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ تدابیر ہم کو بھی نافع ہیں تب بھی ہم کو تو احکام الٰہیہ کا اتباع لازم ہے اور ان تدابیر غیر مشروعہ کا اختیار کرنا جائز نہیں۔ کیا شراب اور

قمار و سود میں نفع نہیں؛ ضرور ہے خود نص میں ارشاد ہے ؎ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ مگر اس نفع کو لیکر کیا کریں جسکے ساتھ خدا کا غضب بھی ملا ہوا ہے اسلئے مسلمانوں کو وہی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں جو شریعت کے موافق ہوں اس کی یہی صورت ہے کہ عمل کا اہتمام کیا جائے۔ اب لیڈرز تدابیر تو خلاف شرع کرتے ہیں اور علماء کی شکایت کرتے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھ ملکر کام نہیں کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ اعمال غیر مشروعہ میں تو شرکت کر ہی نہیں سکتے اگر یہ اعمال مشروعہ بھی ہوتب بھی انکی یہ شکایت صحیح نہ تھی کیونکہ ملکر کام کرنیکے یہ معنی نہیں ہیں کہ سب کے سب ایک ہی کام کو لپٹ جائیں بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ کام تقسیم کر دیئے جائیں جیسے لوہار بڑھئی معمار مزدور سب ملکر مکان بناتے ہیں اسکے یہ معنی تھوڑا ہی ہیں کہ ہر اینٹ کو لوہار بھی ہاتھ لگائے بڑھئی بھی ہاتھ لگائے بلکہ اپنے اپنے کام کو ہر ایک الگ کر رہا ہے۔ پھر نتیجہ مجموعہ پر مرتب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر لیڈر شریعت کے موافق بھی تدابیر کریں تب بھی علماء کا یہ کام نہیں کہ وہ ان تدابیر میں عملی حصہ لیں بلکہ یہ کام عوام کا ہے یا لیڈروں کا علماء کا کام یہ ہے کہ جو تدبیر تم کرنا چاہو اوّل علماء سے استفتاء کر لو کہ یہ جائز بھی ہے یا نہیں وہ اسکے متعلق حکم شرعی بتلا دیں گے تم اس پر عمل کرو تمام متمدن اقوام کا یہی طریقہ ہے کہ انکے یہاں عملی محکمہ الگ ہوتا ہے علمی محکمہ الگ ہوتا ہے یہ نہیں کیا جاتا کہ ایک کام کیلئے طلبہ اور اساتذہ بھی اپنا پڑھانا

؎ آپ کچھ کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں۔

چھوڑ دیں اور سب اگر اس کام میں لگ جائیں بلکہ یہ لوگ علمی ترقی میں بدستور لگے رہتے ہیں کام کرنے والی جماعت دوسری ہوتی ہے بہر حال اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہر قسم کی فلاح اطاعت وعمل ہی سے حاصل ہو گی دنیا میں بھی آخرت میں بھی اب چونکہ مسلمانوں نے عمل صالح کو ترک کر رکھا ہے تو دیکھ لیجئے کیسی فلاح ہو رہی ہے کہ ہر روز پہلے سے بدتر ہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عمل کی تاکید بھی فرمائی ہے اور تسہیل بھی ساتھ ساتھ ہے تکمیل وتتمیم بھی ساتھ ہے پس یہ آیت عمل کے مکمل بیان کو حامل ہے اسلئے میں نے اسکو اختیار کیا تھا پھر لطف یہ ہے کہ آیت کے سب اجزا ایک ہی شئے کے متعلق ہیں یعنی عمل کے اور اسی کو دل چاہا کرتا ہے کہ ایک مجلس میں ایک ہی مضمون کا بیان ہو چنانچہ الحمد للہ اسوقت ایک ہی مضمون کے متعلق بیان ہوا ہے گو درمیان میں استطراداً دوسرے مضامین بھی آگئے مگر وہ سب تابع تھے اصل مضمون ایک ہی تھا اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو علم و عمل کا جامع بنائے اور ہمارے اعمال ظاہرہ و باطنہ کی اصلاح و تکمیل فرمائے مشائخ کی بھی اور طالبین کی بھی نیز مشائخ کو طالبین پر شفقت عطا ہو اور طالبین کو استفادہ و اعتماد کی توفیق ہو اور سب کا خاتمہ بالخیر ہو آمین

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

تَمَّتْ بِحَمْدِ اللّٰهِ الَّذِيْ بِنِعْمَتِهٖ وَجَلَالِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ ۔

ختم ہوا اس اللہ تعالیٰ کے احسان سے کہ جسکی نعمت اور زندگی سے ایسے امور انجام کو پہنچتے ہیں

المجاھدہ

مجاہدہ کی ضرورت کے متعلق یہ وعظ مورخہ ۲ صفر ۱۳۳۲ھ بوقت شب بعد عشاء مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں کھڑے ہوئے بیان فرمایا جو مولانا ظفر احمد صاحب نے قلمبند فرمایا حاضرین کی تعداد ۵۰۰ کے قریب تھی۔ یہ وعظ پونے تین گھنٹہ میں ختم ہوا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ و
نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا
مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لآ الہ الا اللہ وحدہ
لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا محمّدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم - اما بعد فاعوذ
باللہ من الشیطان الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○
من کان یرجو لقاء اللہ فان اجل اللہ لآت وھو السمیع
العلیم ○ ومن جاھد فانما یجاھد لنفسہ ان اللہ لغنی
عن العٰلمین ○ والذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لنکفرن عنھم
سیاٰتھم ولنجزینھم احسن الذی کانوا یعملون ○

تمہید اسوقت ایک ضروری مسئلہ اصلاح عمل اور طرز عمل کے متعلق بیان کرنیکا قصد ہے اور وہ مسئلہ ایسا بدیہی ہے کہ اسکے ثبوت کے لئے مشاہدہ ہی کافی دلیل ہے کسی نص کی ضرورت نہیں کیونکہ نص کی ضرورت تو اثبات احکام یا اخبار عن الغیب کیلئے ہوا کرتی ہے۔ اور جو امور مشاہدہ کے متعلق ہوں ان کے لئے مشاہدہ کے سوا اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی ہاں اگر کوئی تبرعاً دلیل بھی بیان کردے تو اس سے مدعیٰ اور موکد ہو جائے گا چنانچہ وہ مسئلہ جو اسوقت بیان ہوگا اسی قسم کا ہے کہ مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت و معلوم ہے مگر میں نے اسوقت حسب معمول آیات کی تلاوت تبرعاً کردی ہے کیونکہ ان آیات کو اس مسئلہ سے ایک ظاہر علاقہ ہے۔ اب وہ مسئلہ سننا چاہیئے اور اسکی ضرورت بھی اس کے سننے سے معلوم ہو جائے گی کیونکہ جی یہ چاہا کرتا ہے کہ جو کچھ بیان ہو کسی ضروری مسئلہ کے متعلق ہو ورنہ یوں تو بیان کرنے کو بہت سی باتیں ہیں مگر بلا ضرورت کے لوگوں کا وقت صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

اصلاحِ عمل اب غور سے سنئے کہ ہم لوگوں سے اپنے عمل کے بارہ میں ایک غلطی ہو رہی ہے جس کی تفصیل یہ ہے باب عمل میں آجکل دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں جنکو صرف اعتقاد کی درستی

کا خیال ہے وہ عمل کو مہتم بالشان ہی نہیں سمجھتے اسلئے انکو اصلاحِ عمل اور تکثیرِ اعمال کا اہتمام ہی نہیں۔ اگر یہ لوگ یوں کہتے کہ عقیدہ کا درجہ عمل سے زیادہ ہے تو ہم کو ان سے منازعت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس کا ہم کو بھی انکار نہیں واقعی یہ درست ہے کہ عمل کا درجہ عقیدہ سے مؤخرہ ہے مگر اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ عمل فضول و بیکار ہے کیا جو چیز کسی سے مؤخر ہو وہ بیکار ہوا کرتی ہے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ شاخوں کا مرتبہ جڑ سے مؤخر ہے مگر باینہمہ کوئی بھی شاخوں کو بیکار نہیں کہہ سکتا کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ درخت بارآور نہیں ہو سکتا جس کی شاخیں نہ ہوں اگرچہ اس کی جڑ کیسی ہی مضبوط ہو ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ خالی عقیدہ جس میں عمل نہ ہو بارآور نہ ہوگا مجرد عقائد سے بغیر عمل کے وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جو مطلوب شارع ہے گو کبھی بعض کیفیات بغیر اعمال کے حاصل ہو جائیں مگر کیفیات خود مطلوب نہیں باقی جو ثمرہ شارع کے نزدیک مقصود ہے وہ بغیر اعمال کے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم کو اخبار شارع سے یہی معلوم ہوا ہے کہ بدون عقیدہ و عمل دونوں کی درستی کے ثمرۂ مقصود کے حصول کا یقین نہیں ہو سکتا گو یہ ممکن ہے کہ بعض کو صرف اصل کی درستی سے بھی حاصل ہو جائے مگر بوجہ وعدہ نہ ہونے کے اس کا یقین نہیں۔ ان لوگوں نے قرآن کی صرف ایک آیت یاد کر لی ہے ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون جس سے یہ سمجھ لیا کہ محض علم کافی ہے یعنی اصلاحِ عقیدہ اور یہ نہ دیکھا کہ قرآن میں بہت جگہ یہ بات بھی مصرح ہے کہ عمل کرنے والے اور عمل نہ کرنے والے بھی برابر

نہیں ہو سکتے سنیئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ام حسب الذین اجترحوا السیئات ان نجعلھم کالذین آمنو وعملوا الصلحٰت سواء محیاھم ومماتھم ساء ما یحکمون ○ ایک مقام پر ارشاد ہے۔ ام نجعل الذین آمنو وعملوا الصلحٰت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار ط ایک جگہ ارشاد ہے افمن کان مؤمنا کمن کان فاسقا لا یستوٗن ○ بہرحال ثابت ہو گیا کہ عادۃ اللہ یہ ہے کہ دین سے جو خاص ثمرہ مطلوب ہے، وہ بغیر عمل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک غلطی تو یہ تھی۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ بعض لوگ اعمال کی ضرورت تو سمجھتے ہیں مگر اعمال کے ساتھ کسی اور شئے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ظاہر میں ان کی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے عقیدہ اور عمل دونوں کو ضروری سمجھا مگر اس میں بھی ایک نقص ہے وہ یہ کہ انہوں نے تصحیح عقائد کے بعد اصلاح اعمال اور تکمیل اعمال و مواظبتِ اعمال کیلئے صرف ارادہ کو کافی سمجھا حالانکہ تجربہ اور مشاہدہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اصلاح اعمال کی سہولت کیلئے ایک اور شئے کی بھی ضرورت ہے اگرچہ نفس اصلاح ممکن ہے یعنی وہ امر اصلاح کا موقوف علیہ عقلاً نہیں ہے اور نہ عادۃً اس معنی کو موقوف علیہ ہے کہ اس کے بغیر کسی طرح بھی عمل نہ ہو سکے لیکن معنی کو ضرور موقوف علیہ ہے کہ بدون اس کے عمل بسہولت نہیں ہو سکتا پس وہ سہولت میں موقوف علیہ ہے۔

صدورِ عمل

صدورِ عمل بغیر اسکے ہو سکتا ہے۔ اسکی مثال ریل کی سی ہے کہ جیسے مسافت طویلہ بدون ریل کے بسہولت

طے نہیں ہو سکتی اگرچہ بدقت طے ہو سکتی ہے ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ اصلاح عقائد کے بعد گو صدورِ عمل بتکلف بدون اس خاص شئے کے ہو سکتا ہے مگر بسہولت نہیں ہو سکتا بلکہ سہولت اعمال کیلئے اس خاص شئے کی ضرورت ہے مجھے اسوقت اسی کا بیان کرنا مقصود ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جسکے معلوم نہ ہونے سے باب عمل میں بہت لوگ غلطی کر رہے ہیں حاصل اس شئے کا یہ ہے کہ صدور اعمال بعد اصلاح عقائد کے گو ارادہ سے ہو سکتا ہے لیکن اس ارادہ کے کچھ معاوفات و موانع مزاحم ہو جاتے ہیں جس سے صدور اعمال دشوار ہو جاتا ہے اور اس دشواری سے بعض اوقات عدم صدور اعمال کی نوبت آجاتی ہے تو سہولت کیلئے اس شئے کی ضرورت ہوئی اس شئے کے حصول کے بعد صدور اعمال بالکل سہل ہو جاتا ہے۔ اور میں اسکو تجربہ سے ثابت کرنا چاہتا ہوں ابھی آیت سے استدلال نہیں کرتا کیونکہ آیت میں دوسرے معانی بھی محتمل ہیں اسلئے اوّل میں تجربہ سے اسکا ثبوت دیتا ہوں پھر بعد میں تبرعاً آیات سے تائید کر دوں گا۔

مجاہدۂ نفس

سنیئے اس شئے کا نام ہے مجاہدۂ نفس اور مخالفت نفس یہ بات بہت قابلِ قدر ہے اسکو معمولی نہ سمجھئے۔ اب تجربہ سے اسکی ضرورت کو معلوم کیجئے کہ یہ تو سب مسلمان جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور نماز پڑھنے کو بہت لوگوں کا جی بھی چاہتا ہے ترک صلوٰۃ سے ان کا دِل بھی برا ہوتا ہے مگر پھر بھی بہت لوگ نماز نہیں پڑھتے باوجودیکہ سب کو عقیدہ فرضیت صلوٰۃ کا حاصل ہے۔ اسی طرح بعضے ارادہ کرکے

پڑھتے بھی ہیں مگر وہ ارادہ بعض عوائق سے مضمحل ہو کر مؤثر نہیں رہتا اور اس وجہ سے نماز پر دوام نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صدور و دوام اعمال کیلئے صرف اصلاح عقائد یا ارادہ ضعیفہ کافی نہیں ہے بلکہ کسی اور شے کی ضرورت ہے جسکے بعد صدور و دوام و رسوخ اعمال ضروری ہے اور وہ تکمیل اعمال کا موقوف علیہ ہے اور وہ شے مجاہدۂ نفس اور مخالفت نفس ہے چنانچہ بے نمازی اسی واسطے بے نمازی ہے کہ وہ اپنے نفس کا اتباع کرتا ہے اور اسکو آرام دیتا ہے۔ اگر وہ مجاہدۂ نفس کرتا تو بے نمازی نہ ہوتا۔ یہاں شاید کوئی یہ سوال کرے کہ جو لوگ نماز پڑھتے وہ کونسا مجاہدہ کرتے ہیں ان کے نفس کو کونسی مشقت ہے بلکہ الٹا ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ان کو نماز فوت ہونے سے رنج ہوتا ہے تو فوت میں مشقت ہوئی اسکا جواب یہ ہے کہ ان کو مشقت تو ہے مگر شوق کی وجہ سے وہ مشقت باقی نہیں رہی اور شوق ہی کی وجہ سے ان کو اس میں لذت آنے لگی جس کا اعلیٰ مرتبہ وہ ہے جو حدیث میں وارد ہے جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ اور یہ درجہ تو کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے کہ نماز سے لذت اور راحت حاصل ہو تو کم و بیش مشقت رہتی ہی ہے مگر جسکو یہ درجہ حاصل ہے اس کو بھی اوّل مشقت و مجاہدہ کرنا پڑا ہے پھر مجاہدہ کرتے کرتے یہ حال ہو گیا کہ مشقت مغلوب اور شوق و لذت غالب ہو گئی یہ تو خواص کی حالت ہے اور عام طور پر تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ نمازی آدمی بھی بعض دفعہ نماز میں کسل کرنے لگتے ہیں مگر حق تعالیٰ کی توفیق سے وہ کسل دُور ہو جاتا ہے اور یہ توفیق عادۃً ان کے مجاہدہ پر مرتب ہوتی

ہے کیونکہ ان کا ارادہ نفس کی مخالفت ہی کا ہوتا ہے نفس کی موافقت میں
ترک صلوٰۃ کا ارادہ وہ نہیں کرتے ارادہ کے بعد ذرا وہ ہمت سے کام
لیتے ہیں کہ توفیق حق شامل حال ہو جاتی ہے۔ اسی واسطے حدیث میں
اسباغ الوضوء علی المکارہ کا ثواب زیادہ وارد ہے اور اسی واسطے حدیث
میں آیا ہے۔ حجبت النار بالشہوات وحفت الجنۃ بالمکارہ کہ جہنم شہوتوں
سے محجوب ہے، اور بہشت مشقتوں سے گھری ہوئی ہے یعنی جیسے باغوں
کے گرد کانٹوں کی باڑھ ہوتی ہے ایسے ہی جنت کے گرد مکارہ ہیں جس
سے مراد اعمال شاقہ ہیں تو جو شخص جنت کے اعمال کر رہا ہے یعنی وہ اعمال
جو موجب دخول جنت ہیں یقیناً وہ مکارہ کو پھاند کر آیا ہے اگر وہ مکارہ کو
پھاند کر نہیں آیا تو جان لے کہ یہ رستہ جنت کا نہیں ہے بس بات یہ ہے
کہ مکارہ کو پھاند کر تو آیا ہے مگر اس کے شوق اور غلبۂ حال سے وہ مکارہ
لذیذ ہو گئے جیسے کوئی عاشق محبوب سے ملنے کو دس پانچ کوس طے کر
کے آیا ہو تو مشقت تو اس نے ضرور کی گو عشق کی وجہ سے اسکو اس میں
لذت ہی آئی ہو۔ اگر ایسے نہ ہوتے تو یہ اہل جنت نہ ہوتے کیونکہ اہل
جنت کی تو شان یہ ہے کہ وہ جنت میں جا کر یوں کہیں گے الحمد للہ الذی
اذہب عنا الحزن ط ان ربنا لغفور شکور الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ ط
لا یمسنا فیہا نصب و لا یمسنا لغوب ہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتک ان
کے ساتھ غم لازم تھا گو جسمانی ہی تھا بہر حال وہ شبہ بالکل رفع ہو گیا کہ
نمازی کونسا مجاہدہ کرتے ہیں حاصل جواب یہ ہے کہ شوق کی وجہ سے مشقت

نہاں ہو جاتی ہے اور یہی خاص خاص لوگوں میں ہے ورنہ غالب طبائع میں تو شوق و محبت کم ہے کہ الشاذ کالمعدوم اگر کوئی نمازی ایسا بھی ہو جسکو اصلا مشقت نہ ہوئی ہو اور نہ ہوتی ہو مادرزاد ولی ہو تو یہ شاذ ہے اس سے گفتگو نہیں۔ غرض غالب حالت یہی ہے کہ نماز و روزہ وغیرہ میں مشقت ہوتی ہے اور اس مشقت میں بعض اوقات مانعیت کی نوبت پہونچ جاتی ہے اور اس مشقت کی مانعیت کا علاج مجاہدہ ہے۔

اصلاحِ عقیدہ

پس ترتیب صحیح یہ ہے کہ اوّل تو عقیدہ صحیح کرے اور عقائد و علوم صحیحہ حاصل کرے کہ اس سے اعمال کی تحریک ہوتی ہے۔ مثلاً یہ عقیدہ حاصل کیا کہ اللہ تعالیٰ خالق و رازق ہیں اس سے خدا تعالیٰ کے احسانات اپنے اوپر معلوم ہونگے اور ذکر و فکر احسانات سے محبت و اطاعت کی تحریک ہوتی ہے۔ اور یہ تحریک باعثِ عمل ہے مگر اس باعث کے ساتھ بعض اشیاء مانع بھی ہوتی ہیں اور وہ موانع غالباً دو ہیں ایک اسباب تنعّم دوسرے ضعف نفس۔ یعنی باوجود عقیدہ صحیح ہونے کے اور تحریک طاعت پیدا ہونے کے بھی بعض دفعہ نفس ضعف و کم ہمتی کی وجہ سے یا اسباب تنعّم اور سامان راحت میں منہمک ہونے کے سبب سے نماز روزہ وغیرہ سے سستی کرتا ہے۔

عقیدۂ صحیحہ

بعض دفعہ نفس اپنی تسویل سے ان موانع کے ساتھ عقیدہ صحیحہ سے بھی مانعیت کا کام لیتا ہے اور یہ نہایت حیرت کا مقام ہے یعنی عقائد و علوم صحیحہ سے تو طاعات و اعمال صالحہ کی

تحریک ہوتی ہے مگر نفس کبھی ایسی شرارت کرتا ہے کہ عقیدہ صحیحہ سے ترکِ اعمال میں کام لیتا ہے مثلاً کسی وقت گناہ کا تقاضا ہوا اور اس کے ساتھ ہی دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا کہ گناہ سے جہنم میں جائے گا اس وقت نفس عقائد صحیحہ میں سے ایک عقیدہ سامنے کر کے پہلے عقیدہ پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے یعنی یوں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں اور اس عقیدہ کی اسطرح تقریر کرتا ہے کہ واقعی گناہ کر کے جہنم میں جانے کا اندیشہ ہے مگر یہ جب ہے کہ گناہ سے توبہ نہ کی جائے اور اگر توبہ کر لی جائے تو سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور میں عزم کرتا ہوں کہ فوراً توبہ کر لوں گا اور ایک دفعہ کے بعد پھر یہ گناہ نہ کروں گا تو دیکھئے نفس کیسا شریر ہے کہ عقیدہ صحیحہ سے معصیت میں مدد لے لیتا ہے حالانکہ اس عقیدہ کی تعلیم کا حاصل صرف یہ ہے کہ جس شخص سے پہلے گناہ ہو چکے ہوں اور اب وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا چاہے تو اس کی تسلی کیلئے یہ عقیدہ بتلایا گیا ہے تاکہ گنہگاروں کی ہمت شکستہ نہ ہو اور وہ مایوس ہو کر خدا سے بے تعلقی ہی کو اپنے لئے تجویز نہ کر لیں دوسرے یہ کہ بجز انبیا علیہم السلام کے اتقیاء و صلحاء بھی معصوم نہیں بعض دفعہ ان سے بھی جہالت کی وجہ سے خطا سرزد ہو جاتی ہے اب اگر یہ عقیدہ نہ بتلایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے تو وہ ہرگز اپنے تقویٰ و صلاح ماضی کی طرف غور و فکر سکتے بلکہ یہ سمجھ لیتے کہ اب تو ہم گنہگار ہو ہی چکے ہیں جہنم میں جائیں ہی گے پھر نفس کی لذات میں بھی کیوں کمی کی۔ خطا اور لغزش کے بعد اتقیا و صلحاء

کو تقویٰ و صلاح کی طرف واپس لانے والا یہی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اس سے انکو توبہ و استغفار کی ہمت ہوتی ہے اور چند روز تک بار بار توبہ و استغفار کرنے سے ان کی تسلّی ہو جاتی ہے کہ انشاء اللہ وہ گناہ معاف ہو گیا خوب سمجھ لو اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ مخالفین اسلام نے جو اس تعلیم پر اعتراض کیا ہے کہ یہ تعلیم جرائم پر جری کرنے والی ہے یہ ان کی غلطی ہے جس کا منشا قلت تدبر ہے اگر وہ غور کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ تعلیم نہ ہوتی تو ایک دفعہ جس سے گناہ ہو جاتا وہ عمر بھر جرائم ہی میں گرفتار رہتا ایک دفعہ یا چند دفعہ خطا ہو جانے کے بعد نیکی اور تقویٰ و صلاح کی طرف واپس لانے والا یہی عقیدہ ہے جس پر وہ اعتراض کر رہے ہیں۔

پس یہ عقیدہ تو مخلوق کے دلوں میں خدا کی محبت بڑھانے والا ہے جس سے مخلوق کو اپنے خالق سے تعلق پیدا کرنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے اور جرائم کو کم کرنے والا ہے اور استیصال جرائم کیلئے اس کی ساتھ دوسرا عقیدہ یہ ہے ان اللہ شدید العقاب کہ خدا کا عذاب بہت سخت ہے اسی لئے قرآن میں جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا ذکر ہے وہاں ساتھ ہی سطوت و شدت انتقام کا بھی ذکر ہے جس کا ایک نمونہ یہ ارشاد ہے نبئ عبادی انی انا الغفور الرحیم وان عذابی ہو العذاب الالیم اسی طرح کثیر مواقع میں دمخالفین کی فہم پر ہم کو تعجب ہے کہ وہ زبان سے ایسی بات کہتے ہیں جس سے ان کا دل خود راضی نہیں وہ انصاف کیساتھ اپنے دل کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے یقیناً وہ یہی کہے گا کہ میں ایسا پروردگار چاہتا

ہوں جو رحیم و کریم ہو کہ اپنے جان نثاروں کی تقصیر و خطا سے در گذر کرتا ہو باغیوں اور دشمنوں کو سخت سزا دیتا ہو۔ یقیناً نظام عالم کا قیام ایسے ہی بادشاہ سے ہو سکتا ہے جو نہ محض سخت ہو کہ دوست بھی اس سے مطمئن نہ ہوں نہ محض نرم ہو کہ دشمن بھی بے فکر ہو جائیں جب یہ عقلی قاعدہ اور مسلم مسئلہ ہے تو اسلام اسی کے موافق تعلیم کرتا ہے تو اعتراض کیوں کیا جاتا ہے ۱۲ جامع) غرض نفس کی شہوت وغیرہ بعض دفعہ عقائد صحیحہ سے مخالف کام لینے لگتی ہے اس لئے ایسی چیز کی بھی ضرورت ہے جو اس مانع کا مقابلہ کرے اور وہ مجاہدہ ہے کیونکہ ان سب موانع کا حاصل یہ ہے کہ نفس لذت و آرام چاہتا ہے والعلاج بالضد پس اس کا علاج یہی ہے کہ نفس کو مشقت و تعب کا عادی بنایا جائے۔ اور یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے اب لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو محض اصلاح عقائد کو اصلاحِ عمل کے لئے کافی سمجھتے ہیں انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ عقیدہ کے مزاحم بعض موانع ہوتے ہیں اس لئے ایسی چیز کی بھی ضرورت ہے جس سے یہ موانع دور ہوں ورنہ وہ حالت ہو گی ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

علمی مشقت

تو دیکھئے ایسی ضروری چیز اور لوگ اس سے بالکل غافل ہیں جو لوگ اعمال میں کوشاں بھی ہیں وہ بھی یوں چاہتے ہیں کہ بدون مشقت کے کام ہو جائے یعنی جنکو دین کا شوق بھی ہے وہ بھی مشقت سے گھبراتے ہیں تو یہ لوگ حقیقت میں طالب نہیں بلکہ ہوسناک

ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ طالب دنیا کو تحصیل دنیا میں جس قدر مشقت ہوتی ہے اتنی مشقت و پریشانی دین میں نہیں ہوتی دوڑ دھوپ اور جسمانی تکالیف تو الگ رہیں طالب دنیا کو قلبی تشویش اور پریشانی بھی بہت ہوتی ہے اور طالب دین کو جسمانی مشقت بھی طالب دنیا کی برابر ہرگز نہیں ہوتی باقی قلبی تشویش و پریشانی تو اسکے پاس بھی نہیں پھٹکتی یہ اور بات ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے آخرت وجہنم کی اس کو دہشت ہوتی ہے مگر پریشانی نہیں ہوتی۔ پس طالب دنیا اور طالب دین کے اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اب دونوں کی طلب کو دیکھو تو دنیا والے باوجود اسقدر دوڑ دھوپ اور پریشانی کے یوں کہتے ہیں ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید   یا تن رسد بجاناں یا جان زتن برآید

جب وہ دنیا کے کام میں اس قدر مشقت برداشت کرتے ہیں تو خدا کے کام میں اگر کسی کو خدا کی محبت ہے یہ درخواست کیوں ہے کہ سارا کام بدون مشقت کے ہو جائے

نظر بد مثلاً بعض لوگ نظر بد کے گناہ میں مبتلا ہیں جب ان سے کہا جاتا ہے کہ نگاہ نیچی رکھو اور مت دیکھو کیوں کہ دیکھنا اختیاری امر ہے اس کا ترک بھی اختیاری ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نظر کے روکنے پر قادر نہیں مگر واللہ یہ جواب بالکل غلط ہے یہ شخص قادر ضرور ہے مگر وہ مشقت سے گھبراتا ہے اور یوں چاہتا ہے کہ بدون مشقت کے قادر ہو جاؤں اس کے نزدیک قدرت کے معنی یہی ہیں کہ بدون مشقت

کے آسانی سے کام ہو جائے سو اس معنی کو واقعی قادر نہیں مگر ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی یوں چاہے کہ بدون منہ میں لقمہ دئے کھانا کھالوں اور جب اس طرح پیٹ نہ بھرے تو کہنے لگے کہ کھانا بہت مشکل ہے ہاتھ ہلاؤ روٹی تک لے جاؤ اس کو توڑو پھر لقمہ بناؤ منہ میں دو پھر چباؤ پھر نگلو۔ اگر اسی کا نام دشواری ہے کہ کچھ بھی نہ کرنا پڑے تو واقعی نظر بد سے بچنا دشوار ہے اور تم اس کے روکنے پر قادر نہیں مگر اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے کوئی عاقل اسکو تسلیم نہیں کر سکتا کہ قدرت علی العمل کے معنی یہ ہیں کہ اس میں اصلا مشقت نہ ہو اور عجز عن العمل کے معنی یہ ہیں کہ اس میں کسی قدر مشقت ہو جب یہ معنی مسلم نہیں تو وہ لوگ جو اپنے کو غض بصر سے عاجز کہتے ہیں غور کریں کہ ایسی حماقت میں مبتلا ہیں انہوں نے قدرت و عجز کی حقیقت ہی غلط سمجھ رکھی ہے ورنہ یہ لفظ کبھی زبان پر نہ لاتے کہ ہم غض بصر پر قادر نہیں۔ غرض لوگ یوں چاہتے ہیں کہ بغیر مشقت کے نظر بد کو روک لیں سو قرآن میں اس کا ذمہ کہاں ہے وہاں تو مطلق حکم ہے قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم (مسلمانوں کو حکم دیدیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں) یعنی خواہ تکلیف ہو یا نہ ہو مشقت ہو یا نہ ہو کچھ پرواہ نہیں ان کو ہر حال میں غض بصر کرنا چاہیئے بلکہ اگر غور کیا جائے تو خود اس آیت کا مطلب یہی ہے کہ باوجود مشقت کے غض بصر کرنا چاہیئے۔ اور اس مشقت کو برداشت کرنا چاہیئے۔

طبعی تقاضا

یہ بات اہل علم کے سمجھنے کی ہے کہ قرآن کی تعلیم کا اکثر طرز یہ ہے کہ ممنوعات میں انہی چیزوں سے صراحۃً منع کیا گیا ہے جن سے تقاضا طبیعت الانسانیہ کو خود نفرت ہے اس سے صراحۃً منع نہیں کیا گیا چنانچہ اکل ربوا سے شراب پینے سے منع کیا گیا ہے مگر پیشاب پاخانہ کھانے سے منع نہیں کیا گیا کیونکہ اُس کا تقاضا تھا اس کا تقاضا نہ تھا ایک مقدمہ تو یہ ہوا اب دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ یہ ملاؤ کہ جس چیز کا تقاضا طبیعت میں ہو اس سے رکنا مشقت و دشواری کا سبب ہے یہ مقدمہ عقلی اور بدیہی ہے اب سمجھئے کہ جب قرآن میں نظر بد سے منع کیا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ طبائع میں اس کا تقاضا ہے اور جس کا طبیعت میں ہو اس سے روکنا سبب مشقت ہے تو آیت کا تو خود یہی مطلب ہوا کہ باوجود مشقت کے اس گناہ سے بچو مگر آجکل کے دیندار یوں چاہتے ہیں کہ بغیر مشقت کے سب کچھ ہو جائے اسی کی میں شکایت کر رہا تھا کہ یہ کیسی طلب دین ہے جس میں راحت کی طلب ہے حالانکہ طالب دنیا ذراسی مردار دنیا کیلئے جان و دل سے مرتے کھپتے رہتے ہیں اور طالب دین کو بغیر مشقت کے حصول دین و اصلاح اعمال کا انتظار ہو رہا ہے افسوس ؎

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

بلا مشقت اصلاح

صاحبو! اگر آپ اسی انتظار میں رہیں گے کہ بدون مشقت کے اعمال کی اصلاح ہو تو یہ شہوات نفسانیہ دل میں اپنی جڑیں ایسی مضبوط کر لیں گی کہ پھر واقعی اس کی اصلاح میں

سخت مشقت کی ضرورت ہوگی کیونکہ ان شہوات سے جس قدر مسامحت و مساہلت کی جاتی ہے اسی قدر ان کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت لوگ اسی کے منتظر ہیں کہ کسی بزرگ کی توجہ سے ہماری اصلاح ہو جائے یا وظیفہ سے یا تعویذ سے نفس مہذب ہو جائے حاصل یہ کہ خود کچھ کرنا نہ پڑے۔ یاد رکھو یہ سخت غلطی ہے نفس تمہارا راہ مار رہا ہے اور یہ شیطان کی بڑی رہ زنی ہے نفس کی اصلاح بدون مجاہدہ کے نہیں ہو سکتی توجہ اور وظیفہ سے اصلاح شدہ نفس کی نورانیت میں ترقی ہو جاتی ہے آگے کو راہ مفتوح ہو جاتا ہے رذائل کی اصلاح تھوڑا ہی ہوتی ہے الا نادر ادالنادر کالمعدوم۔ اور اس سے بڑھ کر ایک نہایت دقیق اور نہایت عمیق شیطان کی رہ زنی یہ ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ مشقت سے ترک معصیت میں کام لینا خود معصیت کو ترک معصیت کا ذریعہ بناتا ہے یعنی جب کسی متقی کو بار بار نگاہ نیچی کرنے سے مشقت ہوتی ہے تو شیطان اس کو یہ سبق پڑھاتا ہے کہ میاں ایک دفعہ اسکو خوب جی بھر کے دیکھ لو اس سے ہوس پوری ہو جائیگی پھر نہ دیکھنا تو یہ روز روز کا ارہ چلنا تو موقوف ہو جائے گا مگر واللہ اس جی بھر کے گناہ کرنے سے تو اس کی رگیں اور مضبوط ہو جائیں گی۔ پھر اس کا اس گناہ سے نکلنا بہت دشوار ہو جاویگا کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ شہوت کو نظر سے ترقی ہوتی ہے پھر جب جی بھر کے دیکھنے سے بھی آگ نہیں بجھتی تو شیطان یہ سبق پڑھاتا ہے کہ ایک دفعہ جی بھر کے اس سے منہ کالا کر لو پھر توبہ کر لینا۔ اس کے بعد پھر ہر روز یہی ہوتا رہتا ہے کہ آج

توبہ کروں کل توبہ کروں ابھی جی نہیں بھرا اگر اب توبہ کرونگا تو پھر تقاضا ہوگا چنانچہ بعض تو اسی انتظار میں ختم ہوگئے اور توبہ نصیب نہ ہوئی اور بعض کو سالہا سال کے بعد عنایت حق نے سنبھالا تو توبہ کی توفیق ہوئی مگر ذخیرہ گناہوں کا کتنا جمع ہوگیا یہ تو عملی خرابی ہوئی اور اعتقادی خرابی یہ ہے کہ یہ شخص ترک معصیت کا مقدمہ خیال کر کے معصیت کو طاعت سمجھنے لگتا ہے پس یاد رکھو کہ ترک معصیت کیلئے بھی معصیت کا اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں بلکہ ابتدا ہی سے اس معصیت کے تقاضے کا مقابلہ کرنا چاہیئے ؎

درختے کہ اکنوں گرفت ست پائے | بہ نیروی شخصے برآید ز جائے
دگر ہمچناں روزگارے ہلی | بگردونش از بیچ بر نگسلی
سر چشمہ باید گرفتن بہ میل | چو پر شد نہ شاید گذشتن بہ پیل

اور جو شخص ترک معصیت کیلئے اختیار معصیت کو ذریعہ بناتا ہے اس سے بھی یہی غلطی ہوئی کہ اس نے مشقت سے بچنا چاہا مگر ؎

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

خوب سمجھ لو کہ مشقت سے بچنا ہی غلطی ہے۔ مرد

مرد کون ہے؟

ہو کر رہو نامرد نہ بنو۔ اور مرد اسی کا نام ہے جو شیطان کا مقابلہ کرے پھر گناہوں سے بچنے میں مشقت اوّل اوّل ہی ہوتی ہے پھر ذرا مشقت نہیں ہوتی جو اس سے بھی گھبراتے ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ گلستاں پڑھنے سے گھبرائے اس کو سب عقلاً بھی جواب

دیتے ہیں کہ یہ مشقت چند روزہ ہے پھر تم کو گلستاں میں وہ لطف آئے گا
کہ تم اسکو خود نہ چھوڑو گے اور اگر آج ذراسی مشقت سے گھبراوُگے تو
پھر جاہل رہوگے اور اس سے زیادہ مشقت کرنا پڑے گی یعنی پھاوڑہ
چلانا پڑے گا۔ اسی طرح گناہ کے چھوڑنے میں جو ذراسی مشقت ہے اگر
اس سے گھبراوُگے تو اس سے بڑھکر مشقت کا سامنا ہوگا ایک تو اسوقت
جبکہ گناہ کا ارتکاب کروگے کیونکہ گناہ کرنے میں علاوہ عذاب آخرت
کی دنیا میں بھی عذاب ہوتا ہے گناہ سے دونوں جہاں میں تکلیف ہوتی
ہے۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ گناہ کرنے میں کیا مشقت ہے تو صاحبو!
واللہ جو لوگ گناہوں میں مبتلا ہیں وہ سخت مصیبت میں گرفتار ہیں سکون
قلب واطمینان کا انکو خواب بھی نہیں آتا ہر وقت ان کا دل وحشت زدہ
رہتا ہے اور گناہ کرکے اسکو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرا کہیں ٹھکانا نہیں
وہ خود اپنی نظر میں بہت ذلیل ہو جاتا ہے اور جب اسکو کوئی مصیبت
پیش آجاتی ہے۔ اس وقت تو اسکو ایسی پریشانی ہوتی ہے کہ بدحواس
ہوجاتا ہے تو واللہ گناہ کرنے والے بڑی غلطی میں ہیں کہ گناہ سے جو
غرض تھی یعنی مسرت وہ بھی انکو حاصل نہیں ہوتی یہ تو دنیا کی تکلیف
ہے اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے جو بہت سخت ہے مگر بعض
لوگ سیر بھر بوجھ اٹھانیکا تجربہ کرکے من بوجھ اٹھانے کو تیار ہو جاتے
ہیں یہ ان کی حماقت ہے انکی یہ پہلوانی اسی وقت تک ہے جب تک
کبھی من کا بوجھ سر پر رکھا نہیں گیا جسدن بڑا بوجھ سر پر رکھا جائیگا

ان کا کوچ ہی نکل جائیگا ایسے ہی بعض لوگ جہنم کے پہلوان معلوم ہوتے مگر اس کو دیکھا نہیں اسلئے ساری پہلوانی ہے اور جس دن دیکھ لیں گے اس دن یہ حالت ہو گی۔ یوم یعض الظالم علی یدیہ یقول یالیتنی اتخذت مع الرسول سبیلاہ یا ویلتا لیتنی لم اتخذ فلانا خلیلاہ لقد اضلنی عن الذکر بعد اذ جاءنی وکان الشیطان للانسان خذولاہ

علاج امراضِ باطنہ

بس امراض باطنہ کے بھی علاج کا وہی طریقہ ہے جو امراض جسمانیہ کا ہے کہ جب مرض لاحق ہو اسی وقت اس سے دُور رہنے اور بچنے کی تدبیر کرو اسکو لپٹانے کا بھی نام نہ لو اور گو گناہ سے بچنے میں کسی قدر مشقت ہوتی ہے مگر وہ تھوڑی دیر کی مشقت ہے پھر راحت ہی راحت ہو گی مثلاً کسی کو حسن پرستی کا مرض ہو تو اسکو چاہیئے کہ حسین سے باتیں کرنا ملنا ملانا اسکو گھورنا بالکل چھوڑ دے کہ یہ سخت مضر ہے گو اس وقت ٹھنڈک پہونچتی ہے مگر اس کے بعد جڑ مضبوط ہو جاتی ہے اور عمر بھر کی مصیبت جان کو لگ جاتی ہے چونکہ اس وقت مجھے زیادہ تر فروغ ہی کا بیان مدِنظر ہے اسلئے چند فروغ مجاہدہ کی اور بھی بیان کرتا ہوں مثلاً غضب کے روکنے میں بعض وقت تکلیف ہوتی ہے اور یہ مجاہدہ ہے مگر اس کے بعد ایک خاص فرحت وراحت ہوتی ہے اور اگر غصّہ کو نہ روکا گیا بلکہ جو زبان پہ آیا کہتا گیا تو اسوقت تو نفس خوش ہوتا ہے مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد دل میں کدورت ہوتی ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ یہی نفس جو پہلے بھکا رہا تھا بعد میں ملامت کرتا ہے

اور اسکے بعد غصہ کے نتائج بد دیکھکر تو بہت ہی قلق ہوتا ہے گو نفس ان کی تاویلات بھی کرے مگر پھر بھی اسکو کدورت ضرور ہوتی ہے تجربہ کرکے دیکھا گیا ہے کہ غصہ روکنا ہمیشہ اچھا ہوا اور جب اسکو جاری کیا گیا تو اس کا انجام ہمیشہ برا ہوا اور دل کو قلق بھی ہمیشہ ہوا جیسے مریض کو طبیب کہتا ہے کہ پرہیز کرو دوا پیو تو اس کو بدپرہیزی سے ہمیشہ ندامت ہوتی ہے کیونکہ بدپرہیزی کا برا انجام بہت دنوں تک رہتا ہے اسی طرح گناہ کرکے ہمیشہ ندامت ہوتی ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ گناہ کے بعد نفس خود اپنے کو ملامت نہ کرے پھر بعضے اس ندامت کے بعد ہمیشہ کیلئے گناہ گناہ سے توبہ کر لیتے ہیں اور بعضے ایک بار توبہ کرکے پھر گناہ کرتے ہیں توبہ کرتے ہیں توبہ تو دل لگی ہو گئی اگرچہ یہ ثابت ہے کہ توبہ اگر سو بار بھی ٹوٹ جائے تب بھی قبول ہو جاتی ہے مگر یہ شرط تو ضروری ہے کہ توبہ کی حقیقت تو پائی جائے مگر اکثر حالت تو یہ ہے کہ جو لوگ ایک گناہ سے بار بار توبہ کرتے ہیں ان کی توبہ صرف زبانی ہوتی ہے ورنہ عین توبہ کے وقت بھی ان کا یہ عزم ہوتا ہے کہ یہ گناہ پھر بھی کریں گے۔ بس اسی کو دل لگی کہہ رہا ہوں۔ اسلئے جب کوئی شخص اعمالِ صالحہ کا قصد کرے یا اصلاحِ نفس کا ارادہ کرے تو وہ اپنے کو اس کام کے لئے پہلے تیار کر لے کہ اول اول مشقت برداشت کرنا اور نفس کی مخالفت کرنا پڑے گی پھر مجاہدہ و مخالفت نفس کے مراتب مختلف ہیں ایک مرتبہ مبتدی کے مجاہدہ کا ہے ایک منتہی کے مجاہدہ کا ہے۔ مبتدی کو تو مجاہدہ

میں اول اول دشواری زیادہ ہوتی ہے اور منتہی چونکہ اپنے نفس کو مہذب کر چکا ہے اس سے اعمال صالحہ بلا تکلف صادر ہونے لگتے ہیں۔

نگرانیٔ نفس مگر ایک مجاہدہ کی ان کو بھی ضرورت ہے یعنی نفس کی نگہداشت کی کہ ہر وقت اس کے افعال و حرکات پر نگاہ رکھے غافل نہ ہو اور یہ مجاہدہ کچھ زیادہ دشوار نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تو وہ سوار ہے جسکے نیچے ایسا گھوڑا ہے جس پر ابھی سواری شروع کی گئی ہے اسکو زیادہ ہوشیاری کی بھی ضرورت ہے اور زیادہ مشقت کا بھی سامنا ہے کیونکہ نیا گھوڑا بہت شرارت کرتا ہے اور قابو سے باہر ہو جاتا ہے دوسرا وہ شخص ہے جو ایسے گھوڑے پر سوار ہے جو سواری میں شائستہ ہو چکا ہے اس کو زیادہ مشقت کا تو سامنا نہیں مگر ہوشیار بیٹھنے کی اسکو بھی ضرورت ہے، کیونکہ شائستہ گھوڑا بھی کبھی کبھی بمقتضائے حیوانیت شوخی کرنے لگتا ہے مگر وہ شوخی ایسی ہوتی ہے کہ سوار کی ذراسی دھمکی اس کے دفع کرنے کو کافی ہے لیکن اگر سوار بالکل غافل رہا تو کسی وقت یہ شائستہ گھوڑے کے اوپر سے بھی ضرور گرے گا۔ پس نفس کی نگہداشت کا مجاہدہ منتہی کو بھی لازم ہے۔

فطرتِ نفس اب یہاں سے میں سالکین کی ایک غلطی پر تنبیہ کرتا ہوں وہ یہ کہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ بعض دفعہ مہذب نفس بھی شوخی شرارت کرنے لگتا ہے سو بعض لوگوں کو یہ حقیقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے نفس میں کوئی برا میلان دیکھکر بڑے گھبراتے ہیں

کیونکہ ان کے ذہن میں یہ جم گیا ہے کہ مجاہدہ سے اخلاق رذیلہ بالکل زائل ہو جاتے ہیں اور منشا اس خیال کا یہ ہے کہ اکثر وسط طریق میں وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ تقاضائے معاصی گویا بالکل نہیں رہا حالانکہ اخلاق طبعیہ مجاہدہ سے زائل نہیں ہوتے بلکہ مغلوب و مضمحل ہو جاتے ہیں اور اکثر سلوک کے وسط میں غلبہ حالات و کیفیات کی وجہ سے بہت زیادہ مغلوب و مضمحل ہو جاتے ہیں اس طرح کہ زائل معلوم ہونے لگتے ہیں پھر انتہا میں جب غلبہ حالات کم ہو جاتا ہے اور تمکین حاصل ہوتی ہے تو اخلاق طبعیہ پھر ابھرتے ہیں اس وقت سالک گھبراتا ہے اور رنج کرتا ہے کہ افسوس ہنوز روز اوّل ہی ہے میرا تو سارا مجاہدہ ہی بیکار گیا نفس تو اسی حالت میں ہے جس حالت میں پہلے تھا اور یہ رنج اس لئے مضر ہے کہ اس کے اس رنج و غم سے شیطان کو راہ ملتا ہے کہ وہ اسکو تعطل کی طرف لے جاتا ہے اور اس حالت میں اس شخص میں شکستگی بھی بیحد ہو جاتی ہے کہ بات بات میں کہتا ہے کہ میں کسی قابل نہیں ہوں اور ظاہر میں تو یہ تواضع ہے مگر اس میں رنگ شکایت کا ہے گویا خدا تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو بھلا کر یہ سمجھتا ہے کہ جب میرے اندر گناہ کا تقاضا موجود ہے تو اب میرے پاس کوئی نعمت نہیں حالانکہ یہ سخت ناشکری ہے پھر اس سے بڑھکر یہ کہ یہ شخص اپنی تمام ریاضات گذشتہ کو یاد کر کے اپنے دل میں یوں کہتا ہے کہ میں بڑا بدقسمت ہوں کہ اتنی محنت کے بعد بھی مجھے ناکامی ہی رہی بس اب میرے واسطے کیا رہا

کچھ نہیں۔ اور بعض اوقات یہ شخص اپنی کامیابی سے مایوس ہو کر نفس کو بالکل آزادی دیدیتا ہے کہ جب مجاہدات کے بعد بھی ناکامی ہی ہے تو نفس کو مصیبت میں کیوں ڈالا یہ شخص اس غلطی میں اسلئے مبتلا ہوا کہ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں مجاہدہ کر کے تقاضائے گناہ سے بھی معصوم ہو گیا اور اب میرے اندر سے اخلاق رذیلہ بالکل نکل گئے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کشاکشی ہمیشہ رہتی ہے ہاں بتدی جیسی نہیں رہتی اسلئے میں کہتا ہوں کہ اعمال صالحہ کا جب قصد کرے تو اوّل ہی نفس کو یہ سمجھا لے کہ ان اعمال میں مشقت ہمیشہ رہے گی اور عمر بھر مجاہدہ کرنا ہو گا۔ اور یہاں سے آپ کو معلوم ہوا ہو گا کہ شیخ کتنی بڑی نعمت ہے کہ وہ کیسے کیسے عقبات سے سالک کو نکالتا ہے اور اس کا عقبات سے نکالنا یہی ہے کہ وہ حقائق صحیحہ پر مطلع کرنا اور غلط اعتقادات سے بچانا ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دلا | دامن رہبر بگیر و پس برآ
بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق | عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

اور فرماتے ہیں ؎

صد ہزاران دام و دانہ ست اے خدا | ما چو مرغان حریص بے نوا
بے عنایاتِ حق و خاصان حق | گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

خدا کے خاص بندوں کی کسی پر عنایت ہو جائے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ بہر حال خوب سمجھ لو کہ اعمال صالحہ میں مشقت ہمیشہ رہتی ہے کیونکہ

وہ اعمال نفس کی خواہش کے خلاف ہیں نفس ان میں منازعت ضرور کرتا ہے قلیل یا کثیر اسلئے مخالفت نفس کی عمر بھر ضرورت ہے اور یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے۔

کسلِ نماز

یہاں سے بعض واعظین کی غلطی معلوم ہو گئی کہ وہ آیت یعنی واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالی کو مسلمانوں کے حق میں پڑھ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو نماز میں کسل کرے وہ منافق ہے بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو قرآن کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ کسل کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ عمل میں مشقت کا سامنا ہو مگر عقیدہ میں ضعف یا شک نہ ہو تو وہ کسل نہیں ہے جو منافقین کی نشان تھی یہ تو کسل طبعی ہے اور طبعی کسل اعمال شرعیہ میں مخلصین کو بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ اعمال نفس پر گراں ہیں نفس ان میں بعض دفعہ کسل کرنے لگتا ہے اور اعمال شرعیہ میں مشقت کا سامنا ہونا آیت وماجعل علیکم فی الدین من حرج کے خلاف نہیں کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دین فی نفسہ آسان ہے دشوار نہیں یہ اور بات ہے کہ منازعتِ نفس کی وجہ سے اس میں دشواری آجائے کیونکہ یہ ضرور ہے کہ اعمال شرعیہ میں نفس کی خواہشوں کو پامال کیا جاتا اور اس کی مخالفت کی جاتی ہے اور یہ نفس کو ضرور گراں ہے تو اس منازعت وکشاکشی کی وجہ سے دشواری آجانا یسر فی نفسہ کے خلاف نہیں اسی لئے قرآن میں وماجعل علیکم فی الدین من حرج سے پہلے وجاہدو فی اللہ حق جہادہ بھی آیا ہے جس سے معلوم

ہوا کہ دین میں مجاہدہ کی بھی ضرورت ہے پس ایک جز دہی کومت دیکھو دونوں جزوں کو ملاؤ تو حاصل وہی نکلے گا جو میں نے عرض کیا ہے۔

کسل کی قسمیں

اب سنیئے ایک تو طبعی کسل ہے جس کا منشا منازعت نفس ہے یہ منافقین کے ساتھ خاص نہیں اور دوسری اعتقادی کسل ہے کہ اس شخص کو نماز کی فرضیت پر اور خدا اور رسولؐ پر ہی ایمان نہیں ہے محض کسی مصلحت کی وجہ سے نماز پڑھ رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ دل سے نہ پڑھے گا بلکہ بیگار سی ٹالے گا اور کسل کے ساتھ نماز ادا کرے گا یہ کسل منافقین کی شان ہے اور خدا نہ کرے کہ کسی مسلمان کی شان ہو۔ بہرحال اعمال شرعیہ میں مجاہدہ کی ضررت عمر بھر کے لئے ہے مبتدی کو بھی اور منتہی کو بھی اور دونوں کو کبھی نہ کبھی اعمال میں منازعت نفس کی وجہ سے کسل بھی پیش آتا ہے مبتدی کو زیادہ منتہی کو کم اس کسل کے رفع کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے نیز کسی وقت دونوں کا نفس معاصی کا تقاضا کرتا ہے اس کے مقابلہ کے لئے بھی مجاہدہ کی دونوں کو ضرورت ہے۔ تو ایک غلطی تو مبتدی کرتا ہے کہ وہ اپنے کو مشقت سے بچانا چاہتا ہے اور مجاہدہ کرتا ہی نہیں بلکہ اسی انتظار میں ہے کہ سارا کام بدون مشقت کے ہو جائے اور ایک غلطی منتہی کرتا ہے کہ وہ ابتدا میں مجاہدہ کر کے آئندہ کیلئے مجاہدہ سے اپنے کو مستغنی سمجھتا ہے اور یہ سخت غلطی ہے کیونکہ طبائع بشریہ پھر عود کرتے ہیں اور اسوقت منتہی کو بھی معاصی کا تقاضا ہوتا ہے اور اس کا نفس بھی طاعات

ہیں بعض دفعہ کسل کرنے لگتا ہے اس وقت اس کو بھی مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے مگر مبتدی اور منتہی کے مجاہدہ میں بڑا فرق ہے جس کی مثال اوپر گذر چکی ہے کہ جیسے ایک شخص تو شائستہ گھوڑے پر سوار ہو اور ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس پر آج ہی سواری کی گئی ہے۔ شائستہ گھوڑے کے سوار کو بھی ہوشیار بیٹھنے کی ضرورت ہے کیونکہ شائستہ گھوڑا بھی کبھی شوخی شرارت کرنے لگتا ہے مگر اس کے دبانے میں اس قدر مشقت نہیں ہوتی جسقدر نئے گھوڑے کے دبانے میں ہوتی ہے اس لئے منتہی کا اپنے گذشتہ مجاہدہ و ریاضت کو بیکار و بے سود سمجھنا بھی غلط ہے اور آئندہ کے لئے بھی وہ مجاہدہ سے مستغنی نہیں اور اعمال صالحہ کا کرنا کسی وقت بھی مشقت سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ فروع میں اس کی ایک اور مثال یاد آئی مثلاً کسی شخص کے اندر کبر ہے تو اس کے دو علاج ہیں ایک علمی اور ایک عملی۔ علاج تو مثلاً یہ ہے کہ اپنے عیوب کو سوچا کرے اور یوں سمجھے کہ مجھے اپنے عیوب کا یقین کے ساتھ علم ہے اور دوسروں کے عیوب کا ظن کے ساتھ علم ہے اور جو شخص یقینی معیوب ہو وہ معیوب ظنی سے بدتر ہے اسلئے مجھے اپنے کو سب سے کم تر سمجھنا چاہیئے اور عملی علاج یہ ہے کہ جسکو تم اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہو اسکے ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آؤ اور یہ عملی علاج جزو اعظم ہے بدون اسکے علمی علاج تنہا کافی نہیں مگر اس کا بجالانا دشوار ضرور ہے۔ ہر شخص سے آسان نہیں مگر تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ

جب تک یہ عملی علاج نہ کیا جائے گا تکبر دور نہ ہو گا۔ ایسے ہی حسد کا علاج یہ ہے کہ جس سے حسد ہو اسکے لئے ترقی خیر کی خوب دُعا کیا کرے اور اسکے ساتھ احسان بھی کرتا رہے چند دن میں حسد دور ہو جائیگا مگر یہ بات آسان نہیں گو فی نفسہ یہ سب اعمال آسان ہیں مگر نفس کی منازعت کی وجہ سے دشوار ہو رہے ہیں۔ مگر ان میں دشواری اول اول ہی ہے کیونکہ نفس کی کشاکشی ابتدا میں زیادہ ہوتی ہے پھر زیادہ منازعت نہیں رہتی مگر ایک دو مرتبہ عملی علاج کر کے بے فکر نہ ہونا چاہیئے بلکہ اسکو مدت دراز تک جس کو شیخ محقق تجویز کرے کرنا چاہیئے کیونکہ ایک دو دفعہ سے مرض کی جڑ نہیں جاتی اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے　　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

غرض یہ طریقہ ہے اعمال کی اصلاح کا اور باطن کی اصلاح کا کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جائے اور اسکو مشقت کا عادی بنایا جائے مگر آجکل لوگوں سے مشقت تو ہوتی نہیں یوں چاہتے ہیں کہ ہمارے آرام میں بھی خلل نہ آوے اور اعمال کی بھی اصلاح ہو جائے باطن کی بھی اصلاح ہو جائے۔

اصلاحِ نفس

ایک شخص مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے ایسا وظیفہ بتلا دو جس سے نماز قضا نہ ہو میں نے کہا کہ اگر وظیفہ قضا ہونے لگا تو اس کے واسطے دوسرا وظیفہ پڑھو گے پھر اس کے واسطے تیسرا یہ تو سلسلہ غیر تناہی چلے گا اس کا علاج تو یہ ہے کہ جسدن نماز

قضا ہو اس دن بھوکے رہو یا ہم ۸ ر صدقہ کرو اور یہ صدقہ نہ تو اتنا زیادہ ہو جس کا تحمل نہ ہو نہ اتنا کم ہو جس کی نفس کو خبر بھی نہ ہو بلکہ درمیانی درجہ کا ہو جس سے نفس پر کسی قدر گرانی ہو اور اس سے کہدو کہ جب تو نماز قضا کرے گا میں تجھ بھی سزا دوں گا۔ اور یہ علاج میں نے یا صوفیہ نے اپنی طرف سے اختراع نہیں کیا بلکہ نصوص سنت میں اس کی اصل موجود ہے حدیث میں ہے من قال تعال اقامرک فلیتصدق یعنی جس کی زبان یعنی جس کی زبان سے یہ کلمہ نکل جائے کہ آؤ جوا کھیلیں وہ صدقہ کرے اسی طرح حیض کے زمانہ میں غلطی سے جماع ہو جائے تو وہاں بھی صدقہ کا حکم ہے ابتدائے حیض میں ایک دینار اور آخر میں نصف دینار۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ صدقہ کرنے سے نفس پر زیادہ مشقت پڑتی ہے وہ اس سے بچنے کے لئے تھوڑی مشقت کو برداشت کر لیتا ہے اور یہ کام اس سے چھوٹ جاتے ہیں تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مواقع کیلئے کوئی وظیفہ نہیں تبلایا بلکہ ایسا علاج تبلایا جس میں نفس کو مشقت ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ اصلاح نفس کا طریقہ مجاہدہ ہی ہے وظیفوں سے اصلاح نہیں ہوا کرتی۔ شاید طلبہ کو یہاں یہ شبہ ہو کہ امام ابو حنیفہ رح تو غرامت مالیہ کو ناجائز فرماتے ہیں پھر تم یہ جرمانہ کیونکر تبلاتے ہو۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اپنے اوپر جرمانہ کرنا جائز ہے دوسروں پر جائز نہیں اور ہم بھی تو تعلیم کرتے ہیں کہ جب عمل میں کوتاہی ہو تم خود اپنے اوپر جرمانہ کیا کرو یہ تو نہیں کہتے کہ مریدوں سے

کوتاہی ہو تو ان پر جرمانہ کرکے تم وصول کیا کرو اگر کوئی شیخ ایسا کرے تو بے شک ناجائز کا مرتکب ہوگا۔

فضولیاتِ مستورات

یہ تو وہ امراض تھے جو مردوں اور عورتوں میں مشترک تھے اب میں بعض ان امراض کا علاج بتلاتا ہوں جو مستورات کے ساتھ خاص ہیں کیونکہ اسوقت مستورات کا مجمع بھی موجود ہے سو مستورات میں ایک مرض یہ ہے کہ جب چند عورتیں جمع ہونگی تو ہمیشہ دنیا کی باتیں کریں گی مرد کبھی جمع ہوتے ہیں تو کبھی خدا اور رسول کی باتیں بھی کر لیتے ہیں مگر عورتوں کے مجمع میں خدا اور رسول کی باتیں کبھی سننے میں نہیں آتیں بلکہ ان کی تمامتر گفتگو زیور کپڑے روپے پیسے کے متعلق ہوتی ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان میں زیور کی محبت اور لباس کی محبت زیادہ ہے اس کا علاج یہ ہے کہ زیور کا استعمال کم کر دیا جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ اپنے گھر میں استعمال کم کر دو کیونکہ اپنے گھر میں تو عموماً عورتیں زیور پہنتی ہی نہیں اور لباس بھی معمولی ہی پہنتی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کسی دوسرے کے جاؤ تو زیور کم پہنکر جاؤ اور لباس بھی معمولی پہنکر جاؤ باقی سارے زیور کو اور قیمتی جوڑوں کو اپنے گھر میں پہنو کیونکہ شریعت نے عورتوں کو چاندی سونے کا زیور اور ریشم کا کپڑا صرف اسی لئے حلال کیا ہے تاکہ وہ شوہر کے سامنے اس سے زینت کر سکیں تو ان کے استعمال کا اصلی محل اپنا ہی گھر ہے مگر اب عورتوں نے اس تعلیم کے خلاف یہ وطیرہ اختیار کیا

ہے کہ شوہر کے سامنے تو معمولی حالت میں رہیں گی اور دوسرے گھر بن ٹھنکر جائیں گی تو یہ عمل خلاف شریعت بھی ہے اور اس سے زیور و لباس کی محبت بھی بڑھتی ہے اسلئے عورتوں کو شریعت کی اصل تعلیم پر عمل کرنا چاہیئے کہ اپنے گھر میں سب زیور لباس پہنا کریں اور دوسرے گھر میں معمولی زیور و لباس پہنکر جایا کریں اس سے زیور و لباس کی محبت ان کے دل سے کم ہو جائے گی اور سب سے بڑا مجاہدہ یہ ہے کہ شادی اور دوسری تقریبات کے موقعہ پر سادے کپڑے اور سادا زیور پہنکر جایا کریں۔ اصلاح تو اسی طرح ہو گی بغیر اس کے کتابیں پڑھنے اور وعظ سننے سے کچھ نہ ہو گا۔ رہا یہ کہ یہ تو بہت دشوار ہے دل پر آرہ چل جائے گا کہ بھری برادری میں سب تو اچھے زیور عمدہ لباس سے آئیں اور ہم سادے لباس معمولی زیور میں ہوں تو صاحبو! دنیا کا بھی تو کوئی کام بدون محنت کے نہیں ہوتا اسے اللہ دینداری ایسی سستی کیوں ہے کہ لوگ دیندار بدون محنت کے بننا چاہتے ہیں۔ ؎

ناز پروردہ تنعم نہ برد راہ بدوست
عاشقی شیوہ رندان بلاکش باشد

مگر اِیہ مطلب بھی نہیں کہ اتنی محنت کرو جس سے نفس تھک جائے بعضے اہل مجاہدہ ایسے بھی ہیں چنانچہ ہمارے ساتھ سفر حج میں جہاز میں ایک شخص تھے وہ کئی کئی دن تک کچھ نہ کھاتے اور جب کھانے بیٹھتے تو کئی دن کی خوراک ایک ہی وقت میں کھا جاتے لوگوں نے

ان سے کہا کہ یہ کیا واہیات ہے کہ ایک وقت میں تم کئی دن کی خوراک کھا جاتے ہو کہا میں مجاہدہ کرتا ہوں کیونکہ مجاہدہ کی ایک قسم تو ترک اکل ہے اور ایک قسم اکثار اکل بھی ہے کہ اتنا کھائے کہ نفس پریشان ہو جائے کیونکہ مجاہدہ سے مقصود نفس کو پریشان کرنا ہے اور وہ جس طرح ترک طعام سے پریشان ہوتا ہے بہت کھانے سے بھی پریشان ہوتا ہے سو یہ قول غلط ہے مجاہدہ سے مقصود نفس کو پریشان کرنا نہیں ہے بلکہ نفس کو مشقت کا خوگر بنانا اور راحت و تنعم کی عادت سے نکالنا ہے اور اس کے لئے اتنا مجاہدہ کافی ہے جس سے نفس پر کسی قدر مشقت پڑے بہت زیادہ نفس کو پریشان کرنا اچھا نہیں ورنہ وہ بالکل معطل ہو جائے گا تو خوب سمجھ لو کہ محنت ہمیشہ مستحسن نہیں بلکہ جب اعتدال سے ہو اور اس پر نتیجہ اچھا مرتب ہو اسی وقت مستحسن ہے اس پر مجھے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ یاد آیا کہ آپ نے ایک مدرس کو مدرسہ سے الگ کرنا چاہا اور مہتمم صاحب نے ان کی سفارش کی کہ یہ محنتی بہت ہیں تو مولانا نے فرمایا کہ اگر محنت ہی مطلوب ہے تو مجھے چالیس روپے تنخواہ دیکر مدرس اول کیوں بنایا بلکہ ایک پسنہاری کو چکی دیکر درسگاہ میں بٹھلا دو وہ مجھ سے زیادہ محنت کرے گی اور مزدوری صرف دو آنہ لیگی۔ پس مجاہدہ میں افراط بھی مذموم ہے بلکہ اعتدال کی رعایت لازم ہے اسی کو شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

نہ چنداں بخور کز دہانت بر آید
نہ چنداں کہ از ضعف جانت بر آید

اعتدالِ مجاہدہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک قواماً ہ یعنی خدا کے خاص بندے وہ ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ وہ خرچ کے درمیان میں معتدل ہوتا ہے پس مجاہدہ میں بھی اعتدال کی رعایت کرنا چاہیئے۔ مگر اس اعتدال کو بھی آپ اپنی رائے سے تجویز نہ کیجئے کیونکہ بیمار کی رائے بیمار ہوتی ہے اس طریق میں اپنی رائے سے کامیابی نہیں ہوتی ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست کفرست دریں مذہب خودبینی و خودرائی

بلکہ کسی محقق سے درجۂ اعتدال معلوم کیجئے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں علمائے قوانین ظاہرہ و باطنہ پیدا کئے ہیں ان سے رجوع کرو اور ان سے طریق مجاہدہ معلوم کرو۔ پھر جیسے طالبانِ عمل میں دو فرقے ہیں ایک وہ جو محنت سے بچنا چاہتے ہیں دوسرے وہ جو محنت میں غلو کرتے ہیں اسی طرح طالبان علم میں بھی دو فرقے ہیں ایک وہ جو یوں چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا بھی نہ پڑے اور عالم ہو جائیں اس کی ترکیب انہوں نے یہ نکالی کہ مدرسہ میں داخل ہو کر کسی جماعت میں شریک ہو گئے اور کبھی کبھی درس میں بھی شریک ہو گئے پھر دس دن بارہ دن کو غائب ہو گئے نہ مطالعہ ہے نہ تکرار ہے نہ سبق کے وقت توجہ ہے جماعت نے کتاب ختم کر لی تو ان کی بھی ختم ہو گئی وہ درسیات سے فارغ ہو گئی تو یہ بھی فارغ کہلانے لگے گو واقع میں بالکل ہی فارغ ہوں یعنی کورے تو باد

رکھو اس طرح علم نہیں آیا کرتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسوں ہی کے واسطے فرمایا ہے ؎

لو کان ہذا العلم یدرک بالمنی | ماکان یبقی فی البریۃ جاھل
فاجہد ولا تکسل ولا تک غافلا | فندامۃ العقبی لمن تیر کاسل

اور بعضے محنت میں افراط کرتے ہیں کہ اتنی محنت کرتے ہیں کہ دماغ بھی خراب ہو جائے۔ افراط تفریط دونوں بُرے ہیں۔ شریعت کو ہر شے میں اعتدال مطلوب ہے، اہل مجاہدہ کا ایک افراط یہ بھی ہے کہ بعضے تقلیل غذا میں غلو کرتے ہیں بعضے ہاتھ کو سکھاتے ہیں بعضے لباس نہیں پہنتے بلکہ آگ سلگا کر سردی گذارتے ہیں یہ وہ مجاہدے ہیں جو آجکل جوگیوں میں رائج ہیں اور غضب یہ ہے کہ بعضے مسلمان بھی ان مجاہدات کو کمال اور جوگیوں کو باکمال سمجھنے اور ان کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ کچھ کمال نہیں کیونکہ بدن کو مارنے سے کیا ہوتا ہے مطلوب تو وہ مشقت ہے جس سے نفس پر مشقت ہو یہ ضرور ہے کہ مشقت نفس میں بعض دفعہ مشقت جسم کو بھی دخل ہوتا ہے مگر اس میں اعتدال ضروری ہے مثلاً روزہ رکھ لیا جائے اعتکاف کر لیا جائے بس یہ مشقت کافی ہے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ صاحبو! جس طرح طبیب دوا تجویز کر کے اس کی مقدار بھی خود ہی تجویز کرتا ہے اسی طرح آپ کو مجاہدہ کی مقدار بھی شریعت ہی سے معلوم کرنا چاہیئے جبکہ اصل مجاہدہ کو آپ نے شریعت ہی سے معلوم کیا ہے۔

مخالفت نفس

اب یہاں ایک بات اور سمجھئے کہ مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں ایک مجاہدہ جسمانی کہ نفس کو مشقت کا عادی کیا جائے مثلاً نوافل کی تکثیر سے نماز کا عادی کرنا اور روزہ کی کثرت سے حرص طعام وغیرہ کم کرنا اور ایک مجاہدہ بمعنی مخالفت نفس ہے کہ جس وقت نفس معصیت پر داعی ہو اس وقت اسکے تقاضے کی مخالفت کرنا اصل مقصود یہ دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے اور پہلا مجاہدہ بھی اسی کی تحصیل کے واسطے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہو گا تو اس کو اپنے جذبات کے ضبط کرنے کی بھی عادت ہو گی۔ لیکن اگر کسی کو بدون مجاہدہ جسمانیہ کی مخالفت نفس پر قدرت ہو جائے تو اسکو مجاہدۂ جسمانیہ کی ضرورت نہیں مگر ایسے لوگ شاذو نادر ہیں اسی واسطے صوفیہ نے مجاہدۂ جسمانیہ کا بھی اہتمام کیا ہے اور ان کے نزدیک اسی کے چار ارکان ہیں ترکِ طعام۔ ترک کلام۔ ترک منام۔ و ترک اختلاط مع الانام اور ترک سے مراد تقلیل ہے ترک کلی مراد نہیں۔ جو شخص ان ارکان اربعہ کا عادی ہو جائے گا واقعی وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو جائے گا کہ تقاضائے معصیت کو ضبط کر سکے گا مگر میرا مقصود اسوقت مجاہدہ جسمانیہ کا بیان کرنا نہیں ہے بلکہ مجاہدۂ نفسانیہ کا بیان مقصود ہے کہ گناہ کے وقت نفس کو روکو اور اس میں جو مشقت لاحق ہوتی ہے اسکو برداشت کرنا چاہیئے کیونکہ بدونِ مشقت کے کوئی کام نہیں ہو سکتا نہ دنیا کا نہ دین کا۔ یہ ہے

وہ مسئلہ جس کی ضرورت تھی اور لوگ اس سے غافل ہیں یعنی مخالفت نفس کہ جب نفس گناہ کا تقاضا کرے اس کی مخالفت کرو۔ اور یہ بات اس وقت آپ کو حاصل ہو گی جبکہ نفس کی جائز خواہشوں کی بھی مخالفت کیا کرو۔ مثلاً کسی لذیذ چیز کو جی چاہا تو فوراً اس کی خواہش کو پورا نہ کیا جائے بلکہ اس کی درخواست کو رد کر دیا جائے دس دفعہ میں سے ایک دفعہ اس کی جائز خواہش پوری کر دی اور نو دفعہ ٹال دی جب مباحات میں تم مخالفت نفس کے عادی ہو گے اس وقت معاصی کے تقاضے کی مخالفت پر آسانی سے قادر ہو گے اور جو شخص مباحات میں نفس کو بالکل آزاد رکھتا ہے وہ بعض اوقات تقاضائے معصیت کے وقت اسکو نہیں دبا سکتا تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے یہاں سے معلوم ہوا کہ صوفیہ نے جو ارکان اربعہ مجاہدہ کے تجویز کئے ہیں اس میں انہوں نے ابتداع نہیں کیا اول تو احادیث میں غور کرنے سے ہر رکن کی اصل مل سکتی ہے دوسرے انہوں نے تسہیل مخالفت نفس عند ارادۃ المعصیۃ کیلئے یہ نوع مجاہدہ کی بطور تدبیر کے تجویز کی ہے تدبیر میں نصوص کی بھی حاجت نہیں البتہ نصوص کے خلاف نہ ہونا چاہیئے خلاصہ یہ کہ لوگوں نے جو یہ سمجھ لیا ہے کہ دین کے کاموں میں مشقت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں غلط ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ دین سارا مجاہدہ ہی ہے کیونکہ دین نام ہے۔ پابندی کا اور پابندی نفس کو گراں ہے۔ پس بدون مجاہدہ کے دین کامل نہیں ہو سکتا۔

رجاء و امکان

اب میں اس مسئلہ کو ان آیات پر منطبق کرنا چاہتا ہوں جو میں نے شروع میں تلاوت کی ہیں۔ میں نے تین آیتیں تلاوت کی ہیں ایک من کان یرجوا لقاء اللہ فان اجل اللہ لآت و ہوالسمیع العلیم یہ آیت راجع الی العقیدہ ہے ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے ملنے کی امید رکھتے ہیں تو اللہ کا وہ وقت معین ضرور آنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ (ان کے اقوال کو) خوب سنتے اور (ان کے افعال واحوال کو) خوب جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اوپر بعض مسلمانوں کو جو کفار کی ایذاء سے گھبراتے تھے تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ان کو صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائیگا کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی حالانکہ ہم ان سے پہلے مسلمانوں کو بھی آزمائش سے پرکھ چکے ہیں اسکے بعد جملہ معترضہ کے طور پر کفار کو یہ مضمون سنایا گیا ہے کہ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ وہ ہم سے بچکر بھاگ جائیں گے سو ان کی یہ تجویز بہت بیہودہ ہے اس جملہ معترضہ میں کفار کی تنبیہ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک گونہ تسلی بھی کر دی گئی کہ کفار کی یہ ایذائیں چندروزہ ہیں پھر ہم ان کو اچھی طرح پکڑنے والے ہیں اس کے بعد پھر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ملنے کی امید رکھتے ہیں ان کو تو ایسے واقعات سے پریشان نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اللہ کا وہ وقت مقرر ضرور آنے والا ہے (اسوقت سارا غم غلط ہو جائے گا) اور اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں (تو وہ ان کی باتوں کو سنتے اور

کاموں کو جانتے ہیں اس وقت ان کی طاعات قولیہ اور طاعات فعلیہ سب کا اجر دیکر ان کو خوش کریں گے) اس آیت میں رجاء سے مراد اعتقاد جازم ہے مگر اس میں ایک لطیفہ ہے جسکی وجہ سے اعتقاد کو بعنوان رجاء بیان فرمایا وہ یہ کہ آیت مکی ہے جسکے مخاطب کفار بھی ہیں جو قیامت کے معتقد نہ تھے منکر تھے اسلئے اللہ تعالیٰ نے آیت کو رجاء و امکان سے شروع فرمایا جس سے کفار کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کیونکہ استحالہ کی تو اس میں کوئی بات ہی نہیں اور جب ممکن ہے تو ارشاد فرماتے ہیں کہ جسکو لقاء اللہ کا امکان بھی معلوم ہو۔

ہم اسکو تبلاتے ہیں کہ اس کا وقوع بھی ضرور ہونے والا ہے پس ہماری خبر کے بعد اس کے وقوع میں شک نہ کرنا چاہیئے۔

صفاتِ خداوندی

وہو السمیع العلیم یہ صفات یہاں بہت ہی مناسب ہیں کیونکہ ایماں کے دو جزو ہیں ایک تصدیق بالقلب دوسرے اقرار باللسان کیونکہ قدرت کے وقت اقرار باللسان بھی فرض ہے تو ایماں کے بیان میں ان صفات کا ذکر بہت ہی خوشنما ہے تاکہ بندوں کو اطمینان ہو جائے کہ ہمارا ایمان خدا تعالیٰ سے مخفی نہیں رہ سکتا ان کو ضرور اس کا علم ہوتا ہے تصدیق قلبی کو بھی جانتے ہیں اور اقرار لسانی کو بھی سنتے ہیں یہ آیت تو باب العقائد کے متعلق تھی۔ اس کے بعد دوسری منزل مجاہدہ ہے جو تصحیح عقائد سے موخر ہے اور تکمیل اعمال سے مقدم ہے یعنی اعمال کی تحریک تو

عقائد ہی سے ہو جاتی ہے مگر تکمیل اور رسوخ مجاہدہ سے ہوتا ہے اس کا ذکر دوسری آیت میں ہے ومن جاہد فانما یجاہد لنفسہ ان اللہ لغنی عن العلمین یعنی جو شخص کچھ محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی واسطے محنت کرتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ تمام اہل عالم سے بے نیاز ہے (اسکو کسی کی محنت ومجاہدہ کی ضرورت نہیں) میرا مقصود اس جگہ یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اول عقائد کا ذکر فرمایا پھر مجاہدہ کا ذکر اعمال کے ذکر سے جو آئندہ تیسری آیت میں آتا ہے پہلے فرمایا اس کے کچھ تو معنی ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں اور کوئی وجہ ہو میرے ذہن میں اس کی وجہ یہ آئی ہے کہ اس ترتیب سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ عقائد مذکورہ آیت اولی کے صدور اعمال مذکورہ آیت ثالثہ میں مؤثر ضرور ہیں مگر وہ تاثیر بلا واسطہ کمزور ہوتی ہے اور بواسطہ مجاہدہ کے قوی ہو جاتی ہے اس لئے مجاہدہ کے توسط بین العقائد والاعمال ظاہر کرنے کیلئے یہ ترتیب اختیار کی گئی ہے۔

نصیحتِ ناصح

اب آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی مجاہدہ کرتا ہے وہ اپنے واسطے مجاہدہ کرتا ہے یہ جملہ اس واسطے فرمایا کہ نصیحت کا اثر کامل ہو کیونکہ جب نصیحت میں ناصح کی کوئی غرض ہوتی ہے اثر کم ہوتا ہے اور دنیا میں بے غرض نصیحت کرنے والا بجز انبیاء علیہم السلام کے کوئی نہیں مگر انبیاء کی نصیحت تو خدا ہی کی نصیحت ہے وہ تو محض مبلغ سفیر ہیں باقی سب کی کچھ نہ کچھ غرض ہوتی

ہے اسی لئے امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ جیسا شاگرد کو استاد کا ممنون ہونا چاہیئے۔ ایسا ہی استاد کو بھی شاگردوں کا ممنون ہونا چاہیئے کیونکہ شاگرد اگر نہ ہوتے تو استاد کے علوم میں ترقی نہ ہوتی کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ بہت سے علوم استاد کے قلب پر درس کے وقت القا ہوتے ہیں اور یہ شاگرد کی کشش سے ہوتا ہے جیسے بچہ ماں کے پستان چوستا ہے تو دودھ اتر آتا ہے اگر بچہ دودھ پینا چھوڑ دے تو چار دن میں اس کے پستان خشک ہو جائیں اسی طرح ترقی فی العلوم میں شاگردوں کا استاد پر احسان ہے۔ پس دنیا میں جس پر بھی کوئی احسان کرتا ہے محسن الیہ کی طرف سے بھی اس پر کوئی نہ کوئی احسان ضرور ہے بجز حضرت حق کے کہ ان کو کوئی کچھ نفع نہیں پہونچا سکتا نہ ان کے افعال معلل بالاغراض ہیں وہ جس پر جو احسان کرتے ہیں بالکل بے غرض اور سراسر عنایت وکرم ہی ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

من نکردم خلق تا سودے کنم ... بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

اسی لئے یہاں فانما یجاہد لنفسہ پڑھا گیا تاکہ نصیحت کا اثر کامل ہو جائے کہ ہم کو تمہارے اعمال و مجاہدات سے ذرا بھی نفع نہیں جو کچھ نفع ہے سراسر تمہارا ہی ہے پھر مجاہدہ کر کے اپنی ہی ذات پر احسان کرو کسی دوسرے پر احسان نہ کرو ان اللہ لغنی عن العلمین بیشک اللہ تعالیٰ کی ذات اہل عالم سے بے نیاز ہے یہ لفظ ہمارے محاورہ میں خدا تعالیٰ کے متعلق چند مقام پر استعمال کیا جاتا ہے بعض جگہ اس کا استعمال بری طرح

کیا جاتا ہے اس سے احتراز کرنا چاہیئے یعنی جب کوئی جوان موت ہو جاتی ہے جو چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مر گیا ہو تو اس وقت برادری والے تعزیت کو جمع ہوتے ہیں اور میت کی موت کا ذکر ہوتا ہے تو ایک کہتا ہے ہائے ہائے کیسا جوان تھا جوانی چڑھ رہی تھی دوسرا کہتا ہے اجی ابھی اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا عمر نے وفا نہ کی تیسرا کہتا ہے کہ کیسی بے وقت موت ہوئی بچے کیسے ذرا ذرا سے چھوڑ گیا ان کی پرورش کی بڑی دقت ہو گئی چوتھے بوجھ بجگڑ سب کے جواب میں کہتے ہیں میاں اس کی ذات بڑی بے نیاز ہے وہ بے پروا ذات ہے اس موقع پر اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ نعوذ باللہ نعوذ باللہ کارخانہ خداوندی میں بڑا اندھیر ہے مصالح عباد پر مطلق نظر نہیں بس جو جی میں آیا کر دیا جو چاہا حکم دیدیا تو خدائی کیا ہوئی اودھ کی سلطنت یا ان نیا ذنگر کا راج ہو سو یہ کلمہ اس موقع پر تو بہت سخت ہے اسکے تو یہ معنی ہوئے کہ خدا کو کسی پر رحم نہیں حالانکہ قرآن خدا کی رحمت کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ غرض یہ معنی میں نے اسلئے بیان کر دیئے تاکہ کوئی آیت میں لفظ غنی کو اس معنی پر محمول نہ کرے بلکہ قرآن میں غنی کو دو معنی میں استعمال کیا گیا ہے ایک یہ کہ خدا کو تمہارے عمل صالح سے کوئی نفع نہیں یہاں یہی معنی ہیں دوسرے یہ کہ خدا کا تمہارے کفر و معاصی سے

کچھ ضرر نہیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم کہ اگر تم کفر کرو تو خدا تعالیٰ کو اس سے ضرر نہ ہوگا۔ تیسری آیت اعمال

کے متعلق ہے والذین آمنو وعملوا الصالحات لنکفرن عنہم سیئاتہم ولنجزینہم احسن الذی کانوا یعلمون۔ یہاں ایمان کا مکرر ذکر اسلئے فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ عمل بدون ایمان مقبول نہیں۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف فرما دیں گے یعنی جہنم سے ان کو نجات دیں گے اور ان کو جزا حسن دیں گے میرا مقصود جو کچھ تھا وہ بحمد اللہ حاصل ہو گیا کہ ایمان وعمل صالح مقصود اصلی ہے اور مجاہدہ اسی کی تکمیل کے واسطے ہے کہ بدون مجاہدہ کے عمل صالح علی سبیل الکمال حاصل نہیں ہوتا چنانچہ برادری کی رسمیں بھی لوگوں سے اسی واسطے نہیں چھوٹتی ہیں کہ وہ مجاہدہ سے کام نہیں لیتے رسوم قدیمہ کے چھوڑنے میں نفس کو کلفت ضرور ہوتی ہے لیکن اگر نفس مجاہدہ کا عادی ہو تو اس سے گھبرائے گا نہیں نہ ذلت کی پروا کرے گا نہ کسی کے طعن کی پروا کرے گا اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ذلت اور طعن کی پروا کرنا محض اس وجہ سے ہے کہ دین کی وقعت نہیں یا دیندار بننے کی خواہش نہیں کیونکہ مشاہدہ یہ ہے کہ جس چیز کی وقعت انسان کی نظر میں ہو یا اس سے محبت ہو تو اس کی تحصیل میں ذلت وطعن کی ہرگز پرواہ نہیں۔ چنانچہ بہت سے شرفاء کو آپ دیکھیں گے کہ وہ بازاری عورتوں سے نکاح کر لیتے ہیں کیا اس سے برادری میں ان کی ذلت نہیں ہوتی یا لوگ طعن نہیں کرتے مگر چونکہ اسکو اس سے محبت ہے اسلئے کسی کی بات کی

پرواہ نہیں کرتا اسی طرح بعض لوگ اپنی لڑکی کو ایسے لڑکے سے بیاہ دیتے ہیں جو ذات میں یا نسب میں کم ہے مگر مالدار بہت بڑا ہے اس موقعہ پر بھی برادری کی طرف سے بہت کچھ لعنت ملامت ہوتی ہے مگر نفع کے سامنے کسی بات کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اے اللہ! دین ہی اس واسطے رہ گیا ہے کہ یہاں ہر مانع کی پرواہ کی جاتی ہے کوئی کہتا ہے کہ اس میں چھوڑنے میں ذلت ہے کوئی کہتا ہے کہ برادری طعن دے گی کہ خرچ کرتے ہوئے جان نکلتی تھی اسلئے شریعت کی آڑ لیلی کوئی کہیگا کہ ان کو دوسروں کے یہاں کھانا ہی آتا ہے کھلانا نہیں آتا میں تسلیم کرتا ہوں کہ برادری سب کچھ کہے گی لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ سب باتوں میں برادری کے کہنے کی پرواہ نہیں کی جاتی بعض لوگ کسی غریب کی زمین یا گھر کا کوئی حصہ دبا لیتے ہیں برادری تو وہاں بھی برا بھلا کہتی ہے کوئی چماری سے یا لونڈوں سے منہ کالا کرتا ہے وہاں بھی تو لوگ اسکو ذلیل کرتے اور گلی کوچوں میں بُرا بھلا کہتے پھرتے ہیں اگر تم برادری کی باتوں کو ایسا ہی ماننے والے ہو تو براہ کرم ان باتوں میں بھی برادری کی طعن وملامت کی پرواہ کر لیا کرو۔ کچھ نہیں یہ تو محض بہانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا خود اس میں کرنے کو جی چاہتا ہے اگر تمہارا جی نہ چاہتا تو تم کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے جیسا دوسرے کاموں میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ پھر جو لوگ برادری کی ملامت کا بہانہ کرتے ہیں ان کے واسطے کہ ...اور جواب ہے وہ

یہ کہ جیسے تمہاری دنیا کی ایک برادری ہے دین کی بھی ایک برادری ہے یعنی علماء و صلحاء ہم نے مانا کہ اس میں چھوڑنے میں دنیا کی برادری تم کو برا کہے گی مگر دینی برادری تم کو اچھا کہے گی اور شاباشی دے گی اور تمہارے حق میں دعا کرے گی اور اس سے بڑھکر ایک اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے خوش ہونگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کتنی بڑی چیز ہے افسوس خدا کے مقابلہ میں برادری کی رضامندی کی پرواہ کرنا کتنی سخت بات ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی جو حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کی حالت کے متعلق فرمائی تھی قال یٰقوم ارھطی اعز علیکم من اللہ واتخذتموہ وراءکم ظہریا ان ربی بما تعملون محیط ۵ بعض لوگ آپس میں نااتفاقی رکھتے ہیں اور مصالحت نہیں کرتے وہ بھی اسی واسطے کہ مشقت سے گھبراتے ہیں اگر وہ نفس کو مجاہدہ کا عادی کرلیتے تو کسی کو ایک دوسرے سے معافی چاہنے میں پس و پیش نہ ہوتا گو معافی چاہنا ابتداً بہت مشکل ہے مگر جو شخص مجاہدہ سے نفس کو پامال کرچکتا ہے اسکے لئے ایک بھنگی سے بھی معافی چاہنا دشوار نہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ آجکل جو لوگ نفاق و اتحاد کا لکچر دیتے ہیں یہ کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ یہ لکچرار بھی اور لکچر سننے والے بھی اول مجاہدہ سے نفس کی اصلاح کریں بدون اس کے ہرگز اتفاق و اتحاد قائم نہیں ہوسکتا چنانچہ اگر اس لکچرار ہی کی رائے سے کوئی دوسرا شخص کسی میں مخالفت ظاہر کردے

تو یہ اتحاد و اتفاق کا سب لکچر بھول جائیں گے اور دوسرے شخص کی مخالفت و تذلیل و تحقیر کے درپئے ہو جائیں گے پھر دونوں میں ایسی بری طرح مخالفت چلتی ہے کہ اخبار کے کالم دونوں کی طرف سے گالیوں میں بھرے ہوئے شائع ہوتے ہیں جس سے دونوں کی تہذیب و اتفاق و اتحاد کی حقیقت کھل جاتی ہے حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ کا ارشاد ہے کہ لوگ اتحاد و اتفاق کیلئے تقریریں تو کرتے ہیں مگر اس کی جڑ کو کوئی مضبوط نہیں کرتا اتحاد و اتفاق کی جڑ تواضع ہے متکبرین میں کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا اگر ہوگا تو اسی طرح کہ ایک شخص اپنے تکبر کو چھوڑ کر تواضع اختیار کرے۔ سبحان اللہ! یہ مقولہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور یہ ایسے حجرہ نشین کا مقولہ ہے جس نے سیاسی میدان میں قدم بھی نہیں رکھا مگر واللہ سب سیاست داں انکے سامنے ہیچ ہیں کوئی شخص بھی اتحاد و اتفاق کے لئے اس سے بہتر نسخہ نہیں بتلا سکتا پس اتحاد و اتفاق کی جڑ تواضع ہے۔

تواضع کی اصل

تواضع کی اصل مجاہدۂ نفس ہے کیونکہ تواضع اس کا نام نہیں کہ زبان سے اپنے کو خاکسار نیاز مند ذرۂ بیمقدار کہدیا بلکہ تواضع یہ ہے کہ اگر کوئی تم کو واقعی ذرۂ بیمقدار اور خاکسار سمجھ کر برا بھلا کہے اور حقیر و ذلیل کرے تو تم کو انتقام کا جوش پیدا نہ ہو اور نفس کو یوں سمجھا لو کہ واقعی تو تو ایسا ہی ہے پھر برا کیوں مانتا ہے اور اگر کسی کی برائی سے کچھ رنج واثر بھی نہ ہو تو یہ

تواضع کا اعلیٰ درجہ ہے کہ مدح و ذم برابر ہو جائے مطلب یہ کہ عقلاً برابر ہو جائے کیونکہ طبعاً تو مساوات نہیں ہو سکتی ہاں کوئی مغلوب الحال ہو تو اور بات ہے اسی طرح طلبہ اور مدرسین میں ایک مرض ہے کہ اپنی غلطی کا کبھی اقرار نہیں کرتے اگر کوئی بات زبان سے غلط نکل جائے یا کتاب کے کسی مقام کی غلط تقریر ہو جائے اور کوئی طالب علم اس کی صحیح تقریر کرے تو مدرس اس کو ہرگز تسلیم نہ کرے گا جہانتک ممکن ہو گا اپنی بات کو بنانے کی کوشش کرے گا اس کا منشا بھی یہی ہے کہ یہ شخص نفس کو مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا مشقت سے بچانا چاہتا ہے کیونکہ غلطی کا اقرار کر لینا نفس پر بہت گراں ہے اور گرانی کی وجہ یہ ہے کہ نفس اسکو سبب ذلت سمجھتا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے بخدا اقرار خطا سے اور عزت بڑھ جاتی ہے ہم نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو بارہا دیکھا ہے کہ جب درس کے وقت کتاب کے کسی مقام پر شبہ ہو جاتا تو کتاب ہاتھ میں لیکر اپنے ماتحت مدرس کے پاس چلے جاتے اور فرماتے کہ مجھے اس مقام پر شرح صدر نہیں ہوا ذرا آپ اس کی تقریر فرما دیں بھلا مدرس اول ہو کر ماتحت مدرس سے ایسی درخواست کرنا کوئی معمولی بات تھی بہت بڑی بات تھی مگر کیا اس سے نعوذ باللہ مولانا کی عزت و وقعت کم ہو گئی بخدا ہرگز نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ ہو گئی چنانچہ آج یہ بات مولانا کے محاسن میں بیان ہو رہی ہے اور ان کے دیکھنے والے آج ان صورتوں کو ترستے

ہیں کہ ہائے وہ لوگ کہاں گئے جن کو باوجود کمال کے اپنے نقص کے اقرار میں ذرا بھی پس وپیش نہ تھا اور اب ایسا زمانہ آگیا کہ ناقصوں کو بھی اپنے نقص کے اقرار سے عار ہے بلکہ وہ اپنے لئے کمال کے مدعی ہیں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بھی عادت تھی کہ درس کے وقت اگر کسی مقام کی تقریر میں آپ سے لغزش ہو جاتی اور کوئی ادنیٰ طالب علم بھی عرض کر دیتا کہ حضرت اس مقام کا مطلب تو یہ معلوم ہوتا ہے تو مولانا فوراً اس کی بات کو ہاں کر کے صاف فرما دیتے کہ میں نے غلطی کی صحیح مطلب وہ ہے جو تم نے بیان کیا پھر ایک دفعہ پر بس نہ ہوتا تھا بلکہ بار بار اس جملہ کو دہراتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی میں نے غلط مطلب بیان کیا تھا۔ وہ طالب علم شرمندہ ہو جاتا کہ میں نے ناحق تقریر کی مگر مولانا اپنی غلطی کے اقرار سے نہ رکتے تھے اور واللہ اس سے مولانا کی عزت و محبت و عظمت پہلے سے زیادہ بڑھتی تھی پس نفس کا یہ خیال غلط ہے کہ اقرار خطا سے ذلت ہوتی ہے اور بالفرض اگر ذلت ہوتی بھی ہے تو کیا تم کوئی کام ذلت کا نہیں کرتے ہو اگر ایسا ہی ذلت سے بچنا ہے تو کسی شخص کے مکان سے طلبہ کھانا بھی نہ لایا کریں اور کوئی مولوی صاحب چندہ کے واسطے بھی نہ جایا کریں کیا اس میں ذلت نہیں ہوتی بخدا جب مولوی چندہ کے لئے دورہ کرتے ہیں عوام اسکو بہت ذلت سے دیکھتے ہیں خصوصاً جس چندہ میں خطاب خاص ہو اس میں

تو بہت ہی ذلت ہوتی ہے اور دوسرے پر جبر بھی ہوتا ہے اسی لئے مجھے ایسے چندہ کے جواز میں کلام ہے۔ جو خطاب خاص سے وصول کیا جاتا ہے مگر طلبہ و علماء اس کے جواز کی کوشش کرتے ہیں اور ذلت کی پرواہ نہیں کرتے پھر اقرار خطا ہی میں ذلت کی پرواہ کیوں ہے بس وجہ یہ ہے کہ چندہ وغیرہ میں گو ذلت ہے مگر روپیہ تو ملتا ہے اور اقرار خطا میں روپیہ نہیں ملتا سو آپ تو اہل علم ہیں آپ کی نظر نفع عاجل پر نہ ہونا چاہیئے بلکہ نفع آجل پر ہونا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ اقرار خطا میں خدا کی رضا ضرور ہے حدیث میں من ترک الجدال والمراء نبی لہ بیت فی الجنتہ اوکمال قال اور کہاں تک فروغ بیان کروں آپ غور کر کے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم جتنے گناہوں میں مبتلا ہیں سب کی اصل یہ ہے کہ ہم نفس کو مشقت سے بچانا چاہتے ہیں اور جتنے اوامر کو ہم ترک کر رہے ہیں اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے

مستقل مجاہدہ

پس معلوم ہوا کہ اصلاح اعمال نفس کا مدار عادی مجاہدہ پر ہے اسی مسئلہ کو بتلانے کے واسطے اس وقت یہ بیان اختیار کیا تھا جو الحمد للہ بقدر ضرورت بیان ہو گیا اب دعا کیجیئے کہ حق تعالیٰ شانہ گناہوں کے چھوڑنے کی ہم کو ہمت عطا فرمائیں کہ یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے پھر اس پر دو کامیابیاں مرتب ہونگی ایک تو بڑی کامیابی خود گناہوں کا چھوٹ جانا ہے کیونکہ جرائم کا نہ ہونا یا کم ہونا بھی بڑی کامیابی ہے دوسرے رزق میں وسعت ہوگی کیونکہ اعمالِ صالحہ

کو اور گناہوں کے چھوڑنے کو رزق کی وسعت میں بہت بڑا دخل ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولو ان اہل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیہم برکات من السماء والارض ولاکن کذبوا فاخذناہم بما کانوا یکسبون۔ اسی طرح معاصی کو تنگیٔ رزق ونزول بلا میں بڑا دخل ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ جس قوم میں سود کی کثرت ہو گی اللہ تعالیٰ اس پر قحط مسلط کر دیں گے اور جس قوم میں زنا کی کثرت ہو گی اس پر طاعون وغیرہ ایسے امراض مسلط ہونگے جو پہلے لوگوں نے دیکھے بھی نہ تھے پس مجاہدہ میں ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی کامیابی ہے۔ بلکہ یوں کہئیے کہ دینی اور دنیوی اور تمدنی اور سیاسی تمام مصالح کی بنیاد اور جڑ یہی ہے کہ انسان اپنے نفس کی مخالفت کا عادی بنے اور نفس کو مشقت کا عادی بنائے اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق شامل حال ہو وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہٖ واصحابہ وبارک وسلم وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اشرف علی

۳ ذیقعدہ ۱۳۴۹ھ

التحصیل والتسہیل

مع

التکمیل والتعدیل

اہل سلوک کے متعلق یہ وعظ ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ بروز آخری جمعہ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ جو پونے چار گھنٹوں میں ختم ہوا۔ حاضرین کی تعداد ۳۰۰ کے قریب تھی۔ یہ وعظ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵ ومثل الذین ینفقون اموالھم ابتغاء مرضات اللہ وتثبیتا من انفسھم کمثل جنۃ بربوۃ اصابھا وابل فاٰتت اکلھا ضعفین فان لم یصبھا وابل فطل واللہ بما تعملون بصیرط

تمہید

جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے غالباً موقعہ و وقت کے لحاظ سے وہ سامعین کو غیر مرتبط معلوم ہوئی ہوگی کیونکہ اس میں احکام رمضان کا پتہ بھی نہیں۔ مگر مجھے جزئیات سے زیادہ کلیات کا اہتمام ہے۔ کیونکہ کلیات سننے میں کم آتے ہیں اور جزئیات کو اکثر لوگ بیان کرتے رہتے ہیں دوسرے کلیات جامع بھی ہوتے ہیں جزئیات کو اور ان کا یاد رکھنا بہت سے جزئیات کو یاد رکھنے سے مغنی ہوتا ہے اس وجہ سے میں نے اسوقت ایک مضمون کلی اختیار کیا ہے جو کلیت و عموم کی وجہ سے احکام رمضان کو بھی شامل ہے چنانچہ تقریر سے معلوم ہو جائے گا کہ اس مضمون کو ہر عمل سے تعلق ہے اور روایات حدیثیہ کو بھی ملا لیا جائے تو اس آیت کا تعلق احکام رمضان سے اور زیادہ معلوم ہوگا نہ اسلئے کہ اس میں انفاق کا ثواب مذکور ہے اور رمضان میں انفاق کا ثواب زیادہ ہوتا ہے بلکہ دوسری وجہ سے جس کو میں آخر بیان کروں گا گو انفاق کو بھی اس مہینہ سے خاص خصوصیت ہے اور یہ بھی رمضان کے ساتھ اس آیت کی مناسبت کی وجہ ہو سکتی ہے اس لئے حدیث میں اسکو شہر المواساۃ کہا گیا ہے جس کا

استعمال اکثر اعانت[عہ] مالیہ میں ہوتا ہے۔

رمضان و حسنات اس مہینہ میں باہم ایک دوسرے سے ہمدردی کرنا چاہیئے۔ نیز اس مہینہ میں تضاعف حسنات ہوتا ہے جو اتفاق وصلوٰۃ سب کو عام ہے تو ایک تعلق عام اس آیت کا رمضان سے یہ بھی ہے یعنی اس مہینہ میں فرض کا ثواب ستّر فرضوں کے برابر ہے اور نفل کا ثواب فرض کے برابر ہے مگر اس تضاعف حسنات کے معاملہ میں لوگ ایک غلطی میں مبتلا ہیں جس کو میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے مگر شاید بعض لوگ اس وقت حاضر نہ ہوں اس لئے دوبارہ بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ بعض حضرات نے یہ سن کر رمضان میں تضاعف حسنات ہوتا ہے اس سے یہ اثر لیا کہ رمضان کے لئے طاعات صدقہ کو ملتوی اور مؤخر کرنے لگے زکوٰۃ تو عموماً اسی مہینہ میں ادا کی جاتی ہے گو وجوب زکوٰۃ اس سے پہلے ہو گیا ہو اور اس کے سوا بھی دیگر صدقات کو اس ماہ پر موقوف رکھا جاتا ہے۔ یہ غلطی ہے جس کا منشار مقصد نصوص سے بُعد ہے۔ اور مقصد نصوص کا سمجھ لینا ہی فقہ ہے جس کی فضیلت حدیث میں یوں آئی ہے۔ من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین جس کی بنا پر علمار نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت حق کیا ہے بجز فقیہ کے کہ اس کو معلوم ہے کہ خدا نے اس کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا ہے بوجہ اس حدیث کے تو یہ فضیلت محض اس بات سے حاصل نہیں ہوئی کہ حدیث و قرآن کا ترجمہ لیا جائے

عہ کذا یفھم من القاموس مادہ اسا ۱۲ منہ

اور کچھ علمی نکات بیان کر دیئے جائیں بلکہ یہ فضیلت اس سے حاصل ہوتی ہے کہ شارع کا مقصد سمجھ لیا جائے اسی کا نام فقہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جس میں ہمارے اکابر سلف ممتاز تھے گو وسعت نظر میں متاخرین بڑھے ہوئے ہیں مگر عمق نظر میں متقدمین بدرجہا افضل ہیں یہاں تک کہ صحابہ کی نظر سب سے زیادہ عمیق ہے۔ ان سے بڑھکر شارع کے مقصد کو کون سمجھ سکتا ہے ان کے برابر نور ایمان و تقویٰ کس کو نصیب ہے، اور علوم قرآنیہ میں عمق نظر اسی نور کی برکت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس مضمون پر کسی کو اس حدیث سے شبہ نہ ہو۔ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ای الخلق اعجب الیکم ایماناً قالوا الملٰئکۃ الی اٰخر الحدیث یعنی حضورؐ نے صحابہ سے ایک دن دریافت فرمایا کہ تبلاؤ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے صحابہ نے عرض کیا فرشتوں کا آپ نے فرمایا کہ فرشتوں کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ وہ تو ہر وقت اپنے رب کے قرب میں ہیں صحابہ نے عرض کیا پھر انبیاء کا فرمایا ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ وہ تو وحی کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں صحابہ نے عرض کیا پھر ہمارا ایمان عجیب تر ہے فرمایا تمہارے ایمان نہ لانے کی کونسی وجہ ہو سکتی ہے میں تمہارے درمیان موجود ہوں یعنی تم نے مجھے دیکھا نزول وحی کو دیکھا میرے معجزات دیکھے پھر آپ نے فرمایا ان لوگوں کا ایمان عجیب تر ہے جو میرے بعد آئیں گے اور صرف چند اوراق دیکھیں گے جن میں قرآن ہوگا اور ان پر ایمان لائیں گے تو اس سے یہ وسوسہ نہ ہو کہ تم صحابہ کو متاخرین

سے افضل بتلاتے ہو اور اس حدیث کی رو سے صحابہ سے متاخرین کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ حضورؐ نے پچھلوں کے ایمان کو اعجب ہی تو فرمایا ہے اکمل و اقوی و افضل تو نہیں فرمایا اور اعجب ہونے سے اکمل و افضل ہونا لازم نہیں آتا پس اس حدیث کی بناء پر یہ مسلم کہ متاخرین کا ایمان سب سے عجیب تر ہے مگر صحابہ کے ایمان سے افضل و اقوی نہیں کیونکہ دوسرے دلائل سے یہ طے ہو چکا ہے کہ سب سے زیادہ کامل ایمان انبیاء علیہم السلام کا ہے پھر ملائکہ کا پھر صحابہ کا پھر جو صحابہ کے مشابہ ہو اسی طرح ہر زمانہ میں دیکھتے جاؤ جو شخص صحابہ کے ساتھ اخلاق و عادات و طرز معاملات میں مشابہ تر ہو گا اسکا ایمان قوی تر ہو گا اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ اعجب ہونا، قوی و اکمل ہونے کو مستلزم نہیں اس کی ایک نظیر میرے پاس ہے میں پوچھتا ہوں کہ کیا حق تعالیٰ کا علیم و قدیر و سمیع ہونا عجیب تر ہے ہرگز نہیں بلکہ انسان کا علیم و حکیم ہونا عجیب ہے کیونکہ حادث ممکن کا صفات کمالیہ سے متصف ہونا واقعی تعجب کی بات ہے اور واجب قدیم کا صفات کمال سے موصوف ہونا کیا عجیب ہے وہ بھی صفات کمال سے موصوف نہ ہو تو اور کون ہو گا مگر انسان کے علم و حکمت کے اعجب ہونے سے اس کے علم و حکمت کا اکمل ہونا لازم نہیں بلکہ اکمل و افضل و اقوی اللہ تعالیٰ ہی کا علم و حکمت ہے یہ گفتگو درمیان میں ایک شبہ کے رفع کرنے کو شروع ہو گئی تھی کہ حضرات صحابہ کے ایمان کی قوت و فضیلت پر حدیث ای الخلق اعجب ایماناً سے شبہ نہ کیا جاوے میں یہ کہہ رہا تھا کہ مقاصد نصوص کا سمجھنا فقہ ہے جس میں حق تعالیٰ نے

متقدمین کو فضیلت دی ہے امام ابو حنیفہ، امام شافعی وغیرہ اسی عمق فہم کی وجہ سے امام ہیں اس خاص صفت میں ائمہ مجتہدین سب ممتاز ہیں اور کوئی انکی برابری نہیں کرسکتا رہا یہ کہ پھر باہم مجتہدین میں کون افضل ہیں سو اس کے بیان کرنے کو ہمارا منہ نہیں ہم اس قابل نہیں کہ فقہاء میں تفاضل کریں کیونکہ اول تو ہمارا یہ درجہ نہیں دوسرے ہمارے اندر اخفیاط نہیں ہم تفاضل کے وقت دوسرے کی تنقیص کر دیتے ہیں۔

فضیلتِ انبیاء

اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جڑ ہی کاٹ دی فرماتے ہیں لا تفضلوا بین الانبیاء[ع۱] کہ انبیاء علیہم السلام میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو۔ اور فرماتے ہیں لا ینبغی لعبد ان یقول انی خیر من یونس ابن متی[ع۲] اس میں انا سے مراد خود حضورؐ ہیں ہر متکلم مراد نہیں (کما قیل ۱۲) یعنی کسی کو میری نسبت یہ کہنا لائق نہیں کہ میں یونس علیہ السلام سے افضل ہوں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت تمام انبیاء پر قطعی ہے مگر حضورؐ نے اس میں تفصیلی گفتگو سے منع فرما دیا (نیز اس سے بھی منع فرما دیا کہ کسی نبی کا نام لیکر یہ کہا جائے کہ ہمارے حضورؐ فلاں نبی سے افضل ہیں بس اجمالاً ہی کہنا چاہیئے کہ آپ سب سے افضل ہیں ۱۲) کیونکہ تفصیل سے دوسرے نبی کی تنقیص ہو جاتی ہے۔ اور ایسے بہت کم لوگ ہیں جو تفصیلی کلام کے مقابلہ میں تنقیص سے بچ سکیں۔ اسلئے حضورؐ کی یہ غایت رحمت ہے کہ

ع۱ مشکوٰۃ عن شیخین ۱۲ ع۲ متفق علیہ ۱۲

آپ نے ہم کو اس بات میں تفصیلی گفتگو سے بالکل منع فرما دیا اور اگر کسی کا اس باب میں تفصیلی گفتگو کرکے یہ خیال ہو کہ میرے کلام سے کسی نبی کی تنقیص لازم نہیں آتی تو میں اس کے سامنے ایک معیار بیان کرتا ہوں اس پر اپنی تقریر کو پرکھ لیا جائے وہ یہ کہ تفاضل انبیاء پر تقریر کرنے کے قبل یہ سوچ لے کہ اس مجلس میں سارے انبیاء علیہم السلام مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہیں اور میں سب کے سامنے حضور کے فضائل ظاہر کر رہا ہوں اس وقت معلوم ہو جاوے گا کہ کس مضمون کے بیان کی جراٴت ہوتی ہے اور کس کی نہیں ہوتی اس معیار سے اپنی اکثر تقریروں کا حدود سے متجاوز ہونا معلوم ہو جاوئے گا اور اس کی فکر ہوگی کہ کسی لفظ سے ایہاماً بھی کسی دوسرے نبی کی تنقیص لازم نہ آجائے ورنہ وہ حضرات تو شاید خفا نہ ہوں مگر سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو جائیں گے کیونکہ حدیث میں ہے الانبیاء اخوۃ من علات وامھاتھم شتی ودینھم واحد[۱] یعنی انبیاء میں باہم علاتی بھائیوں جیسا تعلق ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ حضرات کیسے بھائی ہیں دنیا داروں کی طرح نہیں بلکہ ان میں باہم پورا اتحاد و اتفاق و محبت ہے تو ایسے بھائیوں میں سے ایک کو اپنے دوسرے بھائی کی تنقیص کب گوارا ہو سکتی ہے ہرگز نہیں حضرت اس معیار کو پیش نظر رکھکر تم اپنی تمام تقریروں اور تحریروں کو جو باب تفاضل میں لکھی ہوں یا کی ہوں

---

[۱] متفق علیہ۔

چنانچہ ان میں سے کوئی بھی ایسی ہے جس کو بے تکلف تمام انبیاء کے سامنے پڑھ کر سنا سکو یقیناً ایسی تقریریں بہت کم ملیں گی زیادہ حصہ وہی ہو گا جس کو سب کے سامنے پڑھنے کی تم کبھی جرأت نہیں کر سکتے (یہ بہت سچی ترازو ہے جو ایک رتی پر بھی جھک جائے گی اس کی قدر کرو) ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں فتویٰ دیتے ہوئے یہ مراقبہ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دے رہا ہوں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے تو میں فتویٰ نہیں دیتا۔ حضرت یہ وہ باتیں ہیں جن میں صوفیہ دوسروں سے ممتاز ہیں گو اس مضمون کا عقیدہ تو سب کو ہے کہ انسان جو کام بھی کرتا ہے خدا کے سامنے کرتا ہے مگر اس کا مراقبہ اور استحضار دوسرا اثر رکھتا ہے بس اسی مراقبہ سے تم تفاضل انبیاء کے وقت کام لو۔ انشاء اللہ کلام میں اعتدال پیدا ہو جائے گا۔ ہمارے حاجی صاحب فرماتے تھے کہ سلاسل صوفیہ میں بھی ایک سلسلہ والوں کو دوسرے سلسلہ پر اپنی فضیلت ثابت نہ کرنا چاہئے کیونکہ ہر سلسلہ والے کے لئے دوسرے سلسلہ کے بزرگ چچا ہیں اور چچا بمنزلہ باپ کے ہے حدیث میں بھی ہے عم الرجل صنو ابیہ یعنی عظمت و ادب میں دونوں برابر ہیں گو بعض حقوق میں باپ مقدم ہیں لیکن تمہارا باپ یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ تم اپنے چچا کی یعنی باپ کے بھائی کی تنقیص و توہین کرو جب سلاسل ولایت میں بھی تفاضل سے اکابر نے منع کیا ہے تو تفاضل انبیاء تو یقیناً اشد ہے اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاق پر نظر کرنے سے

یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے جو اپنے فضائل احادیث میں بیان فرمائے ہیں اس سے آپ کا مقصود یہ ہے کہ ان کے معلوم ہو جانے سے متبعین کو تسلی ہو گی کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایسا متبوع دیا اور اتباع پر زیادہ رغبت ہو گی گو یہ علوم خود بھی مقصود ہیں مگر حضورؐ کا مقصود ترغیب اتباع ہی معلوم ہوتا ہے اد یحتمل ان یکون امتثالا لامرہ تعالیٰ واما بنعمۃ ربک فحدث ۱۲) کیونکہ حضورؐ کا مذاق یہ تھا کہ آپ کو اتباع احکام کا سب سے بڑھکر اہتمام تھا اور جس چیز کو اس میں دخل ہوتا آپ اس کو اختیار کرنے کی کوشش فرماتے اس کے متعلق کہ آپ کو اتباع کا زیادہ اہتمام ہے بہ نسبت بیان فضائل کے ایک مرد صالح کا خواب بھی ہے جو بعض رسائل میں طبع بھی کرا دیا ہے ان کو مولود وغیرہ کا بہت شوق تھا محض غلبہ محبت نبویہ کی وجہ سے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں ہم زیادہ تعریف سے خوش نہیں بلکہ ہم اس سے خوش ہوتے ہیں جو ہمارے احکام کا اتباع کرے مگر آج کل حالت یہ ہے کہ شعراء ایک نعتیہ دیوان لکھ کر اپنے کو سب سے زیادہ حضورؐ کا مقرب سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ عمل کی یہ حالت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل خلاف ہے یقیناً ایسی تعریف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش نہیں ہو سکتے پس حضورؐ کے مذاق پر نظر کرنے سے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے فضائل کو زیادہ تر ترغیب اتباع کی نیت سے بیان فرمایا ہے اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ فضائل تو

عقائد کی قبیل سے ہیں جو خود مقصود ہوتے ہیں اور تم ان کو مقصود لغیرہ بتلاتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں کچھ حرج نہیں کہ ایک شئ مقصود بالذات بھی ہو اور دوسری مقصود میں معین بھی ہو آپ کو خبر نہیں مقاصد شرعیہ کی ایسی حالت ہے جیسے مقناطیس کی حالت ہے کہ ہر مقصود دوسرے کا جاذب اور اس میں معین ہے پس عقائد کا مقصود بالذات ہونا اوں کے مقصود للاعمال ہونے کے منافی نہیں اور میں نے اس مسئلہ کو قرآن سے سمجھا حق تعالیٰ فرماتے ہیں ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا ان ذلک علی اللہ یسیر لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتاکم۔ بتلائیے اس آیت میں لام غایت کا متعلق کون ہے مذکور تو ہے نہیں چنانچہ ظاہر ہے نہ اسمیں کوئی جزو اسکا صالح نہیں لامحالہ مقدر ماننا پڑے گا اب یہ بھی سمجھ لو کہ مقدر کیا ہے تو اس لام سے اوپر اللہ تعالیٰ نے مسئلہ تقدیر بیان فرمایا ہے یعنی تم کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے خواہ آفاقی ہو یا نفسی وہ ایک کتاب میں اپنے ظہور سے پہلے لکھی ہوئی تھی چونکہ یہ عجیب بات تھی اس لئے فرماتے ہیں کہ تعجب نہ کرو اللہ کو یہ سب آسان ہے اب اس مسئلہ کے بتلانے کی حکمت بیان فرماتے کہ ہم نے تم کو یہ مسئلہ اسلئے کیوں بتلایا تاکہ تم فائت پر غم نہ کرو اور عطا کی ہوئی چیز پر اتراؤ نہیں پس وہ مقدر اخبرناکم بہ ہے۔

اصلاح اعمال میں تقدیر کا دخل اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر

کو اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے کیونکہ اس سے حزن و بطر رفع ہو جاتا ہے اور حزن جڑ ہے تعطل ظاہر کی اور تکبر و بطر اصل ہے تعطل باطن کی یعنی غمگین و پریشان آدمی ظاہر میں تمام دین و دنیا کے کاموں سے معطل ہو جاتا ہے اور متکبر آدمی کا دل خدا کے تعلق سے معطل ہو جاتا ہے جب تک تکبر نہ نکلے خدا کے ساتھ دل کو لگاؤ نہیں ہو سکتا یہ تو تقدیر کو دخل تھا اعمال میں۔ اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ توحید جو اعظم العقائد واساس العقائد ہے اس کو بھی اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے چنانچہ سعدی فرماتے ہیں ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش ۔ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد زکس ۔ ہمیں ست بنیاد توحید و بس

یعنی توحید سے مخلوق کا خوف وطمع زائل ہو جاتا ہے۔ جب اتنا بڑا عقیدہ بھی اصلاح اعمال میں دخیل ہے تو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے اعتقاد کو آپ کے اتباع میں دخیل مانا جاوے تو کیا اشکال ہے اور یہی حضورؐ کا اصل مقصود ہے (گو وہ فضائل ایک درجہ میں مقصود بالذات بھی ہیں)

اس لئے حضورؐ نے اس میں زیادہ کاوش سے منع فرمایا کیونکہ جو مقصود ہے اس اعتقاد فضیلت سے وہ بدون تفصیل کے بھی صرف اجمالی اعتقاد سے حاصل ہو سکتا ہے اسی طرح ہمارے اکابر نے اولیاء و مجتہدین میں بھی تفاضل سے منع فرمایا ہے غرض متقدمین کو فقہ اور

تعمق نظر کی وجہ سے متاخرین پر فضیلت ضرور ہے لیکن باہم متقدمین میں سے[٥]
کس کو کس پر فضیلت ہے اس سے بحث نہ کرنا چاہیئے یہ گفتگو اس پر چلی تھی
کہ لوگوں نے حدیث تضاعف ثواب فی رمضان کے باب میں شارع کا مقصد
نہیں سمجھا اور فقہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر یہ عمل کیا کہ تفاضل حسنات کے
لئے طاعات کو مؤخر کرنے لگے کہ اگر کسی کی زکوٰۃ کا سال ۲۸ شعبان کو پورا
ہوتا ہے تو وہ ۲۸ کو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا بلکہ رمضان کے لئے اس کو ملتوی
کرتا ہے چاہے غریب مسکینوں کا (جنکا یہ مال زکوٰۃ شرعی حق ہے) خاتمہ
ہی ہو جائے ارے تم کو کیا خبر ہے کہ مساکین پر کیا گذر رہی ہے تم کو تو
رمضان کا انتظار ہے اور اس غریب کی روح کو ایک ایک گھڑی کا انتظار
ہے بس وہ حال ہو گا تا تو بمن می رسی من بخدامی رسم ۔ صاحبو۔ میں سچ
کہتا ہوں کہ حدیث کا مطلب یہ نہیں جو آپ نے سمجھا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا مقصود یہ نہیں کہ رمضان تک طاعات کو مؤخر کیا جائے بلکہ
مطلب یہ ہے کہ رمضان میں طاعات کے اندر جلدی کی جائے یعنی جس
طاعت کی ہمت ہو سکے اور جس عمل صالح کی توفیق ہو سکے اس کو جلدی

---

[٥] میں کہتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ فقہ کے موجد ہیں کما قال الامام الشافعی الناس کلھم عیال علی ابی
حنیفۃ فی الفقہ نیز وہ تابعی ہیں کما اثبت الذہبی والحافظ ابن حجر والدارقطنی وغیرہم رویتہ الانس
بن مالک وفی الحدیث خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ولیس احد من المجتہدین المقلدین تابعیا سوا الامام
پس امام ابوحنیفہ کا تمام ائمہ مجتہدین سے افضل ہونا تو لفظ سے بھی ثابت ہے اور موجد فقہ ہونے
سے بھی ۱۲ ظ مگر اس سے علی الاطلاق فضیلت سب پر ثابت نہیں ہوتی ۱۲۔ اشرف

رمضان ہی میں کردو رمضان کے بعد کے لئے مؤخر نہ کرو کیونکہ رمضان میں ثواب زیادہ ہے پس تضاعف حسنات کا مقصود تو تعجیل اعمال فی رمضان تھا لوگوں نے اس سے تاخیر اعمال الی رمضان سمجھ لیا

ع بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ جس شخص کا سال زکوٰۃ ۲۸ شعبان کو پورا ہو تو کیا وہ شعبان ہی میں صدقہ کردے اس کے جواب میں میں تو یہی کہونگا کہ ہاں دیر نہ کرے رمضان کا انتظار نہ کرے رہا یہ سوال کہ کیا شعبان میں وہی ثواب ہوگا جو رمضان میں ہوتا تم اسکا ٹھیکہ لیتے ہو اسکا جواب یہ ہے کہ میں ٹھیکہ دار تو نہیں ہوں ہاں ٹیکہ دار ہوں کہ اللہ ورسول کے بیان کردہ قواعد پر ٹیک لگاکر کہتا ہوں کہ اللہ ورسول کو تاخیر طاعات مطلوب نہیں بلکہ تسارع وتسابق الی الخیر مقصود ہے چنانچہ جابجا فاستبقوا الخیرات یسارعون فی الخیرات ۔ نص میں وارد ہے ۔ اس لئے میں جزم کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تاخیر فی الخیر شارع کو ہرگز مطلوب نہیں اور میں قواعد سے کہتا ہوں کہ جس کو شعبان میں صرف کا موقعہ ملے وہ ہرگز تاخیر نہ کرے اس کو شعبان ہی میں اتنا ثواب ملے گا ۔ جو شاید رمضان کے ثواب سے بھی بڑھ جائے کیونکہ انفاق فی رمضان سے کمیتہً ثواب بڑھتا ہے اور تعجیل وسبقت فی الخیر سے کیفیتہً ثواب زیادہ ہوتا ہے اور کیفیت میں کمیت سے زیادہ مطلوبیتہ ہے صاحبو! میں اس کی نظیر علماء کے کلام سے اپنے پاس رکھتا ہوں حدیث میں ہے کہ مسجد محلہ میں نماز پڑھنے سے ۲۵ نماز دں

کا ثواب ملتا ہے اور جامع مسجد میں ۵۰۰ نمازوں کا مگر محلہ والوں کو یہ جائز نہیں کہ محلہ کی مسجد چھوڑ چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھنے جایا کریں اگر ایسا کروگے تو گناہ ہوگا۔ اس مقام پر علماء نے لکھا ہے کہ جامع مسجد کی نماز اس شخص کے حق میں کمیتہ زیادہ ہے اور مسجد محلہ کی نماز کیفیتہ زیادہ ہے (کیونکہ اس کے ذمہ اس مسجد کی آبادی واجب ہے تو یہ شخص مسجد میں نماز بھی پڑھتا ہے اور واجب عمارت کو بھی ادا کرتا ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے واجب عمارت ادا نہ ہوگا کیونکہ اس کے ذمہ اسکی عمارت و آبادی واجب نہیں بلکہ یہ واجب جامع مسجد کے محلہ والوں کے ذمہ ہے ۱۲) ہاں اگر کوئی جامع مسجد کے محلہ میں جا بسے تو اور بات ہے پھر اسکو کیفیت و کمیت دونوں میں ترقی ہو جائے گی گو قرب سے بعد اقدام کا بھی خسارہ ہو جائیگا۔ بس تم اپنے حساب اور قواعد کو رہنے دو اس میں پانچ کو جانے دو جو حکم ہو جائے اسکو مان لو اپنی طرف سے حساب نہ لگاؤ کہ اسوقت جمع کرنے میں ثواب کم ہوگا رمضان میں زیادہ ہوگا صاحبو! یہ تسلیم کہ رمضان میں زیادہ ہوگا مگر یہ آپکو کیونکر معلوم ہوا کہ اسوقت کم ہوگا ممکن ہے اسوقت ہی زیادہ مل جائے کیونکہ اسوقت خرچ کروگے تو ادا ہوگا اور رمضان تک تاخیر کروگے تو قضا ہو جائیگا اور ادا میں جو لطف ہے وہ بات قضا میں کہاں تم کو آخرت کے حقائق و خواص کی کیا خبر۔ تم انکے متعلق قیاس سے کام نہ لو اہل سائنس کو اقرار ہے کہ ابتک خواص اشیاء کا انکو اتنا بھی علم نہیں ہوا جتنا سمندر میں سے ایک

قطرہ حالانکہ حیرت در حیرت انگیز ایجادات ہو رہی ہیں۔ اخبار میں دیکھا ہے کہ امریکہ نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے کہ اس کو پرانے کھنڈر دں اور ویرانوں میں لگایا جائے تو پہلے زمانہ کی تمام باتیں جو اس گھر کے آدمیوں نے اس گھر میں کی تھیں اُس آلہ کے ذریعہ سے سنائی دینگی اب بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ یہ آوازیں کرہ ہوا میں اب تک موجود ہیں مگر انکے ادراک کے لئے لطیف آلہ کی ضرورت تھی وہ اب ایجاد ہو گیا پہلے ایجاد نہ ہوا تھا اسلئے کوئی ان باتوں کو نہ سن سکا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ روحوں کی آواز ہے ارواح بولتی ہیں اب میں اس خبر کو بیان کر کے کہتا ہوں کہ قرآن نے کہا تھا کہ قیامت کو زمین بولے گی یومئذ تحدث اخبارھا تو اسکا سب نے انکار کیا اور کہا بھلا یہ کس طرح ہو گا زمین کیونکر بولے گی کیا اسکے بھی زبان ہے قرآن نے اسکا بڑا زبردست جواب دیا ہے بان ربک اوحی لھا یعنی زمین اسلئے بولے گی کہ خدا کا اسکو یہی حکم ہو گا اس جواب نے سب سائنس والوں کی گردنیں توڑ دیں کیونکہ اسباب ظاہرہ میں تو وہ شبہات نکال سکتے تھے اس میں کیا شبہ نکال سکتے ہیں کیونکہ یہ تو حقیقی سبب ہے اگر اس میں کلام کریں گے کہ کیا زمین کے زبان ہے تو ہم سوال کریں گے تو اچھا بتلاؤ یہ زبان کیونکر بولتی ہے کیا اسکے بھی زبان ہے خلاصہ یہ ہے کہ جب عالم اسباب کی حقائق کا ابتک احاطہ نہیں ہو سکا تو عالم آخرت کی حقائق کا تو کون احاطہ کر سکتا ہے پھر آپ وہاں کے ثواب وغیرہ کے بارے میں اپنا حساب اور قاعدہ

رہنے دیجئے چنانچہ بعض لوگوں نے حقوق العباد کے بارہ میں ایک حساب لگایا ہے کہ زید کا ہمارے ذمہ حق ہے اور عمرو کے ذمہ ہمارا حق ہے تو اب ہم کو زید کے حق کی فکر کرنا کیا ضرور۔ قیامت میں اگر زید ہم سے اپنے حق کا مطالبہ کریگا تو ہم عمرو پر حوالہ کر دیں گے کہ اسکے ذمہ ہمارا حق ہے اس سے وصول کر لو اسطرح مقاصہ ہو جائیگا۔ مگر اول تو کیا ضرور ہے کہ دوسروں کے ذمہ آپ کے حقوق اتنے ہی ہوں جتنے دوسروں کے آپکے ذمہ ہیں دوسرے فرض کر لیا جائے کہ برابر ہی ہو گئے مگر ممکن ہے کہ پھر بھی مقاصہ نہ ہو کیونکہ ممکن ہے کہ دوسرا تو تمہارے حقوق کی ادئیگی کی فکر میں عمر بھر لگا رہا ہو مگر افلاس یا اور کسی عذر کی وجہ سے مجبور رہا ہو (اور اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ہم خود حقوق کو ادا کر دینگے اور اس شخص پر اصلا مواخذہ نہ ہو گا ۱۲) اور تم اس مقاصہ کے حساب سے بے فکر ہو گئے ہو تم نے ابھی سے دوسرے کا حق مارنے کی ٹھان لی ہے تو تم اور وہ برابر کہاں ہوئے تم پر ظلم و غصب و خیانت وغیرہ متعدد دفعات قائم ہیں اور اس پر صرف ایک دفعہ تھی کہ قرض لیکر ادا نہیں کیا۔ تیسرے ممکن ہے کہ حقوق کے مکافات مکسوب اعمال سے ہو سکے اور موروث اعمال سے نہ ہو سکے اسلئے دوسرے شخص کی جو نیکیاں تم کو ملی ہیں وہ معاوضہ ان حقوق کا نہ ہو سکیں جو تمہارے ذمہ ہیں تو یہ حساب محض لغو ہے خدا سے ڈرنا چاہیئے کہیں بنیئے کے حساب کی طرح نہ ہو جائے کہ لیکھا جوں کا توں۔ کنبہ ڈوبا کیوں۔ بعض لوگ پوچھا کرتے

ہیں کہ جس عورت کے کئی نکاح ہوئے ہوں وہ کس کو ملے گی یہ سوال بھی محض فضول ہے کیونکہ یہ تو یقینی ہے کہ وہاں کسی کو قلق نہ ہوگا سب کے سب خوش وخرم رہیں گے یہ نہ ہوگا کہ شوہروں میں باہم لڑائی جھگڑا ہو وہ کہے میں لوں وہ کہے میں لوں ممکن ہے اللہ تعالیٰ اسکے پہلے خاوند کو دنیا ہی کی عورتوں میں سے کوئی عورت ایسی ہی حسین یا اس سے بہتر دیدے کیونکہ دنیا میں بہت لڑکیاں بغیر شادی کے بھی تو مرجاتی ہیں یا حوریں زیادہ دیدیں غرض اللہ تعالیٰ سب کو خوش کر دینگے جنت میں کوئی غمگین نہ ہوگا اسلئے یہ سوال محض فضول غرض یہ کہ تم خدا کے ساتھ حساب نہ لگاؤ حساب وہاں کیا کرتے ہیں جہاں مساوات ہو دیکھو دکاندار ہم سے اور آپ سے تو حساب کرتے ہیں اور بادشاہوں سے بھاؤ تاؤ نہیں کرتے وہاں تجارتی مال کو بھی ہدیہ کہہ کر پیش کرتے ہیں اور جب وہاں سے قیمت پوچھی جاتی ہے تو قیمت نہیں بتلاتے بس یہی کہتے ہیں کہ اسکی کچھ قیمت نہیں صرف حضور کی خوشنودی ہی سب کچھ قیمت ہے اسکے بعد انکو قیمت سے بھی بہت زیادہ مل جاتا ہے پھر غضب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ حساب کتاب کرتے ہو جن کا حق یہ ہے کہ ؎

نیاوردم از خانہ چیزے نخست ... تو دادی ہمہ چیز ومن چیز تست

کیونکہ سب چیزیں تو انہی کی ملک ہیں اور حساب وہاں ہوتا ہے ایک عوض ایک عاقد کا ہو دوسرا عوض دوسرے عاقد کا اور یہ جو

حق تعالیٰ نے فرمایا ان اللہ اشتری من المومنین انفسہم واموالہم بان لھم الجنہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جنت کے بدلہ میں انکے جان و مال کو خرید لیا ہے جس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ جان و مال ہماری ملک ہے تو اسکی ایسی مثال ہے جیسے تم بچہ کو بلا تملیک پیسہ دیدیتے ہو اور انفاق کی عادت ڈالنے کے لئے اسکے ہاتھ سے مدرسہ میں دلواتے ہو اب مدرسہ کی کارروائی میں بچہ کا نام چھپے گا کہ فلاں بچہ نے مدرسہ میں چندہ دیا تھا کارروائی میں اپنا نام دیکھکر بچہ خوش ہوتا ہے تو کیا حقیقت میں چندہ دینے والا وہ بچہ ہے یا آپ ہیں اسکو خود سمجھ لیجئے اور یہاں استطراداً اسکے متعلق چند باتیں یاد آگئیں وہ بھی تبلادوں ایک یہ کہ باپ کو مناسب ہے کہ بچہ کے ہاتھ سے بھی کبھی کبھی خرچ کرایا کرے کبھی اسکے ہاتھ سے فقیر کو دلوادیا کبھی مدرسہ میں دلوادیا تاکہ اسکا حوصلہ بڑھے اور مال کی حرص نہ پیدا ہو دوسرے یہ کہ جب بچوں کے ہاتھ سے کسی دوسرے کو رقم دلواؤ خواہ فقیر کو یا مدرسہ کو تو اسوقت یہ رقم بچہ کو ہبہ نہ کرو بلکہ اباحت کے طور پر دو ورنہ وہ اسکی ملک ہو جائے گی پھر ہبہ صبی حرام ہوگا۔ اور اگر غلطی سے ایسا ہو جائے تو فقیر سے یا مدرسہ والوں سے رقم واپس نہ لو بلکہ خود بچہ کو اُسکے عوض اور رقم دیدو جس میں نیت عوض کی قید ضروری ہے ورنہ یہ مستقل ہبہ ہوگا پہلے کا عوض نہ ہوگا اور مدرسہ والوں کو چندہ کرنے والوں کو بھی چندہ لیتے ہوئے ان مسائل کا لحاظ رکھنا چاہیئے یہ چندہ جمع کرنے والے ہر شخص کی رقم کے لئے ہیں خواہ

کوئی بچہ دے یا عورت اور ان مسائل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے چنانچہ پانی پت میں ایک مدرسہ کے سفیر جو واعظ النساء تھے کہ ہمیشہ عورتوں ہی میں وعظ کہا کرتے تھے تشریف لائے اور چندہ کا وعظ کہا انکو ایک ہی حدیث یاد تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اے عورتوں میں نے تم کو جہنم میں سب سے زیادہ دیکھا ہے پس صدقہ کر کے اپنے کو جہنم سے بچاؤ اگرچہ زیور ہی میں سے ہو اسی حدیث کا ہمیشہ بیان کرتے تھے۔ عورتیں مردوں کے اعتبار سے زیادہ مالدار ہیں کیونکہ تھوڑا بہت زیور ہر عورت کے ہاتھ کان میں ہر وقت ہوتا ہے نیز یہ مردوں سے زیادہ سخی بھی ہیں کیونکہ زیور میں انکو کونسی مشقت پڑی تھی یا تو شوہر نے کما کر بنا دیا ماں باپ نے جوڑ جاڑ کر چڑھا دیا انکو تو ہر حال میں مفت ہی پڑتا ہے اس لئے چندہ کے وعظ میں انکے ہاتھ کان سے بہت جلدی زیور نکلنے لگتا ہے وہ سفیر صاحب غالباً اسی لئے عورتوں میں زیادہ وعظ کہتے تھے کہ یہ مالدار بھی ہیں اور عقل سے کوری بھی ہیں ہر شخص کی باتوں سے متاثر ہو جاتی ہیں ان سے چندہ خوب ملیگا چنانچہ ہر وعظ کے بعد ان کے پاس بہت سا زیور جمع ہو جاتا تھا ایک دن کسی عورت نے اپنے کان کی سونے کی بالیاں چندہ میں دیدیں سفیر صاحب بڑے خوش ہوئے مگر تھوڑی ہی دیر میں انکی خوشی کرکری ہو گئی کیونکہ اس عورت کا خاوند جو گھر میں آیا اس نے بیوی کے کان ننگے دیکھے پوچھا بالیاں کیا ہوئیں کہا مدرسہ کے مدرسہ چندہ میں دیدیں کہا بیوقوف تو کون تھی دینے والی

تجھے پہننے کو دی تھیں یا تیری ملکیت بنا دی تھی اسکے بعد وہ سفیر صاحب
کے پاس آیا اور کہا آپکو میری بیوی نے سونے کی بالیاں چندہ میں دی
تھیں وہ واپس کر دیجئے کیونکہ وہ اسکی ملک نہیں ہیں میری ملک ہیں
اور اس نے میری بغیر اجازت دی ہیں۔ سیدھی اور معقول بات تھی
مگر سفیر صاحب کسی طرح واپس دینے کو تیار نہ ہوئے اور اس سے جھگڑا
کرنے لگے ان دنوں میں بھی وہاں گیا ہوا تھا سفیر صاحب میرے پاس
آئے میں نے ان سے کہا کہ آپ معقول بات کو کیوں نہیں مانتے اور
بالیاں واپس کیوں نہیں دیتے تو انہوں نے بڑا عذر یہ کیا کہ میں تو
تنؔو روپیہ کی رسید کاٹ کر دے چکا ہوں اب اگر بالیاں واپس دے
دوں تو مدرسہ والے تو مجھ سے روپے وصول کر لیں گے کیونکہ رسید
کٹی ہوئی ہے۔ میں نے کہا اسکی تدبیر یوں کیجئے کہ ان سے وہ رسید منگوا
لیجئے اور اس پر انکے قلم سے لکھوا لیجئے کہ ہم نے یہ چندہ واپس لے لیا
اور دستخط کرا کے ایک دو گواہیاں بھی کرا لیجئے اسی طرح مثنی رسید پر
جو آپ کی بھی ہیں ہے واپسی مع دستخط اور گواہوں کے لکھوا لیجئے پھر
مدرسہ والے آپ سے کچھ نہ کہیں گے یہ تدبیر سُن کر مولوی صاحب کے
حواس درست ہوئے ان کا بال بال بچا اور اس غریب کی بالی بچی پس
عورتوں سے چندہ لینے والوں کو بڑی احتیاط کرنا چاہیئے کیونکہ یہ
اکثر بدون شوہر سے پوچھے شوہر ہی کے مال میں سخاوت کیا کرتی ہیں
یہ مسائل درمیان میں استطرادا مذکور ہو گئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا

کہ جسطرح آپ بچہ کے ہاتھ رقم دلواکر بچہ کا نام کر دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ آپ کا نام کر رہے ہیں ورنہ بتلائیے کہ جان آپکی کدھر سے ہو گئی مال آپ کا کدھر سے ہو گیا یہ تو سب کچھ حق تعالیٰ کا ہے آپ کا نام برائے نام ہے اب بتلاؤ اسکے عوض میں جو کچھ جنت کی نعمتیں ملیں گی وہ عوض ہے ہر گز نہیں بلکہ سراسر فضل و رحمت ہے مگر اس برائے نام مِلک کا شریعت نے اعتبار کیا ہے اور اسکو مِلک حقیقی ہی کے احکام دیئے ہیں یہ شریعت کا بڑا احسان ہے ورنہ اگر یہ نہ ہو اور حقیقت کا مسئلہ عملاً بھی مان لیا جائے کہ ؎

در حقیقت مالک ہر شئے خداست　　　این امانت چند روزہ نزد ماست

تو عالم میں فساد برپا ہو جائے کوئی کسی کی بیوی کو لے بھاگے کوئی کسی کی نقدی اور زیور پر قبضہ کرلے اور جب مالک کہے کہ یہ تو میری چیز ہے اسکو یہی کہہ کر دھمکا دے کہ تیری کہاں سے آئی تھی سب چیزیں خدا کی ہیں ہم بھی خدا کے ہیں آجتک تو نے برتا اب ہم برتیں گے اس مسئلہ پر عمل ہونے لگے تو پھر شیخ صاحب بھی پٹھانوں جیسے کام کرنے لگیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

سر پنہان ست اندر زیر و بم　　　فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسکا یہی مطلب بیان فرمایا تھا کہ اگر توحید کو ظاہر کر دوں تو نظام عالم درہم برہم ہو جائیگا اسکی وجہ یہی ہے کہ توحید کا تو یہی مقتضا ہے کہ خدا تعالیٰ کے روبرو

کسی کی ملک ملک نہیں ایک مقام پر مولانا نے اسکے مناسب ایک حکایت بیان فرمائی ہے کہ ایک ایسا ہی شخص ایک شخص کے باغ میں گھس کر انگور کھانے لگا باغبان آگیا تو اس کو دیکھکر بھی آپ ڈرے نہیں بے تکلف کھاتے رہے اس نے دھمکایا کہ نامعقول یہ کیا کر رہا ہے بدون اجازت کے میرا پھل کھا رہا ہے تو وہ صاحب حقیقت بولے بس خاموش رہ بک بک نہ لگا۔ باغ بھی خدا کا پھل بھی خدا کا ہاتھ بھی خدا کا میں بھی خدا کا پھر تو روکنے والا کون ہے اس نے نوکر کو آواز دی کہ ایک رسّا اور ڈنڈا لانا اور اس میں اسکو جکڑ کر ڈنڈے سے مارنا شروع کیا اب وہ لگا چلاتے تو باغ والا کہتا ہے کہ بس خاموش رہو رسّا بھی خدا کا تُنگا بھی خدا کا پھر چلانے کی کیا بات ہے غرض خوب بازآ آخر اس نے عقیدہ سے توبہ کی اور کہا ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار اختیار ست اختیار ست اختیار ست

اہل جبر وہی لوگ ہیں جو حقیقت کے قائل ہیں اور اختیار کے انکار سے شریعت کے منکر ہیں انہوں نے ؎

در حقیقت مالک ہر شئی خداست میں اتنا اور اضافہ کر دیا کہ فاعل ہر شئی نیز خداست کہ ہر کام کرنے والا بھی انسان نہیں بلکہ خدا ہی ہے اور صفت اختیار سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے انکار کر بیٹھے ہیں میں کہتا ہوں بہت اچھا اگر انسان کو اختیار کچھ نہیں ہے تو پھر سب کو اعمال صالحہ کے بعد بھی جہنم کے لئے تیار رہنا چاہیے کیونکہ آپ نے یہ اعمال تھوڑا ہی کئے ہیں آپ تو مجبور تھے جیسے یہاں مجبور رہو آخرت میں

بھی مجبور رہو اللہ تعالیٰ جہاں بھیجدیں چلے جانا صاحبو! انسان میں صفت
اختیار کا ہونا دلیل کا محتاج نہیں بلکہ یہ وجدانی امر ہے ہر شخص وجدان
سے اسکو محسوس کرتا ہے کہ ہاں میرے اندر اختیار ہے۔ دیکھئے مرتعش
(جسکے ہاتھ میں رعشہ ہو) اور کاتب کی حرکت ید میں فرق بین ہے پہلا
شخص حرکت میں مجبور ہے دوسرا مجبور نہیں ایک شخص کو ڈھاکر زبردستی
اسکا منہ کھول کر کسی نے شراب پلادی اور ایک نے روپیہ ہاتھ میں
لیا اور شراب کی بھٹی پر گیا بھاؤ تاؤ کیا اور بوتل خرید کر پی لی۔ کیا دونوں
برابر ہیں ہرگز نہیں بلکہ مجبور پہلا شخص ہے دوسرے کو مجبور کوئی نہیں کہہ
سکتا ۱۲) اور یہ ایسا فرق ہے جس کو حیوانات بھی جانتے ہیں اگر آپ کتے
یا بھیڑیئے کے ڈھیلا یا لاٹھی ماریں تو وہ لاٹھی ڈھیلے پر حملہ نہ کریگا بلکہ
آپ پر حملہ کریگا وہ بھی جانتا ہے کہ لاٹھی اور ڈھیلے کی خطا نہیں وہ تو
مجبور ہے خطا آدمی کی ہے جو اختیار سے ہم کو ستا رہا ہے بہر حال اگر شریعت
نہ ہو تو حقیقت سے تو سارے عالم میں فساد ہو جائے لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ
شریعت نے جو انسان کے برائے نام ملک اور اختیار کو تسلیم کر کے اس کے
احکام مقرر کئے ہیں اس سے یہ تو مقصود نہیں کہ تم حق تعالیٰ کے سامنے
بھی اپنی ملک جتلایا کرو بس انسان کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے
حقیقت پر نظر رکھے کہ اپنی جان کو اپنی جان نہ سمجھے نہ مال کو اپنا مال
سمجھے نہ اپنے کمالات کو اپنے کمالات سمجھے بلکہ سب کو عطایائے حق سمجھتا
رہے اور بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے شریعت پر نظر رکھے یہ ایک اشکال

تھا جس کو میں نے درمیان میں حل کر دیا۔

اہتمام حسنات و اجتناب سیّات

اب اصل بات کی طرف عود کرتا ہوں کہ تم حق تعالیٰ سے حساب نہ کرو اور شعبان و رمضان میں تفاوت نہ کرو جب موقع ہو فوراً خرچ کر دو تم کو کیا خبر کہ اسوقت کتنا ثواب ملا رمضان سے کم ملا یا زیادہ کیا عجب ہے کہ اسوقت ضرورت کے وقت جو مسکین کو سہارا مل گیا ہے اسکی دُعا عرش سے کتنی اوپر گئی ہو گی اور اس دعا سے تم کو کیا کچھ ملا ہو گا اور مان لو کہ اسوقت رمضان سے کم ہی ثواب ملا تو تم کو یہ کیا خبر ہے کہ رمضان تک تم زندہ رہو یا نہ رہو اور یوں امید تو پہلے زمانہ میں بھی کسی کو نہ تھی کہ ایک دن یقیناً زندہ رہیں گے مگر پہلے زندگی کی ایسی ناامیدی بھی نہ تھی جیسی آجکل ہو گئی ہے کیونکہ آئے دن نئی نئی وبائیں قسم قسم کی بلائیں آتی رہتی ہیں اب تو ایک دن کا بھی بھروسہ نہیں اگر کہو کہ ہم وصیت کر جائیں گے کہ رمضان میں اتنی رقم دیدی جائے تو اسکا جواب یہ ہے کہ وصیت کا ثواب اپنے ہاتھ سے دینے کے برابر نہیں دوسرے کیا بھروسہ ہے کہ ورثہ ادا کریں گے یا نہیں یہ غلطی تو ان لوگوں کو ہوتی ہے جو راغب الی الخیر ہیں اور جو راغب الی الخیر نہیں ہیں انکے یہاں تو رمضان کا مہینہ آتا ہی نہیں جیسا ایک خشک مین کا قصہ ہے کہ رمضان میں ایک دوست ان سے ملنے گئے تو دیکھا وہ بے تکلف ناشتہ کر رہے سگریٹ پی رہے ہیں کہا کیا آپ رمضان میں

ایسا کرتے ہیں کہنے لگے رمضان کیا ہوتا ہے کہا ایک مہینہ کا نام ہے تو جنٹل مین نے مہینوں کی گنتی شروع کی جنوری - فروری - مارچ - اپریل - مئی - جون - جولائی - الخ کہا ان میں تو رمضان کا نام کہیں بھی نہیں یہ تو نمبر اول کے جنٹل مین تھے اور جو نمبر دوم کے جنٹل مین ہیں انکے یہاں رمضان آتا تو ہے مگر بلائے بے درماں کی طرح آتا ہے کیونکہ وہ سارے سال تو مشغول رہتے ہیں جنوری فروری میں رمضان کی خبر انکو ایک دم ہو جاتی ہے کہ آج رمضان آگیا تو وہ گھبرا کر کہتے ہیں کہ ابھی ابھی تو گیا تھا ابھی پھر آگیا - صاحبو! مسلمانوں کو تو شمسی حساب میں ایسا غلو نہ چاہیئے کہ سال بھر بھی اسلامی مہینوں کی خبر نہ ہو یہ میں نے مانا کہ تجارتی ضرورتیں شمسی حساب پر مجبور کرتی ہیں تو میں اس سے منع نہیں کرتا آپ تجارتی کاغذات میں اسی سے حساب رکھیئے مگر نجی معاملات میں کونسی مجبوری ہے دوستوں کو جو رات دن خطوط لکھے جاتے ہیں ان میں شمسی حساب کی کیا ضرورت ہے اسکو چھوڑو اور اپنی نجی خط وکتابت میں قمری حساب کو استعمال کرو - غرض اس میں شک نہیں کہ رمضان میں تضاعف حسنات ہوتا ہے اور اسلئے تمام سال میں رمضان کا مہینہ سب مہینوں سے افضل ہے مگر اسکا یہ مطلب نہیں جو لوگوں نے سمجھا ہے کہ اسکی وجہ سے طاعات کو دوسرے مہینوں پر ملتوی رکھتے ہیں کہ رمضان میں کریں گے یاد رکھو کہ شارع کا یہ مطلب ہرگز نہیں ایک تو یہ غلطی تھی ایک دوسری غلطی پر اور متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ

لوگوں نے رمضان کے فضائل میں سے بس یہی یاد کر لیا ہے کہ اس میں حسنات کا تضاعف ہوتا ہے اور یہ نہیں یاد رکھا کہ گناہ کا بھی تضاعف ہوتا ہے کیونکہ مبارک مکان و مبارک زمان میں جسطرح نیکی بڑھتی ہے گناہ بھی بڑھتا ہے جیساکہ زنا کرنا ہر جگہ بُرا ہے مگر مسجد میں کرنا بہت بُرا ہے اسی طرح رمضان کا گناہ اور دنوں کے گناہ سے سخت ہوگا پس رمضان میں جبکہ طاعات و حسنات کا اہتمام ضروری ہے ایسا ہی سئیات سے اجتناب بھی سخت ضروری ہے مگر یار لوگوں نے گناہوں میں بھی وہی خانہ ساز حساب لگایا ہے جو حسنات میں لگایا تھا یعنی اللہ تعالیٰ سے ضابطہ کرنا چاہتے ہیں چنانچہ علماء سے پوچھتے ہیں کہ یہ کام کرنا کیسا ہے وہ بتلاتے ہیں کہ گناہ ہے تو اسکے بعد سوال ہوتا ہے کہ یہ چھوٹا ہی سا گناہ ہے یا بڑا گناہ ہے میں ایسے نامعقولوں کو یہ جواب دیتا ہوں کہ کیوں صاحب اگر چھوٹا گناہ ہوا تو آپ کا ارادہ کرنے کا ہے اگر کہے ہاں تو میں کہتا ہوں کہ پھر مجھے بھی اجازت دو کہ تمہارے گھر کے چھپّر میں ایک چھوٹی سی چنگاری رکھدوں اور اگر کوئی ایسا کرے اور یہ کہے کہ یہ تو ذراسی چنگاری ہے اس کا کیا حرج ہے تو تم گوارا کرلوگے اسکا جواب سب یہی دیتے ہیں کہ نہیں کیونکہ ذراسی چنگاری کا بڑھ جانا کیا مشکل ہے خدا بُری گھڑی نہ لائے تو حضرت ایسی ہی ہر چیز کا بڑھ جانا کیا مشکل ہے خصوصاً گناہ کا اور ایک گناہ تو ایسا ہے جسکا بڑھنا بڑے ہی غضب کا ہے اور اسی سے لوگ بہت بے فکر ہیں یعنی نگاہ بد۔ کانپور میں ایک صاحب بوڑھے ثقہ پابند صوم و صلوٰۃ تہجد گزار تھے مگر اس مرض بدنظری

کی بدولت ایک یہودن کے عشق میں گرفتار تھے اور یہ حال ہوا کہ ایکدن میرے سامنے رونے لگے اور کہا کہ اس عشق نے تو میرا ایمان بھی برباد کر دیا نہ میرا اسلام کچھ رہا نہ ایمان بس اگر وہ یہودن ہے تو میں یہودی ہوں اور وہ مسلمان ہے تو میں مسلمان ہوں میں نے کہا توبہ کرو تو یہ کیا بکتے ہو مگر وہ ایسے بیخود تھے کہ باوجود میرا ادب کرنیکے میرے سامنے بھی ایسے کلمات کفر کہہ گئے حضرت یہ نظر بد سخت خطرناک ہے حدیث میں ہے النظر سہم من سہام ابلیس[ع] کہ یہ شیطان کا تیر ہے اور ایک شاعر کہتا ہے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشان زدۂ ۔ بحیرتم چہ عجب تیر بے کمان زدہ

واقعی یہ تیر بے کمان ہی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھکر ہے اسلئے رمضان میں تمام گناہوں سے عموماً اور نظر بد سے خصوصاً نہایت اہتمام کے ساتھ بچنا چاہیئے یہ مضمون صرف استطراداً بیان ہو گیا کیونکہ اسوقت جو آیت میں نے پڑھی ہے اور اس سے جو مضمون بیان کرنے کا ارادہ ہے اس کو رمضان سے صرف اسی وجہ سے تعلق نہیں ہے کہ آیت میں انفاق کا ذکر ہے اور رمضان میں انفاق کی فضیلت وارد ہے بلکہ زیادہ تعلق دوسری وجہ سے ہے مگر استطراداً کچھ مضمون انفاق بھی بیان کر دیا گیا کیونکہ آیت میں تو انفاق کا بھی ذکر ہے گو مجھ کو مقصود بالذات دوسرا مضمون ہے۔

ع؎ روی الحاکم عن ابی حذیفۃ وصح اسنادہ کذا فی تخریج العراقی

پختگی نفس رضائے الٰہی ہے

اب مَیں اصل مقصود کو شروع کرنا چاہتا ہوں جسکے لئے اول ترجمہ آیت کا سننا ضروری ہے تاکہ ترجمہ نہ جاننے والوں کو بھی ربط کا عجیب ہونا معلوم ہوجائے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں (تاکہ آیندہ انفاق بھی اور دوسرے اعمال صالحہ بھی سہولت سے صادر ہوا کریں) ان لوگوں کے صدقات ونفقات کی حالت مثل ایک باغ کی حالت کے ہے جو بلند زمین پر ہے اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ زمین تو نشیب کی اچھی ہوتی ہے جس میں پانی ٹھہرے بلند زمین میں پانی کیونکر ٹھہرے گا۔ جواب یہ ہے کہ زمین بلند سے یہ کیونکر سمجھ لیا گیا کہ وہ گنبد ہے بلکہ بلند بھی ہے اور مسطح بھی ہے کیونکہ بلندی پر ہوا لطیف ہوتی ہے اسکے بعد ارشاد ہے۔ اصابھا وابل اسکو موسلا دھار بارش نصیب ہوگئی تو وہ اپنا پھل دوچند لایا یا چار چند۔ دو باتیں اسلئے کہی کہ ضعف کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ ضعف کہتے ہیں مجموعہ مثلین کو تو ضعفین تثنیہ ہے اسکے معنی چار مثل یعنی چار چند کے ہوگئے اور بعض نے کہا ہے کہ ان مثلین میں سے ہر مثل کو ضعف کہتے ہیں انکے نزدیک ضعفین کا ترجمہ دوچند ہوگا جیسے زوج کبھی ہر فرد کو کہتے ہیں جسکا تثنیہ زوجین بمعنی صنفین آتا ہے اور کبھی مجموعہ فردین کو کہتے ہیں جیسے دو کے عدد کو زوج کہتے ہیں بمعنی مجموعہ عددین آگے فرماتے ہیں فان لم

یصیبھا وابل فطل اور اگر اسکو موسلا دھار بارش نہ پہونچے تو پھوار بھی کافی ہے ای فطل یکفیہ طل یا تو طل مبتدا ہے خبر محذوف ہے یا فاعل ہے جسکا فعل مقدر ہے اور نکرہ کا مبتدا ہونا جو ممنوع ہے وہ اسوجہ سے ہے کہ مفید نہیں ہوتا اور اگر مفید ہو تو مبتدا ہونا جائز ہے اور یہاں مفید ہے وجہ افادہ کی یہ ہے کہ یہ صورۃً نکرہ ہے اور معنیً نکرہ موصوفہ ہے کیونکہ طل سے مراد مطلق طل نہیں بلکہ وہ طل ہے جو اس باغ سے لگے اسکو پہونچے اسکے بعد ارشاد ہے واللّٰہ بما تعملون بصیر ۵ اس کا ربط آیت کے اجزاء کی تحلیل سے معلوم ہوگا بدون اسکے معلوم نہ ہوگا اور تحلیل اجزاء میں طول ہے اسلئے اسکو ترک کرتا ہوں اگر موقع ہوا تو اخیر میں اس پر بھی تنبیہ کر دوں گا خدا کرے یاد رہے اب میں اپنا مقصود جو اس آیت سے مجھے استنباط کرنا ہے بیان کرتا ہوں اور وہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسکو میں اپنے احباب سے اکثر خاص خطاب سے عرض کیا کرتا ہوں اور آج عام خطاب سے سب کے سامنے عرض کرتا ہوں پس مسئلہ تو جدید نہیں مگر شاید تقریر میں کچھ جدت آجائے اور قدیم بھی ہو تو ہر قدیم فرسودہ نہیں ہوتا آسمان کتنا پرانا ہے مگر حالت یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فارجع البصر ھل تریٰ من فطور ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا وھو حسیر ۵ کہ ذرا دیکھو تو آسمان کہیں سے کچھ پھٹا ہوا نظر آتا ہے پھر بار بار دیکھو تو نگاہ تھک کر لوٹ آئے گی اور کوئی شقاق یا فطور نظر نہ آئے گا شمس و قمر کتنے پرانے ہیں مگر

دیکھو ویسے ہی آب و تاب کے ساتھ اب تک موجود ہیں اور بعضے پرانے بڈھے نئے بڈھوں سے اچھے ہیں بہر حال مضمون کا جدید ہونا کچھ ضرور نہیں مگر آجکل لوگوں کو جدت کا ہیضہ ہے ہیضہ مردوں کو بھی ہوتا ہے گو حیض عورتوں ہی کو ہوتا ہے مگر ہیضہ اور حیض قریب ہی قریب ہے تجوید و قرأت سے کون بولتا ہے عام تکلم و تلفظ ہیں تو حیض و ہیضہ برابر ہے قرأت پر ایک لطیفہ یاد آیا ایک قاری صاحب نے اپنے شاگردوں کو حکم کر رکھا تھا کہ ہر بات قرأت سے کیا کرو تو ایک دفعہ حقہ پیتے ہوئے قاری صاحب کے عمامہ پر چنگاری گر پڑی شاگرد نے قاری صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھکر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرأت کے ساتھ پڑھکر نہایت ترتیل سے کہا جناب قاری صاحب جناب قاری صاحب آپ کے عمامہ شریف پر آگ کی ایک چنگاری گر پڑی ہے اور ہر جگہ خوب مد کھینچا اتنی دیر میں عمامہ کی انگل جل گیا۔

راحت کی جگہ عالم آخرت ہے

وہ مسئلہ یہ ہے کہ آجکل بعض سالکین کو سہولت کی بہت تلاش ہے جس کی وجہ صرف راحت طلبی ہے جیسے ایک طبیب ماہر کہتا ہے کہ کوئی صورت ایسی ہوتی کہ سارا کھانا ایک دم سے پیٹ میں اتر جایا کرے لقمہ لقمہ نہ کھانا پڑے تاکہ تداخل طعام نہ ہو خیر اس شخص کی اس رائے کی بنا تو ایک مصلحت بھی ہے لیکن آجکل تو ایسا ممکن بھی ہوتا تو اسکی بنا راحت طلبی ہی ہوتی۔ افسوس آجکل سالکین بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا نہ

پڑے خود بخود سارا کام ایک دن میں ہو جائے یہ سخت غلطی ہے صاحبو!
راحت کی جگہ تو عالم آخرت ہے اور وہاں بھی جو راحت حاصل ہو گی وہ
بھی دنیا کی جہد کا ثمرہ ہے۔

ع چند روزے جہد کن باقی بخند

بدون مشقت و مجاہدہ کے راحت نصیب نہیں ہو سکتی ہاں اگر حق تعالیٰ
خود ہی دنیا میں راحت دیدیں تو اور بات ہے تم کو طلب راحت کا کیا حق
ہے تمہارا مذاق تو یہ ہونا چاہیئے ؎

زندہ کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

مولانا ایسے ہی لوگوں کی بابت فرماتے ہیں ؎

گر طرب را باز دانی از بلا
پس زبون وسوسہ باشی دلا

اور فرماتے ہیں ؎

تو بیک زخمی گریزانی ز عشق
تو بجز نامی چہ می دانی ز عشق

بس آجکل سالکین کی محبت و طلب کی یہ حالت ہے جیسے ایک شخص ایک
درخت کے نیچے بیٹھ کر کہا کرتا تھا کہ اے اللہ مجھے کھینچ کسی ظریف نے سن لیا
اس نے اسکے ساتھ دل لگی کی کہ اگلے دن اندھیرے سے اس درخت پر
ایک رسی ساتھ لیکر جا بیٹھا جب رات کو وہ شخص آیا اور وہی دعا شروع
کی کہ اے اللہ مجھے کھینچ لے تو اس ظریف نے دبی زبان سے کہا کہ اے
میرے بندے آج میں تجھے کھینچتا ہوں یہ رسی اپنے گلے میں ڈال لے وہ
بڑا خوش ہوا کہ اب مجھے معراج ہو گی رسی کا پھندا فوراً گلے میں ڈال لیا

اور ظریف نے کھینچنا شروع کیا جب ایک بالشت زمین سے اٹھا اور پھندے سے گلا گھٹنے لگا تو فوراً کہتا ہے کہ اے اللہ مجھے چھوڑ دیں نہیں کھینچنا اس نے رسی چھوڑ دی اور اس نے فوراً پھندا گلے سے نکال کر اپنے گھر کا رستہ لیا پھر ساری عمر اس درخت کے نیچے جانے کا نام نہیں لیا بس یہی حالت آجکل کے طالبوں کی ہے کہ جبتک تکلیف نہ ہو حتیٰ کہ عمل میں بھی کچھ مشقت نہ ہو اسوقت تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت وعشق کا دعوے ہے اور جہاں کچھ تکلیف یا مشقت ہوئی سارا عشق رخصت ہوا حالانکہ ان کو تو جان دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے ہمارے حاجی صاحب کا شعر ہے ع متاع جان جاناں دینے پر بھی سستی ہے الیٰ آخرہ

مگر اب سالک نہیں ہونا چاہتے بلکہ مالک ہونا چاہتے ہیں اسی لئے سہولت کے طالب ہیں چنانچہ میرے پاس کثرت سے خطوط میں یہ فرمائش آتی ہے کہ کوئی سہل سا طریقہ آسان سا عمل کوئی سہل سا نسخہ بتلا دیجئے ایسی درخواست کا جواب ایک بزرگ نے خوب دیا ان سے ایک پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر نے یہی درخواست کی تھی کہ کوئی سہل سا طریق بتلا دیجئے جس سے بہت جلدی کامیابی ہو جائے بزرگ نے ابھی اس کا جواب نہیں دیا بلکہ باتوں میں لگایا اور باتوں باتوں میں اُن سے دریافت کیا کہ ڈپٹی صاحب ذرا اپنی سوانح عمری تو بیان فرمایئے کہ آپ نے کیا کیا پڑھا اور کس طرح ڈپٹی کلکٹر ہوئے انہوں نے اپنی سرگذشت بیان کی کہ بارہ سال تک انگریزی پڑھی بی۔ اے کا امتحان

دیا پھر قانون کا امتحان دیا پھر سال بھر تک ملازمت کے لئے سفارشیں حاصل کیں درخواستیں دیں تو نائب تحصیلدار ہوا پھر کئی سال کے بعد تحصیلدار ہوا پھر کئی سال کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہوا اور سالہا سال کی ملازمت کے بعد اب پنشن ملی ہے جب یہ اپنی سرگذشت بیان کر چکے تو بزرگ نے فرمایا کہ آپکو شرم تو نہیں آتی کہ دنیا مردار کے لئے تو اتنی عمر برباد کی اور مشقتیں برداشت کیں اور طلب خدا کے لئے یہ درخواست ہے کہ تھوڑی سی مدت میں کامیابی ہو جائے ڈپٹی صاحب کم از کم طلب خدا کے لئے اس سے دگنی مدّت تو صرف کرو کیونکہ آخرت دنیا سے افضل ہے تو افضل کے لئے مفضول سے دگنی مدت تو چاہیئے ورنہ مساوی تو ضرور چاہیئے۔ واقعی عقل کا مقتضیٰ تو یہی ہے جوان بزرگ نے فرمایا اب آپکی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ جو لوگ طلب خدا میں سہولت کے طالب ہیں وہ کیسی سخت غلطی میں مبتلا ہیں ہم کو تو وہ کام کرنا چاہیئے جس کا ہم کو حکم ہوا ہے۔ وصول و حصول کا تقاضا نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ہماری برائے نام کوشش پر وصول و حصول کا مرتب ہو جانا خود خلافِ قاعدہ ہے تو اس برائے نام کوشش پر حصول ثمرات کا اپنے کو مستحق سمجھنا اور عدم حصول پر شکایت کرنا سخت ناانصافی ہے۔

تحصیل عمل بالاختیار وہ کام کیا ہے جس کا ہم کو حکم ہوا ہے وہ تحصیل عمل بالاختیار ہے کہ اپنے اختیار کو صرف کر کے اعمال کو بجالائیں اور اسی استعمالِ اختیار کا دوسرا

لقب امانت ہے جسکے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان ط کہ ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین وجبال پر پیش کی کہ اس کا تحمل کرتے ہو تو سب نے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا اس امانت سے مراد کیا ہے۔ محققین علماء فرماتے ہیں کہ اس سے تکلیف تشریعی مراد ہے اور تکلیف کے معنی تحصیل عمل بالاختیار کیونکہ مطلق عبادت واطاعت سے تو کوئی شی خالی نہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثم استوی الی السماء وھی دخان فقال لھا وللارض ائتیا طوعا او کرھا قالتا اتینا طائعین ط کہ ہمنے زمین و آسمان سے کہا کہ ہمارے احکام (تکوینیہ) کیلئے تیار ہو جاؤ خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے سب نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے تیار ہیں اور لفظ طائعین سے صاف رد ہو رہا ہے ان لوگوں کا جو سموات و ارض وجمادات کی عبادت کو حالیہ یا قسریہ کہتے ہیں میں کہتا ہوں کیا قسرد حال میں طوع بھی ہوا کرتا ہے ہر گز نہیں بہر حال عابد و مطیع تو تمام مخلوقات ہیں لیکن مکلف سب نہیں بجز انسان کے اس سے معلوم ہوا کہ تکلیف و اطاعت میں فرق ہے اور جس امانت سے تمام عالم گھبرا گیا وہ تکلیف ہی ہے جس سے مراد عمل مع الاختیار ہے حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق سے یہ فرمایا تھا کہ ہمارے کچھ احکام تشریعیہ ہیں انکا مکلف بالاختیار کون ہوتا ہے یعنی جو شخص انکا تحمل کرے گا اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کی جاویگی یعنی اسکی قوت ارادیہ ان احکام پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہ

ہو گی بلکہ عمل و عدم عمل دونوں پر قدرت دی جائے گی پھر جو اپنے اختیار سے احکام کو بجالائے اسکو مقرب بنالیا جائیگا اور جو اپنے اختیار سے احکام میں کوتاہی کریگا اسکو مطرود کر دیا جائیگا اس سے سموات وارض وجبال اور تمام مخلوق ڈر گئی انسان اسکے لئے آمادہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مکلف بنادیا یعنی اسکو صفت اختیار مع عقل کے عطا کر دی گئی باقی مخلوقات میں یہ صفت اختیار اور عقل نہیں ہے اور وہ جن احکام تکوینیہ کو یا عبادت کو بجالاتے ہیں وہ انکے لئے طبعی ہیں یعنی انکی قوت ارادیہ اسکے خلاف کی طرف مائل ہی نہیں ہوتی بخلاف انسان کے کہ جن احکام کا یہ مکلف ہے وہ اسکے لئے طبعی نہیں بلکہ اسکی قوت ارادیہ عمل و عدم عمل دونوں کی طرف مائل ہوتی ہے اب اس کی تکلیف کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ اپنے اختیار سے ایک جانب کو ترجیح دے یعنی جانب عمل کو مامورات اور جانب عدم عمل کو منہیات میں اسی کا نام تحصیل عمل ہے اور اس سے یہ لازم نہیں کہ غیر انسان عاقل نہ ہو ممکن ہے کہ دوسری مخلوقات بھی عاقل ہوں مگر عاقل کامل نہیں یعنی انکو عقل کا وہ درجہ حاصل نہیں جو تکلیف احکام کے لئے کافی ہو۔ آخر صبی۔ مراہق بھی تو عاقل ہے مگر باوجود عقل کے مکلف نہیں کیونکہ اس کی عقل کامل نہیں جو تکلیف کے لئے کافی ہو اور چونکہ اس پر کوئی شرعی اشکال لازم نہیں آتا اسلئے میں اسکا قائل ہوں کہ تمام مخلوقات حیوانات و نباتات حتیٰ کہ جمادات بھی عاقل ہیں یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ انسان کے سوا سب غیر عاقل ہے ہاں یہ مسلم ہے کہ ان میں اتنی عقل نہیں جو تکلیف

کے لئے کافی ہو پس وہ مثل مراہق کے عاقل ہو سکتے ہیں اس کی کسی نص سے نفی نہیں ہوتی بلکہ تائید ہوتی ہے آخر ہد ہد کی گفتگو حضرت سلیمانؑ کے ساتھ جو قرآن میں مذکور ہے کیا یہ سب طبعی کلام ہے ہرگز نہیں بلکہ عاقلانہ کلام ہے اور اگر اسکو حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ قرار دو کہ اللہ تعالیٰ نے انکی خدمت کے لئے بعض حیوانات کو عقل دیدی تھی تو میں کہوں گا کہ اب بھی بعض حیوانات کی حرکات ایسی ہوتی ہیں کہ خالی از عقل کہنا دشوار ہے چنانچہ جسکی حکایت میں اب بیان کرتا ہوں وہ مرحومؔ مرگیا یعنی ہمارے گھر میں ایک طوطا تھا اس نے ایک دن بیبیوں کو پان کھاتے دیکھکر خود بھی پنجرہ سے نکل کر اس ترتیب سے پان کھایا کہ اول تو پان کا ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا پھر چونا کی ڈبیہ میں سے چونچ پر ذرا سا چونا لیا پھر کتھہ کی ڈبیہ میں سے کتھہ لیا اور دو دانہ چھالیہ کے اٹھائے اور سب کو ملا کر کھا گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ وہاں ہی تمباکو کی ڈبیہ تھی مگر تمباکو نہیں کھایا سب کو اس حرکت پر حیرت ہوگئی کہ اس نے کیونکر باقاعدہ سارا کام کیا اور جب حیوانات میں بھی ایک درجہ عقل کا ہو سکتا ہے اور اسکے بعد بھی وہ مکلف نہیں تو یہاں سے سمجھ لو کہ اگر مجاذیب میں بھی ایک درجہ عقل کا ہو تو کچھ تعجب نہ کرنا چاہیئے اور یہ نہ کہنا چاہیئے کہ انکو تو کھانے پینے کا پورا ہوش ہے پھر یہ مجذوب کدھر سے ہوئے اسی لئے شیخ ابن عربی رح فرماتے ہیں کہ مجاذیب پر اعتراض نہ کرو گو ظاہر میں وہ

ؔ ظرافت سے مرحوم کہہ دیا ۱۲

صحیح الحواس معلوم ہوں کیونکہ صحت حواس تو بہائم میں بھی ہے جانور بھی اپنے نفع ونقصان کو سمجھتا ہے مگر اتنے ادراک سے وہ مکلف نہیں ہوا تو مجذوب بھی باوجود عقل قلیل کے غیر مکلف ہو سکتا ہے جسکی مثال واضح وہی ہے جیسی مراہق کی مگر اسکے لئے ایک معیار بھی ہے کہیں تم کافروں کو بھی مجذوب نہ کہنے لگو وہ معیار یہ ہے جسکو مولانا فرماتے ہیں ؎

جملہ دانایاں ہمیں گفتہ ہمیں　　　ہست داناں رحمۃ للعالمین

یہ دوسرا مصرعہ جملہ معترضہ ہے جو بطور مدح کے درمیان میں لایا گیا ہے کہ واقعی محقق بھی عالم کے لئے سراپا رحمت ہے یہ گفت کا مقولہ نہیں اس کا مقولہ اگلے شعر میں ہے ؎

گر انارے می خری خنداں بخر　　　کہ دہد خندہ اش زدانہ او خبر

کہ اگر ایک انار خرید و تو کھلا ہوا خرید و کیونکہ کھلے ہوئے انار کا اندرونی حال ظاہر ہو جاتا ہے بند انار مت لو کہیں اندر سے کچا اور خراب نہ نکلے ؎

نامبارک خندہ آں لالہ بود　　　کہ زخنداں او سوادو دل نمود

مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی صحبت اختیار کرو اور اس سے فیض لینا چاہو تو پہلے علامات وآثار کو دیکھکر اسے جانچ لو اور اگر وہ سالک ہو تو آثار سلوک کو دیکھو اور اگر مجذوب ہو تو یہ دیکھو کہ اس زمانہ کے صلحاء اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں اگر وہ اسکو مجذوب کہیں اچھا سمجھیں تو وہ اچھا ہے گو نماز روزہ کا پابند نہ ہو۔ اگر صلحاء زمانہ اس کو مجذوب نہ سمجھیں اور ظاہری حالت اس کے خلاف شروع ہو تو اس کے پاس

نہ جاؤ تو امانت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات سے فرمایا کہ یہ صفت اختیار ہے
اور یہ عقل ہے ان کو کون لیتا ہے جو انکو لے گا وہ مکلف احکام بنایا جائیگا
اس سے سب ڈر گئے اور انسان تیار ہوگیا پس مکلف بجز انسان وجنات کے
کوئی نہیں اور شمس و قمر و احجار جو جہنم میں جائیں گے تو معذب ہوکر نہ جائیں
گے تاکہ تکلیف کا شبہ ہو بلکہ آلۂ تعذیب ہوکر جائیں گے تاکہ کفار کو ان کو
دیکھکر حسرت ہو کہ افسوس ہمنے کن چیزوں کو معبود بنایا تھا جو ہماری تو کیا
اپنی بھی امداد نہیں کرسکتے اور گو عدم امداد کا علم غیبت میں بھی ہوسکتا تھا
مگر اس صورت میں کفار کو یہ وسوسہ ہوتا کہ نہ معلوم خدا تعالیٰ نے ہمارے
معبودوں کو کہاں مقید کردیا جو ہماری امداد نہ کرسکے اسلئے سب کو پاس
پاس کردیں گے کہ لو یہ تمہارے معبود ہیں اگر ان میں کچھ طاقت ہے تو ان
سے امداد طلب کرلو اس صورت میں انکو حسرت زیادہ ہوگی اب یہاں
ایک سوال ہوتا ہے وہ یہ کہ انسان کو کیا سوجھی تھی جو اس امانت کے لئے
تیار ہوگیا کیا یہی سب سے بڑا تیس مار خاں تھا اس کا جواب یہ ہے کہ انسان
میں عشق کا مادہ بہت زیادہ ہے اسی لئے میں ابتدا رطالب علمی میں کہا
کرتا تھا کہ انسان کی حقیقت حیوان عاشق ہے اسکی فصل عاشق ہے کیونکہ
ناطق تو جنات و ملائکہ بھی ہیں عاشق انسان کے سوا کوئی نہیں (اور عشق و
محبت میں فرق ہے اسلئے محبت کا وجود ملائکہ وجنات میں بھی ہوسکتا ہے
میں محبت کی ان سے نفی نہیں کرتا عشق کی نفی کرتا ہوں جس کے لئے جوش
اور شوق اور ہیجان و ولولہ لازم ہے ۱۲) غرض انسان میں عشق بہت زیادہ

تھا اور اسوقت بھی تھا جبکہ اسکو عقل کامل بھی عطا نہ ہوئی تھی (کیونکہ عقل کامل تو بعد حمل امانت کے عطا ہوئی اور غلبۂ عشق تو قلت عقل ہی میں زیادہ ہوتا ہے اسی لئے کیفیات باطنہ کا غلبہ قلیل العقل پر زیادہ ہوتا ہے کیونکہ غلبۂ کیفیات کے لئے یکسوئی شرط ہے جو غیر عاقل کو زیادہ میسر ہوتی ہے اور عاقل کو تو یکسوئی کے برابر بھی یکسوئی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اس کا دماغ برابر کام کرتا رہتا ہے اور یہ گفتگو قاعدہ کی بنا پر ہے ورنہ باب جذب الٰہی ہر شخص پر مفتوح ہو سکتا ہے وہ کسی قاعدہ سے مقید نہیں بہر حال انسان کے حمل امانت کا منشاء عشق تھا اور اسکو میں نے عارف شیرازی کے کلام سے سمجھا ہے فرماتے ہیں ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید ۔۔۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اس میں لفظ دیوانہ سے منشاء حمل امانت پر اشارہ ہے (اور اسی سے معلوم ہوگیا کہ عشق دیوانگی کا نام ہے جو محبت کے علاوہ درجہ ہے ۱۲) جب یہ معلوم ہوگیا کہ امانت اختیار و عقل کا نام ہے تو جو لوگ تسہیل کے طالب ہیں وہ اس امانت اختیار کو برباد کرنا چاہتے ہیں کہ بس ہمکو اپنے ارادہ اور اختیار سے کچھ نہ کرنا پڑے مفت سہولت سے کام ہو جایا کرے کوئی ایسا حال غالب ہو جائے کہ گناہ خود بخود چھوٹ جائیں ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے ایسا استغراق ہو جائے کہ نماز میں خود بخود دل لگنے لگے ۔ ہمکو احضار قلب کی ضرورت نہ ہو گویا یہ شخص صفت اختیار کو معطل کرنا چاہتا ہے اور جو شخص امانت الٰہیہ کو اور ایسی بڑی نعمت کو ضائع کرے جس میں انسان

تمام مخلوق سے ممتاز ہے اس سے بڑھکر ظالم کون ہوگا بزرگوں نے تو اللہ تعالیٰ کے تجلیات کی اس قدر عظمت کی ہے کہ ایک بزرگ نے کسی صوفی کے متعلق سنا کہ وہ کھانا کھاتے ہوئے لذیذ شوربے میں پانی کا پیالہ بھر کر ڈال دیتا ہے تاکہ نفس کو لذت نہ آئے فرمایا طفل طریقت ہے یہ اس تجلّی الٰہی کو برباد کرتا ہے جو لذیذ طعام کے ساتھ متعلق ہے اور اس حکمت کو برباد کرتا ہے جو لذائذ دنیا میں رکھی گئی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ یہ نمونہ ہیں لذائذ آخرت کا مگر اس تجلّی کا انکشاف اور اس حکمت کی معرفت محض نیت کرنے اور نوبت ان اکل اللذیذ لیکون انموذجاً للاٰخرۃ کہنے سے حاصل نہیں ہوتی کہیں آپ آج ہی سے نفس پرستی اور لذات میں انہماک شروع کردیں بلکہ اسکی معرفت بہت سی منزلیں طے کرنیکے بعد نصیب ہوتی ہے۔ ۵

صوفی نشود صافی تا در نہ کشند جامی | بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

اسلئے بسیار سفر کی ضرورت ہے اور بسیار سفر کو تو آپ کیا سمجھیں گے میں اسوقت دو سفر بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ سالک کا ایک سفر توالی الاحوال ہے کہ اس پر حالات طاری ہوتے ہیں ایک دوسرا سفر من الاحوال ہے جس میں وہ سب احوال سلب ہو جاتے ہیں پھر اسکے بعد دوسرے نوع کے احوال عطا ہوتے ہیں اسکی ایسی مثال ہے جیسے باغ میں درختوں پر دو قسم کے پھول آتے ہیں ایک چھوٹا پھول ہوتا ہے وہ چند روز کے بعد جھڑ جاتا ہے اسوقت ناواقف روتا ہے کہ ہائے میرا باغ برباد ہوگیا

مگر محقق خوش ہے کہ الحمد للہ سفر اول ختم ہو کر سفر ثانی شروع ہوا (اول عروج ہے دوسرا نزول ہے ۱۲ ظ) پھر سچا پھول آتا ہے وہ باقی رہتا ہے اب اس پر پھل لگنے شروع ہوتے ہیں یا جیسے صبح دو ہوتی ہیں کاذب جس کا نور جلدی ہی زائل ہو جاتا ہے دوسری صادق جسکا نور بڑھتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اے شدہ تو صبح کاذب را رہین صبح صادق را ز کاذب ہم ببین

مولانا نے سفر اول کو صبح کاذب سے تشبیہ دی اور سفر ثانی کو صبح صادق سے کہ جیسے اول صبح کاذب کی روشنی آتی ہے جسکی روشنی بڑھتی چلی جاتی ہے اسی طرح سالک پر دو حالتیں گذرتی ہیں ایک میں احوال ناقصہ عطا ہوتے ہیں اور دوسری منزل میں احوال ناقصہ سلب ہو کر احوال کاملہ عطا ہوتے ہیں اب یہ شخص پختہ ہو گیا اسکو حق ہے کہ لذائذ بھی کھائے اور عمدہ لباس بھی پہنے کیونکہ اب یہ ہر شئی میں تجلّی حق کا مشاہدہ کرتا اور اس کا حق ادا کرتا ہے صوفی خام کو حق نہیں کہ مرغ مسلم کھایا کرے لیکن اگر بلا تکلف مل جائے تو انکار بھی نہ کرے کھالے بشرطیکہ حلال ہو اور حلال بھی خالص ہونا ضرور نہیں بلکہ نخالص بھی کافی ہے یعنی جو فتویٰ سے حلال ہو بس وہ حلال ہے زیادہ کاوش اور تقویٰ بھگارنے کی ضرورت نہیں جیسے ایک شخص کی ہمارے قصبہ کے افسر پولیس نے

؎ اور عجیب بات ہے کہ پہلا پھول زیادہ بھڑک دار ہوتا ہے دوسرا بھڑک دار نہیں ہوتا یہی کیفیت حالات تلوین تمکین کی ہے ۱۲ ظ

دعوت کی تھی آپ نے دعوت قبول کر کے عین وقت پر کھود کرید شروع کی کہ یہ دودھ کہاں سے آیا گوشت کسطرح آیا غلہ کیسے داموں سے آیا تنخواہ کے روپیہ سے یا رشوت سے۔ غرض بھرے مجمع میں داعی کو ذلیل کیا یہ تقویٰ کا ہیضہ ہے اگر کسی شخص پر اطمینان نہ ہو تو یا تو اسکی دعوت ہی منظور نہ کرے لطیف پیرایہ سے عذر کر دے یہ نہ کہے کہ آپکی آمدنی حرام ہے اسلئے دعوت قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اس عنوان سے اسکی دل شکنی ہوگی باقی امر بالمعروف کے لئے اور بھی بہت وقت ہے اسی وقت امر بالمعروف ضرور نہیں کیونکہ امر بالمعروف میں یہ بھی شرط ہے کہ ایسا وقت اور موقعہ تجویز کرے جس میں مخاطب کے قبول کی امید ہو پس یا تو عذر کر دے یا یہ کر دے جیسا میں نے ایک تھانہ دار سے معاملہ کیا انہوں نے میری دعوت کی میں نے مجمع کے سامنے تو بلا شرط قبول کر لی پھر تنہائی میں لیجا کر ان سے کہدیا کہ ذرا کھانے میں اسکی رعایت رکھی جائے کہ تمام سامان تنخواہ کی رقم سے کیا جائے وہ کہنے لگے صاحب بھلا یہ کب ہوسکتا ہے کہ آپ کو بھی ناپاک مال کھلاؤں۔ اسطرح اپنا بھی بچاؤ ہوگیا اور داعی کی دلشکنی بھی نہ ہوئی غرض یہ کہ جو مال فتوی سے حلال ہو اس میں تامل نکرو مولانا فضل الرحمٰن خان صاحب گنج مرادآبادی کے ایک خلیفہ تھے جو حاضر خدمت رہتے تھے ایک بار مولانا کے یہاں کہیں سے کھانا آیا حضرت نے ان کے پاس بھیجدیا وہ کہنے لگے کہ آپ نے کچھ تفتیش بھی کر لیا ہے کہ حلال ہے یا حرام تو مولانا نے فرمایا ارے کھالے بڑا حلال کھانے والا آیا زیادہ تحقیق کرے گا تو بھوکوں مرجائیگا۔

مولانا کا مطلب بھی یہی تھا کہ جو مال فتویٰ سے حلال ہو وہی کافی ہے گو اہل ورع کے نزدیک حلال نہ ہو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اہل اللہ کو تو عطائے حق کی اتنی قدر ہے کہ ان بزرگ نے شوربہ میں پانی ملانے والے صوفی کو طفل طریقت فرمایا کہ تجلی الٰہی کو برباد کرتا ہے اور وہ تجلی مذکر ہے نعماء آخرت کی اور اس کو فقہانے بھی سمجھا ہے میں انکو بھی حکماء اُمت سمجھتا ہوں جیسا کہ صوفیہ کو سمجھتا ہوں اور حیرت ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں بڑا جھگڑا ہے مگر یہ جھگڑا غیر محققین میں ہے محقق دونوں کا جامع ہوتا ہے تو ہدایہ میں جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ چار انگشت تک ریشم مردوں کو بھی جائز ہے وہاں ایک دلیل تو نقلی لکھی ہے اور ایک دلیل عقلی لکھی ہے لتکون انموذ جالحریر الجنة یعنی تھوڑا سا ریشم مردوں کے لئے اسواسطے جائز کر دیا گیا تاکہ حریر جنت کا نمونہ سامنے ہو جائے پھر یہ حکمت دیگر لذائذ ونعم کو بھی عام ہے اسلئے اسکے ابطال کو محقق نے ناپسند کیا اور مبطل کو طفل طریقت کہا اسی طرح جو شخص سہولت کا طالب ہے وہ امانت الٰہیہ اختیار کو باطل کر رہا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس سے اہل اللہ نے بہت سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے چنانچہ ایک بار حضرت غوث اعظم رح وعظ فرما رہے تھے کہ درمیان میں دفعۃً ساکت ہو گئے اور کچھ دیر تک ساکت رہ کر پھر بیان شروع فرمایا اور کہا کہ اسوقت میرے سکوت کی یہ وجہ ہوئی کہ ایک بزرگ ابھی شام سے بغداد ایک قدم میں بطور کرامت کے آئے تھے میں نے انکو تنبّہ کیا ہے کہ اس تصرف میں حکمت عطائے قدم کا

ابطال ہے اللہ تعالیٰ نے قدم اسلئے دیئے ہیں تاکہ انسے مشی کا کام لیا جائے جب بطور کرامت کے راستہ طے کیا جائیگا تو اس میں یہ حکمت باطل ہوگی وہ بزرگ اس سے توبہ کرکے واپس ہوگئے (مطلب یہ ہے کہ از خود ایسا تصرف نہ کرنا چاہیئے اور اگر بلا قصد کے کبھی حق تعالیٰ طویل راستہ کو قصیر کردیں تو وہ کرامت غیر اختیاریہ ہے جو نعمت ہے نیز طے طریق کی دعا کا بھی مضائقہ نہیں جیسا حدیث میں ہے اللھم اطوعنا البعد صرف تصرف بالقصد کی ممانعت ہے ۱۲) اسی طرح ایک بار ہمارے حضرت حاجی صاحب کے یہاں بے وقت بہت سے مہمان آگئے گھر والوں کو فکر ہوئی تو حضرت نے اپنا رومال گھر میں بھیجدیا کہ اسکو آٹے پر ڈھک دو اور پکانا شروع کردو انشاء اللہ برکت ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایسی برکت ہوئی کہ سب مہمانوں نے فراغت سے کھانا کھالیا اور بہت بچ رہا۔ اس کی اطلاع حضرت حافظ محمد ضامن صاحب (شہید رحمتہ اللہ علیہ) کو ہوئی تو آپ حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کرامت مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا تصرف عطا فرمایا بس آپکا رومال سلامت رہے پھر دنیا میں قحط تو کیوں آئے گا اور قحط میں جو حکمتیں ہیں وہ باقی رہیں گی حضرت حاجی صاحب کو تنبہ ہوا اور فرمایا حافظ صاحب میں اس سے توبہ کرتا ہوں انشاء اللہ پھر کبھی ایسا نہ ہوگا تو حضرت جب اہل اللہ نے حق تعالیٰ کی ذرا ذرا سی تجلیات کی اسقدر عظمت کی ہے اور ان کی حکمتوں کے ابطال کو ممنوع قرار دیا ہے تو بتلایئے اتنی بڑی

امانت کا ابطال جس پر تکلیف کا مدار ہے کیونکر ممنوع نہ ہوگا اب میں اُن
لوگوں کو تنبیہ کرتا ہوں جو طریق میں سہولت کے طالب ہیں کہ وہ اس بے
ادبی سے توبہ کریں جس کا بے ادبی ہونا بھی شاید ان کو اب تک معلوم نہ
ہوا ہوگا بلکہ وہ اب تک اس طلب سہولت کو دینداری سمجھتے ہوں گے
مگر وہ کان کھولکر سن لیں کہ اس طلب میں وہ امانت الٰہیہ کا ابطال کر
رہے ہیں پس سہل یہ ہے کہ وہ بجائے تسہیل کے اسہال لے لیں جس
سے ضعف ہو جائیگا تو پھر یہ معذور ہو جائیں گے اسوقت مولانا انکے
لئے عذر کا فتویٰ دیدیں گے پھر وضو کی جگہ تیمم ہو جائے گا اور زیادہ
ضعف ہوا تو بجائے قیام کے قعود رہجائے گا اور اس سے بھی زیادہ
ضعف ہوا تو صوم وصلوٰۃ سب ساقط ہو جائیں گے جو کامل سہولت ہے
اور جب تک معذور نہیں ہوئے اسوقت تک سہولت کی طلب کے کیا
معنی جو کہ معذورین کے لئے خاص ہے بلکہ غور کیا جائے تو وہاں بھی ان
کو سہولت مزعومہ نہیں ہے کیوں کہ اس عذر کے سبب وہ سہل عمل بھی
انکو دشوار ہوگا خلاصہ یہ ہے کہ تم تحصیل عمل کے مکلف ہو کہ اپنے اختیار
کو صرف کر کے عمل کرو تم کو طلب تسہیل کا کوئی حق نہیں ہاں صرف اتنا حق
ہے کہ عمل تمہارے اختیار و قدرت سے خارج نہ ہو سو اس کا شریعت
میں پورا لحاظ ہے کہ امور غیر اختیاریہ کا تمکو مکلف نہیں کیا بلکہ اختیارات
کا مکلف بنایا ہے اب تم یہ چاہتے ہو کہ اختیارات میں ارادہ و اختیار
و قدرت کے استعمال کی بھی ضرورت نہ رہے اسکا تم کو کیا حق ہے بلکہ

اس میں سراسر ابطال امانت اختیار ہے جس کا جرم ہونا اوپر واضح ہو گیا پس تم کو تو طلب تسہیل کا کوئی حق نہیں ہاں اگر شریعت کسی جگہ خود تسہیل کا لحاظ کرے تو یہ اسکی عنایت ہے مگر تم کو اس کے مطالبہ کا حق نہیں۔
اور نصوص میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے بعض مقامات پر تحصیل و تسہیل دونوں کو جمع بھی کر دیا ہے مگر اس کا التزام نہیں کیا بعض جگہ محض تحصیل عمل کا امر ہے۔ تحصیل مبحوث عنہ کی رعایت نہیں کی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شریعت میں کہیں تو صرف امر و نہی ہے کہ اس کام کو کرو اور اسکو نہ کرو یہ تو تحصیل کا عنوان ہے اور کہیں امر و نہی کے ساتھ سہولت عمل کا طریقہ بھی تبلا دیا ہے جس میں تکلیف و عنایت دونوں کو جمع کر دیا ہے مگر اس سے یہ سمجھ لینا کہ شارع کے ذمہ تسہیل بھی ہے سخت نادانی ہے شارع کو حق ہے کہ امور اختیاریہ کی تحصیل کا امر کرے اور سہولت عمل کا طریق نہ تبلائے اور اگر چاہے تو تبلا بھی دے اس حقیقت کو ملحوظ رکھکر اب سنیئے کہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے انفاق کا امر فرمایا ہے یہ تو تحصیل ہے مگر اس میں تکلیف کے ساتھ عنایت کو بھی جمع کر دیا ہے بعبارت دیگر یوں کہئے کہ طلب تحصیل کے ساتھ تسہیل کی بھی رعایت کی ہے بیان اسکا یہ ہے کہ انفاق فعل اختیاری ہے اور فعل اختیاری کے لئے عادۃً تصور غایت ضروری ہے جس کے بغیر صدور نہیں ہو سکتا پس صدور فعل کے لئے تصور غایت کا شرط عادی ہونا تو ضروری ہے اور وہ بھی اکثری لیکن اس میں مجھ

کو کلام ہے کہ تصور غایت عقلاً بھی لازم ہے یا نہیں حکماء اس کو عقلاً لازم کہتے ہیں اسی لئے تصور غایت کو علت شمار کیا ہے جس کو علت غائیہ سے موسوم کرتے ہیں مگر اس کے لزوم عقلی میں کلام ہے۔ آپ مدرسہ میں جا کر طلباء سے پوچھئے کہ وہ کس لئے پڑھ رہے ہیں تو سو میں سے ساٹھ بھی غایت نہ بتلا سکیں گے اور جو بتلائیں گے بھی ان میں بہت سے اسی وقت گھڑینگے اور لیجئے کھانا تو سب کھاتے ہیں اور یہ فعل اختیاری ہے ذرا بتلا دو کہ کھانے کے وقت کیا غایت ذہن میں ہوتی ہے اور کیا سوچکر کھاتے ہو یقیناً بہت سے آدمی کچھ بھی نہیں سوچتے اور کوئی غایت ان کے ذہن میں نہیں ہوتی ہاں جو ان پڑھ ہیں انکی تو البتہ اس میں ایک غایۃ ہوتی ہے وہ کیا ہے یہی کہ کھائیں اور ہگیں اور وہ بھی لازم التصور نہیں بلکہ لازم الترتب آپ تعجب نہ کریں کہ یہ کیسی غایت ہے ایک بڑے فلسفی نے یعنی صاحب شمس بازغہ نے ہی شمس بازغہ میں غایت کی یہ بھی ایک قسم لکھی ہے کالتغوط للاکل بندہ خدا کو مثال بھی ایسی ہی ملی مگر اعتراض کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہر شخص کا اپنا اپنا مذاق ہے ان فلسفیوں کی طبیعت ایسی ہی ہوگی جیسے ایک بادشاہ نے چار سمت کی چار عورتیں جمع کی تھیں ایک دفعہ اس نے سب کی طبائع کا امتحان کرنا چاہا اور رات کے آخیر حصہ میں سب سے پوچھا کہ اب کیا وقت ہے سب نے بالاتفاق کہا کہ صبح ہوگئی اس نے دلیل پوچھی تو ایک نے کہا کہ میری نتھ کا موتی ٹھنڈا ہوگیا ہے یہ بہت لطیف وجہ بیان کی کیونکہ

صبح کی ہوا میں خنکی زیادہ ہوتی ہے اس نے موتی کی ٹھنڈک سے اس پر استدلال کیا دوسری نے کہا کہ پان کا مزا منھ میں بدل گیا ہے تیسری نے کہا کہ شمع کی روشنی دھیمی پڑگئی ہے یہ دلائل تو لطافت ادراک پر مبنی تھے چوتھی نے کہا کہ میرا گواہ آرہا ہے بادشاہ نے اس بیوی کو الگ کردیا کیونکہ اسکے جواب سے کثافت فہم مترشح تھی تو جیسے ان جوابات کی بنا ر اختلاف مذاق پر تھی ایسے ہی شمس بازغہ کی مثال ان فلسفیوں کے مذاق کی خبر دے رہی ہے غرض مجھے افعال اختیاریہ میں تصور غایہ کا لزوم عقلی مسلم نہیں ورنہ تخالف نہ ہوتا ہاں یہ ضرور ہے کہ بعادۃ اکثریہ بدوں تصور غایۃ کے افعال اختیاریہ کا صدور دشوار ہے خصوصاً افعال شاقہ کا اور انفاق فعل شاق ہے تو اسکے قبل اسکی غایت کا تصور ضروری ہوگا سو یہاں دو غایتیں مذکور ہیں اول غایۃ تو یہ بیان فرمائی ابتغاء مرضاۃ اللہ کہ وہ لوگ اپنا مال خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا ر طلب کرنے کیلئے اس غایۃ کا اثر تو تحصیل ہے کہ اسکے تصور کے بغیر اس فعل اختیاری کا صدور عادۃً دشوار تھا اسکے بعد ایک اور غایۃ بیان فرماتے ہیں وتثبیتا من انفسھم مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں من بمعنی لام ہے۔ ای تثبیتا لانفسھم یعنی دوسری غرض انفاق میں یہ ہوتی ہے کہ اپنے نفسوں میں اعمال کے اندر پختگی پیدا کریں اس کا حاصل یہ ہے کہ بعض بخیلوں کو انفاق میں بہت دشواری ہوتی ہے جن کا مذاق یہ ہوتا ہے سے

گر جاں طلبی مضائقہ نیست   ور زر طلبی سخن دریں است

جیسا مولانا نے ایک بدوی کا قصہ لکھا ہے کہ سفر میں ایک کتا اس کا رفیق تھا وہ مرنے لگا تو بدوی اس کی مفارقت کے غم میں رونے لگا کسی مسافر نے پوچھا کہ تو کیوں روتا ہے کہا یہ کتا میرا رفیق سفر تھا اب یہ مر رہا ہے میں اسکے غم میں رو رہا ہوں پوچھا اسکو تکلیف کیا ہے کہا بھوکا ہے فاقہ سے مر رہا ہے اس نے دیکھا کہ ایک طرف ایک پوٹلا بندھا ہوا رکھا ہے بدوی سے پوچھا کہ اس پوٹلہ میں کیا ہے کہا سوکھی ہوئی روٹیاں ہیں کہا ظالم جب تجھے اپنے کتے سے اسقدر محبت ہے کہ اسکے غم میں رو رہا ہے تو اس میں سے ایک روٹی نکال کر کیوں نہیں کھلا دیتا تو وہ کہتا ہے ؎

گفت ناید بے درم در راہ ناں   لیک ہست آب دو دیدہ رائگاں

کہ مجھے اتنی محبت نہیں جو اسے روٹیاں کھلا دوں روٹی کے تو دام لگے ہیں اور آنسو مفت کے ہیں بس میں اتنی ہی محبت رکھتا ہوں کہ اس کو رو لوں تو حق تعالیٰ وتثبیتا من انفسہم میں ایسے بخیلوں کے لئے انفاق کی دشواری اور تنگی رفع کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ تم انفاق اسی نیت سے کرو کہ اس سے نفس میں قوت پیدا ہو گی اور انفاق سہل ہو جائیگا بار بار اسی نیت سے انفاق کرو تو یہ مادہ راسخ ہو جائیگا اس غایت کا اثر تسہیل ہے اور جو طریقہ سہولت انفاق کا یہاں بتلایا گیا ہے یہ تمام اعمال میں جاری ہے کہ تکرار عمل سے ہر عمل صعب سہل ہو جاتا ہے گو

فطری خلق کی برابر سہولت نہ ہو یعنی جیسے فطری سخی کو انفاق میں سہولت ہوتی ہے ویسی آسانی گو نہ ہو مگر تکرار سے بھی بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے خصوصاً جبکہ تکرار اسی غرض سے ہو تاکہ عمل سہل ہو جائے اور یہ غرض گو بالذات مقصود نہیں بلکہ غرض اول اصل ہے مگر چونکہ اس بخیل کو انفاق دشوار تھا اسلئے دوسری غرض کو تسہیل کے لئے بیان فرما دیا اسی طرح ایک حدیث میں ہے یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء متفق علیہ یہاں حضور نے نکاح کی ایک غرض بیان فرما دی کہ اس سے عفت فرج وحفاظت نگاہ سہل ہو جاتی ہے اصل مطلوب تو تحصین فرج وغض بصر ہے جو کہ بدون نکاح بھی قدرت واختیار میں ہے مگر حضور نے نکاح کا بھی امر فرما دیا کیونکہ وہ اس مطلوب کی تسہیل کا وسیلہ ہے اسی لئے اغض واحصن صیغۂ تفضیل سے فرمایا یعنی یہ غض و تحصین میں زیادہ معین ہے اور اسی لئے نکاح کو غض بصر وحصن فرج کی غایۃ تسہیل کہا ہے کیونکہ نگاہ وشرمگاہ کی حفاظت بدون نکاح کے بھی ممکن ہے کیونکہ نگاہ کا اٹھانا امر اختیاری ہے کوئی دوسرا تو سر نہیں اٹھا دیتا اور یہ امر مشاہد ہے لیکن اس شخص کو اس میں دھوکہ ہو جاتا ہے کہ یہ یوں سمجھتا ہے کہ میں نظر میں مضطر ہوں اور دھوکہ اضطرار کا اسلئے ہوتا ہے کہ آجکل لوگ عموماً نگاہ نیچی رکھنے کے عادی نہیں اونٹ کی طرح سر اٹھا کر ہی چلنے کے عادی ہیں اسلئے نگاہ میں اپنے کو مضطر

سمجھتے ہیں پھر نگاہ ڈالکر ہٹانے میں اسکو نفس کے ساتھ کتنا کشتی سخت
ہوتی ہے جس کی مقاومت دشوار ہوتی ہے اس دشواری کو وہ اضطرار
سمجھنے لگتا ہے حالانکہ وہ اضطرار نہیں ہے کیونکہ وہ اس حالت میں
بھی غض بصر پر قادر رہتا ہے پس وہ مختار ہے اگر اس پر کسی کو شبہ ہو کہ
جس اضطرار میں میتہ حلال ہو جاتا ہے اضطرار تو وہ بھی نہیں کیونکہ عدم
تناول پھر بھی اختیار میں رہتا ہے پھر سخت تکلیف کو شریعت نے اضطرار
قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے فمن اضطر فی مخمصۃ تو معلوم ہوا کہ سخت
تکلیف بھی اضطرار میں داخل ہے تو غض بصر میں بھی جب سخت بے چینی
ہونے لگے وہ اضطرار کیوں نہیں اور اگر اضطرار ہے تو وہ شخص معذور
ہے تو میں کہوں گا کہ آیت میں اضطرار اصطلاحی کا ذکر نہیں بلکہ اضطرار لغوی
کا ذکر ہے اور یہ اضطرار لغوی اکل میتہ میں عذر ہے اور نظر بالشہوۃ میں
عذر نہیں اگر کوئی کہے کہ اس فرق کا کیا سبب اسکا جواب یہ ہے کہ آپ
کی قسمت خدا کی یہی مرضی یہ جواب تو ضابطہ کا تھا اب میں تبرعاً دونوں
میں فرق بھی بتلاتا ہوں کہ اختصار مخمصہ میں موت کا اندیشہ ہے اور
حیات کا ابقاء مطلوب ہے کیونکہ وہ معراج ترقی ہے حیات ناسوتیہ ہی
سے روح کو ترقی ہوتی ہے کیونکہ مدار ترقی اعمال ہیں اور روح مجرد سے
صدور بعض اعمال کا نہیں ہو سکتا تھا اگر یہ وجہ نہ ہوتی تو پھر جنت سے
دنیا میں ہمارے بھیجے جانیکی کیا ضرورت تھی اور نظر الی الاجنبیہ سے بچنے
میں موت کا خوف نہیں بلکہ غض بصر میں زیادہ حیات ہے حدیث میں

وعدہ ہے کہ جو شخص تقاضائے نظر کے وقت نگاہ نیچی کرلے اس کو حلاوت ایمان نصیب ہوتی ہے۔

اور اس کے ساتھ ایک طبعی حلاوت بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ جب غض بصر کے بعد اسکا دل یہ کہتا ہے کہ شاباش آج شیطان کو خوب زیر کیا اور یہ فخر اہل اللہ نے بھی کیا ہے مگر اشر و بطر کے ساتھ نہیں بلکہ تحدث بالنعمۃ کے طور پر اور اس قسم کا فرح محمود ہے چنانچہ نص ہے قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذلک فلیفرحوا۔ غرض غض بصر میں باطنی حیات بھی ہے اور حیات ظاہرہ کا القاء بھی ہے کیونکہ بعض دفعہ یہ نگاہ بدجان وایمان تک لے لیتی ہے ابن القیم رح نے ایک قصہ لکھا ہے کہ کوئی شخص کسی امرد پر عاشق تھا اور وہ اس سے نفور یہاں تک کہ یہ عشق میں گھل کر مرنے کے قریب ہو گیا اور آثار نزع شروع ہو گئے اس امرد کو اطلاع ہوئی تو اسکے دل میں رحم آیا کہ لاؤ ایک دفعہ اس سے مل لوں ابتو مر ہی رہا ہے وہ اس ارادہ سے گھر سے چلا اور اسکی اطلاع کسی نے عاشق کو دی تو فوراً جسم میں قوت آگئی اور اٹھ بیٹھا پھر امرد کو اپنی بدنامی کا خیال ہوا اور راستہ ہی سے لوٹ گیا اور مومن کے قول پر عمل پیرا ہوا ؎

کہا اس بت سے مرتا ہے وہ مومن　　کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

اس امرد نے اسوقت اسی شعر پر عمل کیا اس کی اطلاع بھی عاشق کو ہوئی تو پھر گر پڑا اور نزع شروع ہو گیا لوگوں نے اس کو کلمہ کی تلقین شروع کی تو بجائے کلمہ کے اس نے امرد کو خطاب کر کے اشعار پڑھنا شروع کئے

جن میں ایک شعر یہ تھا ؎

رضاک اشھی الی فوادی | من رحمۃ الخالق الجلیل

(نعوذ باللہ نعوذ باللہ) اور اسی کلمہ کفر پر جان دیدی - اور یہ خطرہ نظر عمد میں ہے اور وہی حرام بھی ہے باقی اور نظر فجاءۃ میں یہ اثر نہیں ہوتا کیونکہ فوراً غض بصر کرنے سے وہ اثر قوی نہیں ہونے پاتا اگر اس پر کسی کو شبہ ہو کہ ممکن ہے اس میں بھی ہلاکت ہو جائے تو میں کہونگا کہ یہ امکان ایسا ہے جیسا امام ابو یوسفؒ کے شاگرد نے مجلس امالی میں سوال کیا تھا کہ آپ نے ابھی جو یہ فرمایا ہے کہ غروب آفتاب کے ساتھ ہی روزہ افطار کر لینا چاہیئے تو بھلا اگر کسی دن آفتاب ہی غروب نہ ہو تو کیا کرے اور وجہ فرق کی یہی ہے کہ نظر فجاءۃ میں بوجہ عدم التفات کے دقائق حسن کا ادراک نہیں ہوتا یوں ہی سرسری طور پر صورت سامنے ہو جاتی ہے اب اسکو حکم ہے صرف نظر کا اگر فوراً نگاہ کو ہٹالے تو کچھ خطرہ نہیں اور اگر اسکے بعد عمداً دیکھنے لگا تو اب اس کو اسکے ساتھ تعلق ہو جانیکا احتمال ہے اور تعلق کے بعد اگر وصال نہ ہوا تو موت کا خطرہ ہے اور ایک دو بار وصال ہو گیا تو اس سے پیاس بجھے گی نہیں بلکہ زیادہ بھڑکے گی ؎

کنار و بوس سے دونا ہوا عشق | مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اور اگر کسی کو ہمیشہ وصال میسر ہو سکتا ہے تو اس کمبخت کو نکاح سے کون چیز مانع ہے ایسی حالت میں شریعت کا حکم یہ ہے لم یر للمتحابین

مثل النکاح یعنی جن میں باہم محبت ہو جائے انکو نکاح کر لینا چاہیئے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر اسکا علاج نظر و وصال سے نہیں ہو سکتا بلکہ اسکا علاج یہ ہے کہ اسکی طرف سے خیال کو ہٹاؤ جسکا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی بدصورت بدشکل کا مراقبہ کرو چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو دیکھو میں اسکا مراقبہ بھی بتلاتا ہوں مراقبہ موت و رویت تو سب بتلاتے ہیں میں بدشکل کافر کا مراقبہ بھی بتلاتا ہوں کیونکہ طب میں کبھی طیبات سے علاج ہوتا ہے کبھی خبیثات سے (اور اگر کوئی شکل قابل نفرت مراقبہ کے لئے نہ ملے تو پھر اس محبوب ہی کو بدشکل تصور کرو یعنی یوں خیال کرو کہ یہ ایک دن مریگا اور اس کا چہرہ خاک میں مل جائیگا اس میں سے خون پیپ ناک اور آنکھ کے راستہ سے بہے گا اسکے بدن میں کیڑے پڑ جائیں گے تھوڑی دیر اسکی اس حالت کا مراقبہ کرو اس سے بھی نفع ہوگا) اور خیال ہٹانے کی یہ صورت نافع نہیں کہ تم براہ راست اسکے حسن کے تصور دفع کرنے کا قصد کرو کیونکہ اس میں پھر استحضار ہوگا حسن کا سلب بھی جلب ہو جائیگا میں نے مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ سے ایک حکایت اسی قبیل کی سنی ہے کہ ایک شخص نے اپنے لڑکے کی شادی میں دولہا کے لئے کسی کا دوشالہ مانگ کر مجلس نکاح میں اوڑھا دیا وہ اوچھا آدمی تھا اس نے دوشالہ تو دے دیا مگر اب جو شخص مجلس میں سے آکر پوچھتا کہ دولہا کہاں ہے وہ کہتا ہے کہ دولہا تو وہ ہے مگر دوشالہ میرا ہے لڑکے کے باپ نے کہا تو بڑا اوچھا آدمی ہے بھلا اس کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ دوشالہ میرا ہے اس نے کہا کہ

بہت اچھا اب نہ کہونگا۔ اسکے بعد کسی نے پوچھا کہ دولہا کونسا ہے تو آپ کہتے
ہیں کہ دولہا تو وہ ہے اور دوشالہ میرا نہیں ہے۔ بارات والوں نے پھر
ملامت کی کہ کمبخت تجھے دوشالہ کے ذکر ہی کی کیا ضرورت ہے اس نے
کہا بہت اچھا اب سے ذکر نہ کرونگا اسکے بعد کسی نے پوچھا تو کہا کہ دولہا تو
وہ ہے اور دوشالہ کا ذکر ہی نہیں کہ کس کا ہے اس پر دولہا نے دوشالہ
اتار کر پھینک دیا تو دیکھئے اس نے دوشالہ کی نفی کی تھی مگر وہ بھی
اثبات تھا اسی طرح محبوب کے تصور کو بلا واسطہ دفع کرنا یہ بھی جلب
تصور ہے بلکہ اس کا صحیح قاعدہ وہ ہے جسکو فلاسفہ اور صوفیہ نے بیان
کیا ہے النفس لا تتوجہ الی شیئین فی ان واحد کہ ایک آن میں دو
چیزوں کی طرف نفس متوجہ نہیں ہو سکتا اور گو اس کو قاعدہ عقلیہ کہا جاتا
ہے مگر میرے نزدیک یہ بھی قاعدہ عقلیہ نہیں۔ بلکہ قاعدہ عادیہ ہے مگر
عادۃ اس میں لزوم ایسا ہے جس سے لزوم عقلی کا شبہ ہو جاتا ہے اور
اس قاعدہ کے استعمال کا طریقہ وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ کسی دوسری
شے کی طرف توجہ کو منعطف کرو کیونکہ عشق بطالت سے ہوتا ہے اطباء
نے اس کی تصریح کی ہے اسی لئے طلبہ کو عشق زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ
بہت بے فکر ہیں (پہلے زمانہ کے طلبہ ایسے بے فکر نہ تھے اسلئے ان میں
یہ مرض نہ تھا اور آجکل بیفکری زیادہ ہے) کیونکہ جو کام ان کے ذمہ
ہے مطالعہ و تکرار وغیرہ اختیاری ہے کہ جب چاہیں الگ کر دیں اور
بے فکر ہو جاویں باقی جو شخص کسی فکر میں لگا ہوا ہو اس کو عشق نہیں ہوتا

چنانچہ گھس کھدے مزدور کو تصور حسینان کی کہاں مہلت ہے پس تم بطالت وبیفکری کو دور کردو اور کوئی شغل اپنے ذمہ لگاؤ اور کسی شئی کی طرف اپنی توجہ کو منعطف کرو۔ حدیث میں اسی علاج کی تعلیم ہے چنانچہ حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر اجنبیہ پر نظر پڑجائے تو اسی وقت اپنی بیوی سے جاکر مشغول ہوجاؤ اسکے بعد حضورؐ فرماتے ہیں فان الذی معہا مثل الذی معہا (کہ جو چیز اسکے پاس ہے ویسی ہی اسکے پاس ہے) ظاہر میں یہ جملہ معمولی بات ہے مگر حقیقت میں یہ ایک قاعدہ عظیمہ پر تنبیہ ہے جس کی تقریر حضرت استاذ علیہ الرحمۃ نے فرمائی ہے جو کسی کے کلام میں میری نظر سے نہیں گذری اسکو بیان کرتا ہوں اس سے آپکو ہماری اکابر کے کمال علوم کا اندازہ ہوگا مولانا نے فرمایا کہ تمنا ولات میں چار قسم کی چیزیں ہیں بعض میں محض لذت مقصود ہے جیسے فواکہ بعض میں دفع حاجت مقصود ہے بعض میں دونوں مقصود ہیں مگر غالب حاجت ہے جیسے اغذیہ یومیہ بعض میں دونوں مقصود ہیں مگر غالب لذت ہے اور عادۃ قرب نساء ایسی ہی چیز ہے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ میں ہم کو اس امر کی تعلیم فرمائی ہے کہ تم اس میں بھی حاجت ہی کو غالب رکھو اور دفع حاجت میں اجنبیہ اور منکوحہ دونوں مساوی ہیں یہ مطلب ہے ان الذی معہا مثل الذی معہا (اے انہما مساویان فی قضاء الحاجۃ) سبحان اللہ بے نظیر علم ہے۔ بہرحال شارع نے اس حدیث معشر الشباب تزوجوا الخ میں نکاح کی ترغیب اسلئے دی ہے تاکہ غض

بصر سہل ہو جاوے اور یہ شارع کے ذمہ نہ تھا بلکہ محض عنایت تسہیل
کی وجہ سے ارشاد فرمایا کہ جس کو غض بصر دشوار ہو وہ نکاح کرلے گو شارع
کو یہ بھی حق تھا کہ بدون اسکے بھی غض بصر کا امر فرمادیں کیونکہ نظر اختیاری
ہے جیسا کہ اوپر مفصل مذکور ہوا اور اس سے معلوم ہوا کہ کبھی شارع بھی
تسہیل کا لحاظ فرماتے ہیں پس صوفیہ اہل بدعت نہیں جو اعمال شرعیہ
میں سہولت کا طریق بتلاتے ہیں اور اسی میں مشائخ علماء ظاہر سے
ممتاز ہیں کیونکہ علماء اس کو نہیں جانتے پس صوفیہ پر یہ اعتراض نہیں
ہو سکتا کہ انہوں نے یہ بدعت کہاں سے نکالی کہ اعمال شرعیہ کی تسہیل
کے طرق بتلاتے ہیں۔ میں نے بتلا دیا کہ شارع نے بھی کبھی اس کا
لحاظ فرمایا ہے چنانچہ اول تو شارع نے تسہیل غض بصر کے لئے نکاح کو
تجویز کیا اور جو نکاح پر قادر نہ ہو اسکے لئے اسی تسہیل کے لئے ارشاد
ہے ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء کہ جو نکاح نہ کرسکے
وہ روزے رکھا کرے کیونکہ روزہ بمنزلہ اختصاء کے ہے بلکہ اس سے
بڑھکر ہے کیونکہ اختصاء کے بعد بھی بعض دفعہ شہوت کم نہیں ہوتی
چنانچہ تجربہ ہے کہ ایسے لوگ باندیاں خریدتے ہیں اور انسے مجامعت
کرتے ہیں ہاں انکو انزال نہیں ہوتا اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے
کہ قطع عضو کے بعد بھی شہوت باقی رہتی ہے ایسا مرد مساحقہ کا طالب
ہوتا ہے ایک بزرگ سے میں نے ایک حکایت سنی ہے جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو شہوت باقی رہتی ہے وہ حکایت یہ ہے ایک

شخص کو خضر علیہ السلام سے ملاقات کی تمنّا بیحد تھی چنانچہ ایک بار ملاقات ہوئی اور حضرت خضر نے دریافت فرمایا کہ بتلاؤ مجھ سے کیا کام ہے کہا میرے لیئے دعا کر دیجئے کہ بیفکری کی زندگی نصیب ہو فرمایا دنیا میں بیفکری دشوار ہے کیونکہ یہ دارابتلاء ہے یہاں چین نہیں ہوسکتا ہاں یہ ممکن ہے کہ تم دنیا میں مختلف لوگوں کی حالت دیکھ کر کسی ایک کو تجویز کرو میں دعا کردونگا کہ تم بھی ویسے ہی ہو جاؤ اس نے کہا بہت اچھا یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں کوئی تو بیفکر ملے گا چنانچہ اس نے سیاحت شروع کی اور امراء و سلاطین کا امتحان شروع کیا معلوم ہوا کہ ہر شخص کوئی نہ کوئی فکر ضرور کرتا ہے۔ بیفکر کوئی نہیں پھر ایک جوہری کو دیکھا کہ وہ بڑا بے فکر ہے صبح کو دکان کھولتا ہے دس بارہ لڑکے جوان اسکے پاس دکان میں رہتے ہیں جو اسکے بیٹے معلوم ہوتے تھے اور نوکر چاکر انکے علاوہ تھے وہ صبح سے شام تک دکان پر بیٹھتا اور خوب خیرات کرتا اور تجارت بھی کرتا ظاہر میں اسکو کوئی فکر معلوم نہ ہوتا تھا یہ اسکے پاس تین دن ٹھہرا اور اسکو دیکھ کر بڑا خوش ہوا کہ بس میں بھی اسی کے مثل ہونے کی دعا کراؤں گا پھر خیال ہوا کہ اس سے بھی دریافت تو کرنا چاہیئے مبادا اس کو کوئی ایسا فکر ہو جس کی مجھے اطلاع نہ ہو چنانچہ اس سے دریافت کیا اور وجہ بھی بتلادی کہ میں نے حضرت خضر سے یہ درخواست کی تھی انہوں نے یہ جواب دیا اور اب تجھ کو دیکھکر مجھے خیال ہوتا ہے کہ تیرے جیسی زندگی کی دعا کراؤں یہ سنکر وہ جوہری سانس بھر کر آبدیدہ ہوا اور

کہا خدا میرے جیسی مصیبت تو کسی دشمن کو بھی نہ دے پھر قصہ بیان کیا کہ میری بیوی بہت حسین ہے ایک دفعہ وہ بیمار ہوئی اور مرنے کے قریب ہوگئی میں رونے لگا تو اسنے کہا کیوں روتے ہو تم تو چار دن کے بعد دوسرا نکاح کر لوگے پھر مجھے بھول بھال جاؤ گے میں نے کہا یہ ہرگز مجھسے نہ ہوگا کہا سب یونہی کہا کرتے ہیں تو میں نے استرہ نکال کر اپنا عضو کاٹ ڈالا کہ اب تو اطمینان ہوگیا اس نے کہا ہاں واقعی اطمینان ہوگیا اسکے بعد وہ کمبخت اچھی ہوگئی اور میں بیکار ہوچکا تھا تو اس نے نوکروں سے تعلق پیدا کرلیا اور یہ جتنے لڑکے آپ کے سامنے ہیں سب انہی نوکروں کی عنایت مگر میں خاموش ہوں کیا کہوں کیونکہ یہ بلا میں نے اپنے ہاتھوں خریدی ہے اب یہ شخص اپنے گھر واپس آیا اور حضرت خضر سے ملاقات ہوئی پوچھا کہو تمنے کسی کو تجویز کیا کہا واقعی دنیا میں کوئی بھی فکر سے خالی نہیں حضرت خضر نے فرمایا بس تم یہ خیال چھوڑ دو اور اس کی درخواست کرو کہ حق تعالیٰ تم کو اپنی محبت عطا فرمائیں اور آخرت کی بیفکری نصیب ہو کہا ہاں بس اسی کی دعا کر دیجئے واقعی یہی بات ہے پھر اگر کچھ بیفکری ہے تو تعلق مع اللہ ہی میں ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست ... جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

خلوت گاہ حق سے مراد تعلق مع اللہ ہی ہے تو اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اس شخص کو اپنی حالت پر حسرت تھی اس حسرت میں خواہش کو بھی دخل تھا کہ تمتع کی خواہش موجود مگر فقدان اسباب و آلات سے

معذور اسلئے غمزدہ تھا اور روزہ ان سب سے بڑھکر ہے کہ شہوت بھی کم ہوجاتی ہے اور انسان بھی بیکار نہیں ہوتا۔ مگر ایک بات سمجھ لینا چاہیئے کہ بعض دفعہ روزہ سے ابتدا رصوم میں شہوت کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے اس سے دھوکہ نہ کھایا جائے کہ شریعت نے کیسا علاج تجویز کیا بات یہ ہے کہ بعض دفعہ قلت شہوت کا منشار کثافتِ اخلاط ہوتا ہے ایسی حالت میں چونکہ روزے سے اخلاط میں لطافت پیدا ہوگی تو اول اول شہوت بڑھے گی مگر یہ برابر روزہ رکھتا ہے تو کثرت صوم کا انجام ضعف شہوت ہی ہوگا اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ قلت شہوت کا منشار کبھی کثافت اخلاط ہوتا ہے اسکو میں بہت دعوے کے ساتھ کہتا ہوں اور ببانگ دہل کہتا ہوں کہ جس پر شہوت کا زیادہ غلبہ ہو وہ اسوقت خوب پیٹ تنکر کھانا کھائے تو شہوت افسردہ ہوجائیگی مگر شارع نے یہ علاج اسلئے تجویز نہیں کیا کہ اس سے لحوق امراض کا اندیشہ ہے بہر حال کثرت صوم کا انجام ضعف شہوت ہی ہے گو ابتدا رمیں ضعف کا احساس نہ ہو چنانچہ اخیر حصّہ رمضان میں ہر شخص کو ضعف معلوم ہوتا ہے گو افطار وسحر میں اس نے کتنا ہی پیٹ بھر کر کھایا ہو کیونکہ میرے نزدیک سبب ضعف تبدیل وقت ہے تقلیل غذا سے ضعف نہیں ہوتا پس جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ روح صوم تقلیل غذا ہے جب افطار وسحر میں خوب پیٹ بھر کر کھالیا تو اس روزہ سے فائدہ ہی کیا ہوا انکا قول میرے نزدیک صحیح نہیں بلکہ صرف تبدیل وقت ہی ضعف

بہیمیت کے لئے کافی ہے غرض یہ حدیث صاف تبلا رہی ہے کہ شارع نے جسطرح تحصیل اعمال کا اہتمام کیا ہے اسی طرح تسہیل اعمال کا بھی کہیں کہیں لحاظ فرمایا ہے چنانچہ یہ حدیث تو رعایت تسہیل میں صریح تھی اب آیت میں غور کیجئے تو یہاں بھی حق تعالیٰ نے اول ایک غایت تحصیل عمل کے لئے بیان فرمائی اسکے بعد دوسری غایت تحصیل عمل کے لئے ذکر فرمائی کہ تکرار انفاق سے انفاق سہل ہو جاتا ہے پس انفاق میں یہ غرض بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے اور یہ طریقہ تمام اعمال کی تسہیل میں مفید ہے تکرار عمل سے ہر عمل شاق سہل ہو جاتا ہے جیسا اوپر عـہ بھی مذکور ہو چکا ہے مگر طریق تسہیل کا تبلانا شارع کے ذمہ نہیں یہی وجہ ہے کہ تمام احکام میں اسکی رعایت نہیں کی گئی اور ہر عمل کی سہولت کا طریقہ شارع نے نہیں تبلایا نیز علماء کے ذمہ بھی طرق سہولت تبلانا لازم نہیں اور اسی کی فرع یہ بھی ہے کہ علماء کے ذمہ یہ بھی نہیں کہ سائل کے جواب میں ایسی تقریر کریں کہ مخاطب کی سمجھ ہی میں آجائے جبکہ وہ مسئلہ انکی فہم سے عالی ہو۔ ہاں مسئلہ کی تقریر کر دینا جبکہ وہ ضروری سمجھیں انکے ذمہ ہے خواہ مخاطب سمجھے یا نہ سمجھے اور اگر مخاطب سے فہم کی امید نہ ہو تو علماء کے ذمہ تقریر کرنا بھی لازم نہیں ان کو یہ کہدینے کا حق ہے کہ تم اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے رامپور میں ایک شخص نے مجھسے کہا کہ معراج کا مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آیا مجھے اس پر

عـہ جس مقام پر حدیث یا معشر الشباب کا ذکر شروع ہوا ہے اس مقام سے ذرا پہلے اسکا بیان آیا ہے ۱۲۔ منہ

کچھ اشکالات ہیں میں نے کہا بیان کیجئے کہا یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان زمین سے آسمان پر پہنچ جائے کیونکہ درمیان میں کرۂ زمہریر ہے کرہ نار ہے نیز حکماء کا قول ہے کہ چند میل اوپر ہوا نہیں ہے وہاں کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ سانس کے لئے ہوا کی ضرورت ہے پھر معراج کیونکر ہوئی میں نے کہا بدون نفس کے زندہ رہنا محال ہے یا مستبعد ہے۔ اسی طرح زمہریر و نار میں زندہ رہنا محال یا مستبعد ہے گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت محال و مستبعد میں فرق ہی نہ سمجھتے تھے میں نے ان دونوں میں فرق ظاہر کیا اور کہا اب آپکے اشکالات کا حاصل یہ ہوا کہ معراج کا واقعہ مستبعد ہے سو اس سے ہم کو انکار نہیں معجزات مستبعد تو ہوتے ہی ہیں ورنہ معجزہ ہی کیوں کہا جاوے لیکن محال ہرگز نہیں کیونکہ اس میں عقلی استحالہ کچھ نہیں وہ کہنے لگے کہ یہ دقائق میں نہیں سمجھتا مجھے اسکی کوئی نظیر مشاہدات میں بتلایئے میں نے کہا کہ نظیر پر ثبوت دعویٰ موقوف نہیں ہوتا کیونکہ نظیر بھی تو ایک واقعہ ہے اگر ہر واقعہ کو دوسرے واقعہ کے واسطے سے مانا جائیگا تو یا تو تسلسل لازم آئے گا اور وہ محال ہے یا کہیں سلسلہ کو قطع کردگے تو یہ آخیر کا واقعہ بدون نظیر کے مانا گیا پھر واقعہ معراج ہی کو اولاً بدون نظیر کے کیونکہ نہیں مانا جاتا مگر وہ پھر بھی وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتے رہے کہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا بس اتنی کسر رہ گئی کہ میں آپ کے سامنے آسمان پر اڑوں کہ دیکھو معراج یوں ہوا کرتی ہے اس کے بعد ایک دوست نے مجھ سے

کہا کہ تنفس کی ضرورت مکث طویل میں ہوتی ہے اور مکث طویل ہی سے خردبرد کا اثر بھی لازم آتا ہے سرعت سیر میں نہ تنفس کی ضرورت ہے نہ مرور فی النار سے احتراق لازم آتا ہے چنانچہ چراغ کی لو میں جلدی جلدی انگلی چلائی جائے تو آگ کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا بس اگر مان لیا جائے کہ اوپر ہوا نہیں ہے تو اس سے واقعہ معراج پر کیا اشکال ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طبقہ کو جو نہایت سرعت سے طے کیا ہے جس میں آپ کو تنفس کی ضرورت ہی نہیں ہوئی اور ضرورت ہوئی بھی تو پندرہ بیس منٹ حبس دم کرنے سے ہلاکت نہیں ہوتی اور اسی سرعت کی وجہ سے آپکے جسم پر نار و زمہریر کا اثر نہیں ہوا مجھے یہ جواب پسند آیا اور خیال ہوا کہ اس وقت یہ بات معلوم ہو جاتی تو سائل کی تسلی ہو جاتی مگر مجھے زیادہ خیال نہیں ہوا کیونکہ تسلی کرنا ہمارے ذمہ نہیں ہے علیگڈھ میں ایک پروفیسر میرے پاس آئے جو علوم عربیہ کے استاد وہاں مشہور تھے انھوں نے ایک حدیث[ع۵] حاکم کا متن پڑھا ولا ظهرت الفاحشة فی قوم الا سلط علیهم الموت یعنی وبا اور طاعون کثرت زنا سے ہوتا ہے سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا طاعون و زنا میں ارتباط سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا پھر اسکے نہ سمجھنے سے ضرر ہی کیا ہوا کہنے لگے ضرر تو کچھ نہیں ہوا لیکن معلوم ہونے سے نفع ہوتا۔ میں نے کہا کہ وہ نفع کیا ہے کہنے

ع۵ کذا فی الترغیب ۱۲۔

لگے اطمینان میں نے کہا اطمینان کے مطلوب ہونیکی کیا دلیل کہا اگر یہ مطلوب نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اسکو طلب نہ فرماتے میں نے کہا کہ کیا ضرور ہے کہ جو چیز حضرت ابراہیمؑ کے لئے نافع ہو وہ آپکے لئے بھی نافع ہو بس اس پر وہ خاموش ہوگئے میں نے اسکے بعد انسے کہا کہ مولانا آپ یہ نہ سمجھیں کہ ملانوں کو اس کا ارتباط معلوم نہیں۔ الحمدللہ کہ ہم کو بعض اسرار کا علم بھی بزرگوں کے طفیل سے حاصل ہے مگر بتلانا مصلحت نہیں سمجھتے اور میں نے یہ شعر پڑھا ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

ہمیں خبر ہے مگر آپ کو نہیں بتلاتے کیونکہ اسرار کا بتلانا ہمارا ذمہ نہیں صرف احکام کا بتلانا ہمارے ذمہ ہے پھر میں نے احباب کے جلسہ خاص میں اس ارتباط کی تقریر کردی غرض اسی طرح طرق تسہیل کا بتلانا ہمارے ذمہ نہیں بلکہ مشائخ کے بھی ذمہ نہیں گو مشائخ نیے اسی سے ہیں کہ وہ فن تسہیل سے واقف ہیں مگر یہ انکے ذمہ نہیں محض ان کی عنایت ورحمت ہے مخلوق پر کہ وہ طرق تسہیل بتلا دیتے ہیں اور وہ بھی اس طرق کو اس شخص کے لئے استعمال کرتے ہیں جو تحصیل میں ساعی ہو اور جو شخص تحصیل اعمال میں کوتاہی کرکے تسہیل کا طالب ہو وہ اسکے ساتھ تسہیل کا معاملہ نہیں کرتے بلکہ تکلیف کا معاملہ کرتے ہیں (یہاں پہونچکر اذان عصر ہوگئی تو فرمایا کہ بس میں اب ختم ہی کرنے والا ہوں یہ فرماکر خاموش ہوگئے۔ اور اذان کے بعد فرمایا) کہ اب میں مقصود کی

توضیح کرکے چند باتیں تفسیر آیت کے متعلق بیان کرکے ختم کرتا ہوں
میرا مقصود اس آیت کی تلاوت سے یہ تھا کہ شارع نے اصل میں ہمکو
اعمال اختیاریہ کی تحصیل کا مکلف کیا ہے اور شارع کے ذمہ تسہیل کی رعایت
نہیں مگر محض عنایت کی وجہ سے بعض دفعہ تسہیل کی بھی رعایت فرمالیتے
ہیں جیسا کہ اس آیت میں کیا گیا ہے پس سالکین کی یہ بڑی غلطی ہے کہ
وہ سہولت کے طالب ہیں اور طلب تحصیل میں کوتاہی کرتے ہیں اس
میں مقصود بالذات کو تابع اور مقصود بالغرض کو اصل قرار دینا ہے نیز
صفت اختیار کا ابطال ہے جو امانت الٰہیہ ہے اب میں مختصراً تشبیہ
کے متعلق جو اس آیت میں مذکور ہے کچھ عرض کرتا ہوں حق تعالیٰ نے یہاں
نفقات کو جنات سے تشبیہ دی ہے وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جسطرح باغ
میں پھل کو ترقی ہوتی ہے اسی طرح نفقات میں زیادت ہوتی ہے اور
وابل سے اخلاص کی تشبیہ مقصود ہے جس کی دلیل اوپر کی آیات ہیں کیونکہ
اوپر ریاء فی الانفاق کی مذمت ہے کالذی ینفق مالہ رئاء الناس
ولا یؤمن باللہ والیوم الاٰخر الاٰیہ۔ اسکے بعد اخلاص فی الانفاق کی
فضیلت بیان فرمائی گئی اور جب وابل سے مراد اخلاص ہے اور اس
کے مقابلہ میں طل مذکور ہے اور وابل کہتے ہیں موسلا دھار بارش کو
طل کہتے ہیں پھوار کو تو اس تقابل سے معلوم ہوا کہ وابل سے اخلاص
کامل مراد ہے اور طل سے اخلاص قلیل مراد ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر
اخلاص کامل ہوا تو نفقات میں ترقی زیادہ ہو گئی اور اگر اخلاص قلیل

ہوا تو وہ بھی ترقی کے لئے کافی ہے گو زیادہ ترقی نہ ہو اور اسکا یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل بھی مطلوب ہے بلکہ اس سے دہمیوں کا علاج کیا گیا ہے کیونکہ اگر اخلاص کامل کا مطلوب ہونا انکے ذہن نشین ہو جائے تو ان سے کوئی عمل نہ ہو سکے گا کیونکہ پہلے ہی دن اخلاص کامل میسر نہیں ہو سکتا جیسے ایک بزرگ کا قصّہ ہے کہ ان کے سامنے ایک جنازہ کی نماز شروع ہوئی اور وہ شریک نہ ہوئے کسی نے پوچھا کہ آپ نے نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھی فرمایا کہ میں نیت کی تصحیح میں مشغول رہا یہی سوچتا رہا کہ اسوقت اس میّت کی نماز پڑھنے میں کیا نیت ہے کیونکہ نماز جنازہ میں مختلف نیتیں ہوتی ہیں کبھی اعزہ و اقربا کی خاطر سے پڑھی جاتی ہے کبھی میّت کی وجاہت کا اثر ہوتا ہے کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ میّت محلہ دار ہے اگر نماز نہ پڑھیں گے تو اہل محلہ ملامت کریں گے یہی وجہ ہے کہ رئیس یا عالم کے جنازہ کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے غریبوں کے جنازہ کا اسقدر اہتمام نہیں ہوتا اگر اخلاص منشا ہوتا تو یہ فرق کیوں ہوتا۔ اسی طرح حافظ اگر تراویح میں سوچتا رہے کہ میں تراویح میں جو بنا سنوار کر قرآن پڑھ رہا ہوں اس میں کیا نیت ہے کیونکہ تنہا نماز پڑھتے ہوئے ایسا اہتمام نہیں ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ تراویح ہرگز نہ پڑھا سکے گا پس اس وہم کا علاج کر دیا گیا کہ تم کس وہم میں پڑے ہمارے یہاں اخلاص قلیل بھی کافی ہے بس تم اپنی طرف سے بُرا قصد نہ کرو اسکے بعد بیفکر ہو کر کام میں لگو اور اخلاص کامل کے لئے سعی کرتے رہو اسی طرح سے ایک دن اخلاص کامل بھی میّسر

ہو جائیگا اور اگر پہلے ہی دن اخلاص کامل پر عمل کو موقوف رکھا تو تم سے کچھ
بھی نہ ہو سکے گا یہ مطلب ہے فان لم یصبہا وابل فطل کا کہ ابتدا ءمیں اخلاص
قلیل ہی کو کافی سمجھو اور عمل شروع کر دو یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل ہی
مطلوب ہے بلکہ مطلوب تو اخلاص کامل ہے مگر اسکے حصول کا طریقہ یہی ہے
کہ اول قلیل ہی سے عمل شروع کر دو۔ طل پر مجھے ایک لطیفہ ہارون رشید
کی باندی کا یاد آگیا گو مضمون سے اسکو تعلق نہیں مگر لفظ طل سے تعلق
ہے ہارون الرشید نے اپنی ایک جاریہ کو کسی غلام سے ہنستے بولتے دیکھ
لیا جسکا نام تھا طل (غلام لونڈیوں کے ایسے ہی نام ہمارے عرف میں
رکھتے ہیں جیسے بہار وغیرہ) ہارون الرشید نے اس جاریہ کو ڈانٹا اور
کہا خبردار جو کبھی اس سے بات کی بلکہ کبھی زبان سے اسکا نام بھی مت
لینا ایک بار وہ لونڈی قرآن مجید کی تلاوت کر رہی تھی کہ یہی آیت آئی
اسکو معلوم ہوا کہ امیر المومنین ایسے موقع پر موجود ہیں جہاں اسکی آواز
جا رہی تھی تو اس نے کیا مزہ کیا کہ آیت کو اسطرح پڑھا فان لم یصبہا
وابل فالذی نہانی عنہ امیر المومنین۔ امیر المومنین ہنسنے لگے اور خطا
معاف کر دی اور نام لینے کی اجازت دیدی۔ پس اصل مقصود تو اخلاص
کامل ہے اور اسی کا امر ہے وہی مطلوب ہے اور اس سے تکمیل عمل کی
مقصودیت پر دلالت ہوگئی مگر چونکہ اس میں بعض وہمیوں کو غلو ہو جاتا
ہے اسلئے فطل میں اسکی تعدیل کر دی گئی گو یا فاصابہا وابل میں تکمیل
کی تعلیم تھی اور فطل میں تعدیل کر دی گئی تو اس آیت میں چار چیزیں

مذکور ہوئیں۔ تحصیل۔ تسہیل۔ تکمیل۔ تعدیل۔ اور اسی مناسبت سے
میں اس بیان کا نام التحصیل والتسہیل مع التکمیل والتعدیل تجویز کرتا
ہوں اور اس مضمون کو خاص رمضان سے یہ تعلق ہے کہ طاعات رمضان
کو بھی مثل تکرار اتفاق کے تسہیل اعمال میں بڑا دخل ہے یعنی رمضان میں
یہ خاصیت ہے کہ اس ماہ میں جن طاعات پر مداومت کرلے سال بھر
ان پر مداومت سہل رہتی ہے اور جن گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرلے
سال بھر انسے بچنا آسان ہو جاتا ہے ابن حبان نے ایک حدیث مرفوع
روایت کی ہے سلم لہ الجمعۃ سلم لہ ما بینہ وبین الجمعۃ الاخری ومن
سلم لہ رمضان سلم لہ السنۃ کلہا (قلت اخرجہ السیوطی فی الجامع
الصغیر وعزاہ الی الدارقطنی وابن عدی واحمد عن عائشۃ
بلفظ اذا سلمت الجمعۃ سلمت الایام واذا سلم رمضان سلمت
السنۃ وقال العزیزی وھو حدیث ضعیف ج۱ ص۱۳۵) رہا یہ کہ رمضان
میں یہ خاصیت بالکیفیت ہے یا بالخاصہ ہے دونوں احتمال ہیں اگر
بالخاصہ ہے تو تب تو وجہ بیان کرنیکی ضرورت نہیں اور بالکیفیت ہے
تو یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ مہینہ بھر کسی عمل سے رکنے میں اس سے اجتناب
کی عادت ہو جاتی ہے اب سال بھر اس سے بچنا سہل ہو جاتا ہے اسی
طرح کسی عمل کے کرنے میں بھی ایسا ہی سمجھو مگر سہولت کے معنی یہ ہیں کہ
اگر اب اس عادت سے کام لو تو سہولت ہو جائے گی یہ معنی نہیں کہ عادت
سے کام لینے کی بھی ضرورت نہ رہے گی جیسے کسی شخص کی آنکھیں بنائی

گئیں اور ان میں روشنی آگئی تو آنکھ کے درست ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اس سے کام لیگا آنکھیں کھولیگا تو نظر آئیگا اگر کوئی احمق یہ کہے کہ میں تو آنکھ نہ کھولونگا کھولنے سے نظر آیا تو فائدہ ہی کیا ہوا آنکھ بننے کے تو یہ معنی ہیں کہ بدون کھولے بھی نظر آئے تو ایسی تیسی اس احمق کی پس یہ مطلب نہیں کہ رمضان لاٹھی لیکر تم کو گناہوں سے روکے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسکی ایسی برکت ہے کہ اس میں گناہوں کو اہتمام سے چھوڑ کر بعد میں اس برکت سے کام لینا چاہو تو گناہوں کا چھوڑنا آسان ہو گا ورنہ پھر یہ عالم ابتلا ہی کیا ہوا اگر جبراً تمسے گناہ چھڑا دیئے جائیں۔ پس اب بقیہ رمضان میں اہتمام کیساتھ گناہوں سے بچو خصوصاً نگاہِ بد اور غیبت سے اور اعمال صالحہ کا اہتمام کرو تلاوت قرآن و نماز و ذکر میں مشغول رہو اور دوسرے دنوں سے آجکل کچھ کام بڑھا دو اور ایک عمل جسکو رمضان سے خصوصیت ہے ابھی باقی ہے یعنی شب قدر کی تلاش کرنا اس کا بھی خاص اہتمام کرو ابھی کچھ لیالی قدر باقی ہیں انکو غنیمت سمجھو دو راتیں تو گذر گئی ہیں اگر ان میں اہتمام نہ کیا ہو تو بقیہ ہی کا اہتمام کر لو تاکہ فان لم یصبہا وابل فطل ہی کا مصداق ہو جائے اور کل رات میں نہ جاگ سکو تو زیادہ حصہ جاگ لو یہ بھی نہ ہو سکے تو دوسری راتوں سے کچھ زیادہ جاگ لو یہ بھی فان لم یصبہا وابل فطل میں داخل ہے غرض نہ سب راتیں ضروری ہیں نہ پوری رات ضروری ہے جتنا ہو جائے غنیمت ہے اس سے دریغ نہ

کرد ؎

مراز زلف تو موئے بسند ست ہوس را رہ مدہ بوئے بسند ست

زلف محبوب کی خوشبو ہی کافی ہے یہ شعر شیخ عبدالحق نے اس موقعہ پر لکھا ہے جہاں حدیث میں یہ قصہ آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وداع میں خلق راس کے بعد اپنے موئے مبارک تقسیم فرمائے تھے شیخ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کے بال دنیا میں موجود ہیں گو سند صحیح کے ساتھ ہم کو نہ ملیں مگر ہمکو یہ خبر ہی کافی ہے۔ شیخ میں عشق کا غلبہ ہے اشعار محبت بڑے موقعہ سے ذکر کرتے ہیں چنانچہ اس حدیث کی شرح میں جس میں حضورؐ کے مرض کے وصال کا واقعہ مذکور ہے کہ ایک دن صحابہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت صدیقؓ امام تھے۔ حضورؐ نے اپنے حجرہ کا پردہ اٹھا کر صحابہ کی جماعت کو دیکھا اور تبسّم فرمایا۔ صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم کو اس وقت حضورؐ کا چہرہ دیکھکر ایسی حالت ہوئی کہ قریب تھے کہ نماز توڑ دیں شیخ اس واقعہ کو بیان کرکے یہ شعر لکھتے ہیں ؎

درنماز خم ابروئے تو چوں یاد آمد حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

خیر یہ تو استطرادا ذکر ہو گیا اصل مقصود پہلا شعر تھا کہ ؎

مراز زلف تو موئے بسند ست ہوس را رہ مدہ بوئے بسند ست

تم اگر ساری رات نہ جاگ سکو تو جتنا ہو سکے اور دنوں سے کچھ زیادہ شب قدر جاگ لو ہمارے حاجی صاحب کا شعر ہے ؎

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہونچے وہاں گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

ہیں عالی ہمتوں کی ہمت کم نہیں کرنا بلکہ کم ہمتوں کی ہمت بڑھا رہا ہوں کہ وہ زیادہ نہ کرسکیں تو قلیل ہی سے دریغ نہ کریں اور جو زیادہ کر سکتے ہیں وہ زیادہ ہیں کمی نہ کریں اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرما دیں اور عمل کی توفیق ہو وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین ط

تکمیل الاعمال بتبدیل الاحوال

تبدیل احوال سالکین کے متعلق یہ وعظ اہلیہ منشی محمد خلیل الرحمٰن خان صاحب کانپوری کی فرمائش پر شب جمعہ شوال ۱۳۳۸ھ کو چھوٹی بیگم صاحبہ کے مکان پر تھانہ بھون میں ہوا۔ جسے خواجہ عزیز الحسن صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥ الا من تاب وآمن وعمل عملا صالحا فاولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات وکان اللہ غفورا رحیما۔

وجۂ بیان اسوقت مجھکو ایک ضروری مضمون بیان کرنا ہے۔ اصلاحِ اعمال کے متعلق۔ اور اصلاح احوال کے متعلق اور اس مضمون کے ضمن میں ان کوتاہیوں اور غلطیوں کو بھی بقدر ضرورت بیان کرنا چاہتا ہوں جو سالکین کو اثنائے سلوک میں پیش آتی ہیں اور غلطیاں بعض عامیانہ ہیں اور بعض خاصیانہ۔ یعنی بعض تو وہ ہیں جو عوام کو واقع ہوتی ہیں اور بعض وہ ہیں جو خواص کو پیش آتی ہیں اور اس مضمون کے سننے کے بعد معلوم ہوگا کہ یہ مضمون نہایت ضروری ہے اور مشترک ہے۔ عوام اور خواص سب کے درمیان کہ جس پر سب کو متنبہ ہونا ضروری ہے گو یہ مضمون ذرا دقیق اور غامض ہے لیکن انشاء اللہ اسکا اہتمام کیا جاویگا اور کوشش جاوے گی کہ مستورات بھی سمجھ لیں۔ ہر چند اس مضمون کے یہاں بیان کرنیکی رائے نہ ہوتی تھی کیونکہ شاید مستورات کے ذہن میں نہ آوے مگر ضروری ہونے نے مجبور کیا لہٰذا اسی کو اختیار کرتا ہوں لیکن انشاء اللہ اپنی طرف سے اہتمام کیا جاویگا۔ سمجھانے کا آگے حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے اسی پر بھروسہ ہے۔

توبہ کا طریق حق تعالیٰ نے اس سے قبل کی آیت میں بعض اعمال منہی عنہا یعنی بعض معاصی کا بیان کیا ہے اور اس پر وعیدیں فرمائی ہیں کہ جو شرک کریگا یا بدکاری کریگا یا قتل کریگا اسکو اسطرح عذاب ہوگا۔

پھر اُس عذاب سے استثناء فرماتے ہیں۔ اس آیت میں جسکا یہ حاصل ہے کہ سب کو عذاب ہوگا مگر ان کو نہ ہوگا جنکی یہ شان ہے کہ انھوں نے جملہ معاصی سے توبہ کرلی اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کئے یعنی کفر سے بھی توبہ کی اور کفر سے توبہ یہ ہے کہ کفر چھوڑ کر ایمان لے آئے اور چونکہ اوپر ذکر کفر و شرک کا بھی تھا اُسکے متعلق توبہ ارشاد فرمایا ہے کہ آمن یعنی ایمان لے آئے اور چونکہ بعض اور معاصی بھی مذکور تھے۔ گو ان کا وقوع بھی کافروں ہی سے مذکور ہے مگر فی نفسہ انکی خصوصیت خاص کفار ہی سے نہیں بلکہ جو بھی مبتلاء ہو اسی کے لئے تدارک اور اصلاح کا طریقہ بھی بتلانا ہے اسلئے آمن کے ساتھ تاب کو فرمایا۔ گو تاب کو مقدم فرمایا جس سے مطلب یہ ہے کہ توبہ تو جملہ معاصی سے ضروری ہے ہی مگر بالتخصیص کفر سے توبہ نہایت ہی ضروری ہے یعنی ایمان بھی ضروری ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جتنے معاصی ہیں اُن سے توبہ کرنا چاہیئے اور ان میں سے کفر و شرک بھی ہیں۔ اور توبہ کا طریق یہ ہے۔ یعنی بعض معاصی سے توبہ یہ ہے کہ ایمان بھی لا دے گویا یہ تخصیص بعد تعمیم ہے ورنہ ظاہر یہ تھا کہ ایمان مقدم ہوتا مگر اس میں یہ نکتہ ہے جو میں نے بیان کیا اور یہ بات عکس میں حاصل نہ ہوتی۔ پھر فرماتے ہیں دعمل عملاً صالحا یہ نہیں کہ توبہ کر کے بیٹھ رہے بلکہ آئندہ کے لئے بھی اہتمام کرے اور نیک کام کیا کرے نیک کام میں دونوں امر آگئے معاصی کا چھوڑنا بھی اور طاعات کا اختیار کرنا بھی۔ جو شخص ایسا کریگا وہ البتہ عذاب سے بچے گا آگے اسکی صورت بتلاتے ہیں کہ کیا طریق ہوگا عذاب سے بچنے کا اور کیا خاصیت

ہو گی۔ اس طرزِ عمل کی لیکن اس خاصیت کے ذکر کو میں ذرا مؤخر کر دوں گا گو مقصود زیادہ اسی کو بیان کرنا ہے مگر چونکہ توبہ کا مضمون بھی جو اس مقام پر مذکور ہے ضروری ہے۔ اس لئے میں اس طرف بھی متوجہ کرنا چاہتا ہوں

عادت احساس مٹا دیتی ہے

حق تعالیٰ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں کا تدارک ضروری ہے۔ چونکہ یہ ظاہر ہے کہ ہم لوگوں سے کوتاہی ضرور ہو رہی ہے اور وہ کوتاہی ظاہر ہے۔ یعنی حالت یہ ہے کہ عام طور سے سب ہی ارتکاب کر رہے ہیں معاصی کا۔ سب ہی مبتلا ہیں لکھے پڑھے بھی اَن پڑھ بھی۔ مرد بھی عورتیں بھی۔ اور کسی کو اس طرف توجہ نہیں کہ ہاں میں گناہ کر رہا ہوں۔ چاہے وہ گناہ چھوٹا ہی ہو بلکہ بعض حیثیتوں سے چھوٹا گناہ بھی بڑا بن جاتا ہے اسواسطے کہ جب گناہ کو چھوٹا سمجھا تو یہ گناہ کا چھوٹا سمجھنا خود بڑا گناہ ہے۔ یوں تو اعتقاداً چھوٹے گناہ کو چھوٹا سمجھے کیونکہ خود شریعت نے صغیرہ وکبیرہ کی طرف تقسیم کی ہے لیکن عملاً چھوٹا سمجھنے سے یعنی ہلکا سمجھنے سے اس پر اصرار ہو گا۔ اب وہ گناہ بڑا ہو گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس مرض میں سب ہی مبتلا ہیں دور کیوں جائیے اب غیبت ہی ہے۔ کون اس گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا لیکن ساتھ ہی جیسا کہ گناہوں سے کراہت ہونا چاہیئے وہ کراہت اس سے نہیں۔ ٹٹول کر دیکھ لو عوام بھی خواص بھی مرد بھی عورت بھی کہ غیبت کو اتنا برا نہیں سمجھتے جیسا کہ اور گناہوں کو۔ بلکہ دل بھی برا نہیں ہوتا جیسا کہ گناہ کرنے سے ہوتا ہے۔ دیکھئے اگر کسی مسلمان

کو بھولے سے شراب پینے کے بعد یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے دھوکے سے شراب پی لی ہے تو گو اسکو گناہ نہیں ہوا اس لئے کہ اسکو خبر ہی نہیں ہوئی کہ یہ شراب ہے لیکن ٹٹول کر دیکھ لیجئے کہ کتنی متلی ہوگی کتنا جی برا ہوگا کتنا غصہ آئیگا پلانے والے پر اگر خود ہی دھوکہ میں پی گیا تو اپنے اوپر کتنا غصہ آئیگا اور کتنی نفریں کریگا کہ لاحول ولا قوۃ کیا حماقت ہوئی دوڑا دوڑا پھرے گا بیچین ہو کر فتوے پوچھنے پہونچے گا کہ مولوی صاحب غضب ہو گیا میں سمجھا کہ دوا ہے برتن میں حالانکہ تھی شراب میں دوا کے دھوکہ میں پی گیا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تو شراب تھی اجی میرا ایمان رہا گیا۔ اجی اب کسطرح اسکا تدارک کروں اب مولوی صاحب ہیتیرا کہہ رہے ہیں کہ ارے بھائی غلطی میں گناہ نہیں ہوتا تم بے فکر رہو لیکن اسکا دل کسی طرح صاف نہیں ہوتا۔ کیوں صاحب شراب پینا بلا قصد حالانکہ گناہ نہ تھا صرف گناہ کے مشابہ تھا مگر اس سے کتنا جی برا ہوا لیکن ٹٹول کر دیکھئے کہ باوجود جاننے کے کہ غیبت گناہ ہے غیبت کرکے کبھی اس سے آدھا، تہائی، چوتھائی بھی جی برا ہوتا ہے ہرگز نہیں۔ بس معلوم ہوا کہ عادت جو غیبت کرنے کی پڑ گئی ہے کرتے کرتے مساوات ہو گئی ہے اور یہی حالت ہر گناہ کی ہے کہ عادت سے مساوات ہو جاتی ہے۔ ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ انھوں نے کہیں راستہ چلتے کسی کو کوئی گناہ کرتے ہوئے دیکھ لیا چونکہ اس سے پہلے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا اسلئے اسقدر ناگوار ہوا اور اسقدر تکلیف پہونچی کہ مارے غصہ کے

جب گھر گئے ہیں اور استنجے کی حاجت ہوئی تو پیشاب جو کیا تو بجائے پیشاب کے خالص خون نکلا۔ کیا ٹھکانا ہے اثر کا۔ اگلے دن پھر ایسا ہی اتفاق ہوا لیکن پیشاب ہی ہوا گو گرم ہوا پھر ایسا ہی اتفاق ہوا تو گرمی بھی نہ رہی اچھے خاصے ہو گئے جیسے تھے۔ تو دیکھئے عادت کو کتنا بڑا دخل ہے مگر گناہ دیکھنے کی عادت میں تو تھے مجبور اس لئے یہاں ملامت نہیں ہے اب کیا آنکھیں بند کر کے چلیں کیا آنکھیں پھوڑ لیں ایک شخص راستہ میں گناہ کرتا ہے اور پہلے سے خبر نہیں تو اگر اس پر بلا قصد نظر پڑ جائے تو مجبوری ہے اُس پر اگر کراہت طبعی میں تفاوت ہو جائے تو کچھ غم نہیں کیونکہ یہ دیکھنا بالقصد نہیں تھا لیکن گناہ کا صادر کرنا یہ تو اختیاری امر تھا۔ یہ گویا بالقصد تھا اس سے جو تفاوت ہوا یہ البتہ ہے قابل ملامت۔ تو یہ حالت ہو گئی ہے عادت کی وجہ سے کہ گناہ کر کے جی بھی برا نہیں ہوتا مگر تب بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایمان نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ عقلی و اعتقادی ناگواری تو اب بھی ہوتی ہے چنانچہ کوئی متنبہ کرتا ہے تو نادم ہوتے ہیں کہتے ہیں کہ بھائی دعا کرو ہم سے یہ گناہ چھوٹ جائیں اور ہم ان بری عادتوں سے نجات پائیں۔ بہر حال عقلی ناگواری کافی ہے بقائے ایمان کے لئے اسواسطے میں نے عرض کیا تھا کہ معاصی سے بوجہ عادت کے اگر طبعی ناگواری نہ رہے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایمان نہیں رہا۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ جب نیکی کر کے جی خوش ہو اور گناہ کر کے رنج ہو تب تم مومن ہو تو بعض دفعہ یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ حالت تو ہماری نہیں۔ پس ہمارا کیا ایمان رہا اسمیں بھی محقق کہتے ہیں کہ یہاں خوش ہونا اور

جی بُرا ہونا طبعی مراد نہیں۔ اگر طبعی نہ ہو عقلی ہی ہو تب بھی کافی ہے بقائے ایمان کے لئے۔ ہاں اگر عقلاً بھی نہ ہو تو ایمان جاتا رہا۔ تو بہر حال اگرچہ بوجہ عادت پڑ جانے کے معاصی سے طبعاً کراہت نہیں رہی لیکن عقلاً تو برا سمجھتے ہیں۔ البتہ برائی کی وہ کیفیت جو اول بار گناہ کے صدور کے وقت ہوئی تھی وہ نہ رہی۔

اہتمام ترکِ معصیت ضروری ہے

ہر چند انسان امور طبعیہ کا مکلف نہیں۔ لیکن جب حق تعالیٰ نے ایک دولت دی ہو اور وہ ہو جائے کم ہماری سوء تدبیر سے تو چاہے گناہ نہ ہو اُسکے کم ہو جانیکا لیکن آئندہ کے لئے یہ دروازہ تو ہے معاصی کا۔ کیونکہ اب مانع ضعیف ہو گیا ہے لہٰذا اندیشہ یہ ہو گیا ہے کہ معاصی کا صدور زیادہ ہوگا یہ بھی فکر کی بات ہے اسکا بھی تو غم ہونا چاہیئے جو محتاط ہیں وہ احتمالات بعیدہ سے بھی مغموم ہوتے ہیں۔ مشہور ہے کہ کسی کے بیٹے پر سے ایک دفعہ سوتے میں سانپ گزر گیا تھا وہ غم میں بیٹھا ہوا تھا لوگوں نے کہا کہ میاں اب غم کی کیا بات ہے خدا کا شکر کرو کہ بچ گئے کاٹا نہیں۔ اس نے کہا کہ جی اسکا غم نہیں کہ اُس نے کاٹ لیا مگر غم اسکا ہے کہ یہ اس کے آنے جانے کے لیے سڑک ہو گئی یہ برا ہوا کہ میرا بیٹا سانپ کا راستہ ہو گیا دیکھئے کبھی کاٹ بھی نہ لے۔ یہ ہے تو حکایت ہنسی کی۔ مگر ہر ہنسی سے نتیجہ نکالنا چاہیئے اور سبق لینا چاہیئے گو یہ حکایت ہزل ہے مگر بعضے ہزل کے اندر بھی جد ہوا کرتا ہے تو اس حکایت میں جو احتیاط ہے اسکا حاصل

یہ ہے کہ اندیشہ کی چیز سے بچنے کے اہتمام میں مشغول ہو اور تدبیر میں لگ جائے یہ معنی ہیں احتیاط کے تو اگر کسی نے غیبت کی اور اُسکا جی بُرا نہ ہوا تو اس مقام میں چونکہ ایک باضابطہ مولوی یہ کہہ سکتا تھا کہ ایمان موجود ہے اور رنج طبعی ہے نہ ہوا تو گناہ کیا ہوا۔ میں اُسکا جواب دے رہا ہوں کہ بھائی پہلے جب مسرت طبعیہ اور کراہیت طبعیہ موجود تھی اسوقت یہ مانع قوی تھا صدور معصیت کا اسوقت زیادہ مقاومت کی حاجت نہ ہوتی تھی کیونکہ خود طبیعت کے اندر ہی مقاوم موجود تھا۔ وہ مقاوم اب ضعیف ہو گیا۔ اب اگر بہت ہی اہتمام کے ساتھ معصیت سے رکو گے تب تو بچ سکو گے ورنہ بہت جلد مبتلا ہو جاؤ گے۔ دیکھئے شراب سے جو جی برا ہوتا ہے تو خود پینا تو درکنار اگر کوئی زبردستی پلا دے یا خود دھوکہ میں بلا قصد پی جائے تب بھی پریشان ہو جاتا ہے اور توبہ کرتا ہے اور غیبت سے ایسا جی برا نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات حس بھی نہیں ہوتی کہ ہم غیبت کر رہے ہیں بعض مرتبہ تو آخیر تک بھی حس نہیں ہوتی۔

رحمت کی قدر کی ضرورت

لیکن بعض دفعہ تھوڑی دیر ہی میں متنبہ ہو جاتا ہے مگر آدھی غیبت کے بعد پھر کون رکتا ہے۔ بالخصوص جو مولانا ہیں اُنکو اس قسم کا تنبہ ضرور ہو جاتا ہے۔ البتہ عوام کو اکثر بالکل حس ہی نہیں ہوتی (مزاح فرمایا) وہ بڑے مزے میں ہیں غیبت کو آخیر تک پہنچا کر ختم ہی کر دیتے ہیں اور انھیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم نے کوئی گناہ کیا۔ اور مولانا صاحب کو

بوجہ علم ہونے کے تنبہ ہوتا ہے خاصکر اگر کوئی مولانا صاحب تھوڑے سے شاہ صاحب بھی ہوں تب تو ضرور احساس ہوتا ہے مگر چونکہ بات تو شروع ہوگئی تھی۔ تنبہ کے اثر کو دل سے ہٹا کر اور اُس سے اعراض اور بے پروائی کرکے بجائے منقطع کر دینے کے غیبت کو اخیر تک پہونچا کر چھوڑتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اب حکایت تو شروع کر چکے ہیں غیبت تو ہو ہی گئی پھر اب چھوڑنے ہی سے کیا فائدہ ہوگا۔ دوسرے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اگر بیچ میں سے کہنا چھوڑ دونگا تو سامع یوں سمجھے گا کہ اب آپکو خبر ہوئی کہ یہ غیبت ہے اور یہ سمجھے گا کہ دیکھو مولانا صاحب نے شاہ صاحب نے باوجود غیبت ہونے کے پھر اسکا ارتکاب کیا اس سے ہماری شاہ صاحبی اور مولوی صاحبی میں فرق آئیگا اور اگر غیبت کو پورا کر گئے تو اللہ میاں کو راضی کر لینا کونسا مشکل ہے کیونکہ انکی نظر شاہ صاحبی اور مولوی صاحبی پر نہیں ہے اور اگر بیچ میں منقطع کر دیا تو ہماری وقعت اور عظمت میں فرق آجائیگا اور اللہ کو راضی کر لینا تو اتنا آسان سمجھتے ہیں جیسے توبہ توبہ بچے کا راضی کر لینا کہ چاہے خفا ہو رہا ہو اور غصہ کر رہا ہو جہاں اس سے یہ کہا کہ آج تجھے ہم ایک پیسہ دیں گے بس ہنسنے لگا لڑکا کیا ہے وہ تو ذرا سی دیر میں راضی ہو جاتے ہیں وہ تو بہت ہی ارزاں ہیں۔ اللہ توبہ اللہ توبہ نعوذ باللہ۔ یہ انکی رحمت کی قدر کی۔

جباری و قہاری پر نظر رکھنے کی ضرورت

مگر جہاں انکی رحمت پر نظر کی انکی جباری

انکی قہاری انکا جلال یہ بھی تو دیکھنے کے قابل تھے اللہ اکبر اس پر نظر کرکے گناہوں سے ضرور رکاوٹ ہونی چاہیئے کیونکہ ایسے جبار اور ایسے قہار کے راضی کرنیکی ہمت ہی کہاں پڑیگی۔ دیکھئے ایک حاکم پر پورا اطمینان ہوتا ہے کہ میں جب معافی مانگوں گا ضرور معاف کردے گا مگر خدا جانتا ہے باوجود یقین کے بولنے کی ہمت نہیں پڑتی اسی طرح جنھوں نے حق تعالیٰ کی عظمت کو پہچان لیا انہیں باوجود اس یقین کے کہ وہ رحیم وکریم ہیں معافی چاہنے سے ضرور معاف کردیں گے لیکن معافی مانگنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ ایک عالم کو ان کے انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کہ حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا انھوں نے کہا کہ حق تعالیٰ نے مجھسے یہ فرمایا کہ تم ہمارے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کرتے جاؤ اور ہم سے معافی لیتے جاؤ چنانچہ میں نے سارے گناہوں کا تو اقرار کرلیا لیکن ایک ایسا واہیات گناہ ہے کہ ہمت نہیں ہوتی اسکے اقرار کرنے کی خدا کے سامنے۔ میں نے ایک لڑکے کو بری نگاہ سے دیکھا تھا اب یہ خدا کے سامنے کیسے کہوں کہ میں نے لڑکے کو گھورا تھا بس اس گناہ کے عذاب میں مبتلا ہوں وہاں سے یہ اصرار ہے کہ زبان سے اقرار کرو۔ مجھے عذاب جھیلنا تو آسان ہے لیکن زبان سے یہ نہیں کہا جاتا کہ میں نے لڑکے کو گھورا تھا بھلا ایسی واہیات بات کو خدا کے سامنے کیسے کہدوں تو بات یہ ہے کہ بعد موت کے حقیقت اور عظمت حق جل شانہ وعم نوالہ کی منکشف ہوجاتی ہے اس لئے وہاں ان جلالت شان کا پورا اثر پڑیگا یہاں چونکہ غفلت ہے مستوری ہے استتار ہے۔

اسلیئے اثر نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی رحمت ہے کیونکہ اگر یہاں پر اتنا انکشاف ہوتا جتنا کہ آخرت میں ہوگا تو شاید شدت ہیبت سے نیک اعمال کا صدور بھی نہ ہوسکتا اسلیئے حکمت کے اقتضار سے کچھ استتار تو ہونا چاہیئے مگر اتنا بھی نہیں کہ انکشاف کا کچھ اثر ہی نہ ہو۔ دونوں کا ہونا ضروری ہے من وجہ انکشاف ہو من وجہ استتار نہ اتنا انکشاف ہو کہ توبہ کرنے کی بھی ہمت نہ پڑے نہ اتنا استتار ہو کہ معاودت معاصی پر حامل ہو۔ گناہوں کی کچھ پرواہی نہ تو خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی عظمت اور شان کا کچھ تو اثر ہونا چاہیئے گناہوں کے لئے کچھ توڑ کاوٹ ہونا چاہیئے بس گویا یہ سمجھ رکھا ہے جسکی تشبیہ ایسی ہے جیسے بچے کے راضی کر لینے کی۔ کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے۔ خدا کے کمالات اور شان کا ماننے والا اور اس پر اس ماننے کا صرف ایسا اثر جیسے بچہ کا۔ کسقدر بیقدری ہے ؎

اے گراں جان خوار دیدستی مرا، زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا،

کید نفس کی صورت

چونکہ دام تو خدا کے راضی کرنے میں لگے نہیں اسلیئے یہ بیقدری ہے ماقدروا اللّٰہ حق قدرہ اس لئے خدا کا راضی کرنا آسان سمجھتے ہیں بہ نسبت مخلوق کی نظر سے گر جانے کے چونکہ مخلوق کی نظر سے گر جانا گراں اور ناگوار ہے اسواسطے یہ حضرت باوجود تنبہ کے وہ حکایت تو پوری کر ہی دیتے ہیں کیونکہ بیچ میں چھوڑنے سے سننے والے دل میں یہ نہ کہیں گے کہ حضرت نے غیبت شروع ہی کیوں کی تھی تو معلوم ہوا کہ ان حضرت کو دوران گفتگو ہی میں یہ خبر ہو

گئی تھی کہ میں غیبت کر رہا ہوں پھر بھی اُسکو چپکے چپکے کیے چلے گئے یہ تو مقدس نفوس کی حالت ہے دل کو یہ کہکر سمجھا لیتے ہیں کہ آئندہ کو خیال رکھیں گے اب جو غیبت شروع کر چکے ہیں اسے تو کر ہی لو۔ تاکہ سننے والا اسی گمان میں رہے کہ حضرت غیبت کرتے ہی نہیں اسکا بھی پتہ نہ چلے کہ حضرت غیبت کرتے ہوئے بیچ میں چھوڑ دیتے ہیں کتنا بڑا کید نفس کا ہے۔ کچھ حد ہے۔ تو یہ کیا بات ہے۔ بات یہ ہے کہ جی اتنا بھی برا نہیں ہوتا جیسا عادت صدور کے قبل ہوتا۔ اور میں بجائے ہونا کے یوں نہ کہونگا کہ قبل عادت صدور تھا۔ کیونکہ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں کہ غیبت کے ارتکاب کی عادت نہ ہوئی ہو۔ غرض یہ ہے کہ ایسا جی بُرا نہیں ہوتا جیسے شراب پینے میں جو اول اول شراب پیتا ہے اسکا بہت جی برا ہوتا ہے۔ اسی طرح افیون جو اول اول کھاتا ہے اُسے بہت تکلیف ہوتی ہے خاصکر اگر یُسن لیں کہ افیون گناہ بھی ہے تب تو اور بھی جی بُرا ہوتا ہے۔ ویسے خود طبیعت بھی ایسی چیزوں کو قبول نہیں کرتی مگر باوجود اس کراہت طبعی کے جب عادت افیون کھانے کی پڑ جاتی ہے تو پھر یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر نہ ملے تو پریشان اور حیران ہوتا ہے اور آدھی تو آدمی۔ لکھنؤ کا واقعہ ہے۔ ایک بندر کا قصہ سنا ہے کہ وہاں کسی بزرگ نے یعنی کسی افیونی نے کھلا کھلا کر ایک بندر کو افیون کی عادت ڈالدی۔ بڑا سا بندر تھا یہ حکایت سنی ہے واللہ اعلم کہاں تک صحیح ہے کہ وہ سڑک پر پڑا رہتا تھا بڑا سا بندر تھا۔ جو کوئی سفید پوش اُدھر سے گذرتا اُس کا دامن پکڑ کر بیٹھ

جاتا مگر کاٹتا نہ تھا کیونکہ افیون کھانے سے آدمی خوش اخلاق بہت ہو جاتا ہے۔ غصہ تو رہتا ہی نہیں مگر کوئی صاحب اس غرض کیواسطے کہیں کھانا شروع نہ کر دیں۔ کسی کا اس نے دامن پکڑا وہ ڈرا کہ کہیں کاٹ نہ کھائے کوئی شخص اُسکے حال سے واقف آگیا اُس نے کہا کہ آپ ڈریئے نہیں۔ ایک پیسہ دیدیجئے اسکو افیون کی عادت ہے۔ افیون کے لئے پیسہ مانگ رہا ہے بس انہوں نے پیسہ دیدیا۔ اُس نے پیسہ لیتے ہی دامن چھوڑ دیا بس وہ اسی طرح ہمیشہ سفید پوشوں سے پیسہ وصول کر کر کے کسی افیون کی دکان پر پہونچتا تھا۔ سب کو اسکا حال معلوم تھا ہی دُکاندار نے کٹوری میں افیون گھول کر سامنے رکھدی اُس نے پی لی اور کونہ میں آپ بیٹھ گئے مراقب۔ اب آپ بیٹھے پینگ میں جھوم رہے ہیں اور مزے لے رہے ہیں۔ مگر ہمیشہ ایک ہی شخص کو نہ ستاتا تھا ہر روز اس کا مظلوم ایک مختلف شخص ہوتا تھا۔ بیچارہ بہت بھلا مانس بلکہ بھلا بندر تھا۔ بھلا مانس تو کیوں ہوتا مانس تو آدمی کو کہتے ہیں۔ غرض عادت کا خاصہ یہ ہے کہ طلب پیدا ہو جاتی ہے۔ آدمی تو کیا جانور میں بھی اس سے طلب پیدا ہو جاتی ہے۔ تو وجہ کیا۔ وجہ یہ ہے کہ چونکہ جی برا نہیں ہوتا اس لئے مانع طبعی نہیں ہے اور تجربہ ہے کہ ہم لوگوں کے افعال میں بھی اور ترک میں بھی یعنی جو افعال محمودہ ہم کرتے ہیں یا جن افعال مذمومہ سے ہم بچتے ہیں اس میں محض داعیہ عقلی کافی نہیں یعنی محض اسکے ذریعہ سے اس فعل اور ترک پر سہولت سے قادر نہیں ہو سکتے بلکہ ضرورت اسکی ہے کہ کچھ طبعی تقاضا

بھی ہو ۔

توفیق منجانب اللہ ہوتی ہے

اب ہم نماز جو پڑھتے ہیں تو یوں سمجھتے ہوں گے کہ ہم بڑا کام کرتے ہیں ۔ حالانکہ نمازی سوچ لیں کہ نماز کے وقت قلب میں نماز کا تقاضا ایسا ہونا ہے کہ اگر نہ پڑھیں تو جی بُرا ہو اور دل پر بڑا بوجھ رہے ۔ تو حضرت یہ وہ چیز ہے جو پانچوں وقت زبردستی نماز کے لئے کھڑا کر دیتی ہے حدیث میں ہے ؎

واللہ لولا اللہ ما اہتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا

یعنی لولا ہدایۃ اللہ الخ اور ہدایت بھی کونسی ارائت الی المطلوب بھی نہیں ایصال الی المطلوب اگر وہ کشش نہ فرمائیں تو ہم سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا ؎

اگر از جانب معشوق نہ باشد کششے کشش عاشق بیچارہ بجائے نرسد

یہ جو کچھ ہم سے نماز روزہ ہو رہا ہے یہ محض خدا کا فضل و کرم ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ یہ میری طلب کا نتیجہ ہے ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے برآہوئے چیں بستہ اند

مگر نسبت آپ کے ارادہ ہی کی طرف کر دی جاتی ہے تاکہ آپکا جی خوش ہو ہمت بڑھے ۔ جیسے بچہ سے باپ پتھر اٹھوا دیتا ہے ۔ پتھر بچے سے تو اٹھتا نہیں لیکن باپ اٹھوا دیتا ہے اس طرح کہ ہاتھ تو لگا دیتا ہے اس کا لیکن اٹھا لے جاتا ہے خود بلکہ بچے کو بھی خود اٹھا لیتا ہے اس طرح کہ ایک گود میں تو بچہ اور ایک گود میں پتھر ۔ پھر کہتا ہے کہ واہ بھائی واہ بڑا بھاری پتھر اٹھا لائے شاباش ۔ آہا اب تو ماشاء اللہ تم پہلوان ہو گئے وہ بچہ خوش ہوتا

ہے سمجھتا ہے کہ ہم سچ مچ پہلوان ہو گئے۔ اُلّو کہیں کا۔ وہ کیا پہلوان ہوتا وہ تو باپ نے دراصل پتھر اٹھایا ہے لیکن اس نے اپنے بچہ کی ہمت بڑھانے کے لئے اسکا بھی ہاتھ برائے نام لگا کر اٹھانا اسی کی طرف منسوب کر دیا اسی طرح انسان بڑا خوش ہوتا ہے کہ میں نے نماز پڑھی ہے حالانکہ حق تعالیٰ نے خود ایک گود میں آپ کو اور ایک گود میں نماز کو لیکر دونوں کو منزلِ مقصود تک پہونچا دیا ہے کام تو خود کیا اور نام آپکا کیا کہ انھوں نے ہماری نماز ادا کی ع مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

ع کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل، نسیم صبح تیری مہربانی،

حقیقت میں انہیں کا فضل ہے انہیں کی رحمت ہے کہ ہمیں اسطرح سے نیک کاموں کی توفیق دے رکھی ہے۔

گناہوں کی جڑ

بہر حال اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بدون مانع طبعی کے گناہوں سے بچنا نہایت دشوار ہے اسلئے ضرورت ہے طبعی کراہت کی بھی سو قبل صدور معصیت تو طبعی کراہت ہوتی ہے لیکن جب گناہ صادر ہو گیا تو وہ اب طبعی نفرت کم ہوئی۔ پھر صدور ہوا تو اور کم ہوئی پھر اور کم ہوئی اسی طرح کم ہوتے ہوتے پھر نفرت طبعی تو رہتی نہیں صرف عقلی رہجاتی ہے ایمان تو رہتا ہے مگر وہ جو پہلے ایک عرفان کی کیفیت تھی اور ایقان کی وہ جاتی رہتی ہے پھر ہر موقع پر سخت مقاومت کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ جو آسانی سے بچا رہتا تھا وہ بات نہیں رہتی اسلئے ضرورت ہے کہ ہر مسلمان محض اکتساب فضائل ہی پر اکتفا

نہ کرے بلکہ گناہوں کو بھی چھوڑ دے یک لخت اور دفعتہً اسکا اہتمام کرے چند روز تو اہتمام کرنا پڑیگا پھر سہولت ہو جائیگی۔ حالت موجودہ میں چونکہ طبعی نفرت گناہوں سے جیسی چاہیئے ویسی نہیں ہے اسلئے کوئی غیبت میں مبتلا ہے کوئی حرام خوری میں مبتلا ہے کوئی کینہ میں مبتلا ہے کوئی حسد میں مبتلا ہے کوئی تکبر میں مبتلا ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ ان گناہوں کے چھوڑنے کی فکر بھی نہیں۔ بہت سے ایسے ہیں کہ چوری نہیں کرتے شراب خواری نہیں کرتے بہت سے ایسے گناہوں سے بچے ہوئے ہیں نمازوں کے بھی پابند ہیں باقی حسد کینہ تکبر دوسروں کو ذلیل سمجھنا کسی کے ساتھ بدگمانی کرنا ان کو تو گناہ ہی نہیں سمجھتے حالانکہ یہ ایسے گناہ ہیں کہ سب گناہوں سے بڑھکر بلکہ یہ جڑ ہیں سب گناہوں کی۔ چونکہ ان گناہوں کو گناہ ہی نہیں سمجھتے اس لئے بے تکلف ارتکاب کرتے ہیں اور ارتکاب کے بعد اپنے کو مقدس سمجھتے ہیں۔ شراب پینے والے کو فاسق فاجر سمجھتے ہیں اور اپنے کو مقدس سمجھتے ہیں حالانکہ کیا حق ہے انہیں اپنے آپکو مقدس سمجھنے کا۔ ؎

ریا حلال شمارند و جام بادہ حرام　　زہے شریعت و ملت زہے طریقت و کیش

یہ عجیب شریعت ہے اور یہ عجیب طریقت ہے۔ دونوں کی خبر لی ہے۔ حضرت حافظ شیرازی نے مولویوں کی بھی اور درویشوں کی بھی یعنی یہ عجب مولویت ہے اور یہ عجب درویشی ہے کہ ریا کو اور نمائش کو اور جو اخلاق رذیلہ ہیں نفسانیہ انکو تو حلال سمجھتے ہیں ہاتھ میں تسبیح ہے اور

غیبتیں کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ اللہ کر رہے ہیں۔ بعض کو
تو دیکھا کہ تسبیح پڑھتے پڑھتے تھوڑی دیر کے لئے پڑھنا منقطع کر دیتے ہیں
اور اس توقف میں غیبت کر لیتے ہیں۔ مگر تماشہ تو ہم نے یہ دیکھا کہ تسبیح
کے دانے بھی برابر چل رہے ہیں اور غیبت بھی کر رہے ہیں۔ نہیں معلوم
غیبتیں شمار کر رہے ہیں پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ ہمارا قلب ذاکر ہے بس اس
ذکر کو ہم گنتے ہیں سبحان اللہ ع سبحہ برکف توبہ برلب دل پر از ذوق گناہ۔
یہ حال ہے ع سبحہ برکف توبہ برلب دل پر از ذوق گناہ۔ سبحہ سین
سے ہے یعنی تسبیح ع معصیت راخندہ می آید بر استغفار ما۔ ہماری توبہ
ایسی ہے کہ اس پر گناہ ہی ہنسیں تو تعجب نہیں کیونکہ دل سے تو گناہوں
کے کرنیکے لئے تیار ہیں اور زبان سے ان گناہوں کو برا بھلا کہہ رہے
ہیں۔ یہ تو واقعی استغفار کی حالت ہے نہ کہ استغفار بھی ہو بلکہ ہاتھ
میں تو تسبیح ہے اور بجائے استغفار کے اُلٹی غیبتیں کر رہے ہیں گناہ
تو کر رہے ہیں اور دکھانے کو کھٹ کھٹ تسبیح بھی چل رہی ہے بس
نفلیں اور تسبیح پڑھنے کا نام تقدس اور بزرگی رہ گیا ہے بالخصوص
عورتوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ انکی بڑی معراج یہ ہے کہ قرآن ختم کر لیا اور
حضرت اگر دو ایک سیپارہ بھی روز پڑھنے لگیں پھر تو رابعہ بصریہ ہو
گئیں اور اگر ترجمہ بھی پڑھ لیا تب تو حضرت عائشہ سے بھی بڑھ گئیں
حضرت فاطمہ سے بھی آگے نکل گئیں ایسی جلدی ناز ہونا ہے انکو ایک
بیوی تھیں ذرا دیندار انکا شوہر تھا ذرا عامی شخص۔ تو آپ کیا کہتی ہیں

کہ اللہ اللہ مجھ جیسی پارسا اور افسوس ایسے سے بیاہی۔ ہے کمبخت اپنے
منہ سے پارسا کہتے شرم بھی نہ آئی۔ اپنے آپ کو پارسا سمجھنے سے سب کیا
دھرا برباد ہو جاتا ہے۔ جہاں خیال میں آیا کہ میں کچھ ہوں بس سب کیا کرایا برباد
ہو گیا تو صاحب کاہے پر ناز کرتے ہو تو انکو بڑی جلدی ناز ہو جاتا ہے تو کیا
بات ہے۔ بات یہ ہے کہ تقدس فقط اسکو سمجھتی ہیں کہ نفلیں پڑھ لیں وظیفے
پڑھ لئے قرآن پڑھ لیا ترجمہ سیکھ لیا اور جو بی بی جی بھی ہو گئیں یعنی دو چار
لڑکیوں کو بھی پڑھانے لگیں پھر تو معلم الملکوت ہو گئیں کیونکہ بچے بھی معصوم
ہونے میں فرشتوں کے مشابہ ہیں اور چونکہ اسی میں منحصر سمجھ لیا ہے طاعتوں
کو کہ ہم دس لڑکیوں کو پڑھاتے ہیں اسلئے غیبت سے وہ نہیں بچتی تکبر سے وہ
نہیں بچتی کینہ اور حسد سے وہ نہیں بچتی کسی پر طعن کرنا کسی کا دل دکھانا کسی
کو کوسنا کاٹنا فخر کرنا شیخی بگھارنا دعوی کرنا یہ اسکے نزدیک گویا گناہ ہی نہیں
س میں سب مبتلا ہیں خامکر جو نیک بیبیاں ہیں ان کے یہاں رات دن
یہی باتیں ہیں۔

حقوق اللہ کی حقیقت

حدیث شریف میں ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک
عورت کا ذکر آیا کہ وہ بہت نمازیں پڑھتی ہے۔ بہت روزے رکھتی ہے۔
بہت قرآن پڑھتی ہے ولکن تؤذی جیرانھا لیکن زبان دراز ہے اپنے
پڑوسیوں کو تکلیف پہونچاتی ہے۔ حضورؐ نے یہ سنکر فرمایا ھی فی النار
وہ دوزخی ہے اور یہ بھی پوچھا گیا یارسول اللہ ایک عورت ہے کہ وہ بہت

نماز روزہ تو نہیں کرتی یہ نہیں کہ فرض نماز روزہ بھی نہ کرتی تھی مطلب یہ تھا کہ بہت نفل نمازیں نہ پڑھتی تھی اور بہت نفل روزے نہ رکھتی تھی جیسے ایک عورت نے مجھ سے کہا کہ مولوی جی میں آٹھ وقت کی نماز پڑھتی ہوں۔ میں نے کہا کم بخت۔ اللہ میاں نے تو پانچ وقت کی نماز فرض کی اور تو آٹھ وقت کی پڑھتی ہے۔ اگر تہجد اشراق اور اوابین کی نفلیں مراد ہیں تو کہاں نفل نماز کہاں فرض نماز ان کو ان میں کیوں ملاتی ہے۔ یوں کیوں نہ کہدیا کہ میں یہ یہ نفلیں پڑھتی ہوں۔ فرضوں کے ساتھ نفلوں کو بھی آپ نے ملا دیا اور ہانک دیا کہ میں آٹھ وقت کی نماز پڑھتی ہوں تاکہ یوں معلوم ہو کہ آٹھوں نمازیں ایک ہی درجہ کی ہیں یہ حالت ہے تو وہ عورت زیادہ نماز روزہ نہ کرتی تھی جیسا کہ بعض عورتیں نفلیں بہت پڑھا کرتی ہیں اور نفل روزے بہت رکھتی ہیں۔ یعنی شب برات کا روزہ مریم روزہ شش عید کے روزے تو بعضی جو نیک عورتیں ہیں وہ نفلیں بہت پڑھا کرتی ہیں روزے بہت رکھا کرتی ہیں یہ بات نہیں تھی اُس بیچاری میں یعنی ضروری ضروری نماز روزہ کرتی تھی ولکن لا توذی جیرانھا لیکن زبان دراز نہیں تھی اور اپنے پڑوسیوں کو تکلیف نہیں پہونچاتی تھی آپ نے فرمایا ھی فی الجنۃ وہ جنت میں ہے۔ حضرت خدا کے یہاں اول تو اس پر نظر ہے یعنی حقوقِ اللہ کی نسبت حقوق العباد پر زیادہ نظر ہے کیونکہ حقوق اللہ جو ہیں وہ دراصل ہم لوگوں کے ہی حقوق النفس ہیں مگر یہ حق تعالیٰ کی رحمت اور شفقت ہے کہ اگر کوئی اپنے حق کو ادا کرے مثلاً نماز پڑھے تو وہ بھی کہتے ہے

ہیں کہ اس نے میرا حق ادا کیا تاکہ جی خوش ہو اور دل بڑھے کہ کتنا بڑا فضل ہے کہ کیا تو میں نے اپنا کام خدا نے اسکو اپنا کام بنا لیا نماز روزہ وغیرہ کو خدا نے اپنا حق قرار دیا حالانکہ حقیقت میں یہ سب ہمارے ہی حقوق ہیں کیونکہ حق تو وہ ہے کہ اگر اسکو نہ ادا کیا جائے تو صاحب حق کا ضرر ہو جیسے کسی کے دس روپیہ ہمارے ذمہ ہیں اگر ہم نہ دیں تو اس کا ضرر ہے سو اگر ہم نماز روزہ نہ کریں تو خدا کا کیا ضرر ہے وہاں تو یہ کیفیت ہے من کفر فعلیہ کفرہ اور یہ شان ہے۔ کہ ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم ولا یرضی لعبادہ الکفر یعنی اگر تم کفر بھی کرو تو حق تعالیٰ پسند تو نہیں کرتا لیکن اسکا نقصان نہیں تو حضرت اسواسطے جو حقوق اللہ ہیں وہ بھی ہمارے ہی حقوق ہیں اگر نماز روزہ نہ کریں تو ہمارا ہی نقصان ہے خدا کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ ظاہر ہے۔ جب یہ بات ہے تو حق تعالیٰ کی اس پر زیادہ نظر ہے کہ کون تو ایسا ہے جو اپنے حقوق کی زیادہ نگہداشت کرتا ہے اور کون ایسا ہے جو دوسروں کے حقوق کی رعایت کرتا ہے فقہا نے لکھا ہے اس کا قاعدہ کہ حق العبد مقدمٌ علی حق اللہ بہت سی نظیریں اسکی ہیں مثلاً زکوٰۃ ہے اسکے بارہ میں یہ حکم ہے کہ جو مقروض ہو اُسکے ذمہ زکوٰۃ نہیں اسواسطے کہ زکوٰۃ ہے خدا کا حق۔ اور قرض ہے بندہ کا حق اور بندہ کا حق مقدم ہے۔ خدا کے حق پر اب یہاں یہ شبہ ہوتا ہے عوام کو کہ جب خدا بڑا ہے تو اس کا حق بھی بڑا ہونا چاہیئے۔ لیکن میری اس تقریر سے وہ بھی رفع ہو گیا کہ وہ تو مجازاً کہا جاتا ہے خدا کا حق دراصل وہ تو اپنے

ہی نفس کا حق ہے پھر جو حق تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت کر دی تو اس واسطے چونکہ اُس نے حکم کیا اور حکم کیوں کیا۔ حکم اسلئے کیا کہ نفس کو نفع پہونچے تو وہ حیثیتیں ہیں اس قسم کے حق کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ خدا کا حکم ہے اس حیثیت سے تو وہ حق اللہ ہے مگر یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس حکم کی بناء کیا ہے سو بناء یہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی خدا کا نفع ہے نہیں بلکہ اس حکم کرنے کی بناء فقط یہ ہے کہ بندہ کے نفس کو نفع پہونچے اس حیثیت سے وہ حق نفس ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے ہم نے کسی کی دعوت کی کوئی مہمان ہے ہمارا اگر وہ کھانا کھاویگا تو اسی کا نفع ہے ہمارا کوئی نفع نہیں کیونکہ اس کا کھانا ہمارے پیٹ میں تھوڑا ہی چلا جاویگا اور اگر وہ نہ کھاوے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں اسی کا نقصان ہے یوں تعلق کی وجہ سے وہ یہ کہدے تو اور بات ہے کہ دیکھئے میں نے کہنا مان لیا اور کھانا کھالیا یہ ہماری لیاقت کی بات ہے کہ اسکے کھانے کو اپنا نفع اور اسکے نہ کھانے کو اپنا ضرر سمجھیں تو حقیقت میں نفس کے حق پر دوسرے کے حق کو مقدم کیا گیا ہے اس پر فقہا کی بہت نظر ہے یہاں تک کہ اس تقدیم پر بہت سے احکام متفرع کئے گئے ہیں۔

حقوق العباد سے غفلت

لیکن باوجود تقدیم حقوق غیر کے ہمارا معاملہ ایسا ہے لوگوں کے ساتھ جیسے بھیڑیا کا بھیڑ کے ساتھ کہ پرائے حق کو کھاتے ہیں پرائی آبرو برباد کرتے ہیں غیبتیں کر کرکے شکایتیں کر کرکے۔ بات کہنے میں اس کی پرواہ نہیں ہے کہ

کسی کو ناگوار ہوگی جو جی میں آیا پھٹ سے کہدیا کسی کو رنج ہو تو ہوا کرے۔ وہ سیاست بھی کرتے ہیں تو محض غیظ نفس سے حالانکہ ؎

درشتی و نرمی بہم در بہ است
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

جس پر سیاست کرنے کا حق ہو اس پر کبھی کبھی سختی بھی کر سکتے ہیں مگر حدود سے تو خارج ہونا جائز نہیں ہے کیونکہ سیاست کے بھی حدود ہیں سختی کے بھی حدود ہیں سزا کے بھی حدود ہیں اب تو محض غیظ نفس منشار ہوتا ہے۔ ہم لوگ ایسے ایسے گناہوں میں تو مبتلا ہیں۔ پھر اپنے آپ کو ہیچ سمجھتے ہیں کہ ہم مقدس ہیں بلکہ جو فاسق فاجر ہیں اکثر دیکھا کہ ان میں تکبر ہوتا ہے جو بدترین گناہ ہے۔ پھر مقدس ہی کہاں رہے خلاصہ یہ کہ اگر یہ گناہ ہوں تو اور دوسرے گناہ ہوں تو ہمارا یہ برتاؤ ہو رہا ہے۔ اے صاحب خیر گناہ سے جی برا نہ ہو تو خدا نے عقل تو دی ہے ذہن تو دیا ہے کان تو ہیں کانوں میں تو پڑا تھا کہ یہ گناہ ہے پھر چاہے جی برا ہوتا نہ ہوتا اس سے بچنا چاہیئے تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ گناہوں کا چھوڑنا ایک امر عظیم الشان ہے اسلئے میں نے پہلے اسکا بقدر ضرورت بیان کر دیا ہے تاکہ مَن تَابَ میں تو داخل ہو جاؤ۔

توبہ کا طریق

پھر اس داخل ہونیکا نتیجہ کیا مرتب ہوگا فاولئک یبدل اللہ سیأتھم حسنات لیکن من تاب میں جب شامل ہو گے جب کہ توبہ بھی طریقہ سے کروگے کیونکہ ہر گناہ سے توبہ کرنیکا جدا طریقہ ہے۔ مثلاً اگر نماز نہیں پڑھی تو توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ پچھلی نماز قضا کرو اور آگے کو ادا کرتے رہو اگر حج نہیں کیا تو اب کرلو اور اس گناہ سے توبہ کرلو۔

کسی کے مال کا نقصان کیا ہے تو مالک کو ادا کرو یا واپس کرو یا معاف کراؤ۔ اور آئندہ کو برابر حق ادا کرتے رہو آئندہ کسی کا حق ضائع نہ کرو اگر غیبت کی ہو معاف کراؤ۔ اگر وہ شخص جسکی غیبت کی تھی مر گیا ہو یا اس سے ملنے کی امید نہ ہو تو یہ بھی طریقہ ہے کہ اسکے لئے ہمیشہ دعائے مغفرت کرتے رہو۔ اس سے بھی غیبت کا گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ قیامت میں خدا تعالیٰ اس سے معاف کرا دیگا۔ بہر حال ہر گناہ سے توبہ کرنے کا طریقہ جو معین ہے شریعت والوں سے پوچھ کر عمل کرو اور اُس طریقہ کو استعمال کرو تو یہ میں خاصیت ہے کہ کوئی کتنا ہی بڑا گنہگار ہو کسی نے کتنے ہی زیادہ گناہ کئے ہوں حق تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے سب معاف فرما دیتے ہیں۔ تو غرض من تاب کے تعلق سے یہ مضمون بھی ضروری تھا اور یہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ توبہ عن الشرک کا نام ہے ایمان۔ غرض توبہ ہی میں یہ بھی داخل ہے۔ ایمان بھی توبہ ہی کا ایک فرد ہے۔

نیک اعمال کی تاکید

آگے عمل عملاً صالحاً ہے یعنی توبہ کے بعد بے فکر نہ ہو جائے بلکہ آئندہ بھی نیک عمل کرتا رہے اور یہ میں بیان کر ہی چکا ہوں کہ توبہ کے مفہوم میں دو چیزیں ہیں ایک وہ اعمال جنکے کرنے کا حکم ہے ان کو پابندی سے ادا کرنا ہے اور جن سے ممانعت ہے انکا گویا اہتمام کے ساتھ تارک رہے یہ دونوں عملاً صالحاً میں داخل ہیں اور یہاں یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ فعل ترک کو کیسے شامل ہوگا۔ خوب سمجھ لو کہ ظاہر میں گناہوں کا چھوڑنا مفہوم عدمی معلوم ہوتا ہے مگر در اصل مفہوم

وجودی ہے اسکا مضمون وجودی ہے گو عنوان عدمی ہے اسکے سمجھنے کے واسطے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے یوں سمجھئے۔ اس سے بھی آسان تقریر کرتا ہوں انسان جو مکلف کیا گیا ہے تو اعمال اختیاریہ کا مکلف کیا گیا ہے جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب یہ سمجھئے کہ مثلاً ہم جو اسوقت کھڑے ہیں تو نہ چوری کر رہے ہیں نہ شراب پی رہے ہیں نہ کسی کو بُری نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ غرض سینکڑوں گناہ ہیں جنکو ہم اسوقت چھوڑے ہوئے ہیں ایک تو ترک یہ ہے یہ تو ایسا ہے کہ اس ترک کی طرف ہمارا التفات بھی نہیں ہوتا اسکو ترک نہیں کہتے اسواسطے کہ جس ترک کا انسان مکلف بنایا گیا ہے وہ وہ ترک ہے جو اپنے اختیار اور قصد سے ہو اور اختیار اور قصد کا مسبوق بالعلم ہونا ضروری ہے اور یہ ترک مسبوق بالعلم نہیں لہٰذا یہ وہ ترک ہی نہیں جسکا انسان مکلف بنایا گیا ہے اور یہ ترک مفہوم عدمی ہے جب انسان اسکا مکلف نہیں تو اس ترک کا حکم بھی نہیں۔ ایک ترک تو یہ ہے اور ایک ترک یہ ہے کہ یا تو کوئی فی الحال داعیہ ہو مثلاً کوئی عورت چلی جارہی ہے جی چاہا کہ لاؤ اسے دیکھیں پھر نگاہ کو روک لیا۔ یہ ہے ترک وجودی اسکے لئے ضرورت ہے علم اور قصد کی مثلاً شراب پینے کا قصد تو نہیں لیکن ساتھ ہی یہ خیال ہے کہ کبھی نہیں پئیں گے انشاء اللہ۔ یہ ترک وجودی ہے عدمی نہیں اور اجر اسی پر ملتا ہے۔ ورنہ اگر ترک عدمی پر بھی اجر ملتا تو یہ لازم آتا کہ ہر لمحہ میں کروڑوں طاعتوں کا اجر مل رہا ہے مثلاً اسوقت ہم ہزاروں گناہوں کو نہیں کر رہے ہیں۔ فرض کر دنا محرم

پر نظر کرنا ہی ہے ہم اسوقت کسی نامحرم پر نظر نہیں کر رہے ہیں اب نامحرم ہیں لاکھوں۔ نہ ہم زینب کو دیکھ رہے ہیں نہ ہندہ کو دیکھ رہے ہیں نہ خالدہ کو دیکھ رہے ہیں نہ اور کسی کو دیکھ رہے ہیں غرض دنیا میں جتنی نامحرم عورتیں ہیں ان میں سے ہم اسوقت کسی کو بھی نہیں دیکھ رہے ہیں تو چاہئیے کہ دنیا بھر کی نامحرم عورتوں پر نظر نہ کرنیکا ہمیں ثواب ملے بلکہ اور جتنی مرچکی ہیں اور جو آئندہ پیدا ہوں اُن سب پر نظر نہ کرنیکا ثواب بھی ملے تو حضرت آدم سے لیکر نفخ صور تک جتنی نامحرم عورتیں ہوں ان سب پر نظر نہ کرنیکا ثواب گویا ہمیں ہر لحظہ مل رہا ہے۔ اس سے تو یہ لازم آیا کہ ہر شخص کے نامہ اعمال میں گناہوں سے نیکیوں کا شمار زیادہ ہو اس کا تو کوئی بھی قائل نہیں ہو سکتا کیونکہ قاعدہ ہے کہ فاما الغلت موازینہ فھو فی عیشۃ راضیۃ واما من خفت موازینہ فامہ ھاویہ اگر یہ بات ہو تو ہر شخص کی طاعات کا پلہ ہمیشہ معاصی سے بڑھا رہے اگر کوئی نماز کبھی نہ پڑھے تب بھی تو چاہیئے کہ کوئی معذب ہی نہ ہو حالانکہ یہ نص کے خلاف ہے۔ علماء نے تو تصریح ہی کر دی ہے کہ ترک وہی ماجور علیہ ہے۔ جو وجودی ہو۔ تو عملاً صالحا میں یہ ترک بھی شامل ہیں تو خلاصہ توبہ کا یہ ہوا کہ جن اعمال کا حکم ہے انکو کرنا اور جنکی ممانعت ہے انکو ترک کرنا تو خلاصہ ارشاد کا یہ ہے کہ فقط توبہ پر اکتفا نہ کرے بلکہ آئندہ کیلئے بھی اصلاح اعمال کرے یعنی گناہوں کو بھی چھوڑے اور اعمال کی پابندی بھی کرے۔

ایمان پر عمل صالح کی خاصیت اب اسکے واسطے ضرورت ہوگی

اب اسکے واسطے ضرورت ہو گی علم حاصل کرنے کی کسی سے پوچھکر یا پڑھ کر جب اس طریق سے توبہ کرچکا تو اب گویا خدا کے رستہ پر پڑا ہے۔ اب اسکے متعلق اسکو کچھ احوال پیش آئیں گے۔ ان کے متعلق میں ایک مضمون بیان کرتا ہوں گو وہ مختصر ہی ہو گا مگر انشاء اللہ کافی ہو گا اور بہت نافع۔ وہ یہ ہے کہ میں اب خاصیت بیان کرتا ہوں کہ ایمان اور عمل صالح میں خاصیت کیا ہے اس خاصیت کی بابت فرماتے ہیں فاولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات یعنی اسکی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں۔ یہ ہے ترجمہ یعنی ان کے اندر جو برائیاں یعنی بری باتیں ہیں انکو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں یہ خاصیت بیان کی ہے حق تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کی۔ البتہ اس خاصیت کا قوت وضعف تابع ہو گا ایمان وعمل صالح کی قوت وضعف کے نیز یہ خاصیت فی نفسہ ہے یہ ممکن ہے کہ کسی عارض ظاہری یا باطنی کے سبب اسکا ظہور نہ ہو۔ اب اسکی تھوڑی سی تفصیل میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا صورت تبدیل کی ہوتی ہے تو محققین اور اہل تجربہ کے ارشاد سے اور اپنے متعلقین کو جو مختلف احوال پیش آتے رہتے ہیں یعنی جن کی تربیت باطن میرے متعلق ہے وہ جو اپنے احوال وکیفیات بیان کرتے رہتے ہیں ان سب احوال ومقالات سے اخذ کر کے جو تفصیل مجھے معلوم ہوئی ہے اسکو میں نقل کرتا ہوں حاصل اس تفصیل کا یہ ہے کہ جو خدا کے رستہ میں چلنا شروع کرتا ہے اسکے درمیان میں دو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں ایک اول ہوتی ہے ایک بعد میں ہوتی ہے یعنی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ سب سے

اول تو تبدیل یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ملکات کو بدلتے ہیں جس سے اعانت ہوتی ہے طاعت کے دوام و استقامت پر اور معاصی سے اجتناب پر اس کے لئے ایک مقدمہ عرض کرتا ہوں جس سے اس تبدیل کی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہو گی وہ یہ ہے کہ افعال تابع ہوتے ہیں ملکات کے اور یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ بغیر داعیہ کے عادۃً استمرار اعمال کا متعذر ہے اور داعیہ ہی ہے وہ ملکہ جو اندر سے تقاضا کرتا ہے اسکا اثر یہ ہے کہ فعل سہولت سے صادر ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ملکات متبوع ہیں اور اعمال انکے تابع ہیں جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب یہ سمجھئے کہ حق تعالیٰ کیا کرتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا پرورش فرماتے ہیں اسی سلسلہ میں مجھے اسوقت یہ آیت یاد آگئی اتقوا اللہ وقولوا قولا سدیدا یصلح لکم۔ ظاہراً اصلاح فعل ہے بندہ کا تو یہاں سوال ہوتا ہے کہ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا اس سے تو متوہم ہوتا ہے کہ آپ ہی آپ اصلاح ہو جائے گی یعنی اللہ تعالیٰ خود ہی مثلاً نماز پڑھوا دیں گے کہیں ایسا ہوا بھی ہے پھر یصلح لکم کے کیا معنی۔ اب سمجھ میں آگیا ہو گا کہ اسناد اس اعتبار سے ہے کہ وہ اصلاح کا سامان پہلے مہیا کر دیتے ہیں۔ اسکے بعد وہ مستلزم ہوتا ہے۔ ترتب اصلاح کو کیونکہ جب ملکات درست ہو گئے تو معاصی سے بچنا آسان ہو جاتا ہے دشواری نہیں رہتی اس معنی کر وہ اصلاح حق تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہے اور بندہ کی طرف بھی۔ تو مدد یہ ہوتی ہے حق تعالیٰ کی طرف سے کہ ملکات کو بدل دیتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ بدون ملکات کے درست ہوئے انسان سے کچھ

نہیں ہو سکتا جب تک ملکات درست نہ ہوں بہت کم توقع ہے کہ افعال شنیعہ کا صدور نہ ہو سکے اور یہ تبدیل کا قصہ طویل الذیل اور وسیع ہے یعنی اسکے تحقق اور ظہور کا سلسلہ آخرت تک جاری رہتا ہے یہاں بھی تبدل ہوتا ہے مختلف حالتوں میں وہاں بھی۔ یہ ایسا جامع وعدہ ہے سبحان اللہ سالکین ہر قدم پر اسکا تحقق دیکھتے ہیں اور واقعی حق تعالی کے وعدہ کی ایسی ہی شان ہونی چاہئے خود فرما رہے ہیں فلھم اجرٌ غیر ممنون قطع نظر آخرت کے میں دیکھتا ہوں کہ دنیا ہی میں یہ تبدل شروع ہو جاتا ہے یہیں سے استمرار اور ثبات اور دوام سب کی توفیق ہوتی ہے اور اس تبدیل کا انقطاع ہی نہیں جو تبدیل ہوتی ہے ہوتی ہی چلی جاتی ہے چونکہ یہ تبدیل سالکین کو پیش آتی ہے اسلئے انکو متنبہ کر دینا ضروری معلوم ہوا تاکہ ان کو اسکی بصیرت ہو کہ کتنی بڑی دولت ہم کو حاصل ہوتی ہے۔ اس نے اپنا کام کیا تھا۔ یعنی اعمال صالحہ شروع کئے تھے اور مطلوب ہے اعمال صالحہ کا دوام۔ اس دوام میں وہ خود اسطرح مدد فرماتے ہیں کہ اسکے اندر جو ملکات تھے سیئہ انکو بدل کر ملکات حسنہ کر دیتے ہیں مثلاً پہلے بخل غالب تھا اب سخاوت غالب ہو گئی۔ یہیں سے عاقل سمجھ جائیگا کہ ملکات حسنہ کو اور قوی کر دیا جائیگا اسواسطے کہ جتنا ضعف ملکات حسنہ میں تھا وہ ملکات سیئہ کی آمیزش سے تھا تو ضرور ہوا کہ اب ملکات حسنہ کا حسن اور زیادہ ہو جائیگا کیونکہ حسن کی کمی کی علت قبیح کی آمیزش ہی تو ہے۔ غرض اس تبدیل کا حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ ملکات حسنہ کو تو پہلے سے بھی

زیادہ قوی کر دیتے ہیں اور ملکات سیئہ کو ضعیف اور مضمحل کر دیتے ہیں۔ مضمحل میں نے اسلئے کہا کہ ملکات سیئہ کا بالکل ازالہ نہیں ہوتا اسواسطے کہ اگر بالکل ازالہ ہو جاوے تو یہ حکمت کے خلاف ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ ثواب ملے کیونکہ ازالہ کی صورت میں تو گناہوں سے بچنے میں کوئی ثواب ہی نہیں اسواسطے کہ جب دل میں گناہ کا تقاضہ ہی نہ رہا بالکل التفات ہی نہ رہا ترک طاعت کا وسوسہ ہی نہ آوے تو گویا گناہ کے صدور کی قدرت ہی نہ رہی اسوقت اختیارِ طاعت اور ترکِ معصیت کوئی کمال ہی نہیں اسلئے ملکات سیئہ کا ازالہ تو نہیں ہوتا ہاں ان میں اضمحلال ہو جاتا ہے یعنی ان کے تقاضے کی کیفیت اتنی مضمحل ہو جاتی ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا کہ نہیں ہے اس لئے بعض سالکین کو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم میں اب کوئی ملکہ سیئہ نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ جب بعد چندے کسی محرک سے وہ ملکات عود کرتے ہیں تو روتے ہیں سالک صاحب بیٹھکر کہ ہائے میرا سارا مجاہدہ برباد ہو گیا ارے یہ تو پھر معصیت کے تقاضے ہونے لگے۔

تبدیل ملکات کی حقیقت

اس وجہ سے مجھے متنبہ کرنا ضروری ہے کہ تبدیل ملکات کی حقیقت کیا ہے اور اسکی صورت کیا ہوتی ہے سالک نے غلطی اسلئے کی کہ وہ حقیقت اس تبدیل کی نہیں سمجھا وہ تبدیل ایسی سمجھتا ہے کہ ملکات سیئہ بالکل ہی جاتے رہتے ہیں حالانکہ ملکات سیئہ زائل نہیں ہوتے بلکہ ان میں

اضمحلال ہو جاتا ہے مگر اس اضمحلال کا اثر ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسا زوال کا تو یہ رحمت ہے کہ دواعی خیر کے تو قوی ہو جاتے ہیں اور دواعی شر کے ضعیف ہو جاتے ہیں نیکی کا تو ہر وقت تقاضا ہوتا رہتا ہے اور برائی کا بالکل تقاضا نہیں ہوتا بلکہ ترک طاعت اور ارتکاب معصیت ایسا دشوار ہو جاتا ہے کہ اگر اسکا قصد بھی کرے تو اسقدر جی برا ہو کہ گویا ذبح کر ڈالا اور اس تبدیل کو فنا بھی کہتے ہیں کیونکہ بجائے سیئہ کے ملکات حسنہ پیدا ہو گئے اور یہ فنائے حسی ہے۔ فنا کی دو قسمیں ہیں۔ فنائے حسی اور فنائے علمی۔ فنائے علمی اُسے کہتے ہیں کہ غیر اسکے علم سے فنا ہو گیا جیسا کہ حق تعالیٰ کا ذکر ایسا غالب ہوا کہ ذاکر کے علم سے غیر حق فانی ہو گیا تو وہ غیر واقع میں فانی تھوڑا ہی ہو گیا بلکہ واقع میں تو وہ موجود ہے لیکن اسکے علم سے غائب ہو گیا ہے اور یہاں واقع میں وہ ملکہ سیئہ جاتا ہی رہتا ہے لیکن جاتے رہنے کی حقیقت یہ ہے کہ مضمحل ہو جاتا ہے یعنی اس میں اضمحلال اسدرجہ ہو جاتا ہے کہ گویا وہ جاتا ہی رہتا ہے یہاں یہ نہیں ہے کہ اس ملکہ کی طرف سالک کا التفات نہیں رہا۔ نہیں بلکہ وہ ملکہ واقع میں زائل ہو گیا لیکن اُسی تفسیر کے ساتھ اسکو فنائے حسی اور فنائے ذاتی کہتے ہیں تو بہر حال یہ رحمت ہوتی ہے کہ ملکات سیئہ ملکات حسنہ سے مبدل ہو جاتے ہیں۔ اب یہ ہوتا ہے کہ معصیت کا بالکل تقاضا ہی نہیں ہوتا اب اگر کبھی سہواً بھی نسیاناً بھی صدور معصیت کا ہو جاتا ہے تو ایک پہاڑ غم کا ٹوٹ پڑتا ہے یہ حالت ہوتی ہے ؎

بر دل سالک ہزاروں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

رد نے رد نے جان دیتا ہے تو یہ رحمت ہوتی ہے تو خلاصہ کیا ہوتا ہے اس تبدیل کا۔ یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ مغلوب کرتے ہیں بری خواہشات کو اور غالب کر دیتے ہیں اچھی خواہشات کو اس سے انسان رستہ چلتا ہے ایک تو یہ تبدیل ہوتی ہے اسکو تبدیل ذات بھی کہتے ہیں یعنی جو پہلی ذات تھی وہ جاتی رہی اُسکے بجائے ایک دوسری ذات اسکے قائم مقام ہوگئی یہ تبدیل ذات ہی تو ہوئی پھر جب ایک زمانہ اس پر گذر گیا اور جو اس میں حکمت تھی خدا کی کہ بندہ خوگر ہو جائے طاعت کا یعنی نفرت ہو جائے معاصی سے اور دلچسپی ہو جائے طاعات سے جب یہ مقصود حاصل ہو گیا تو بعض اوقات اس میں ایک اور تغیر ہوتا ہے وہ یہ کہ جن ملکات سیئہ کو مغلوب و مضمحل کیا گیا تھا جب انکی مقاومت بوجہ ملکات حسنہ کے راسخ ہو جانے کے آسان ہو گئی تو اب وہ چاہتے ہیں اپنے بندہ کا اجر بڑھانا اس واسطے اسوقت رفتار حکمت کی یہ ہوتی ہے کہ اوّل امور طبیعہ دب جاتے ہیں مگر چند روز کے بعد وہ پھر ابھرنا شروع ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں کہ ابھرتے ابھرتے غالب ہو جاتے ہوں بلکہ اپنی اصلی فطرت پر آجاتے ہیں کیونکہ یہ ملکات سیئہ اصل فطرت میں بھی غالب نہ تھے اگر کوئی کہے کہ نہیں ہم تو دیکھتے ہیں کہ بچپن میں بھی یہ ملکات غالب ہوتے ہیں لیکن یہ بات نہیں ہے بچپن میں بھی یہ ملکات موجود تو تھے لیکن غالب نہ تھے مشق کر کر ہم نے شہوت کو غضب کو حرص کو طمع کو قوی کر لیا ہے تو یہ ملکات سیئہ بچپن میں بھی موجود تو تھے لیکن غالب نہ تھے۔ ہاں استعداد تھی غالب ہونیکی لیکن اسکے ساتھ ہی مغلوب ہونیکی بھی استعداد تھی اور حکم یہ تھا کہ ان

کو مغلوب رکھنا لیکن اس نے غالب کر لیا اپنی حماقت سے اب ضرورت پڑی مجاہدہ کی لیکن مجاہدہ کا اثر تو اتنا تھا کہ ملکات سیۂ قصد سے مغلوب ہو جاتے لیکن حق تعالیٰ جانتے تھے کہ اس سے کام نہیں چلیگا اس لئے وہ ان ملکات کو بہت ہی زیادہ مغلوب کرتے ہیں یہانتک کہ بالکل زائل ہونیکے حکم میں ہو جاتے ہیں۔ جب اسکی حکمت پوری ہوگئی یعنی ملکات حسنہ اچھی طرح راسخ ہو گئے تو اب تکمیل اجر کے واسطے پھر ان ملکات سیۂ کو ذرا ذرا قوت دیتے ہیں۔

سالک کا امتحان

اسمیں سالک کا امتحان بھی مقصود ہوتا ہے کہ دیکھیں امور غیر مکتسبہ ہی پر سارے قصہ کو ڈال کر بیٹھ رہا ہے یا خود بھی کچھ اسکو ہمارے امتثال امر کا اہتمام ہوتا ہے۔ اور یہ حکمت امتحان کی اور وہ حکمت سابقہ تکمیل اجر کی حقیقت میں ایک ہیں صرف حیثیتیں مختلف ہیں اسلئے ذرا ذرا وہ امور طبیعہ پھر ابھرتے ہیں جنمیں خاصیت ہے کہ اگر یہ مغلوب بھی ہو جاتے ہیں تو بعد چندے پھر ابھرتے ہیں جیسے ہمیں خوب زور کی بھوک لگ رہی ہو اور کوئی مدت کا بچھڑا ہوا محبوب دفعۃً آجائے تو اسوقت بھوک جاتی رہتی ہے کیا معنی کہ خوشی میں مغلوب ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ہم یوں ہی سمجھتے ہیں کہ بالکل جاتی ہی رہی مگر جب آپس میں اچھی طرح مل ملالئے اور بات چیت ہو چکی تو اب پھر بھوک صاحبہ تشریف لاتی ہیں تو بہر حال امور طبعیہ میں یہ خاصیت ہے کہ وہ مغلوب ہو کر چند روز بعد پھر ابھرتے ہیں بہر حال اس تبدیل کے دو سلسلے

ہیں۔ ایک مکتسب جسکا وقوع عالم ابتلا میں ہوتا ہے ایک موہوب جس کا وقوع عالم جزا میں ہوگا سو مکتسب سلسلہ تو یہ ہے کہ اول ملکات سیئہ دب گئے تھے جسکا اوپر ذکر ہوا پھر اسکے بعد ذرا اور ابھرنے شروع ہوگئے۔ ذکر جب اول اول شروع کرتے ہیں اسوقت تو یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ بیوی یاد آتی ہے نہ بچے یاد آتے ہیں نہ کسی سے ملنا جلنا اچھا معلوم ہوتا ہے نہ کسی سے بولنے چالنے کو جی چاہتا ہے بس ہر وقت یہی جی چاہتا ہے کہ تنہائی میں بیٹھے اللہ اللہ کیا کریں۔ پھر ایک مدت گذرنے کے بعد یہ حالت پلٹا کھاتی ہے اب دوست بھی یاد آنے لگے بیوی بچے بھی یاد آنے لگے بعضی بعضی لذیذ چیزوں کو بھی جی چاہنے لگا۔ اب ذرا فرصت ہوئی تو سیر و تفریح کی خواہش پیدا ہوتی ہے یا اب غصہ کے وقت لہجہ بھی سخت ہو جاتا ہے الفاظ بھی سخت نکلنے لگتے ہیں پہلے تو کوئی جوتی بھی مار لیتا تھا تب بھی چونکہ مجاہدہ کر رہے تھے غصہ بالکل نہ آتا تھا۔ پہلے نہ غم کی باتوں سے غم ہوتا تھا نہ خوشی کی باتوں سے خوشی ہوتی تھی۔ اب اگر بیٹا مرا ہے تو غم بھی ہو رہا ہے۔ آنکھ سے آنسو بھی جاری ہیں۔ پہلے تو وہ حالت تھی اب یہ نوبت آئی۔ اب یہاں ضرورت ہے شیخ محقق کی۔ یہاں سالک یہ غلطی کرتا ہے کہ اپنے کو سمجھتا ہے کہ میں مردود ہو گیا۔ کہتا ہے کہ میری ساری محنت برباد ہی گئی پہلے تو کوئی جوتی بھی مار لیتا تھا تب بھی ناگوار نہ ہوتا تھا۔ ارے میاں مجھے تو اب غصہ آنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری ابھی تک اصلاح ہی نہیں ہوئی معلوم ہوتا ہے میری سب محنت ہی برباد

گئی۔ حضرت محنت برباد نہیں گئی بلکہ اُس تبدیل کی عمر ختم ہو گئی۔

احوال کا تغیر و تبدل

اب دوسری تبدیل شروع ہوئی ہے تنزل نہیں ہوا بلکہ ترقی ہوئی ہے غم کی بات نہیں بلکہ خوشی کی بات ہے جیسے اوپر مذکور ہوا فأولئك يبدل الله سيئاتهم حسنات کے مفہوم میں یہ تبدیل بھی داخل ہے۔ وہ پہلی تبدیل تھی یہ دوسری تبدیل ہے۔ وہ ذات کی تبدیل تھی۔ یہ صفات کی تبدیل ہے۔ وہاں تو غصہ کے بجائے حلم پیدا ہو گیا تھا غصہ کا گویا وجود ہی نہ رہا تھا۔ یہاں غصہ، غصہ ہی رہا مگر اب غصہ میں اثر وہ ہے جو حلم میں تھا۔ یہ تبدیل بہت عجیب ہے پہلی تبدیل کی مثال تو یہ ہے کہ ایک بیجان تھی لکڑی اسکی جگہ سانپ کو بٹھا دیا ایک ذات کی جگہ دوسری ذات کو قائم کر دیا۔ اور یہ بھی گو عجیب ہے مگر ایسی زیادہ عجیب نہیں نہایت عجیب تو یہ ہے کہ ایک لکڑی تھی بیجان اُس میں ایسی روح پھونک دی کہ وہی چلنے لگی اس کے اندر وہ اثر پیدا ہو گیا جو سانپ میں ہوتا۔ یہ نہایت عجیب تبدیل ذاتی تھی یہ وصفی ہے۔ یعنی غضب کی ذات غضب ہی رہی مگر اس میں وہ اثر نہیں رہا جو غضب میں ہوتا ہے۔ طمع، طمع ہی رہا مگر اُسمیں وہ اثر ہوا جو سخاوت میں ہوتا تو سالک میں کبھی یہ تبدیل بھی ہوتی ہے اسلئے اگر پہلی حالت نہیں رہی تو غم نہ کرنا چاہئے بھائی الف بے تے ختم کر چکے ہو اب قرآن شروع ہوا ہے خدا کا شکر کرو کہ الف بے تے ختم ہوئی۔ پہلی تبدیل جو سلوک کی الف بے تے تھی اسکی عمر منقطع ہوئی اب دوسری تبدیل کا سبق شروع ہوا ہے جو بمنزلہ قرآن

کے ہے یہاں اولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات کا صدق یوں ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں سیئات کی ذات تو وہی رہی مگر وصف بدل کر اسکو ایسا بدلا کہ اس سیئہ کو اب حسنہ کہتے ہیں۔ ذات تو وہی رہتی ہے مگر اسکا وصف بدل دیتے ہیں وہ کیونکہ اسکے متعلق ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق ہے۔ سچ تو یہ ہے عجیب و غریب تحقیق ہے۔ یعنی فرماتے تھے کہ شیخ کامل کو چاہیئے کہ رذائل نفس کا ازالہ نہ کرے بلکہ امالہ کر دے۔ بخل رہے بخل ہی مگر اسکا محل بدل دیا جاوے بخل کو کھو کر سخاوت نہ پیدا کی جاوے اسیطرح سمجھو کہ غصہ بھی بڑے کام کی چیز ہے اگر غصہ نہ ہوتا تو اسلام ہی نہ پھیلتا۔ اسلام جو پھیلا تو غصہ ہی کی بدولت کیونکہ مقابلہ میں کافروں کے غصہ ہی میں جان دینا اور جان لینا آسان ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر بخل نہ ہوتا تو رنڈیوں بھڑووں بدمعاشوں میں خوب مال لٹاتا یہاں تک کہ مستحقین کی بھی نوبت نہ آتی۔ اب مستحقین ہی کو دیتے ہیں چھانٹ چھانٹ کر یہ بخل ہی کی تو برکت ہے غیر مستحقین کو نہ دینا یہ بخل ہی تو ہے لیکن یہ بخل جو ہے سخاوت کی ماں ہے اسکا باپ ہے۔

سخاوت خود محتاج ہے اس بخل کی یا مثلاً مال دیکھا کسی کا اسکو دیکھ کر جی للچایا یا طمع تو ہوئی مگر اسکے مقتضا پر عمل نہیں کیا بلکہ شریعت کو مدار عمل ٹھہرایا اور اس مال کے لینے سے رکا رہا تو گویا وہ اثر ہوا اس طمع میں جو استغنا میں ہوتا بلکہ اس طمع سے گویا اور اجر بڑھ گیا استغنا کا اگر طمع نہ ہوتی تو نرے استغنا میں اجر کہاں ملتا وہ تو ایسا ہوتا جیسے کوئی دیوار

کھڑی ہے یا فرض کیجیے کوئی گائے کھڑی ہے اُسکے سامنے کسی کے ہزار روپیہ رکھے ہوئے ہیں تو اسکا جی ہی نہیں چاہتا کہ یہ روپیہ ہماری ملک میں آجاوے اسکے اس رکے رہنے پر کوئی اجر ہی نہیں برخلاف اسکے کہ ہم نے دیکھا کہ لوگ ٹمٹموں اور فٹنوں میں اُڑے اڑے پھر رہے ہیں انہیں دیکھکر ہمیں بھی خواہش ہوئی کہ ہماری ملک میں بھی یہ سواریاں ہوتیں تو ہم بھی اسی طرح اڑے اڑے پھرتے مگر اس وسوسہ کو فوراً یہ کہکر دفع کردیا کہ لاحول ولاقوۃ ان چیزوں میں کیا رکھا ہے اور یہ آیت پڑھنے لگے لا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ ازواجا منھم پس یہ رکنا بڑا عمل ہے اور اسی پر ثواب ہے تو دیکھیے یہ رذائل نفس اب کیسے کارآمد ہورہے ہیں کہ انہیں کی بدولت تقوٰی کی دولت میسر ہے اسی کو تو مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن ست | کہ ازو حمام تقوٰی روشن ست

کہ یہ دنیا کی خواہش ایسی ہے جیسے سوختہ ہوتا ہے کہ حمام کے نیچے گوبر وغیرہ ڈالکر آگ روشن کردیتے ہیں تو اگر حمام کا پانی گرم کرنا چاہو تو اس گوبر سے کام لو اسی طرح یہ جو نفع ہے ع کہ ازو حمام تقوٰی روشن ست۔ یہ ان خواہشات سے رکنے ہی کی بدولت حاصل ہوتا ہے اور یہ رکنا بدولت خواہش ہی کے ہے کیونکہ اگر خواہش ہی نہ ہوگی تو رکنا ہی کہاں متحقق ہوگا جب خواہش ہی جاتی رہی تو صبر اور مجاہدہ ہی کہاں رہا تو یہ تبدیل جو میں نے بیان کی یہ تبدیل وصفی ہے اور یہ لقب تبدیل ذاتی اور تبدیل وصفی میں نے رکھ دیئے ہیں آسانی کیلئے تاکہ پتہ بتلانے میں سہولت ہو۔

اعمال کے درجے

ثواب دیکھئے اس دقیقہ کے نہ جاننے سے بہت سے سالک مغموم ہوتے ہیں کہ بعد ریاضات ومجاہدات کے بھی پھر عود کیا۔ امراض نفسانیہ نے حالانکہ عود ان امراض نے نہیں کیا بلکہ اعمال پہلے ناقص تھے اب کامل ہوگئے یا یوں کہیئے کہ ناقص تو نہ تھے کامل ہی تھے لیکن اکمل نہ تھے اب کامل سے اکمل بنانا منظور ہے حق تعالیٰ کو۔ تو اعمال کے اکمل بنانیکے لئے یہ دوسری تبدیل واقع کی ہے تو خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے احوال کے تین درجے ہیں جنکی ترتیب سمجھ لینی چاہیئے اول درجہ تو یہ ہے کہ ابھی پہلی تبدیل بھی نہیں ہوئی۔ عوام الناس کی تو یہ حالت ہے اور یہ ہے قابل تبدیل لیکن تبدیل اول۔ باقی اول ہی سے دوسری تبدیل کی کوشش نہ کرے اسواسطے کہ دوسری تبدیل جب ہی معتبر ہے کہ جب بعد تبدیل اول ہو اور اگر کہا جائے کہ اسکے عکس میں کیا حرج ہے کیونکہ کمال کی بات تو یہ ہے کہ مثلاً غصہ ہو اور اس غصہ کو نہ چلاوے تو یہ تو اب بھی ممکن ہے پھر تبدیل اول کی تقدیم کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سو حضرت قبل تبدیل اول کے دوسری تبدیل پر قدرت حاصل کر لینا کارے دارد۔ یہ ایسا ہے جیسے بے قاعدہ بغدادی پڑھے کوئی سیپارہ پڑھنے لگے تو کیا وہ سیپارہ پڑھنے پر قادر ہو جائیگا اور اگر کچھ تُشدُبد پڑھ بھی لیا تو کیا اس سے مہارت کاملہ پیدا ہو سکتی ہے اسی طرح یہاں بھی گو شاذ و نادر کبھی ایسا بھی ہو گیا ہے کہ قبل تبدیل اول دوسری تبدیل پر ابتداءً ہی قدرت حاصل ہو گئی ہے مگر یہ کرامت ہے خواہ سالک

کی خواہ کسی شیخ کی۔ اور کرامت دائم نہیں ہوا کرتی جس نے پہلے مجاہدہ نہیں کیا تجربہ کرلو اگر اسکو غصہ کی عادت ہے اور وہ غصہ روکنا چاہے گا تو دو تین دن تو رکے گا پھر کچھ نہیں بلکہ پھر تو تین چار دن کے غصے ایک ساتھ نکالے گا تو اس رکنے سے فائدہ ہی کیا ہوا اگر تین چار دن غصہ روک بھی لیا اور کسی پر نہ چلایا تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اگر اب نہیں چلاتا تو پھر چلاویگا اور پھر چلاویگا۔ بھی ایسا کہ اتنے دن کے غصوں کی ایک ساتھ قضا کریگا یہ تو وہی حکایت ہوئی کہ ایک شخص کے پاس ایک گھوڑا تھا اُس میں ایک ایسی واہیات عادت پڑگئی تھی کہ جب لید کرتا تو چلتے چلتے لوٹتا اور جب اس لید کو سونگھ لیتا تب آگے بڑھتا۔ اس واہیات میں دو تین منٹ برباد ہو جاتے بڑی الجھن ہوتی اور منزل کھوٹی ہوتی سو الگ۔ مگر ہمیشہ صبر کیا کرتا بیچارہ۔ اتفاق سے ایک روز ایک شہسوار کا راستہ میں ساتھ ہو گیا۔ اس نے جو گھوڑے کی یہ حرکت دیکھی تو کہا میاں تمہارے گھوڑے میں یہ کیا واہیات عیب ہے اس نے کہا میاں کیا کہوں اسمیں یہی عادت پڑگئی ہے بہت ہی تنگ ہوں اسکا کوئی علاج ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ سوار نے کہا کہ اچھا اسے میں ٹھیک کر دونگا یہ کہہ کر پیچھے ہو لیا پھر جب گھوڑے نے لید کی تو اپنی عادت کے موافق اس نے سونگھنے کے لئے لوٹنا چاہا مگر سوار نے فوراً ایک زور سے چابک دیا مُنہ پر۔ بس سیدھا ہو گیا اور بیچارہ کو مجبوراً بے سونگھے چلنا پڑا اسی طرح جب وہ لید کرتا اور اسے سونگھنا چاہتا سوار فوراً ایک چابک زور سے منہ پر لگاتا غرض رستہ بھر اس نے لید نہ سونگھنے دی۔ جہاں تک راستہ دونوں کا

مشترک تھا وہاں تک تو دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے جب اس شخص کا گاؤں تھوڑی دور رہ گیا تو رستہ بھٹا سوار کو دوسرے گاؤں جانا تھا جب وہ چلنے لگا تو اس گھوڑے کے مالک نے کہا کہ خدا کے سپرد اور اُس سوار کو بہت دعائیں دیں کہ اللہ تمہارا بھلا کرے تم نے میرے ساتھ بڑا احسان کیا میرے گھوڑے کا عیب دور کر دیا۔ تم نے آج میری منزل سُوارت کر دی ہے ورنہ اس کم بخت کے لید سونگھنے میں دو تین کوس کا حرج ہو جاتا۔ مگر صاحب ادہر تو وہ سوار رخصت ہوا اُدہر گھوڑے نے مڑکر دیکھا کہ اب استاذ جی نہیں ہیں میدان خالی ہے جناب وہ لوٹا اور وہ تقاضا لید سونگھنے کا جو دبا ہوا تھا اس نے زور کیا۔ کئی کوس آچکا تھا راستہ میں جہاں جہاں لید کی تھی لوٹ کر ہر جگہ کی لید کو آپ نے جا جا کر سونگھا جب سب مقامات سے فراغت ہوچکی اسوقت پھر نئے سرے رستہ چلنا شروع کیا۔ وہ شخص بڑا پریشان ہوا اور کہنے لگا خدا بھلا کرے اس سوار کا میری ساری منزل ہی خراب کر گیا۔ غرض جہاں پہونچنا تھا اُس روز نہ پہونچ سکا اگلے دن پھر منزل کی تو حضرت یہ مثل ہوگی۔ کرکے دیکھ لیجئے بدون مجاہدہ کے داعیہ کا مقابلہ اور مقاومت کرنا کارے دارد اگر کچھ دن تک مقاومت کر بھی لی پھر اُسی حالت پر آجاؤ گے اسواسطے ضرورت ہے شیخ کی کہ وہ ان حقائق پر آگاہ کرتا ہے ورنہ اگر فہم کی ضرورت نہ ہو خالی عمل ہی کافی ہو تو واللہ سلوک کا حاصل کرنا کچھ بھی مشکل نہیں چنانچہ حضرت مولانا گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے اگر ہم کو پہلے سے یہ خبر ہوتی کہ تصوف میں اخیر میں کیا چیز حاصل ہوتی

ہے تو میاں ہم تو کچھ بھی نہ کرتے مدتوں کے بعد معلوم ہوا کہ جسکے لئے اتنے مجاہدے اور ریاضت کئے تھے وہ ذراسی بات ہے ۔ حضرت نے تو اپنی عالی ظرفی کی وجہ سے اس ذراسی بات کو نہیں تبلایا میں اپنی کم ظرفی سے تبلاتا ہوں کہ وہ ذراسی چیز ہے کیا جسکو حاصل کرنیکے لئے اتنی محنتیں کرنی پڑتی ہیں وہ یہی ہے جسکو میں نے تبدیل ثانی کے عنوان سے بیان کیا ہے ۔ کیونکہ یہی ہے پیدا کرنے والی تعلق مع اللہ کی اور یہی ہے محافظ تعلق مع اللہ کی اور یہی ہے بڑھانے والی تعلق مع اللہ کی غرض وہ ذراسی بات جو تصوف کا حاصل ہے ۔ یہ ہے کہ جب طاعت میں سستی ہو سستی کا مقابلہ کرکے اُس طاعت کو کرے اور جب گناہ کا تقاضا ہو تقاضے کا مقابلہ کرکے اُس گناہ سے بچے بس جسکو یہ بات حاصل ہو گئی اُسکو پھر کچھ بھی ضرورت نہیں نہ شیخ کی نہ سید کی نہ مغل کی نہ پٹھان کی نہیں تو چاروں ذاتوں کی ضرورت ہے ؎

کشندا زبرائے دلے بارہا | خورند از برائے گلے خارہا

ع مراعات صدکن برائے یکے ۔ تو حضرت شیوخ کو اپنا رہبر بنانا از بس ضروری ہے کیونکہ جو تجربہ کار ہیں اُنہیں اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ اس بات کے حاصل کرنے میں بلا شیخ کی مدد کے ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی اور جو کامیاب ہو گئے ہیں بلا شیخ کے مولانا نے اسکی وجہ بیان فرمائی ہے ۔ مولانا ہیں بڑے محقق اول تو نصیحت فرماتے ہیں کہ کوئی شیخ ضرور تلاش کرو ؎

یار باید راہ را تنہا مرو | بے قلاؤز اندریں صحرا مرد

یعنی بدون رہبر کے اس جنگل میں قدم نہ رکھو پھر فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید　　　　ہم بعون ہمت مرداں رسید

اسمیں دو جواب دیئے ہیں ایک تو لفظ نادر میں پس فرماتے ہیں کہ اول تو یہ نادر ہے والنادر کالمعدوم دوسرے لفظ عون میں پس فرماتے ہیں کہ ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں راہ را بُرید　　　　ہم بعون ہمّت مرداں رسید

یعنی اگر شاذونادر کسی نے بلا رہبر کے بھی یہ راستہ طے کرلیا ہے تو اُسے بھی ضرورت ہوئی ہے مدد کی مگر ایسے طریقہ سے وہ مدد اسے دی گئی ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی جیسے کوئی بچہ گنگوہ سے چل کر تھانہ بھون پہونچا۔ یہاں پہونچکر اس نے کہا کہ دیکھو میں نے کسی سے مدد نہیں لی مگر حضرت کو خبر بھی ہے کہ اماں جان کی گود میں یہاں تک آئے ہیں رستہ بھر اماں جان کی گود میں پڑے سوتے رہے مگر خبر نہیں ہوئی جیسے کوئی عرفات سے سوتا ہوا گذر جائے تب بھی اسکا حج ہو جاتا ہے یہ خوب مزہ کا حج ہوا خبر بھی نہیں ہوئی مزے میں پڑے سوتے رہے اور ہو گئے حاجی کیونکہ یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص بھی کسی سوتے ہوئے کو عرفات پہونچا دے اور وہاں بھی سوتا ہی رہے تو اس کا بھی حج ہو جاتا ہے۔ پہلے آپ چلا تھا عرفات کی طرف مگر کمزور تھا اتنا کہ تھوڑی ہی دُور چل کر غش کھا کر گر پڑا اب میاں کو کچھ ہوش ہی نہیں کہ میں کہاں جا رہا تھا اور کہاں پڑا ہوا ہوں وقت رہ گیا تھا کم اتفاق سے کوئی ایسا شخص ادھر سے گذرا جو اس کا کبھی رفیق رہ چکا تھا اس نے کہا لاؤ اسے شبری میں ڈال کر عرفات لے چلیں چنانچہ وہ اسی حالت میں اُسکو شبری میں لاد کر عرفات لے گیا اور وہاں سے

نکال بھی لایا اور یہ جو جاگے ہیں حضرت تو دیکھتے ہیں کہ میں سب حاجیوں کے ساتھ مزدلفہ میں ہوں اب وہ سمجھتا ہے کہ میں آپ سے آپ گیا تھا عرفات اور خود حج کر کے مزدلفہ پہونچا ہوں۔ احمق کہیں کا۔ یوں سمجھتا ہے کہ میں نے آپ سے آپ حج کر لیا ہے یہ خبر نہیں کہ میاں تو دس قدم بھی چلنے کی طاقت نہ رکھتے تھے رستہ ہی میں بیہوش ہو کر گر پڑے تھے وہ تو کسی دوسرے ہی نے رحم کھا کر اپنی شبری میں لاد لیا ورنہ دیکھتے کیونکر حاجی ہو جاتے۔

فیوض غیبی کی صورت

ہاں یہ دوسری بات ہے کہ بیہوشی میں پتہ ہی نہ چلا کہ مجھے کون شخص عرفات کو لئے جا رہا ہے اسی طرح جو شاذ و نادر بلا اعانت شیخ واصل ہو گیا ہو اسکا یہ سمجھنا غلطی ہے میں خود کامل ہو گیا (اسکی بھی) ضرور کسی نے مدد کی کیونکہ اللہ کے بندے بہت سے ایسے بھی رحیم وکریم ہیں جو بے کہے مخلوق کو فیض پہونچاتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ انکا فیض آفتاب کا سا ہے کہ انہیں خود بھی خبر نہیں کہ ہم سے فیض پہونچ رہا ہے اور بعض اوقات وہ حضرات دعا بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ایک شخص کے بارہ میں یہ مکشوف ہوا کہ اس کا نام اہل شقاوت میں درج ہے آپ یہ دیکھکر تڑپ گئے اور مدتوں اسکے حق میں دعا کرتے رہے یہاں تک کہ اس کا نام سعداء میں درج کر دیا گیا ان حضرت کو اس کا کبھی علم بھی نہ ہوا ہو گا کہ میں جو سعید بن گیا ہوں تو کس کی دعا کی برکت سے وہ سمجھتے ہوں گے کہ میرا کوئی عمل بڑا مقبول ہوا جو میں بزرگ ہو گیا۔ تو حضرت بعضے ایسے بھی اللہ کے بندے ہیں جو اسطرح دعائیں

کرکر کے لوگوں کو فیض پہونچاتے رہتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں کہ خود انہیں بھی خبر نہیں کہ ہم سے لوگوں کو فیض پہونچ رہا ہے نہ لوگوں کو خبر کہ ہمیں ان سے فیض پہونچ رہا ہے خود ان کے وجود ہی کی برکت ہوتی ہے چنانچہ تجربہ ہے کہ جب کوئی کاملین میں سے مرتا ہے تو سب کے قلوب میں کم و بیش تفاوت محسوس ہونے لگتا ہے حالانکہ اعمال وہی موجود رہتے لیکن وہ جو ایک نورانیت اور برکت تھی اسمیں کمی محسوس ہونے لگتی ہے یہ اُسکی شعاعیں تھیں جن سے سب کے قلوب میں نورانیت تھی یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ نے فرمایا کہ ہم نے حضورؐ کے دفن کے بعد ابھی مٹی سے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ ہم نے اپنے قلوب کو متغیر پایا یعنی وہ بات نہیں رہی جو پہلے تھی جس کے معنی حضرات شیعہ یہ سمجھے کہ نعوذ باللہ وہ مرتد ہو گئے تھے لاحول ولاقوۃ یہ قدر کی آنکھوں والوں کی بے قدری۔ سچے اور صحیح الحس حضرات کی ظاہر بات ہے آفتاب جب غروب ہو گیا تو گو اب بھی لالٹین ہیں مگر ان میں وہ نور کہاں جو آفتاب میں تھا اور یوں خیر انکا بھی نور غنیمت ہے اسواسطے کہ ؎

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ ۔۔۔ چارہ نبود در مقامش جز چراغ

یہ بھی غنیمت ہے یہی سہی مگر وہ بات جو پہلے تھی وہ بھلا کہاں رہ سکتی ہے تو یہ تفاوت نور قلب میں حضرات کاملین کی برکات کی علامات ہیں غرض ایسی کوئی صورت نہیں کہ بلا انکی اعانت کے کوئی کامل ہو جائے تو یہ معنی ہیں مولانا کے ارشاد کے ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید ۔۔۔ ہم بعون ہمت مرداں رسید

تصوف کا حاصل

غرض کوئی شیوخ سے مستغنی نہیں شیوخ کے یہ نفع ہیں۔ مثلاً یہی ایک بات ہے جو میں نے عرض کی کہ تصوف کا حاصل یہ ہے کہ جس طاعت میں سستی ہو سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کر لے اور جس گناہ کا تقاضا ہو تقاضا کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچ جاوے دیکھئے یہ ہے تو چھوٹی سی بات کہنے میں مگر وقوع میں کتنی عظیم الشان ہے شیخ کا بس یہی کام ہے کہ وہ اس بات کے حاصل کرنے کی تدبیریں بتلاتا ہے اور کچھ نہیں کرتا یہاں مشائخ کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ اس نے تو سب کی دکان ہی پھیکی کر دی اب کون پوچھے گا ہمکو سو یہ تشویش تو اسے ہو جسے شوق ہو مشیخت کا۔ بلا سے تم ہمیں بھی نہ پوچھو۔ مگر جب اس چھوٹی بات پر عمل کرو گے اسوقت دیکھو گے کہ گاڑی نہیں چلتی۔ بیل بھی موجود پہیئے بھی موجود مگر دھکیلنے والے کی پھر بھی ضرورت ہے اسواسطے کہ گاڑی تو دلدل میں پھنسی ہوئی ہے دل دِل میں سمجھا کرو کہ معلم کی ضرورت نہیں مگر دراصل ہے ضرورت۔ محض دَلدل کافی نہیں۔ تو شیخ کا کام فقط یہ ہے جو میں نے ذکر کیا۔ الحمد للہ حضرت حاجی صاحب کی برکت سے اب تصوف مخفی تو ہے نہیں حاصل کر لو جسکا جی چاہے طریقہ بتلا دیا کہ یہ تگدر ہے یہ اس کے اٹھانے کی ترکیب ہے اٹھالو جسکا جی چاہے حقیقت تصوف کی تو میں نے ظاہر کر دی آگے تمہاری ہمت ہے۔ اجی خوش نویس نے طریقہ بھی بتا دیا کہ ایسے لکھ قلم بھی دیدیا مگر لکھ تو لو بھلا بلا اوستاد سے مشق کئے ہوئے بلا کسی خوش نویس کی مدد کے کوئی خوشنویس ہو ہی سکتا اسی واسطے

حضرت فریدالدین عطار رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دلا،　　　　دامن رہبر بگیر د پس بیا

کرنے والے جانتے ہیں کہ باوجود وضوح طریق کے پھر بھی ضرورت ہوتی ہے رہبر کی ؎

در ارادت باش صادق اے فرید　　　　تا بیابی گنج عرفاں را کلید

؎ بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق　　　　عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق،

حقیقت میں یہی بات ہے تو بس یہ ضرورت ہوتی ہے شیخ کی بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب تک حقیقت طریق معلوم نہ ہو جب تک تو شیخ کی ضرورت کا کماحقہ علم بھی نہیں ہوتا اور بعد مشاہدہ حقیقت کے دلیل سے اور بصیرت سے معلوم ہوگا کہ ہاں واقعی یہ راستہ اکیلے طے نہیں ہو سکتا اور یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص علم پڑھے گا جب ہی تو علم کی قدر ہوگی اور جب ہی تو وہ یہ سمجھے گا کہ کتنا علم کافی ہے۔ جب ہی تو اُمت کے تمام اکابر نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ بلا شیخ کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کوئی تو بات ہے جو حاصل ہو جاتی ہے جسکو مولانا فرماتے ہیں ؎

گر نبودے نالۂ نے را ثمر　　　　نے جہاں را پر نہ کردے از شکر

اگر اس طلب کے اندر کچھ اثر نہ ہوتا تو آخر یہ جو ثمرات کا ظہور اور مشاہدہ ہو رہا ہے یہ کیوں ہوتا۔ بہرحال اب حقیقت معلوم ہو جانیکے بعد تو زیادہ ضرورت محسوس ہوگی شیخ کی پہلے تو چونکہ حقیقت نہیں معلوم تھی اس لئے ضرورت شیخ کا بھی اتنا احساس نہ تھا اب یہ ارمان بھی نہ رہا کہ ارے میاں

اگر ہمیں تصوف کی حقیقت معلوم ہو جاتی تو ہم خود ہی حاصل کرنیکی کوشش کرتے خواہ مخواہ پیروں کے نخرے نہ اٹھانے پڑتے اور ایسے اقوال جو منقول ہیں وہ طالب کے دل بڑھاتے کو ہیں کہ وہ اس طریق کو محال نہ سمجھے سو اب حقیقت معلوم ہوگئی ہے کرکے دیکھو۔ بسم اللہ۔ حضرت کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ ؎

دررہ عشق وسوسۂ اہرمن بسے ست
ہشدار و گوش را بہ پیام سروش دار

حضرت قدم قدم پر گاڑی نہ اٹکے تو جبھی کہیئے گا اول تو البتہ اس قدر ہوگا کہ کبھی پتہ نہ چلے گا کہ حقیقت یہ ہے یا یہ ہے دونوں چیزیں برابر معلوم ہونگی ؎

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں
درمیان شان برزخ لایبغیان

یہ پتہ نہ چلے گا کہ ادھر جاؤں یا اُدھر۔ دونوں چیزیں ایک نظر آئیں گی۔ بہر حال یہ تبدیل کرنا ہے شیخ کہ ملکات فاسدہ کو مغلوب کرنے کے طریقے بتلانا ہے اور وہ طریقے مرکب ہیں تدبیر سے اور ذکر سے پھر کسی تعلیم پر عمل کرنیکے بعد یہ تبدیل واقع ہوتی ہے یعنی ملکات فاسدہ بالکل مغلوب اور کالمعدوم ہو جاتے ہیں اور ملکاتِ حسنہ غالب ہو جاتے ہیں۔

تصوف کے درجات

یہ تفصیل میں اس لئے بیان کر رہا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ درجات تصوف کیا ہیں۔ تو اول درجہ تو مجاہدہ تھا یعنی تعلیم طریق پر عمل۔ اُس کے بعد تبدیل ہوگی۔ جب یہ تبدیل نہ تھی۔ اس وقت دواعی نفس قوی تھے اس لئے اعمال صالحہ کی اور ترک معاصی کی توقع نہ تھی آگے چل کر سڑک کے اندر دوسری منزل آئی وہ یہ کہ ملکات حسنہ غالب ہو گئے اور ملکات سیئہ ایسے مغلوب ہوئے کہ قریب زائل ہو گئے

اب یہ حالت ہے کہ رات بھر جاگنا بھی آسان ہے اب نہ بیوی بچوں کی محبت دل میں ہے نہ کوئی دوست یاد آتا ہے نہ لذائذ کی طرف التفات ہے دنیا سے بالکل دل سرد ہوگیا کسی چیز کی خواہش باقی نہیں رہی سوائے اللہ اللہ اور نماز روزہ کے کسی چیز میں دل نہیں لگتا اگر کوئی ہفت اقلیم کی سلطنت بھی دینے لگے اس سے بھی انکار کر دیں بلکہ جو اُن کے سامنے اسکا بیان بھی کر دے اس کے پیچھے لگ جاویں جب یہ تبدیل راستہ میں واقع ہو چکے اسوقت دوسری تبدیل کا موقع نہیں اگر قبل تبدیل اول کسی کو تبدیل ثانی کے حصول کی ہوس ہو تو وہ اچھی طرح سمجھ لے کہ یہ صورت تو ہو گی مگر حقیقت نہیں . یعنی قبل تبدیل اول کے جو گمان ہے کہ میں قادر ہوں طمع کے روکنے پر وہ قدرت نہیں ہاں صورت ہے قدرت کی اسکی ایسی مثال ہے خوب سمجھ لو جیسا کہ پہلے جھوٹے پھول آتے ہیں جب وہ جھڑ جاتے ہیں تو پھر سچے پھول آتے ہیں پھر پھل آتا ہے تو گو جھوٹے پھولوں کی اور سچے پھولوں کی ایک ہی سی شکل ہوتی ہے مگر دیکھئے حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کسقدر تفاوت ہے کہ سچے پھول تو بار آور ہیں اور جھوٹے پھول بار آور نہیں . یہ مثال تو میرے دل میں اللہ تعالے نے القا فرمائی دوسری مثال مولانا نے ارشاد فرمائی اور اُسی کی برکت سے یہ مثال میرے ذہن میں آئی فرماتے ہیں ؎

اے شدہ صبح کاذب را رہیں ۔۔۔ صبح صادق راز کاذب ہم ببیں

یعنی صبح کاذب کو دیکھکر دھوکہ نہ کھانا جو صبح صادق ہے اسکا انتظار کرو کیونکہ صبح کاذب کا جو نور ہے اس کے بیچ میں تاریکی ہے اسمیں کہیں مت چل پڑنا

ورنہ بستی سے باہر ہوئے نہیں کہ چوروں نے مارا نہیں ایسے میں تنہا جانا اپنے آپ ہلاک کرنا ہے ضرور ہے کہ کوئی رہبر لیلو یا کسی کانسٹیبل کے ساتھ ہولو۔ ناواقف کہتا ہے کہ اُونھ مجھے کانسٹیبل یا رہبر کی ضرورت نہیں اُجالا تو ہو رہا ہے بہت اچھا جاؤ اکیلے پیر غیب[۵] پہونچو گے اور پیر بنجاؤ گے۔ وہاں دفن ہوکر تو واقع میں جسطرح صبح صادق میں اور صبح کاذب میں فرق ہے اسی طرح سے جو تقویٰ قبل مجاہدہ کے ہوتا ہے اور جو بعد مجاہدہ کے ہوتا ہے ان دونوں کی شکل گو ایک سی ہوتی ہے مگر حقیقت میں بڑا فرق ہے۔ غرضکہ یہ دھوکہ ہوتا ہے سلوک میں کہ جب اُس نے مجاہدہ اور ذکر و شغل شروع کیا تو ملکات سیئہ رفتہ رفتہ مغلوب ہونے شروع ہوتے ہیں یہاں تک کہ قریب قریب مردہ کے ہو گئے جب اس تدبیر پر ایک مدت گذر گئی اب وہ ملکات پھر ابھرنے لگے اور رفتہ رفتہ ان میں پھر جان آنا شروع ہوئی اب اسکی جان کو نبی کہ ہائے میں تو پھر ویسا ہی ہو گیا جیسا پہلے تھا پہلے تو یہ حالت تھی کہ کیسا ہی حسین سامنے سے گذرتا اس کی طرف دیکھنا تو کیسا تھوکنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا اور اب جی چاہتا ہے کہ دیکھیں تو کیسا ہے بس جی غارت ہو گیا سارا مجاہدہ ہم تو پھر ویسے کے ویسے ہی ہو گئے بہت سے لوگوں نے اس غم میں خودکشی تک کرلی ہے۔ سمجھے کہ ہم ملعون ہو گئے۔ مردود ہو گئے ملکات سیئہ پہلے مضمحل ہو گئے تھے اور گناہوں سے طبعی نفرت ہو گئی تھی اب صرف عقلی نفرت تو ہے طبعی نہیں رہی بات یہ ہے کہ یہ تیسری منزل ہے سلوک کی جسمیں ملکات سیئہ کا اضمحلال جو قوی ہو گیا تھا۔

---

[۵] یہ تھانہ بھون کے ایک انتہائی سرحد کا نام ہے ۱۲۔

بکم ہونا شروع ہوگیا ہے اب حق تعالیٰ اپنے بندہ کو اجر دینا چاہتے ہیں کیونکہ اب تک ملکات سیئہ مغلوب بحکم معدوم رہے پھر اجر مقاومت کا کہاں ملتا باقی ان ملکات کو جو اتنے دنوں بیکار رکھا گیا یہ ایسا ہے جیسے شریر گھوڑے کا کھانا پینا بند کرکے اسکو شائستہ بنایا جاتا ہے پھر جب شائستہ ہوگیا تو اب اسکو خوب کھلاتے پلاتے ہیں اس کھلانے پلانے سے جو اُسکے اندر قوت پیدا ہوتی ہے اس کے ذریعہ سے اب وہ چلتا تو خوب ہے لیکن شرارت نہیں کرتا اور اگر کبھی کرتا بھی ہے تو ذرا سی ایڑ سے سیدھا ہو جاتا ہے۔ اصل میں حق تعالیٰ کو مقصود تھا مقاومت کا اجر دینا اور اول ہی سے مقاومت تھی مشکل اس لئے یہ انہیں کی شان تربیت تھی کہ انھوں نے پہلے یہ تبدیل کی جسکو تبدیل اول کہا جا رہا ہے ؎

کیمیا داری کہ تبدیلش کنی | گرچہ جوئے خوں بود نیلش کنی

اور یہ تبدیل کی ؎

اے مبدل کردہ خاکے را بزر | خاکِ دیگر رانمودہ بوالبشر

؎ کار تو تبدیل اعیان و عطا | کار ما جرم ست نسیان و خطا

تو یہ تبدیل اول اُس تبدیل ثانی کے لئے مقدمہ تھی جو مقصود تھی یہ حضرت سمجھے کہ بس منزل ختم ہوگئی اسکی تو ایسی مثال ہے جیسے ایک نادان بڑھیا کی حکایت ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ بیان فرماتے تھے کہ جب حج کرنیکے لئے سب لوگ مکہ معظمہ سے عرفات جانے لگے تو اُسکے رفقاء اُسکو بھی لے چلے وہ چلانے لگی کہ ارے بھائی مکہ میں تو آگئے اب آگے اور کہاں لیوں جا ؤ ہو یعنی کہاں

لئے جاتے ہو (۱۲) پہاڑوں اور پتھروں میں ۔ ابجی اللہ کے گھر تو پہونچ گئے اب اور کیا چاہو ہو ۔ یہ خبر نہ تھی اسکو کہ مکہ جو جا رہے ہیں تو عرفات کے ہی لئے تو جا رہے ہیں ۔ یوں فضیلت چاہے مکہ معظمہ ہی کی زیادہ ہو مگر مکہ جو گئے ہیں تو عرفات ہی کے لئے تو گئے ہیں ۔ کیونکہ مکہ معظمہ جانے سے آخر مقصود کیا ہے حج ہی تو ہے اور حج نصیب ہوتا ہے عرفات کے میدان میں پہونچکر تو جیسے یہ بیوقوف بڑھیا مکہ میں داخل ہوکر آگے چلنا نہیں چاہتی تھی اسی طرح بعض سالکین جو ناواقف ہیں وہ اس تبدیل اول کی حالت سے خارج ہونا گوارا نہیں کرتے ارے بھائی ابھی تم مکہ میں داخل ہوئے ہو آگے کیوں نہیں چلتے ارے عرفات تو آگے ہے عرفات میں چلو وہاں پہونچکر حج نصیب ہوگا اب چلے تو بیچ میں مزدلفہ آیا مزدلفہ کیا ہے تبدیل ثانی جسکا نام میں نے رکھا ہے تبدیل وصفی سالک تبدیل ذاتی کی حالت میں سمجھتا تھا کہ مجھے قرب تام حاصل ہے اور اب تبدیل وصفی کی حالت میں سمجھتا ہے کہ مجھے بعد ہو گیا بُعد تو ہوگا مگر یہ بُعد مضر نہیں مزدلفہ پہونچکر مکہ سے تو ضرور بُعد ہوا مگر عرفات کے لئے یہ بُعد ہوا یہ تیسرا اسٹیشن ہے اسکے آگے ایک بہت پُر بہار مقام ہے اسکا نام ہے وصول جو گویا عرفات ہے تو یہ چار منزلیں ہیں اب پہونچا ہے منزل مقصود پر اس مثال سے یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ تبدیل ثانی زیادہ اصعب ہے بہ نسبت تبدیل اول کے کیونکہ مکہ سے عرفات جانے میں بہت مشقت پڑتی ہے لیکن یہاں بعض کو یہ شبہ ہوگا کہ تبدیل ذات تو صاحب زیادہ دشوار ہے بہ نسبت وصف کے کیونکہ تبدیل ذات تو یہ ہے کہ مثلاً تانبا تھا اب سونا ہو یہ تبدیل بہت مشکل ہے اور تبدیل

وصف یہ ہے کہ پہلے سے بھی سونا تھا مگر میلا تھا اسکو صاف کر دیا یہ تو زیادہ مشکل نہیں تو یہ درسیات پڑھنے سے شبہ پیدا ہوا مگر میں نے تو درسیات کی اصطلاح کو نہیں لیا بلکہ میں نے اپنی اصطلاح جدا تقریر کی ہے اور اسکی شرح بھی کر چکا ہوں کہ تبدیل ذات کے معنی یہاں یہ نہیں ہیں کہ وہ ذات جو پہلے تھی وہ بالکل معدوم ہو جاتی ہے بلکہ وہ ذات معدوم بمعنی مغلوب ہو کر اسکے اوپر دوسری ذات اُبھر کر غالب ہو جاتی ہے جیسے پہلے ایک تھا افسر دوسرا تھا اس کا ماتحت پھر اس ماتحت کو افسر کر دیا گیا اور اس افسر کو اسکا ماتحت بنا دیا گیا۔ مثلاً پہلے بخل غالب تھا اور سخاوت مغلوب تھی اب بخل کی ذات کو تو مغلوب کر دیا اور سخاوت کو غالب کر دیا۔ یہ تھوڑا ہی ہوا کہ بخل کو سخاوت بنا دیا یوں خدا کی قدرت میں تو سب کچھ ہے۔ غرض تبدیل ذات تو یہ ہوئی اور تبدیل وصفی یہ ہے کہ بخل رہا تو بخل ہی لیکن اُسمیں اثر اور صفت سخاوت کی پیدا ہو گئی جیسا کہ میں تفصیل کیساتھ بیان کر چکا ہوں بہر حال وہ تبدیل اول اہون ہے اور یہ ثانی اعلیٰ درجہ کی ہے اور اصعب ہے۔ اب تو سمجھ میں آگیا ہوگا کہ تبدیل ثانی اصعب اور اعجب ہے یوں تبدیل اول بھی عجیب ہے مگر تبدیل ثانی بہت عجیب ہے تو گویا تبدیلیں ہوتی ہیں سالک کے احوال میں چونکہ ان کے متعلق عوام اور خواص غلطی کرتے ہیں اسلئے متنبہ کر دیا گیا ہے سو خواص تو سمجھ ہی گئے ہونگے۔

عوام کو ہدایت عوام کو چاہئے کہ جتنی برائیاں اپنے اندر ہوں رفتہ رفتہ عادت ڈالیں اُن سب کے چھوڑنے کی۔ لیکن یہ نہیں کہ خود سوچ کر تدبیریں کریں۔ نہیں بلکہ کسی محقق بزرگ سے رجوع کریں اور

اس بزرگ سے محض ذکر و شغل ہی نہ پوچھیں بلکہ زیادہ تر اپنے امراض کا علاج پوچھیں کہ مجھ میں مثلاً تکبر ہے کوئی تدبیر ایسی بتلایئے کہ یہ کم بخت جاتا رہے یوں نہ پوچھو کہ کس تدبیر سے تکبر کم ہوگا بلکہ یوں پوچھو کہ کوئی ایسی تدبیر بتایئے کہ ہمارا تکبر جاتا رہے بھائی خوب سمجھ لو جب تک عادتوں کو بدلوگے نہیں اور نفس کو دباؤ گے نہیں تمہارا دین قائم نہیں رہ سکتا۔ خصوص ترقی تو ہرگز نہیں کر سکتا اب مَیں عورتوں کو خطاب کرتا ہوں۔ عورتیں تو صرف نماز روزہ ہی کو دین سمجھتی ہیں جس نے نماز روزہ کر لیا اپنے نزدیک پورا دین حاصل کر لیا اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں۔ حالانکہ تمہارے اندر سیکڑوں عیب ہیں تمہارے اندر ناحق کا غصہ ہے تمہارے اندر غلبیت کا عیب ہے۔ تمہارے اندر ریا ہے تمہارے اندر فخر ہے کبر ہے انکی تدبیریں پوچھو بزرگوں سے بالخصوص کبر کے مٹانے کے تو ایسی کوشش کرو کہ کوئی گالیاں بھی دے کوئی کیسی ہی ذلت کرے لیکن تمہیں ناگوار نہ ہو پہلے اسکی کوشش کرو تب آئندہ طریق کھلے گا یہ عورتوں کو مَیں اسلئے سناتا ہوں چونکہ انہیں کچھ خبر ہی نہیں ہے انہیں تبدیل اول ہی کی خبر نہیں جب بُری عادتوں کے چھوڑنے کی کوشش کروگی تو پھر حق تعالیٰ اور توفیق دیگا پھر اور توفیق دیگا چلنا تو شروع کرو پھر تو رستہ ہی میں آوے گی تبدیل اول بھی تبدیل ثانی بھی پھر تو گاڑی چلے ہی گی جب تبدیل ثانی تک خدا پہنچنا نصیب کریگا پھر تو وہاں صرف حقیقت سمجھا دینا ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ تبدیلیں ہوتی ہیں احوال میں اور مَیں عرض کر ہی چکا ہوں کہ ان کے متعلق خواص کی غلطیاں کیا ہیں اور عوام کی غلطیاں کیا ہیں۔ یہ تو دنیا میں تبدیلیں ہوئیں

جنمیں ایک گونہ اکتساب کو دخل ہے آگے آخرت میں بھی تبدیل ہوتی ہے جو موہوب محض ہے۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے رحمت کا وہ تبدیل وہ ہے جو حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض کیلئے یہ تبدیل بھی ہوگی کہ انکو گناہوں کے بدلے نیکیاں دیدی جاوینگی بس اب ختم ہوا یہ بیان۔

آگے فرماتے ہیں۔ وکان اللہ غفورا رحیما

گنہگاروں کو بشارت اسکی دو تقریریں ہیں ایک تو یہ کہ فرمارہے ہیں گنہگاروں کو کہ بشارت سن لو کہ بس تمہاری طرف سے توبہ ہی کی دیر ہے اللہ تعالیٰ غفور ہیں وہ تو توبہ قبول کرہی لیتے ہیں۔ سب گناہوں کو مٹا ہی دیتے ہیں کیونکہ ہم غفور ہیں اور یہی نہیں بلکہ رحیم بھی ہیں یعنی توبہ کے بعد جو اعمال کرو گے انہیں بھی ہم قبول کریں گے اس تفسیر کے اعتبار سے تو یہ ارشاد تحقق توبہ کیساتھ متعلق ہے جو الا من تاب میں مذکور ہے اور جو یبدل اللہ سیئاتھم حسنات کے ساتھ متعلق کیا جاوے تو وہ ایک نہایت لطیف تفسیر ہوگی اور یہ دوسری تقریر ہے یعنی ایک تبدیل کا تعلق تو ہے رحمت سے اور دوسری تبدیل کا تعلق ہے مغفرت سے یعنی بُرے ملکات کو مٹا دیا اور ان کی جگہ اچھے ملکات عطا کردیئے۔ یہ تو مغفرت ہوئی اور یہ رحمت ہے کہ بُرے ملکات کو مٹایا تو نہیں مگر ایسا کردیا کہ انکی خاصیت بدل دی۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی تبدیل کے متعلق غفور کو کہا جاوے اور دوسری تبدیل کے متعلق رحیم کو کہا جاوے تو یہ نہایت ہی اچھا مطلب ہو جاتا ہے اب میں ختم کرتا ہوں نماز (یعنی نماز عشاء ۱۲) میں بھی چند منٹ کی دیر ہوگئی ہے۔ اس وعظ کا

نام تکمیل الاعمال بتبدیل الاحوال مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں احوال کی تبدیل کا بیان ہے جس سے اعمال کی تکمیل ہوتی ہے اور پچھلے جمعہ کے وعظ کا جو نام ہے اسکے مناسب بھی ہے۔ اُسکا نام ہے تجدد الامثال تبعد د الاعمال اور اس کا نام ہے تکمیل الاعمال بتبدیل الاحوال۔ اب دُعا فرمایئے کہ حق تعالیٰ فہم سلیم اور ہمت قوی عطا فرمائے اور اپنی مرضیات کی توفیق اور رہبری فرمائے اور نامرضیات سے بچنے میں مدد فرمائے۔ فقط

خطبہ جمعہ کے بعد ختم کے قریب فرمایا کہ صاحبو! یہ مہینہ شوال کا ہے اسکی بعض خصوصیات کا مختصراً ذکر کرتا ہوں۔ ایک خصوصیت تو اس مہینہ کی یہ ہے کہ اس میں چھ روزے رکھنا مستحب ہے حدیث شریف میں ان روزوں کی بڑی فضیلت آئی ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ جو کوئی رمضان المبارک کے روزوں کے بعد چھ روزے شوال میں بھی رکھے گا اسکو ایسا ثواب ملیگا کہ گویا اُس نے سال بھر برابر روزے رکھے۔ اور یہ سال بھر روزوں کا حساب اس طرح ٹھیک ہے کہ ہر نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا ملتا ہے تو رمضان کے ایک مہینہ کے روزے دس مہینے کے روزوں کے برابر ہوئے اور چھ روزے شوال کے ۶۰ دن کے برابر ہوئے جسکے دو مہینہ ہوتے ہیں تو یہ کل ملکر ایک سال ہو گیا اگر کسی کو ہمت ہو تو یہ خیال کر نیکی بات ہے اور یہ ضروری نہیں کہ یہ چھ روزے مسلسل رکھے بلکہ شوال کے اندر اندر پورے کرلے خواہ ایک ساتھ رکھ لے خواہ فصل کے ساتھ رکھے برابر ثواب ہے۔

دوسری خصوصیت اس مہینہ کی یہ ہے کہ یہ اشہر حج میں سے ہے یعنی اس مہینہ سے حج کے مہینے شروع ہو جاتے ہیں اور چونکہ مکہ معظمہ بعید ہے اسلئے یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان سے روانگی اس مہینہ سے شروع ہو جاتی ہے اگر کسی کو خدا نے وسعت دی ہو تو اُسکو چاہیئے کہ وہ فوراً سفر کا قصد کرلے ہم نے خرچ کا حساب لگایا تھا تو آجکل[۵] ساڑھے تین سو (۳۵۰) روپیہ حج کے لئے کافی ہے یوں کوئی نواب بنکر جانا چاہے تو وہ اور بات ہے اور مدینہ طیبہ کے لئے سوسوا سو روپیہ اور چاہئیں۔ لیکن جسکے پاس صرف حج کیلئے روپیہ ہو مدینہ طیبہ کیلئے روپیہ نہ ہو تو اسکے اوپر حج فرض ہے۔ آجکل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب مدینہ طیبہ ہی نہ جانا ہوا تو کیا حج ہوا۔ یہ بالکل غلط عقیدہ ہے اگر اس بنار پر حج میں تاخیر کریگا تو وہ فاسق ہوگا۔ غرض جسکے پاس ساڑھے تین سو روپیہ علاوہ اہل و عیال کے نان و نفقہ کے موجود ہوں اس پر اسی سال حج کرنا فرض ہے اگر تاخیر کریگا گنہگار ہوگا۔ ہاں اگر راستہ کی بدامنی وغیرہ کے متعلق خبریں سنی ہوں تو اسکی تحقیق کرلے۔ تحقیق کرنیکے ذرائع موجود ہیں اگر کوئی تحقیق کرنا چاہیگا تو ہم بھی مدد کرنیکے لئے حاضر ہیں تحقیق کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ بھی عقل کی اور مصلحت کی بات ہے اگر تحقیق کے بعد امن طریق معلوم ہو جاوے تو پھر بلا عذر حج میں تاخیر کرنا فسق ہے کیونکہ سال بھر کی مدت بہت ہوتی ہے موت حیات صحت مرض کی کسکو خبر ہے۔ لہٰذا جسکے پاس ساڑھے تین سو روپیہ موجود ہوں وہ قصدِ روانگی کرلے کیونکہ ابھی بہت فراغت کا وقت باقی ہے بہت لوگ جارہے ہیں فقط ۔

---

[۵] یہ ایک خاص وقت کا تخمینہ ہے جو اختلافِ اوقات سے بدلتا رہتا ہے تحقیق کرلیا کریں ۱۲ ۔

طریقِ القلندر

اہل شہر کی درخواست پر یہ وعظ ۳۰ نومبر ۱۹۱۸ء مطابق ۲۵ صفر ۱۳۳۷ھ شب شنبہ کو درگاہ حضرت قلندر صاحب رح پانی پتی میں چوکی پر کھڑے ہو کر فرمایا۔ جو دو گھنٹہ چالیس منٹ میں ختم ہوا۔ حاضرین کی تعداد چالیس ہزار کے قریب تھی۔ مولوی حکیم محمد مصطفٰے صاحب و خواجہ عزیز الحسن صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہٗ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ الہ و اصحابہ و بارک وسلم۔

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ط بسم اللہ الرحمن الرحیم ط یاایھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم ط ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واسع علیم انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین اٰمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ولیؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون ۵ و من یتول اللہ و رسولہ والذین اٰمنوا فان حزب اللہ ھم الغالبون ط

لزوم و وجوب

جن آیتوں کی میں نے تلاوت کی ہے ان میں ہر چند کہ مضامین متعدد ہیں۔ مگر باوجود تعدد کے غیر مربوط نہیں بلکہ ان مضامین میں باہم ارتباط ہے اور ارتباط بھی ایسا کہ تابعیت اور متبوعیت یا اصالت اور فرعیت کا کیا معنی کہ ان میں بعض اجزا اصل ہیں اور بعض فروع و توابع یا یوں کہئے کہ بعض مقصود ہیں اور بعض متمم اور مکمل۔ یا یوں کہیئے کہ بعض مقصود ہیں اور بعض علامات و آثار بہر حال جس عنوان سے چاہے تعبیر کیجئے۔ حاصل یہ ہے کہ بعض مضامین اصل ہیں اور بعض تابع۔ اب اس اصل کو جس لفظ سے چاہے تعبیر کر دیا جاوے اور تابع کو جس لفظ سے چاہے تعبیر کر دیا جاوے۔ لیکن یہ خوب سمجھ لیا جاوے کہ تابع کے یہ معنی نہیں کہ وہ مقصود نہیں بلکہ مقصود وہ بھی ہیں مگر مقصود مقصود میں فرق ہوتا ہے یعنی ایک تو مقصود ہوتا ہے من کل الوجوہ اور ایک مقصود ہوتا ہے من بعض الوجوہ۔ گو لزوم اور وجوب دونوں میں مشترک ہوتا ہے۔ مثلاً جیسے نماز اور وضو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نماز اصل ہے اور وضو تابع اور اس کی شرط ہے مگر باوجود اس کے یہ نہیں ہے کہ وضو کسی درجہ میں بھی مقصود نہیں یعنی اس معنی کو غیر مقصود نہیں ہے کہ بلا وضو بھی نماز کو جائز سمجھا جاوے بلکہ دونوں میں عجیب تعلق ہے کہ وضو تو بلا نماز کے صحیح ہے لیکن نماز بلا وضو کے صحیح نہیں۔ یعنی یہ تو ہے کہ بدون وضو کے نماز درست نہیں لیکن اس کا عکس نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی وضو تو کرلے مگر نماز نہ پڑھے یعنی جس نماز کے لئے وضو کیا ہے اس نماز کے وقت کے اندر

اس وضو سے اس نماز کو ادا نہ کرے تب بھی جب دوسرا وقت نماز کا آئے گا۔ تو کسی مفتی کا فتویٰ نہیں کہ اس دوسری نماز کے لئے پھر وضو کرنیکی ضرورت ہے۔ بلکہ وہی وضو کافی ہوگا۔ دوسری نماز کے لئے اداً اور پہلی نماز کے لئے قضاءً۔ غرض وضو بلا نماز صحیح ہو سکتا ہے۔ لیکن نماز بلا وضو صحیح نہیں ہو سکتی۔

مقصود و غیر مقصود یہ مثال اور اس مثال کے اندر یہ خصوصیت یاد رکھنے کے قابل ہے تاکہ اجمالاً ایک غلطی معلوم ہو جاوے۔ جو بعض لوگ اعمال کے اندر کرتے ہیں۔ کہ مقاصد غیر مقاصد کے اندر تفصیل کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اعمالِ غیر مقصود کا حذف بھی جائز ہے یعنی آجکل یہ بہت زبان زد ہے کہ مقصود تو حق تعالیٰ کی یاد ہے۔ اور نماز روزہ وغیرہ محض اس کے ذرائع ہیں۔ اور غیر مقصود ہیں۔ چنانچہ اس زمانے میں بہت لوگوں نے یہ شرب اختیار کر رکھا ہے اس مثال سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ نماز روزہ وغیرہ کا غیر مقصود ہونا ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ وضو کا کہ گو غیر مقصود ہے۔ لیکن کیا اس کو جائز الحذف یا جائز الترک کہہ سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ غیر مقصود ہونیکے معنی یہ ہیں کہ مقصود کے برابر نہیں اور غیر مقصود بھی محض اس درجہ میں ہے کہ نماز کا رکن اور اس میں داخل نہیں کیونکہ شرط ہمیشہ مشروط سے خارج ہوا کرتی ہے۔ مگر بوجہ شرط ہونیکے مقصود کی تکمیل و متمم ہونیکے درجہ میں یہ بھی مقصود ہے۔ بہرحال مقصود کے درجات ہوا کرتے ہیں خوب سمجھ لیجئے۔ میرے الفاظ مقصود و غیر مقصود سے شبہ ہو سکتا تھا۔ اس کو رفع کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس مثال سے اس کو رفع کر دیا گیا بلکہ اس طرح کہا جاوے تو اور زیادہ واضح ہے کہ مقصود تو سب اعمال ہیں۔ لیکن بعض مقصود

ہیں اور بعض مقصود و مقصود اعظم ہیں۔ بہر حال وہ شبہ حذف ہوگیا۔

مقصود اعظم

اب بعد حذفِ شبہ کے میں پھر عود کرتا ہوں اپنی تقریر کی طرف یعنی جتنے اجزا ان آیتوں میں ہیں وہ ہیں تو سب کے سب مقصود لیکن ان میں جو مضمون مقصود اعظم ہے۔ اس کو اس وقت بیان کرنے کے لئے میں نے تجویز کیا ہے۔ کیونکہ وہ مضمون از روئے قواعد شرعیہ کے نیز باعتبار اپنی نوع کے اصل ہے باقی مضامین اسی کے متمم اور توابع اور لاحق ہیں یہ حاصل ہے اس مضمون کا۔ اس مضمون کا حاصل مفصل تو ان آیتوں میں ہے جو عنقریب بیان میں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آنے والا ہے۔ اور مجمل حاصل ایک اور بھی ہے کہ جو حضرت عراقی کے ایک شعر میں ایک دوسرے عنوان سے مذکور ہے۔ جس کے متعلق ایک دوست نے مجھے مشورہ بھی دیا تھا کہ اس شعر کا مضمون آج بیان کیا جاوے۔ وہ شعر حضرت عراقی کا یہ ہے ؎

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی که دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

اس وقت اس فرمائش کو میں نے قبول نہیں کیا تھا۔ مگر رد بھی نہیں کیا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ بیان بالکل اختیار میں نہیں نہ پہلے سے کوئی مضمون تجویز کیا جاتا ہے۔ عادت اللہ ہر ایک کے ساتھ جدا ہے۔ اکثر اور غالب معاملہ اپنے ساتھ یہی دیکھا جاتا ہے کہ عین وقت پر یا قریب کوئی مضمون خود تقاضا کرتا ہے۔ قلب میں۔ بس اسی کا اتباع کیا جاتا ہے۔ اور اسی کو بیان کر دیا جاتا ہے۔ جس عنوان سے بھی میسر ہوا۔ تو اس وقت گو اس فرمائش کو قبول نہیں کیا گیا۔ لیکن رد کی بھی کوئی وجہ نہ تھی بلکہ ذہن خالی تھا۔ مگر وقت کے قریب اسی مضمون کا تقاضا قلب میں پیدا ہوا

میں نکتہ اس وقت یہ سمجھا تھا کہ چونکہ یہ بیان ایک بزرگ کے مزار کے قریب ہے جو بزرگ اسی لقب کے ساتھ مشہور ہیں (یعنی حضرت شرف الدین بوعلی شاہ قلندر قدس سرہٗ العزیز ۱۲ جامع) اس لئے یہ فرمائش کی گئی ہے۔

ترک اعمال

غرض میں یہ سمجھا تھا کہ یہ محض شاعری نکتہ ہے اسی واسطے قلب نے اس فرمائش کو قبول نہیں کیا۔ لیکن بعد اس کے اسکی ضرورت بھی معلوم ہوئی۔ وہ ضرورت یہ ہے کہ اسوقت مسلمانوں کی حالت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر تو وہ ہیں کہ جنھیں اعمال کی طرف توجہ ہی نہیں۔ بہت سے ایسے دیکھے جاتے ہیں۔ کہ نہ نماز نہ روزہ اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ نماز روزہ کے ساتھ تمسخر بھی ہے۔ اور استہزا بھی ہے۔ کوئی تہذیب کے ساتھ استہزا کرتا ہے۔ کوئی بدتہذیبی کے ساتھ۔ تو فقط ترک ہی نہیں۔ بلکہ استہزا اور استخفاف بھی ہے۔ اور اگر خیر استہزار اور استخفاف نہ بھی ہو تو اخلال اور سستی اور کسل تو ضرور ہے۔ استطاعت ہے اعمال کی مگر نہیں کرتے۔ نماز روزہ کر سکتے ہیں۔ مگر نہیں کرتے بدنگاہی سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے۔ غیبت سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے۔ برائے حقوق سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے۔ سب وشتم۔ لڑائی جھگڑا۔ مکر وفریب ان سب سے بچ سکتے ہیں۔ مگر نہیں بچتے۔ کثرت سے تو ہم لوگوں کی یہی حالت ہے کہ گویا اعمال ہیں ہی نہیں بلکہ بجائے ان کے دوسرے اعمال ہیں یعنی معاصی میں مبتلا ہیں۔ اور زیادہ ایسے ہی ہیں مگر اس کے ساتھ ان لوگوں کو اپنے اعمال وطاعات کا دعویٰ بھی نہیں۔ اسلئے یہ لوگ اتنے زیادہ قابل شکایت نہیں۔ جتنے قابل شکایت وہ لوگ ہیں کہ اُن کے یہاں اعمال بھی ہیں۔ تقویٰ بھی طہارت بھی۔ اور اپنے کو عابد زاہد بھی سمجھتے ہیں۔

نگران اعمال میں روح نہ ہونے سے وہ اعمال ایسے ہیں جیسے بادام بلا مغز۔ یا دودھ بلا روغن۔ انکے حال پر زیادہ تاسف ہے اور وہ زیادہ قابل رحم ہیں۔ دو وجہ سے ایک، تو یہ کہ بیچاروں نے محنت بھی کی مشقت بھی اٹھائی مجاہدے بھی کیے مگر افسوس پھر بھی، مقصود حاصل نہ ہوا۔ سارے دن چلے دھوپ سہی خاک پھانکی۔ پیروں میں آبلے پڑے۔ مگر منزل پھر بھی نہ قطع ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک عزیز نے رات کو سفر کا قصد کیا۔ سواروں میں نوکر تھے۔ رخصت قریب ختم تھی۔ ملازمت پر واپس جا رہے تھے۔ بھتیجے نے کہا بھی کہ اندھیری رات ہے اس وقت نہ جائیے۔ پریشان ہو جائیے گا۔ لیکن نہیں مانا۔ کہا تم بچہ ہو۔ کیا سمجھو نوکری کا معاملہ ہے۔ رضا ختم ہو گئی ہے۔ میں کیسے رک سکتا ہوں۔ بھتیجے نے کہا بہت اچھا جائیے مگر پریشان ہو جائیگا خیر صاحب چلے وہاں سے۔ رات ایسی اندھیری کہ چل تو رہے مگر کچھ پتہ نہیں کہ کدھر جا رہے ہیں۔ دو چار میل ٹھیک چلے کیونکہ اپنے گاؤں سے اتنی دور تک تو راستہ ہر شخص کو معلوم رہتا ہی ہے۔ بے دیکھے بھی آدمی جا سکتا ہے۔ مگر آگے چل کر خدا معلوم رخ کس طرف کو ہو گیا کہ راستہ بھولے۔ اور ایسے بھولے کہ بھولنے کو بھی بھول گئے۔ اور بھولنا تو وہی ہے کہ بھولنے کو بھی بھول جاوے۔ چنانچہ رستہ بھول کر خدا جانے کہاں کے کہاں پہونچے اور بالآخر خدا جانے کیسا چکر کھایا کہ پھر اسی راستہ کو ہو لئے جس سے روانہ ہوئے تھے۔ اب وہ تو سمجھ رہے ہیں کہ ہم آگے کو چل رہے ہیں اور حقیقت میں ہٹ رہے ہیں پیچھے۔ غرض ساری رات گھوم گھام کر صبح لوٹ کر پھر وطن شریف ہی میں آ پہونچے۔ صبح صادق کا وقت تھا۔ ان کے مکان کے قریب جامع مسجد ہے جو بہت کرسی دار ہے اور اس کے فنا میں ایک برگد کا درخت

ہے۔ جامع مسجد کو دیکھکر کہا کہ اخاہ یہ کونسا گاؤں ہے جس کی مسجد بھی ایسی ہی ہے۔ جیسی ہمارے گاؤں کی۔ پھر برگد ملا کہا ارے میاں یہ تو درخت بھی ویسا ہی ہے جیسا ہمارے گاؤں کا۔ یہ گاؤں تو ہمارے وطن کا مذکر ہے۔ بھائی یہ گاؤں بہت اچھا ہے۔ آگے بڑھے تو اپنا سا مکان بھی معلوم ہوا۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ بھتیجے صاحب مکان سے نکل کر نماز کو جارہے تھے۔ انھوں نے کہا السلام علیکم کہا کون۔ فلانے۔ کہا ہاں۔ کہا میاں یہ تو بتاؤ میں ہوں کہاں۔ کہا وہیں ہو جہاں میں ہوں اور کہاں ہوتے۔ کہا ارے میاں میں تو رات بھر چلتا رہا۔ اور پھر گھر کے گھر ہی میں رکھے ہوئے لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو بڑی واہیات ہوئی۔ بھتیجے نے کہا میں نے آپ سے کہا نہ تھا۔ لیکن آپ نے مانا ہی نہیں۔ تو بڑا افسوس ہے ایسے مسافر پر جو ساری رات سفر کرے اور صبح کو پھر وہیں آجاوے جہاں سے چلا تھا۔ تھکا بھی ماندہ بھی ہوا۔ وقت بھی صرف ہوا۔ پھر بھی وہیں کا وہیں جہاں پہلے تھا۔ خیر یہاں یہ بات تو نہیں ہے کہ یہ شخص بالکل مشابہ ہے اس مسافر کے یہاں راستہ کچھ نہ کچھ قطع تو ہوتا ہے۔ لیکن بالکل ناتمام یعنی ایسے جیسے چھکڑے کی چال کہ صبح سے شام تک تو چلا اور کتنا آیا دس میل۔ اور ایک ریل ہے کہ اتنے میں دوسو میل نکل گئی۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ریل اور چھکڑے کی رفتار میں جو اس قدر تفاوت ہے تو اس کا سبب کیا ہے۔ ریل میں آخر وہ چیز کیا ہے جس نے اس کی رفتار کو اس درجہ تک پہونچا دیا ہے۔ سبب اس تفاوت رفتار کا یہی ہے کہ ریل میں مشین لگی ہوئی ہے۔ اسی نے اس کو ہوا بنا رکھا ہے۔ اگر چھکڑے میں بھی ویسی ہی مشین لگا دیں تو اس میں بھی وہی بات پیدا ہو جاوے۔ بالخصوص جبکہ اسمیں

مشین لگانا ممکن بھی ہو۔ اور سہل بھی ہو تو حسرت ہے اس شخص پر جو پھر بھی مشین نہ لگائے۔

متقی اور ریاکار

پھر ایسے لوگوں میں بھی بعض تو وہ ہیں جو متقی پرہیزگار ہیں۔ اور بعضے ایسے ہیں جو محض ریاکار ہیں۔ جس میں ریا اور نمائش ہے۔ اس کی تو بالکل ایسی ہی مثال ہے۔ جیسی اس مسافر کی اور بعینہٖ وہی حالت ہے۔ کیونکہ ریا حابط عمل ہے۔ گو فرض تو سر سے اُتر جاتا ہے لیکن مقبول نہیں ہوتا۔ اور مقصود مقبولیت ہی ہے۔ جب مقبول ہی نہ ہوا تو وہ پھر عمل ہی کیا ہوا۔ وہ تو لاشئ محض ہوا۔ اس کی تو وہ پہلی ہی مثال ہے۔ چنانچہ جو لوگ محض نمائش کے لئے عمل کرتے ہیں۔ یعنی فقط اس واسطے کہ لوگ کہیں کہ صاحب یہ بڑے عمل کرنے والے ہیں۔ ان کی بابت حدیث شریف میں وارد ہے۔ فرماتے ہیں۔ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہ قیامت میں سب سے اول ایک ایسے شخص کو لایا جاویگا جو شہید ہوا ہوگا۔ اللہ کے راستہ میں۔ اس کو بتلایا جاویگا کہ ہم نے تم کو یہ یہ نعمتیں دی تھیں وہ ان سب نعمتوں کا اقرار کریگا۔ پھر اس سے پوچھا جاوے گا کہ ہم نے تو تم کو یہ یہ نعمتیں دیں اور تم نے اس میں عمل کیا کیا۔ وہ عرض کریگا کہ میں نے آپکی راہ میں جہاد کی یہاں تک کہ اپنی جان دیدی۔ ارشاد ہوگا کہ تم جھوٹے ہو۔ ہم کو خوش کرنیکے لئے جان نہیں دی۔ بل لیقال انہ جری۔ بلکہ اس لئے جان دی کہ سب میں یہ شہرت ہو جائے کہ بڑے بہادر تھے۔ فقد قیل۔ تو تمہاری تعریف اور شہرت ہو چکی۔ جو تمہارا مطلب تھا وہ دنیا ہی میں تم کو حاصل ہو چکا۔ دوم تمہارا مدعا پورا ہو گیا۔ پھر حکم ہوگا کہ اس کو منہ کے بل جہنم میں پھینک دیا جاوے۔ پھر بلایا جاویگا ایک بڑے عالم کو اسی طرح اس سے پوچھا جاویگا کہ کہیے صاحب

آپ نے کیا کیا۔ وہ کہے گا میں نے یوں وعظ کہے۔ یوں نصیحتیں کیں۔ یوں لوگوں کو ہدایت کی اور یوں علم سکھایا۔ ارشاد ہوگا یہ ہمارے واسطے نہیں کیا۔ بل لیقال انک قاری بلکہ اس واسطے کہ لوگوں میں مشہور ہو کہ بڑے عالم ہیں۔ بس تو آپ بھی وہیں تشریف لیجایئے جہاں آپ کے بھائی صاحب گئے ہیں۔ ذرا غور تو کیجئے یہ آیا ہے حدیث میں کہ اس کو بھی مُنہ کے بل جہنم میں پھینک دیا جاوے گا۔ پھر ایک سخی صاحب لائے جاویں گے ان سے بھی یہی سوال کیا جاویگا۔ وہ کہیگا کہ میں نے بہت مال و دولت اللہ کے راستے میں خرچ کیا تھا۔ ارشاد ہوگا کہ اس واسطے نہیں کیا کہ ہم راضی ہوں۔ بل لیقال انک جواد بلکہ اس واسطے کہ لوگ کہیں کہ بڑے سخی ہیں۔ ان کی داد دہش کا کیا کہنا ہے۔ بس سارے شہر میں وہی تو ایک سخی ہیں۔ اگر کوئی اور بھی سخی ہوگا تو فلانے کے برابر نہیں ہوگا فقد قیل سو جو تمہارا مقصد تھا وہ حاصل ہو چکا۔ لہٰذا تم بھی وہیں جاؤ جہاں تمہارے دو بھائی جا چکے ہیں۔ چنانچہ اس کو بھی جہنم میں منہ کے بل پھینک دیا جاویگا تو حضرت یہ تین عمل کتنے بڑے بڑے ہیں۔ علم دین۔ سخاوت۔ شہادت۔ اب ان سے بڑھ کر اور کونسا عمل ہوگا۔ لیکن دیکھ لیجئے ریا کی بدولت انکی کیا گت بنی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس شخص کا عمل صرف صورت عمل ہے۔ حقیقتاً عمل ہی نہیں۔ اور واقعی جو لوگ محض ریاکار ہیں ان کا تو وہی حال ہے کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل ۔۔۔ واندروں قہر خدائے عز و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید ۔۔۔ واز درونت ننگ می دارد یزید

ناتمام عمل

ان لوگوں کی تو یہ حالت ہوئی۔ اور بعض وہ لوگ ہیں جن کے

عمل ریا سے تو نہیں ہیں۔ خلوص کے ساتھ ہیں مگر ناتمام۔ اور غیر مکمل۔ گویا جسد بلا روح ہیں۔ خیر وہ کچھ ہیں تو سہی مگر ایسے ہی ہیں جیسے چھکڑے کی رفتار بمقابلہ ریل کے۔ تو اگر کوئی نادان ایسا ہو کہ اس کو ریل عطا کی گئی ہو جسمیں انجن بھی ہے اور سامان آگ کا بھی موجود ہے۔ مگر صرف آگ ڈالنے اور مشین چلانے کی کسر ہے۔ اگر اس میں آگ چھوڑ دی اور بھاپ پیدا کر دی تو پھر وہ ریل ہے کہ صبح سے شام تک دو سَو تین سَو میل نکل گئی بلکہ زیادہ نہیں تو بس ایک ٹھیلہ ہے تو انجن بھی موجود آگ کا سامان بھی موجود ہے لیکن بیوقوف ڈرائیور ہے کہ اس کو ٹھیلتا ہے۔ ٹھیلنے کے لئے اوّل تو نیچے اُترنا پڑتا ہے پھر بہت کچھ زور بھی لگانا پڑتا ہے۔ گو اس طرح ٹھیلنے سے بھی وہ چلتی ہے۔ کیونکہ آخر لوہے کی سڑک پر ہے۔ مگر کتنی۔ صبح سے شام تک دو تین چار میل۔ بس۔ اور جہاں چھوڑ دیا۔ بس کھڑی ہو گئی اگر فوراً نہیں تو کچھ دور اور چل کر سہی۔ غرض ٹھیلنے سے دن بھر میں دو چار میل چل سکتی ہے۔ اور بہت سے بہت دس میل۔ اگر کوئی بہت ہی قوی ہوا اور برابر چلا گیا دھکیلتا ہوا۔ تو اُس شخص مذکور کی حالت اس کے مشابہ ہے۔ اور یہ حالت بھی قابل افسوس ہے۔ ہم نے بہت لوگ ایسے دیکھے ہیں کہ تقویٰ بھی۔ طہارت بھی۔ ظاہری حالت بھی درست۔ ڈاڑھی بھی نیچی۔ پائیچے بھی ٹھیک نماز بھی۔ روزہ بھی۔ یہ سب کچھ مگر ساتھ ہی اسکے روح جس کو میں آگے بیان کرونگا وہ نہیں۔ غرض ہر عمل بے روح ہے۔ یعنی کم جان ہے۔ گو بالکل بیجان نہیں۔ اسکی رفتار ایسی ہی سُست ہے جیسی ٹھیلہ کی۔ حق سبحانہ تعالیٰ جل جلالہ دعم نوالہ نے ایک انجن گاڑی اس شخص کو دی جس کی کلیں بھی بہت

اچھی اچھی ہیں۔ بھاپ بنانیکے لیے سامان بھی دیا۔ کوئلہ بھی۔ پانی بھی۔ دیاسلائی بھی۔ مگر آگ سلگائے کون اور بھاپ بنائے کون۔ اسکی بلا سُستی کی وجہ سے ہاتھ پاؤں کو اتنی حرکت دینا بھی گراں ہو رہا ہے تو یہاں کسر کاہیکی ہے۔ صرف بھاپ کی اور آگ سلگانیکی چونکہ بھاپ نہیں اس لیے رفتار تیز نہیں۔ اسوقت اسی بھاپ کو ذکر کیا جارہا ہے۔ اور یہی مراد ہے میری روح سے۔ اور بھاپ نہ تو موجود ہے۔ نہ اس کی فکر و کوشش ہے۔ اسی کو حضرت عراقی رحمتہ اللہ علیہ نے اس شعر میں ذکر کیا ہے۔ اشارۃً ؎

صنمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی — کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

تو یہ ضرورت میری سمجھ میں آئی اس مضمون کی اور اس لئے یہ مضمون باوقعت معلوم ہوا کہ اس میں ایک بڑی کوتاہی کی تکمیل ہے اور اسی وجہ سے اسکو اختیار کیا گیا اور اس ضروری چیز کی شرح اور تعیین میں آگے چل کر دونگا۔ مگر اجمالاً حضرت عراقی کے اس شعر سے سمجھ میں آجاویگی۔ اصل تو یہ وجہ ہے۔ اس شعر کے مضمون کو اختیار کرنیکی۔ باقی اس میں وہ شاعری نکتہ بھی ہے جس کی بنا پر میرے دوست نے مجھے مشورہ دیا تھا۔ یعنی مقام بیان میں۔ اس لقب کے ایک بزرگ کا مزار ہونا مگر ممکن ہے ان کا ذہن بھی اس مضمون کی ضرورت کی طرف گیا ہو۔ بہر حال دو نکتے جمع ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ فی نفسہ بھی یہ مضمون ضروری ہے۔ دوسرے خصوصیتِ مقام سے اسکا استحسان اور بڑھ جاتا کیونکہ جس مقام پر یہ بیان ہو رہا ہے۔ وہاں ایک ایسے بزرگ کا مزار مبارک ہے جو اس لقب قلندر ہی کے ساتھ مشہور ہیں۔ نیز ایک برکت کی بھی انشاء اللہ تعالیٰ توقع ہے۔ پھر چونکہ یہ وعظ

ایک بزرگ کیساتھ نامزد ہے۔ اس لئے بھی امید اس مضمون کے نافع ہونیکی ہے۔ مگر یہ سب درجہ تائید و تزئین میں ہے۔ یہ نکتے درجہ مقصودیت میں نہیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ مجھے اس طریق کو بیان کرنا ہے جس کے متعلق ہم میں کمی ہو رہی ہے۔ اور جس کی طرف اب ہمارا التفات نہیں رہا۔ اس وجہ سے یہ مضمون اختیار کیا گیا ہے۔

طریق قلندرانہ

حق سبحانہ تعالیٰ نے جو مضمون اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے وہ اس طریق کی تفصیل ہے۔ البتہ قرآن میں یہ اصطلاح نہیں ہے اور نہ یہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو اصطلاح چاہے مقرر کر لے۔ تعبیر کرنے والے کو اختیار ہے جس اصطلاح میں چاہے کسی مضمون کو تعبیر کرے۔ گو اس آیت میں یہ اصطلاح نہیں ہے لیکن یہ مضمون ہے وہی۔ چنانچہ تفصیل سے معلوم ہو جاویگا۔ لیکن اس کے قبل ممکن ہے کہ کسی کو اس شعر کے متعلق ایک شبہ ہو اس کو رفع کئے دیتا ہوں۔ وہ شبہ یہ ہے کہ حضرت عراقی نے اس شعر میں رہِ قلندر اور رہِ پارسائی کو متقابل فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں ع صنمارہِ قلندر سزد ار بمن نمائی۔ اے مرشد مجھکو قلندر کا رستہ بتلا دیجئے۔ ع کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی۔ کیونکہ رستہ پارسائی کا تو بہت دور دراز ہے۔ یہ ترجمہ ہے اس شعر کا اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ قلندر کا رستہ پارسائی کے رستہ کے متقابل ہے۔ تو گویا اس طریق قلندری میں پارسائی نہ ہوتی ہوگی۔ یعنی آدمی بالکل آزاد اور رند بے قید ہو جاتا ہوگا۔ اُسے ڈاڑھی رکھنی بھی ضروری نہ رہتی ہوگی اس پر نماز بھی فرض نہ رہتی ہوگی۔ شراب بھی اسے حلال ہو جاتی ہوگی۔ غرض حلال حرام کی بالکل تمیز نہ رہتی ہوگی۔ شاید طریق قلندری کا خلاصہ ذہنوں میں یہ ہوگا نعوذ باللہ بچاوے ایسے طریق سے۔ غرض کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے۔ اس شعر کے مضمون

سے اسکو پہلے رفع کیئے دیتا ہوں۔ کیونکہ اسکا رفع کرنا فی نفسہ بھی ضروری ہے۔ نیز اس کی اس بیان میں بھی ضرورت ہوگی۔ جو مجھے اس وقت کرنا ہے اور یہ اس بیان میں معین بھی ہوگا۔ اب یہاں ضرورت ہے تھوڑے سے علم درسی کی۔ مگر خیر میں حتیٰ الامکان آسانی سے سمجھانے کی کوشش کرونگا کہ غیر اہل علم بھی بقدر ضرورت سمجھ سکیں تقریر اس کی یہ ہے کہ عراقیؒ کے شعر میں جو طریق قلندری و طریق پارسائی میں تقابل واقع ہوا ہے۔ وہ ظاہر سیاق سے تباین پر ضرور دال ہے۔ جس کے لئے عدم تصادق لازم ہے لیکن تباین و عدم تصادق کے لئے تنافی و عدم اجتماع ضروری نہیں دیکھئے۔ کل میں اور اس کے اجزار خارجیہ میں تباین و عدم تصادق متحقق ہے۔ لیکن تنافی نہیں۔ اور اجتماع ہوتا ہے جیسے بیت کے لئے جدار اور سقف اجزار خارجیہ ہیں جن میں باہم تصادق نہیں۔ بلکہ تقابل ہے لیکن ایک کل ہے اور دوسرا جزو اور دلائل سے ثابت ہے جس کا کافی بیان اس وعظ میں بھی ہے کہ طریق قلندر کے دو جزو ہیں ایک عمل جو حقیقت ہے طریق پارسائی کی اور دوسرا محبت اور طریق قلندر نام ہے ان دونوں کے مجموعہ کا۔ اور چونکہ یہ اجزار خارجیہ ہیں ان میں تصادق تو نہیں مگر کلیت و جزئیت کا تعلق ہے پس طریق قلندر کل ہوا اور طریق پارسائی اس کا ایک جزو ہوا۔ جز کے انتفار سے کل کا انتفار لازم ہے۔ پس طریق پارسائی یہاں منتفی ہو جاویگا۔ سو حاصل شعر کا یہ ہوا کہ محض طریق پارسائی کافی نہیں جو کہ ایک جزو ہے۔ طریق قلندری کا بلکہ طریق قلندری مطلوب ہے۔ جسمیں دونوں جزو جمع ہیں طریق پارسائی بھی اور طریق محبت بھی۔ پس اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔ باقی اب دوسری تحقیق ہے کہ ان دونوں میں اصل کون ہے۔ محبت یا اعمال اس کا فیصلہ بھی ہوا جاتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہاں اتنا ہی سمجھ

لیجیے کہ طریق قلندر وہ طریق ہے جو مرکب ہو محبت اور اعمال دونوں سے آگے ایک اصطلاحوں کا فرق ہے جو اصطلاح متقدمین میں پائی جاتی ہے۔ اس کے اعتبار سے رہ قلندری میں یہ بھی قید ہے کہ جس میں اعمال کی تقلیل ہو۔ یعنی اعمال ظاہرہ مستحبہ کی۔ کیا معنی کہ بہت نفلیں اور وظائف نہ ہوں۔ بلکہ محبت کی خاص رعایت ہو۔ یعنی تفکر اور مراقبہ زیادہ ہو۔ ایک تو یہ اصطلاح ہے اور ایک اصطلاح اور ہے یعنی خواہ ان اعمال کی تکثیر بھی ہو مگر غلبہ آزادی کو ہو۔ لیکن آزادی خلق سے نہ کہ خالق سے۔ کیا معنی کہ قلندر کو دنیا کی وضع اور رسوم کی پرواہ نہیں ہوتی۔ نہ مصالح پر نظر ہوتی ہے۔ مثلاً ہم یہ بھی نظر کرتے ہیں کہ بھائی ایسا نہ کہو کوئی کیا کہے گا۔ اور مثلاً ہم لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ فلانے کو کچھ کہو مت برا مانیگا۔ وحشت ہوگی بھائی مگر بشرطیکہ ان رعایتوں کا شریعت سے اذن بھی ہو اور قلندر کو اس کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی کہ کوئی برا مانیگا یا بھلا ماننے گا۔ اس کا دل صاف اور سادہ ہوتا ہے۔ غرض وہ آزاد ہوتا ہے مصالح سے اسکی مصلحت صرف ایک ہوتی ہے ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار	بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

ان کی بڑی مصلحت یہی ہوتی ہے کہ ایک کو لیکر سب کو ترک کردو۔ اس کی تو بس یہی حالت ہوتی ہے ؎

دلا رامے کہ داری دل درو بند	دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اور اس کا یہ مشرب ہوتا ہے ؎

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے	چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بہ کس نگاہے

سوائے محبوب کے کسی پر اس کی نظر ہی نہیں پڑتی۔ بجز ایک کے سارے جہان کو انہوں

نے ہیچ اور فنا کر دیا ہے۔ جب انہوں نے اپنے ہی کو ہیچ اور فنا کر دیا تو پھر دوسرے پر کیا نظر کریں۔ کہتے ہیں کہ ؎

عاشقِ بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا　　اور جو خود ناکام ہو اسکو کسی سے کام کیا

جب اپنی ہی ہستی مٹا دی تو دوسروں کی ہستی کی انھیں کیا پرواہ۔ مشہور ہے کہ جب اپنی ہی ٹوپی اتار دی تو پھر دوسروں کی ٹوپی کی کیا پرواہ۔ جب وہ اپنی ہی ہستی کو مٹا چکا تو دوسروں کی ہستی کی پرواہ اس کی جوتی کو۔ ایسے شخص کو اصطلاح صوفیہ میں حُر کہتے ہیں بعض صوفیائے کرام نے قرآن مجید میں سے ایک لطیفہ نکالا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کے اس قول سے رب انی نذرت لک ما فی بطنی محرراً فتقبل منی۔ اے اللہ میں تیرے نذر کرتی ہوں جو کچھ میری نیت میں ہے اور تیرے راستہ میں اسے آزاد کرتی ہوں۔ اُسکا یہ تھوڑا ہی مطلب ہے کہ وہ غلام تھا۔ اب آزاد کرتی ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ میں اسے تیرے ہی لئے خاص کرتی ہوں۔ اے اللہ میاں یہ خالص تمہارا ہے۔ تمہارے دین کی خدمت میں ساری عمر رہے گا۔ تو حُر کے معنی خالص کے ہوئے چنانچہ اہل لغت نے لکھا ہے۔ طین حُر یعنی وہ مٹی جس میں کنکر وغیرہ نہ ملا ہو۔ حُر خالص مٹی کو کہتے ہیں۔ یہاں بھی حُر کے معنی ہیں خالص اللہ کا۔ اور اب تو خالص کے وہ معنی ہو گئے جو نخالص کے ہیں یعنی ایسا میلا جیسا میل والا گھی۔ سو آجکل کے خالص تو واقعی بالکل نخالص ہیں۔ یعنی اس کے جو اصلی معنی ہیں۔ اس معنی کو نہیں جیسے عوام پوچھتے ہیں کہ یہ گھی نخالص ہے۔ بیچنے والا کہتا ہے کہ ہاں بالکل نخالص ہے ایسے ہی احرار کی دو قسمیں ہیں ایک خالص ایک نخالص نخالص کون جس میں میل ہو۔ میل کا ہے کا ہو۔ میل ہو حب دنیا کا میل ہو حب غیر

کا۔ میل ہو معصیت کا شرک و کفر کا۔ یعنی آج کل آزاد اس کو کہتے ہیں جو شریعت سے آزاد ہو۔ اللہ اکبر ایسا شخص بھی کہیں آزاد کہا جا سکتا ہے۔ حضرت یہ تو وہ آزاد ہے جو ہزاروں قیدوں میں ہے یعنی معصیتوں میں مبتلا ہے۔ پھر آزادی کہاں رہی۔ کیونکہ معصیت کی قید تو سب قیدوں سے سخت قید ہے۔ غرض بے قید کوئی نہیں۔ کوئی خدا کی قید میں ہے کوئی شیطان کی قید میں۔ بہرحال قید سے تو خالی کوئی نہیں۔ اب اس کا فیصلہ خود کر لو کہ کونسی قید پسند کے قابل ہے۔ حضرت سعدی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں ؎

اسیرش نخواہد رہائی ز بند　　　　شکارش نہ جوید خلاص از کمند

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

گر دو صد زنجیر آرے بگسلم　　　　غیر زلف آں نگار مقبلم

یعنی اگر سیکڑوں قیدوں میں بھی ڈالدیا جاوں تو ساری قیدیں توڑ ڈالوں مگر معشوق کی زلف کی قید کہ اس کو توڑنا ہرگز گوارا نہ کروں۔ کیونکہ یہ قید تو محبوب قید ہے۔ غرض قید بھی دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو محبوب قید اور ایک ناگوار قید۔ دیکھو تو سہی اگر عاشق کو کسی دعوت کے لئے پکڑو تو وہ رسّے توڑ کر بھاگے گا کہ ہمیں دعوت سے کیا مطلب ہم تو آزاد ہیں۔ اب فرض کرو اسی روز میں محبوب بھی آگیا اور اس نے بھی کہا کہ چلو میاں تمہاری آج دعوت ہے ہمارے یہاں۔ اور وہ اس سے بھی کہدے کہ نہیں جناب میں تو آزاد ہوں۔ میں دعوتوں میں نہیں جایا کرتا کوئی اس سے کہے کہ ارے احمق جس کی بدولت تو آزاد ہوا ہے۔ اسی کے یہاں تو آج دعوت ہے جس کے لئے تو نے سارے تعلقات قطع کئے آج کی دعوت اسی

شخص کے تعلق سے مسبب ہے اس کی دعوت میں بھی جانے سے تو آزاد بنتا ہے تو تو عاشق ہی نہیں۔ یہ اچھی آزادی ہوئی صاحب کہ نماز بھی چھوڑ دی۔ روزہ بھی چھوڑ دیا۔ یہ آزاد کہاں سے ہوا۔ یہ تو ہزاروں قیدوں کے اندر جکڑا ہوا ہے۔ آزاد وہ ہے جو غیر اللہ سے آزاد ہو۔ جو خالص اور حُر ہو تو قلندر کے یہ معنی ہیں۔

اصطلاح قلندر

خلاصہ یہ کہ متقدمین کی اصطلاح میں تو قلندر وہ ہے جس میں اعمال غیر واجبہ کی تقلیل ہو اور متاخرین نے اس کے معنی میں وسعت کی ہے۔ یعنی قطع نظر اس سے کہ اعمال میں تقلیل ہو یا تکثیر ہو لیکن خلق سے آزاد ہو اور یہ دونوں اصطلاحیں جدا جدا ہیں لیکن ایک نکتہ کی بنا پر یہ دونوں اصطلاحیں متوافق بھی ہو جاتی ہیں۔ یعنی یہ جو کہا جاتا ہے کہ قلندر کے اعمال میں تقلیل ہوتی ہے تو قلت اور کثرت امور اضافیہ میں سے ہیں۔ یعنی بمقابلہ دوسرے اہل اعمال کے تو وہ عمل میں بھی بڑھا ہوا ہے یعنی اوروں سے تو اس کا عمل بھی غالب ہے۔ لیکن خود اس میں جو محبت اور عمل دو چیزیں جمع ہیں۔ ان میں محبت کا حصہ عمل سے بڑھا ہوا ہے۔ پس اس کمی کا یہ مطلب نہیں کہ عمل میں فی نفسہ کوئی کمی ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ گو عمل بھی بہت بڑھا ہوا ہے۔ لیکن محبت میں اُس سے زیادہ بیشی ہے۔ عمل تو کامل ہے ہی مگر محبت کامل سے بھی آگے یعنی اکمل ہے اس تقریر سے یہ دونوں اصطلاحیں باہم متوافق ہو گئیں۔ اب ایک اور تیسری اصطلاح جہلاء کی ہے جو بالکل بدعت ہے کہ قلندر وہ ہے جو چار ابرو کا صفایا کر دے اور نماز روزہ سب کو رخصت کر دے۔ ایسے شخص کو جہلاء کہتے ہیں کہ صاحب یہ قلندر ہیں استغفر اللہ وہ کیا قلندر ہوتا۔ ہاں اگر کوئی معذور ہو

غیر مکلف ہو مثلاً مجنوں ہے دیوانہ ہے تو وہ مستثنیٰ ہے یعنی خدا کے یہاں اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ یہ دوسری گفتگو ہے کہ آیا وہ کامل بھی ہے۔ سو یہ خوب سمجھ لیجیے کہ نہ وہ کامل ہے نہ مکمل۔ کیونکہ مکمل ہونیکے لئے خود کامل ہونا ضروری ہے تکمیل کے لیئے کمال شرط ہے جو خود ہی درزی کا کام نہ جانتا ہو وہ دوسرے کو سینا کیونکر سکھا سکتا ہے۔

اتباع رسولؐ

تو مجاذیب اور بہلول جو ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ خود کامل نہیں ہوتے لہذا دوسرے کی تکمیل بھی نہیں کر سکتے کامل اور مکمل وہی ہے جو قدم بقدم ہو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ جس کا ظاہر ہو مثل ظاہر پیغمبر کے۔ اور باطن ہو مثل باطن پیغمبر کے یعنی ہر امر میں اور ہر حال میں پیغمبر ہی اس کے قبلہ وکعبہ ہوں۔ اس کے ظاہر کا قبلہ حضور کا ظاہر ہو اور اس کے باطن کا قبلہ حضورؐ کا باطن ہو۔ اس کو خوب سمجھ لیجیئے دیکھیئے تو سہی نماز کی صحت کیلئے قبلہ رخ ہونا ضروری ہے۔ ہاں قبلہ سے تھوڑا فرق ہو تو خیر مضائقہ نہیں نماز صحیح ہو جاویگی۔ چاہے رکعتیں بھی زیادہ نہ پڑھے۔ اور چاہے قرأت میں بھی کچھ تقلیل ہو مگر ہو قبلہ رخ تب ہی نماز کی صحت متحقق ہوگی۔ اور اگر مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تو چاہے رکعتوں کی تعداد بھی زیادہ ہو اور قرأت میں بھی تطویل ہو۔ لیکن نماز صحیح نہ ہوگی۔ دیکھو یہ مسجد نبی ہوئی ہے۔ (بیان مسجد سے متصل ہو رہا تھا ۱۲ جامع) اس کی سمت کی طرف نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ کہ یہ مسجد خانہ کعبہ کی طرف گویا منہ کیئے ہوئے ہے لہذا جو کوئی اس کی سمت کی طرف اپنا منہ کر کے نماز پڑھے گا چاہے دور کعت ہی کیوں نہ ہوں اس کی نماز صحیح ہو جاویگی۔ برخلاف اس کے اس مسجد کی سمت کے مقابل مشرق کی

جانب اگر آپ اس مسجد کی ایک شکل بنا کر (کیونکہ وہ مسجد کیا ہو گی مسجد کی محض شکل
ہی ہو گی) اسمیں نماز پڑھیں جس میں اتنی لمبی لمبی سورتیں ہوں۔ کہ ایک رکعت میں تو
سورۂ بقر ہو دوسری میں سورۂ آلِ عمران۔ پھر تیسری میں سورۂ نساء اور چوتھی میں سورۂ
مائدہ غرض چار رکعتوں میں یہ بڑی بڑی چار سورتیں ختم کی گئیں اب آپ ہی کہیے۔
یہ نماز کیسی ہوئی۔ بالکل ہیچ در ہیچ اس پر ثواب تو کیا ملتا بلکہ اور عذاب ہو گا۔ تو اس
نماز میں کیا چیز کم ہے فقط کمی یہ ہے کہ رخ قبلہ سے ملا ہوا نہیں ہے۔ اس کے سوا اور
کوئی کمی نہیں۔ شکل بھی نماز کی۔ مسجد کی بھی ساری ہیئت وہی۔ لیکن تحریف قبلہ کے
سبب وہ نماز ہرگز مقبول نہیں بلکہ مردود ہے۔ نماز بھی اور نمازی بھی۔ تو ہمارے اعمال
کا قبلہ و کعبہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال ہیں۔ جس عمل کا رخ اس
قبلہ کی طرف ہو گا وہی مقبول ہو گا۔ پس ہمارے ظاہر کا قبلہ پیغمبرؐ کا ظاہر ہے۔ اور باطن
کا قبلہ پیغمبرؐ کا باطن یعنی ہماری ظاہری حالت وہ ہونی چاہیئے جو حضور کی ظاہری
حالت تھی۔ یعنی آپ کپڑا پہنتے تھے۔ ہمیں بھی ننگا نہیں رہنا چاہیئے۔ آپ داڑھی
رکھتے تھے ہماری داڑھی بھی منڈی یا کٹی نہ ہونی چاہیئے۔ آپ کے ٹخنے کھلے ہوئے
رہتے تھے ہمارے بھی کھلے رہنے چاہئیں۔ اور یہ ہی نہیں کہ حضور کے ٹخنے کھلے رہتے
تھے بلکہ یہ بھی ثابت ہے کہ حضورؐ نے ٹخنے ڈھانکنے سے منع بھی فرمایا ہے۔ اسی طرح
حضور کے ناخن ترشے ہوئے اور لبیں بنی ہوئی رہتی تھیں۔ یہ ہی حالت ہمارے
ناخن اور لبوں کی ہونی چاہیئے۔ غرض ہمارا ظاہر بالکل مشابہ ہونا چاہیئے حضورؐ کے
ظاہر کے کہ بس صورت دیکھتے ہی معلوم ہو جاوے کہ یہ غلام ہے ایسے آقا کا۔

ایک پیر بھائی ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ایک مرید

الہ آباد کے رہنے والے تھے میں الہ آباد گیا ہوا تھا۔ وعظ کے اندر دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھے شخص داڑھی منڈی ہوئی خوب گورے چٹے گورہ ٹھپئے کے کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔ جاڑے کے دن تھے۔ رضائی جو اوڑھے ہوئے تھے۔ اس پر بھی گوٹہ اور چمک لگی ہوئی تھی۔ وعظ کے بعد میرے پاس آکر بڑی محبت سے بولے کہ مولوی منہ کھولدیے میں نے دل میں کہا کہ جب یہ ایسی محبت سے کہہ رہا ہے تو لاؤ منہ کھولدو۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔ کوئی تھوک تو دیگا نہیں۔ غرض میں نے اپنا منہ کھولدیا۔ اس نے فوراً ہی ایک لڈو میرے منہ میں رکھدیا۔ میں نے کھالیا کہ خدا کی نعمت ہے کسی کے ہاتھ سے دلوائیں۔ میں نے پوچھا تم کون ہو۔ یہ سنتے ہی اس کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ تنہا صاحب محبت غلطی میں مبتلا تھا۔ مکار نہ تھا۔ دکاندار نہ تھا۔ زار زار آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ خود ہی شرمندہ تھا اپنی اس حالت پر رو کر کہا اس نالائق کو بندہ امداد اللہ کہتے ہیں۔ مجھ کو بھی رحم آگیا۔ آخر پیر بھائی کا خیال ہونا ہی ہے۔ اور نہ بھی ہوتا پیر بھائی تو کیا تھا۔ جو شرارت اور سرکشی نہ کرے اور اپنے آپ کو خطاوار سمجھے اس پر رحم ہی آتا ہے۔ البتہ شرارت کرنے والے پر غصہ آتا ہے۔ خیر میں نے ان سے بات چیت کی اور مناسب تسلی دی اس وقت تو ان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع ملا نہیں۔ اتفاق سے ایک مرتبہ میں گنگوہ گیا ہوا تھا۔ وہ بھی وہاں چلتے پھرتے آگئے میری جو خبر سنی تو اطلاع کر کے مع ایک مجمع عظیم کے میرے پاس پہونچے۔ اور آتے ہی پھولوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔ میں نے ہار تو ہاتھ میں لیلیا اور انبساط کے لئے پوچھا یہ کیسے ہیں۔ کہا ہم ایک باغ میں گئے تھے۔ عوام الناس ایسوں کے بڑے معتقد ہوتے ہیں۔

سمجھتے ہیں کہ قطب الاقطاب ہیں۔ ارے قطب الاقطاب ہوتے تو داڑھی کہاں جاتی۔ مگر اُن کے نزدیک تو داڑھی کا نہ ہونا ہی دلیل قطبیت کی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر سارا چین اور جاپان بس اقطاب اور اغواث ہی سے بھرا پڑا ہے۔ کیونکہ وہاں قدرتی طور پر کسی کے داڑھی مونچھ نکلتی ہی نہیں۔ غرض ایسوں کو برکت کے لیے کوئی باغ لیجاتا ہے۔ کوئی کھیتوں پر لیجاتا ہے۔ ان حضرات کو بھی کوئی اپنے باغ لیگیا ہوگا۔ غرض انھوں نے کہا کہ ہم ایک باغ میں گئے تھے۔ باغ والے نے پھول دیدئے تھے۔ سو کچھ تو حضرت شیخ عبدالقدوس رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر چڑھائے۔ جی چاہا کہ کچھ تمہیں بھی دیں۔ کیونکہ وہ پیارے تھے مُردوں میں۔ تم پیارے ہو زندوں میں۔ اپنے پیاروں کو اچھی چیز دیا ہی کرتے ہیں۔ یہ انھوں نے تقریر کی۔ بڑا مجمع تھا۔ میں نے کہا شاہ صاحب یہ پھول جو آپ نے شیخ کے مزار پر چڑھائے ہیں آپکے نزدیک تو بڑی چیز ہیں۔ لیکن ایک مثال فرض کرو اگر کوئی شخص ہو جو سو روپیہ تولہ کا عطر سونگھنے والا ہو اور تم چار آنہ تولہ کا عطر بہت ہی گھٹیا اور چکٹا ہوا لیجاؤ اور جاکر اس کی ناک میں دیدو تو کیسا۔ کیا یہ ایذا رسانی نہیں ہے۔ کہا بیشک۔ میں نے کہا اچھا اب یہ بتاؤ کہ حضرت شیخ تمہارے نزدیک شمائم و روائح جنت سے مشرف ہیں یا محروم ہیں۔ کہنے لگے معاذ اللہ کون کہہ سکتا ہے کہ محروم ہیں۔ میں نے کہا تو بس یہ جو پھول تم نے حضرت شیخ کے مزار پر چڑھائے ہیں۔ دو حال سے خالی نہیں یا تو ان کی خوشبو پہونچتی ہے یا نہیں پہونچتی ہے۔ اگر نہیں پہونچتی تو پھول چڑھانا بیکار اور اگر پہونچتی ہے تو ان جنت کے پھولوں کے مقابلہ میں جو حضرت شیخ کو حاصل ہیں تمہارے یہ دنیا کے پھول سو روپیہ تولہ کے

عطر کے مقابلہ میں چار آنہ تولہ کا چکٹا ہوا عطر ہے یا نہیں۔ کہا بیشک۔ میں نے کہا تو بس یہ تو وہی مثال ہوئی کہ سو روپیہ تولہ کے عطر سونگھنے والے کی ناک میں چار آنہ تولہ کا سڑا ہوا عطر دیدیا۔ تم نے پھول چڑھا کر حضرت شیخ کی روح کو تکلیف پہونچائی۔ کہنے لگے میں توبہ کرتا ہوں یہ مسئلہ آج سمجھ میں آیا ہے۔ اب کبھی کسی مزار پر پھول نہ چڑھاؤں گا۔ میری توبہ ہے۔

محبت کی نشانی

اس کے بعد ہم لوگ نماز کے لئے مسجد میں گئے لوگ وضو کرنے لگے اور وہ ایک طرف بیٹھ گئے۔ میں ان کے پاس جا بیٹھا اور آہستہ سے کہا کہ تم میرے پیر بھائی ہو اس لئے تم سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ تمہیں حضرت حاجی صاحب سے محبت ہے یا نہیں۔ بس رونے لگے کہا میں تو عاشق ہوں۔ میں نے کہا پھر عاشق ہو کر کیوں اپنے محبوب کی مخالفت کرتے ہو۔ کیا حضرت حاجی صاحب کی ایسی ہی داڑھی تھی۔ کہا میں توبہ کرتا ہوں کہ میں اب کبھی داڑھی نہیں منڈاؤں گا۔ صاحب انہوں نے داڑھی منڈانے سے بھی توبہ کرلی میں اس شبہ میں رہا کہ کہیں منہ دیکھے کی توبہ تو نہیں ہے۔ مگر پھر جو میرا الہ آباد جانا ہوا۔ تو رستہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص خوب مقطع داڑھی لئے ہوئے سامنے سے چلے آرہے ہیں۔ میں نے پہچانا بھی نہیں ایک شخص نے بتایا کہ یہ فلانے ہیں تب تو میں بہت خوش ہوا۔ اور بغلگیر ہو کر ملا۔ تو انکی اصلاح اسی اصول سے کی گئی۔ کہ جب تمہاری صورت حضرت حاجی صاحب جیسی نہیں پھر تم ان کے عاشق کیا ہوئے۔

قلندر کے معنی

تو قلندر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اپنا ظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر کے خلاف رکھے۔ نہ بزرگوں کے کلام میں کہیں اس کے

یہ معنی منقول ہیں محض لغو اصطلاح ہے اور اس غلط اصطلاح کے ہونے سے ایک اور خرابی ہوگئی وہ یہ کہ جن بزرگانِ دین کا جن میں کہ علماء بھی تھے قلندر لقب ہوگیا۔ چنانچہ حضرت قلندر صاحب صاحبِ مزار بھی عالم تھے۔ عوام ان کی نسبت اس لفظ کو سن کر یہ سمجھتے ہیں کہ معاذ اللہ یہ حضرات بھی ایسے ہی ہونگے کہ نہ داڑھی نہ مونچھ نہ نماز نہ روزہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ حاشا وکلا یہ حضرات نہایت متبع سنت اور پابند شریعت تھے۔ اور کوئی بزرگ بھی ایسے نہیں ہوئے جنھوں نے اتباع سنت نہ کیا ہو۔ حتیٰ کہ اگر غلبہ حال سے کبھی اتباع میں کچھ کمی بھی ہوگئی ہے۔ تو اپنی اس حالت کو ناقص سمجھا ہے۔ اور کبھی اس پر اصرار نہیں کیا۔ نہ کہ نعوذ باللہ اس کو قصداً اختیار کرتے۔ غرض یہ بالکل تہمت ہے۔ کہ بعض بزرگوں کا طریق خلافِ شریعت بھی رہا ہے۔ سب بزرگوں کا ایک ہی طریق رہا ہے۔ اور وہ طریق شریعت ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کل حادثة الشریعة فھی زندقة، یعنی جس حال یا جس مقال کو شریعت رد کرے وہ بالکل الحاد اور زندقہ ہے۔ حضرت خواجہ عبداللہ انصاری فرماتے ہیں۔ اگر بر ہوا پری مگسے باشی بر آب روی خسے باشی دل بدست آر کہ کسے باشی۔ اگر بزور کرامت ہوا پر بھی اڑو گے تو کیا ہے۔ گویا مکھی ہو جاؤ گے۔ کہ وہ بھی تو ہوا میں بلاتکلف اڑتی ہے۔ پانی پر چلو گے تو یوں سمجھو کہ ایک تنکا ہوگئے۔ کیونکہ وہ بھی تو پانی کی سطح پر بہتا ہوا جاتا ہے۔ ہاں اپنے دل کو قابو میں کرو۔ تب انسان بنو گے۔ اور اسی قسم کے بہت سے اقوال ہیں میری کتاب تعلیم الدین میں جمع ہیں اس میں دیکھ لیجئے۔

اعمال سے بیزاری

حضرت جنید رح سے کسی نے کہا کہ ایک قوم ہے جو یہ کہتی ہے نحن وصلنا فلاحاجۃ لنا الی الصلوٰۃ والصیام ہم

واصل ہو گئے ہیں لہذا ہمیں حاجت نہیں رہی نماز کی اور نہ روزہ کی۔ حضرت جنید رح نے اس کے جواب میں فرمایا صدقوا فی الوصول ولکن الی سقر یہ تو وہ سچ کہتے ہیں کہ واصل ہو گئے ہیں لیکن جہنم واصل ہوئے ہیں۔ خدا واصل نہیں ہوئے۔ پھر ارشاد فرمایا ولو اعشت الف عام لما ترکت من اورادی شیئا الا بعذر شرعی یعنی اگر ہزار برس بھی میں زندہ رہوں تب بھی نماز تو بڑی چیز ہے کیونکہ فرض ہے۔ وظیفے جو محض مستحب ہیں بلکہ بعض مستحب کے درجہ میں بھی نہیں یہ بھی کبھی نہ چھوڑ دوں۔ الا بعذر شرعی۔ ہاں کوئی عذر شرعی لاحق ہو جاوے تو مجبوری ہے۔ ورنہ کوئی وظیفہ تک بھی کبھی نہ چھوڑ دوں چنانچہ حضرت جنید اخیر عمر تک ہاتھ میں تسبیح رکھتے تھے۔ دیکھئے وظیفہ تو وظیفہ تسبیح رکھنا تک بھی عمر بھر نہ چھوڑا۔ حالانکہ تسبیح کا رکھنا نہ سنت نہ مستحب کچھ بھی نہیں۔ نہ موقوف علیہ کسی وظیفہ کا نہ کسی وظیفہ کے لئے شرط۔ نہ منتہی ہو جانے کے بعد حضرت جنید کو اس کی حاجت باقی رہی تھی۔ کیونکہ مبتدی کے لئے تو خیر وہ آلۂ تذکر بھی ہو سکتی ہے۔ منتہی تو تذکر میں راسخ ہو جاتا ہے اسی لئے منتہی کی نشان میں لکھا گیا ہے۔ خلوت وچلہ بر دلازم نماند مگر اس پر بھی حضرت جنید رح نے اس اپنی ابتداء کی حالت کو بھی نہ چھوڑا۔ کسی نے عرض بھی کیا کہ حضرت اب تو آپ منتہی اور واصل کامل ہو چکے۔ اب آپ کو ہر وقت ہاتھ میں تسبیح لئے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ فرمایا ارے اس تسبیح ہی نے تو مجھے واصل بنایا ہے اور اس درجہ تک پہنچایا ہے۔ پھر کیا اب اس رفیق کو چھوڑ دوں۔ اسی کی بدولت تو یہاں تک پہونچے کیا اسی کو رخصت کر دوں۔ اسی نے تو محبوب تک پہونچایا ہے۔ تو پھر یہ بڑی ناشکری ہے۔ کہ آج اس کو جواب دیدوں۔ اللہ اکبر کیسے تھے یہ حضرات جناب یہ ائمہ طریق ہیں۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ناواقف تھے یا خشک ملا تھے۔ یہ لوگ بڑے بڑے عارف کامل اور عاقل گزرے ہیں۔ ان کے یہ اقوال و افعال ہیں۔

کرامت حضرت جنیدؒ کی خدمت میں ایک شخص دس برس رہا۔ چلتے وقت عرض کیا کہ حضرت میں نے اتنی مدت خدمت میں قیام کیا لیکن کبھی کوئی کرامت آپ کی نہیں دیکھی۔ میں نے سنا تھا کہ آپ بہت بڑے کامل ہیں اسی لئے خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ کچھ فیض حاصل کرونگا۔ مگر اتنی مدت قیام کو گزر گئی۔ کوئی کرامت آپ سے کبھی صادر نہ ہوئی۔ یہ سنکر آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ جوش میں آ کر فرمایا کہ اچھا یہ بتلا جنید سے تو نے اس عرصہ میں کوئی فعل سنت کے خلاف ہوتے بھی کبھی دیکھا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ یہ بات تو نہیں دیکھی۔ اس پر آپ نے جوش میں آ کر فرمایا ارے پھر اس سے بڑھکر جنیدؒ کی اور کیا کرامت ہو گی کہ اس نے دس برس تک اپنے خدا کو ایک لمحہ کے لئے بھی ناراض نہیں کیا اس سے بڑھکر اور کیا کرامت تو جنید کی دیکھنا چاہتا ہے۔ واقعی اس سے بڑھکر کیا کرامت ہو سکتی ہے۔ حقیقی کرامت تو یہی ہے۔ بڑی کرامت تو استقامت ہے۔ الاستقامۃ فوق الکرامۃ اسی واسطے خدا تعالیٰ نے یہ دعا تعلیم فرمائی ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم اور صراط اہل الکرامت نہیں فرمایا۔ خوب سمجھ لو شریعت کا اتباع کسی حال میں متروک نہیں۔ سب بزرگوں کا اس پر اتفاق ہے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی طریق چشتیہ کے کتنے بڑے شیخ اور صاحب حال و قال درویش ہیں انھیں کے مکتوبات کو دیکھ لو۔ کوئی مکتوب شرح کی تاکید اور ترغیب سے خالی نہیں۔ غرض یہ طریقہ تھا بزرگوں کا تو یہ معنی قلندر کے بالکل گھڑے ہوئے ہیں کہ نہ نماز ہو۔ نہ روزہ۔ نہ داڑھی ہو نہ مونچھ۔ غرض دراصل

صرف دو اصطلاح صحیح ہیں۔ جن کی حقیقت کی تفصیل میں پہلے عرض کر چکا ہوں ایک کتابی اصطلاح ہے ایک زبانی۔ ایک کتاب میں ہے اور ایک اگرچہ کتاب میں نہیں۔ لیکن مستند حضرات کی زبان پر ہے۔ چنانچہ حضرت عراقی نے بھی اپنے شعر میں اس دوسری ہی اصطلاح کو لیا ہے۔

عمل و محبت

اس اصطلاح میں خلاصہ طریق قلندر کا یہ ہے کہ وہ جامع ہوتا ہے۔ اعمال اور محبت کا عمل اور محبت کے تفاوت کی ایسی مثال ہے۔ جیسے ریل گاڑی کا بدون بھاپ کے ٹھیلنے سے چلنا اور جیسے بھاپ سے چلنا۔ اگر انجن میں بھاپ نہیں ہے۔ تو ریل ڈھکیلنے سے بھی چلیگی تو ضرور مگر کتنی زیادہ سے زیادہ دو چار چھ یا آٹھ دس میل اور وہ بھی بمشکل۔ اور اگر انجن میں بھاپ ہے تو بس چھوٹتے ہی اڑ گیا ساری گاڑیوں کو لیکر ہوا کی طرح۔ ولایتی ڈاک کی رفتار نہیں دیکھی۔ آخر اس میں کیا چیز زیادہ ہے۔ اس میں اور ایک ٹھیلہ گاڑی میں جس کو مزدور چلاتے ہیں۔ کیا فرق ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ ایک میں بھاپ ہے اور ایک میں بھاپ نہیں۔ ورنہ پہیے مشین گاڑیاں سب چیزیں ویسی ہی ہیں۔ مگر فرق کیا ہے۔ دونوں میں صرف بھاپ کا فرق ہے۔ اگر ولایتی ڈاک میں بھی بھاپ نہ رہے تو وہ بھی ٹھیلہ ہے۔ تو عمل مثل گاڑی کے ہے۔ اور محبت گویا بھاپ ہے جو بمنزلہ گاڑی کی روح کے ہے۔ تو اصل چیز ریل میں بھاپ ہی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پہیے توڑ کر رکھدو۔ اگر کہیں پہیے توڑ کر رکھدے تو بھاپ کا نہ ہونا تو خیر اتنا مضر بھی نہیں لیکن ایسی حالت میں بھاپ کا ہونا ہی بس غضب ہے۔ دیکھو ریل کبھی پٹری پر سے اترتی ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ہاتھوں سے ٹھیلتے ہوئے لئے جا رہے ہیں زور کی

آندھی آئی یا کوئی اور سبب ہو گیا کہ پہیے لین سے اتر گئے اب چونکہ اسوقت وہ بھاپ کے زور سے نہیں چل رہی ہے اس لیے لین سے بھی اتر گئی تو زمین کے اوپر ہی چلنے لگے گی اگر زمین سخت ہوئی ورنہ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ کھڑی ہو رہے گی۔ اور اگر کہیں خدانخواستہ ایسا ہوا کہ بھاپ کے زور میں اڑی چلی جا رہی تھی کہ پہیہ لین سے اتر گیا تو بھاپ کی یہ برکت ہوئی کہ پہیے زمین کے اندر گھس گئے پرزے ٹکڑے ہو گئے ڈرائیور اور سواریاں سب ہلاک ہو گئیں۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ تو بس بھاپ موجود ہونے کی صورت میں اگر یہ لین پر رہی تب تو مسافت کو نہایت سہولت اور امن وعافیت اور تیزی کے ساتھ قطع کرتی رہیگی اور اگر کہیں لین کو چھوڑ دیا تو واللہ قیامت برپا ہو جاویگی۔ مشین کا بھی گاڑیوں کا بھی چلانے والے کا بھی مسافروں کا بھی سب کا تہس نہس ہو جاویگا۔ تو اس مثال میں گویا تین حالتیں ہوئیں ایک تو یہ کہ بھاپ نہیں ہے۔ لیکن لین پر ہے۔ اس صورت میں رفتار ضرور آہستہ ہو گی لیکن خیر کوئی خطرہ بھی نہیں۔ دوسری حالت یہ ہے کہ بھاپ تو اس میں ہے لیکن لین پر نہیں ہے۔ یہ بس قیامت کا سامنا ہے۔ اور ایک حالت ہے۔ نور علی نور۔ وہ یہ کہ بھاپ بھی ہو اور لین پر بھی ہو۔ سبحان اللہ یہ ہے البتہ لطف۔ تو اے صاحبو جس نے اپنی ریل میں بھاپ تو پیدا کر لی۔ لیکن اس کو لین پر سے اتار دیا واللہ وہ نہایت خطرناک حالت میں ہے اور وہ بھاپ کیا ہے وہ بھاپ ہے محبت۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور لین کیا ہے۔ صراط مستقیم شریعت کی۔ یعنی جس نے محبت تو پیدا کر لی لیکن اعمال شریعت کو رخصت کر دیا۔ وہ قطع طریق تو کیا کرتا اور الٹا اس نے اپنے آپکو ہلاکت باطنی میں ڈالدیا۔ اور جس نے محبت تو پیدا نہیں کی لیکن عمل شریعت پر کرتا رہا تو اس کی مثال

ایسی ہے جیسے بلا بھاپ کی ریل کہ ٹھیل رہے ہیں اول تو رفتار نہایت سست پھر جہاں ٹھیلنا چھوڑ دیا بس رک گئی۔ اس لئے یہ بھی کچھ نہیں لے صاحب عمل کو اور محبت کو دونوں کو جمع کرلو۔ یہ البتہ ہو گی وہ ریل جسمیں بھاپ بھی ہے۔ پہیئے بھی ہیں۔ اور لین پر بھی ہے۔ پھر دیکھو کیسی جلدی مسافت قطع ہوتی ہے تو میں نے ریل کی مثال میں جو یہ کہا تھا کہ بھاپ اصل چیز ہے۔ کہ اصل چیز ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ فقط محبت کافی ہے۔ عمل کی حاجت نہیں بلکہ بھاپ کے اصل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ پہیوں کی تیزی کا ذریعہ بھی ہے بغیر اس کے رفتار میں تیزی ممکن ہی نہیں۔ لیکن اگر سرے سے پہیئے ہی ندارد ہوں تو نری بھاپ کیا کر سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہیں کے وہیں سی سی بھک بھک ہوتی رہے اسی لئے جس میں محض جوش و خروش ہے۔ اس میں سوائے اس کے کہ حق حق اور الا اللہ الا اللہ کے نعرے لگا لئے اور بھی کچھ ہے۔ نفع کیا اس سے۔ غل شور تو بہت مگر ہیں وہیں جہاں پہلے تھے۔ تو نفع کیا اس جوش و خروش سے یہ جوش و خروش تو ایسا ہی ہے جیسا اس ریل کا جس کے انجن میں آگ بھی دہک رہی ہے بھاپ بھی بھری ہوئی ہے مگر کسر ہے تو کیا کہ پہیئے ٹوٹ گئے ہیں تو وہ بیچاری سوائے اس کے کہ کھڑی دھواں دیئے جائے اور ٹیں ٹاں ٹیں ٹاں کئے جاوے اور کیا کر سکتی ہے۔ جہاں صبح تھیں حضرت وہیں شام۔ اور جو گاڑی بے بھاپ کی چلی جا رہی ہے۔ اس میں غل و شور تو بہت نہیں مگر راستہ آناً فاناً قطع ہو رہا ہے۔ کاش جس گاڑی میں بھاپ تھی پہیئے بھی درست ہوتے اور لین پر بھی ہوتی تب لطف تھا۔ کہ ایک ساتھ کلکتہ جا کر دم لیتی اور اب تو نری بھاپ بالکل بیکار ہے۔

تو محبت کو جو میں نے اصل کہا ہے اسکے یہ معنی ہیں کہ وہ اعمال کی تکمیل کا

ارادہ بلکہ خود اعمال کا بھی ذریعہ ہے کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ بدون محبت کے اعمال کا صدور بھی ممکن نہیں۔ حتیٰ کہ محبت ضعیف یعنی محبت کا ادنیٰ درجہ وہ ہے جس کو ارادہ کہتے ہیں اور یہ مسلم مسئلہ فلسفہ کا ہے کہ بلا ارادہ کے کوئی عمل وجود میں آہی نہیں سکتا۔ ہر عمل کے لئے صدور سے قبل ارادہ کا متعلق ہونا شرط ہے۔ تو محبت کا ادنیٰ درجہ ارادہ ہوا۔ مثلاً ہم نے جب جانا چاہا اور ارادہ کیا تو محبت ضعیف متحقق ہو گئی۔ کیونکہ چاہنے ہی کو تو محبت کہتے ہیں گو تڑپ نہ ہو۔ یہ تو ادنیٰ درجہ کی محبت ہوئی جس کے بدون ادنیٰ درجہ کا عمل ہی صادر نہیں ہو سکتا۔ اور اعلیٰ درجہ کی محبت یہ ہے کہ ؎

تو درو گم شو وصال این ست و بس ۔۔۔ گم شدن گم کن کمال این ست و بس

ہائے کیا اچھا مضمون ہے ؎

تو درو گم شو وصال این ست و بس ۔۔۔ گم شدن گم کن کمال این ست و بس

گویا فنا کا درجہ جس کو کہتے ہیں وہ اعلیٰ درجہ ہے محبت کا یعنی تمام تعلقات

فنا غیر اللہ اس قدر مغلوب ہو جائیں کہ کوئی نہ معبود ہونے میں شریک رہے جو حاصل ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کا اور نہ مقصود ہونے میں شریک رہے جو حاصل ہے۔ فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا کا اور نہ سالک کی نظر میں موجود ہونے میں شریک رہے جو حاصل ہے۔ کل شیٔ ھالک الا وجھہ کا جب اسم فاعل کو معنی حال پر محمول کیا جاوے۔ کما ھو احد الوجوہ فی التفسیر پس اول ادنیٰ درجہ کی محبت پیدا ہوئی اس سے عمل ادنیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ پھر اس عمل

کی برکت سے محبت کا اس سے قوی درجہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس سے پہلے درجہ سے قوی عمل پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے تو ترتیب یوں ہوئی کہ اول محبت ضعیف سی ہوتی ہے جس کو ارادہ کہتے ہیں۔ اس سے ایک عمل پیدا ہوا۔ اور اس کے ساتھ اور بھی مؤیدات کو مدد کے لئے جمع کر لیا۔ تو اس محبت میں اب ترقی ہوئی اس عمل کی برکت سے۔ پھر اسی محبت زائد سے جو عمل پیدا ہوا اس سے اور محبت پیدا ہوئی پھر اس محبت سے اور عمل پیدا ہوا۔ پھر اس عمل کی اور برکت ہوئی۔ پھر اس سے اور عمل پیدا ہوا۔ خلاصہ یہ کہ دونوں میں یہ ترتیب رہتی ہے کہ اول محبت ضعیف پھر عمل ضعیف پھر محبت زائد پھر عمل زائد۔ پھر اور محبت زائد پھر اور عمل زائد۔ غرض ساری عمر یہ دونوں سلسلے چلتے رہتے ہیں۔ کہ ہر عمل سے محبت اور ہر مزید محبت سے مزید عمل غرض نہ اس سے استغنا نہ اس سے ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہو گئی تو بس سارا سلسلہ منقطع تو حضرت یہ تو ساری عمر کا دھندا ہے کہ محبت پھر عمل پھر محبت وعلیٰ ہذا۔ نہ اس سے کبھی فارغ نہ اُس سے کبھی مستغنی۔ یہ ہے گویا حاصل اس طریق جامع بین المحبت والعمل کا جس کو حضرت عراقی نے اپنے شعر میں طریق قلندر سے تعبیر کیا ہے غرض ذہن میں یہ مضمون آیا تھا جو حضرت عراقی کے اس شعر میں مذکور ہے۔ جس کو میں نے اس وقت بیان کرنے کے لئے اختیار کیا ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ کیا کوئی آیت بھی اس مضمون کی ہے۔ سو الحمد للہ قرآن کی یہ آیت بھی ذہن میں آگئی۔ جس میں یہ ہی مضمون موجود ہے۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ تصوف کے اصول صحیحہ قرآن و حدیث میں سب موجود ہیں۔ اور یہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف قرآن و حدیث میں نہیں ہے بالکل غلط ہے۔ یعنی غالی صوفیوں کا بھی یہی خیال ہے اور خشک

علماء کا بھی کہ تصوف سے قرآن و حدیث خالی ہیں ۔ مگر دونوں غلط سمجھے خشک علماء تو یہ کہتے ہیں کہ تصوف کوئی چیز نہیں ۔ یہ سب واہیات ہے ۔ میاں بس نماز روزہ قرآن حدیث سے ثابت اسی کو کرنا چاہیئے ۔ یہ تصوف صوفیوں نے کہاں کا جھگڑا نکالا ہے ۔ تو گویا ان کے نزدیک قرآن و حدیث تصوف سے خالی ہیں ۔ اور غالی صوفی یوں کہتے ہیں کہ قرآن حدیث میں تو ظاہری احکام ہیں ۔ تصوف علم باطن ہے ۔ ان کے نزدیک نعوذ باللہ قرآن حدیث ہی کی ضرورت نہیں ۔ غرض دونوں فرقے قرآن و حدیث کو تصوف سے خالی سمجھتے ہیں ۔ پھر اپنے اپنے خیال کے مطابق ایک نے تو تصوف کو چھوڑ دیا اور ایک نے قرآن حدیث کو جنہوں نے قرآن و حدیث کو چھوڑ دیا ۔ انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے ۔ کہ قرآن حدیث تو محض ظاہری انتظام کی چیزیں ہیں درویشی کا ان سے کیا علاقہ میاں درویشی تو چیز ہی اور ہے ۔ جو باطن سے تعلق رکھتی ہے ۔ اے صاحبو! کیا غضب کرتے ہو ۔ خدا سے ڈرو اس کے متعلق میری ایک مستقل کتاب بھی ہے ۔ اول تو الحمد للہ یہ بات کہ قرآن حدیث سارا لبریز ہے ۔ تصوف سے ہر تصنیف سے ظاہر ہے ۔ لیکن میں نے اس مضمون پر دو مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں ۔ ایک تو حقیقت الطریقہ جو مدت ہوئی مکمل ہو کر شائع ہو چکی ہے ۔ جس میں مسائل تصوف کی حقیقت احادیث سے ثابت کی گئی ہے ۔ اب ایک رسالہ مستقل اور بھی آجکل لکھ رہا ہوں ۔ جس میں صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ تصوف کے مسائل قرآن مجید سے بھی ثابت ہیں ۔ پاؤ قرآن یعنی آٹھ پارہ تو ہو گئے ہیں ۔ بائیس پارہ اور باقی ہیں ۔ خدا مدد فرمائے ۔ یہ رسالہ دراصل عربی میں ہے ۔ پھر خیال ہوا کہ ساتھ ساتھ اردو میں بھی ترجمہ ہوتا جائے تو اچھا ہے چنانچہ ہو رہا ہے ۔ اور وہ جو رسالہ ہے ۔ حقیقت الطریقہ وہ تو اصل ہی سے اردو میں

ہے تو ان دونوں کتابوں سے معلوم ہو گا کہ قرآن حدیث لبریز ہے تصوف سے اور واقعی وہ تصوف ہی نہیں جو قرآن حدیث میں نہ ہو۔ غرض جتنے صحیح اور مقصود مسائل تصوف کے ہیں وہ سب قرآن میں موجود ہیں کوئی آیت شاید خالی ہو جس میں ایک آدھ مسئلہ تصوف کا مذکور نہ ہو چنانچہ اسی آیت کو دیکھئے جو اس وقت تلاوت کی گئی ہے۔ اس میں بھی تصوف موجود ہے فرماتے ہیں یاایھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ الی آخر الآیات۔ حق سبحانہ تعالیٰ اپنے دین کے محفوظ ہونیکی خبر دے رہے ہیں۔ کوئی یہ ناز نہ کرے کہ دین کا کام ہماری وجہ سے چل رہا ہے۔ اے ایمان والو! اگر تم میں سے کوئی نعوذ باللہ دین سے پھر جاوے تو سرکاری کام بند نہ ہو گا۔ چاہے سارے ٹھیکہ دار اور مزدور استعفا دیدیں۔ جیسے دنیا میں سارے عملے والے دفتر کا کام چھوڑ دیں تو حکام کو عین وقت پر پریشانی اور تشویش ضرور ہوتی ہے۔ اس واسطے کہ جب عملے والے سب مخالف ہو گئے تو اب کام کس سے لیں۔ اسی طرح شبہ یہ ہو سکتا تھا کہ اگر نعوذ باللہ سب کے سب مسلمان مرتد ہو جائیں تو شاید اللہ میاں کو بھی سوچ ہو جیسے آج ہی ایک حکایت میں بیان کر رہا تھا کہ ایک نابینا حافظ نے مجھسے بیان کیا کہ ہم چار آدمی نماز پڑھ رہے تھے۔ تین مقتدی اور ایک امام۔ امام صاحب کا وضو ٹوٹا انھوں نے مجھے خلیفہ بنایا اور خود وضو کرنے چلے گئے۔ اب ایک امام اور دو مقتدی رہ گئے۔ مقتدیوں میں سے ایک نے دوسرے سے نماز کے اندر ہی چپکے سے پوچھا کہ ارے یہ کیا ہوا۔ بیچارے نے استخلاف امام کا مسئلہ کبھی سُنا نہ تھا۔ دوسرا نصیحت کرتا ہے کہ ارے چپ رہ یوں بھی ہوا کرے ہے (ہوا کرتا ہے) یہ بڑے بوجھ بجھکڑ تھے۔ اب امام صاحب کی سُنئے جو خلیفہ بنائے جانے کے لائق

سمجھے گئے تھے۔ آپ فرماتے ہیں ارے اب میں کسے نماز پڑھاؤں۔ یہ دو ہی تو مقتدی تھے۔ اور ان دونوں کی نماز بولنے سے فاسد ہو گئی۔ غرض اس نے بھی اپنی نماز تباہ کی تو دیکھئے ذرا سی بات میں سب کی نماز رخصت ہو گئی۔ یہاں کی نماز تو ایسی ہے کہ جب مقتدی نہ رہیں تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ اب میں نماز کسے پڑھاؤں اسی طرح اگر کسی بادشاہ سے ساری رعایا باغی ہو جائے تو اب وہ کس پر سلطنت کرے یہاں کے حکام تو ایسے ہیں کہ رعایا نے ہڑتال کر دی تو بس ان کی حکومت ندارد اللہ میاں کو بھی شاید کوئی نعوذ باللہ ایسا ہی سمجھتا تا۔ سو اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں یہ قصہ نہیں۔ دین سے پھر کر دیکھ لو۔ سب ایک دم سے باغی ہو جاؤ۔ اول تو تمہارے پھر جانے سے ہمارا کوئی کام اٹکتا نہیں اور واقعی اللہ میاں کا ہمارے ایمان اور نماز روزہ سے کیا نفع مگر خیر جیسا بھی کچھ کام ہو رہا ہے گو وہ بندوں کی ہی مصلحت کے لئے ہو رہا ہے۔ سو اس کے متعلق بھی خداوند تعالیٰ جل جلالہٗ وعم نوالہ فرماتے ہیں کہ کسی کے مرتد ہونے سے وہ بھی نہیں رک سکتا۔ یہی حاصل ہے اس آیت کا یاایھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ اے ایمان والو تم میں سے جو کوئی بھی اپنے دین سے پھر جاوے فسوف یاتی اللہ بقوم نزدیک ہی یعنی بہت جلد ایسی قوم کو اللہ میاں پیدا فرما دیں گے۔ جس کی ایسی شان ہو گی یحبھم ویحبونہ وہ اللہ میاں کو دوست رکھیں گے اور اللہ میاں ان کو دوست رکھیں گے۔ دیکھئے سوف کے ساتھ فرماتے ہیں جو تقریب کے لئے آتا ہے یعنی فوراً۔ اور واقعی انہیں کیا ضرورت ہے۔ کسی انتظام یا اہتمام کی۔ ایک لفظ کن سے مولوی، شیخ، غوث ابدال، قطب جو چاہیں بنا دیں۔ اور جس کو چاہیں بنا دیں۔

ایک حکایت چنانچہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے حضرت غوث اعظم کی ایک حکایت لکھی ہے ان کے خادم کی روایت ہے کہ ایک بار آخیر شب میں حضرت اُٹھے۔ خادم کہتے ہیں کہ میں سمجھا نماز تہجد کی تیاری کریں گے چنانچہ میں بھی اٹھا۔ تاکہ حضرت کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ ویسے حضرت کو اپنے اٹھنے کی اطلاع نہ ہونے دی۔ واقعی بزرگوں کی خدمت ہے بڑی مشکل۔ انھوں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ اطلاع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کوئی احسان جتلانا تھوڑا ہی تھا۔ اب تو اگر کوئی خدمت کرتے ہیں تو جتلا کر کرتے ہیں۔ حالانکہ ادب کی بات یہ ہے کہ خیال اور نگرانی تو رکھے۔ مگر خواہ مخواہ جا کر مزاحمت نہ کرے اور تنہائی میں مخل نہ ہو۔ خصوص اخیر رات میں تو بزرگ یہ چاہتے ہیں کہ نہ کوئی ہمیں وضو کیلئے پانی لاکر دے نہ استنجے کا ڈھیلہ لاکر دے بلکہ اس وقت تو یہ جی چاہتا ہے کہ کوئی سامنے بھی نہ آئے اپنے ہاتھ سے سب کام کریں کیونکہ وہ وقت ہی ایسا ہوتا ہے ؎

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے | کہ یارے برخور دار از وصل یارے

بس اسوقت یہ جی چاہتا ہے کہ بالکل تنہائی کا عالم ہو۔ بلکہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اپنے وجود کو بھی جی چاہتا ہے کہ یہ بھی نہ رہے۔ خود اپنا وجود بھی حجاب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت قلندر رح جو اس موقع کے صاحب مزار ہیں۔ اسی مضمون کو اپنے ایک شعر میں بیان فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم

لیجیے اپنی آنکھ پر بھی غصہ ہے یہ کیوں دیکھتی ہے میں ہی تجھے دیکھتا اور ؎

گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

ہیں ہی تیرا کلام سنتا پہ کان کیوں سُنیں۔ واقعی صاحب یہ بھی حالت ہوتی ہے۔ حضرت عارف شیرازی بھی اس مضمون کو فرماتے ہیں اور وہ تو قسم کھا رہے ہیں ؎

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود　　　　کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف روئے

آنکھ پر بھی رشک آتا ہے۔ سو وہ تو وقت ہی ایسا ہوتا ہے۔ کہ اپنے آپ کو بھی مٹانے کو جی چاہتا ہے اور اگر کوئی اپنا خادم خاص بھی اس وقت پاس کھڑا ہو تو وہ بھی پسند نہیں آتا۔ اسی واسطے مؤدب خدام یہ کرتے ہیں کہ پاس کو تو لگے رہے لیکن اس طرح کہ اپنی موجودگی کی تو خبر نہ ہونے دی لیکن جب دیکھا کہ کوئی کام مخدوم کے قابو کا نہیں ہے فوراً حاضر ہو کر شریک ہو گئے اور بعد فراغت پھر غائب۔ چنانچہ اس خادم نے بھی ایسا ہی کیا کہ خفیہ طور پر حضرت غوث پاک کے پیچھے پیچھے لگا رہا۔ ادھر حضرت نے کچھ توجہ بھی نہیں کی کہ میرے ساتھ کوئی اور شخص تو نہیں ہے۔ غرض حضرت اٹھ کر خانقاہ سے نکل کر سیدھے شہر پناہ کے پھاٹک پر پہونچے حضرت شیخ کی برکت اور کرامت سے شہر پناہ کا قفل خود بخود کھل کر گر گیا۔ حضرت کواڑ کھولکر شہر سے باہر ہو گئے۔ چند ہی قدم چلے تھے کہ ایک بڑا بھاری شہر نظر پڑا حالانکہ بغداد کے قریب کوئی اتنا بڑا شہر کہاں۔ اب خادم کو بڑی حیرت کہ یا اللہ میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ لیکن بولے نہیں۔ چپ چاپ ساتھ چلتے رہے۔ یہاں تک کہ اس شہر کے اندر داخل ہو کر ایک مقام پر پہونچے۔ وہاں ایک مکان تھا اس کے اندر داخل ہوئے اس میں چند آدمیوں کا ایک مختصر سا مجمع تھا اور ایک مسند پر تکیہ لگا ہوا تھا۔ جیسے کسی کی آمد کا انتظار ہو رہا ہو حضرت شیخ کو دیکھتے ہی وہ لوگ تعظیم کے لئے اُٹھے اور حضرت کو مسند پر بٹھایا۔ پھر اشاروں سے کچھ عرض معروض کی جس کو حضرت ہی سمجھے۔ خادم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کے بعد ایک طرف

سے آواز کراہنے کی آئی آہ آہ۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ آواز بند ہوگئی۔ پھر کچھ دیر بعد ایسی آواز آنے لگی جیسے پانی ڈالنے کی ہوتی ہے۔ پھر وہ بھی بند ہوگئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک حجرہ کھلا اور اس کے اندر سے ایک جنازہ نکلا۔ جس کے ہمراہ چند آدمی تھے ان میں ایک بوڑھے نورانی شکل کے بزرگ بھی تھے۔ حضرت شیخ کے سامنے جنازہ رکھا گیا۔ حضرت نے نماز جنازہ پڑھائی پھر وہ لوگ جنازہ کو لے گئے۔ ادھر یہ لوگ جنہوں نے حضرت شیخ کا استقبال کیا تھا۔ پھر آکر سب حضرت کے گرد بیٹھ گئے۔ اور اسی طرح اشاروں میں دوبارہ پھر کچھ عرض کیا اس پر حضرت شیخ اسی وقت گردن جھکا کر مراقب ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک زنار دار شخص عیسائی لباس پہنے ہوئے حاضر ہوا۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے اس کا زنار توڑ دیا اور کلمہ شریف پڑھا کر اس کو مسلمان کیا پھر حاضرین سے ارشاد فرمایا کہ یہ ہے پھر حضرت اس جگہ سے اپنے مکان پر لوٹ آئے خادم کو اسی ادھیڑبن میں اور حیرت میں صبح ہوگئی کہ اے اللہ یہ کیا قصہ ہے۔ یہ حضرت کی خدمت میں کچھ سبق بھی پڑھتے تھے۔ کیونکہ پہلے درویش اکثر عالم بھی ہوتے تھے تو چونکہ یہ خادم محض مرید نہ تھے بلکہ شاگرد بھی تھے۔ اس لئے دل کھلا ہوا تھا۔ کیونکہ یہ علاقہ شاگردی استادی کا بے تکلفی کا ہوتا ہے بہ خلاف پیری مریدی کے تعلق کے کہ اس میں اتنی بے تکلفی نہیں ہوتی۔ چنانچہ انھوں نے رات کے واقعہ کے متعلق دریافت کیا کہ حضرت یہ کیا معاملہ تھا۔ مجھے اس قدر حیرت ہے کہ میرے حواس درست نہیں فرمایا کہ وہ شہر موصل تھا جو بغداد سے بہت دور ہے لیکن حق تعالیٰ نے میرے لئے اسے بالکل قریب کر دیا۔ اور طے ارض ہوگیا۔ اور وہ مجمع جنھوں نے میرا استقبال کیا ابدال تھے اور ان ہی میں سے ایک ابدال قریب مرگ تھے۔ جن کے کراہنے کی آواز

آرہی تھی اور وہ بوڑھے نورانی شکل والے بزرگ جو جنازہ لیکر نکلے تھے۔ وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ اس جماعت نے مجھسے باطنی طور پر مجھکو اطلاع دیکر دریافت کیا کہ اس کی جگہ کون ابدال مقرر کیا جائے۔ میں نے حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی۔ ارشاد ہوا کہ قسطنطنیہ کے گرجا میں اسوقت ایک نصرانی صلیب کو پوج رہا ہے اس کو کر دیا جائے۔ چونکہ کافر تو کسی عہدہ باطنی پر ہو نہیں سکتا جیسا آجکل لوگ سمجھتے ہیں کہ چمار چوڑھے بھی صاحب خدمت ہوتے ہیں۔ کیا اللہ میاں کو خدمت کیلئے مسلمان نہیں ملتے جو چوڑھوں چماروں سے کام لیں۔ سبحان اللہ اچھی قدر کی ولایت کی خوب سمجھ لو کہ کافر ہرگز ولی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی کافر کو ولی کرنا بھی ہوتا ہے تو اول اس کو اسلام کی توفیق دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس نصرانی کے معاملہ میں بھی یہ ہی ہوا۔ کہ قسطنطنیہ سے ایک دم میں زمین کی طنابیں کھینچکر اس کو حضرت شیخ کی خدمت میں پہونچایا گیا۔ اور حضرت شیخ کی توجہ کی برکت سے کلمہ پڑھنے کے ساتھ ہی وہ رتبۂ ابدالیت پر پہونچ گیا۔ حالانکہ نہ کوئی مجاہدہ کیا نہ ریاضت۔ اسی کو تو کہتے ہیں حضرت مسعود بک سے

مرشد چو کامل است چلہ شد۔ نشد نشد۔ لیکن یہ محض شاذ و نادر ہے۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے ورنہ چکی ہی پیسنا پڑتی ہے۔ جو کچھ ملتا ہے چکی ہی پیسنے سے ملتا ہے۔ خدا کے واسطے کہیں اس شاذ و نادر ہی پر نہ بیٹھ رہنا۔ شاذ و نادر پر بیٹھے رہنا تو ایسا ہے جیسے کوئی عورت اس بنا پر بے نکاح بیٹھی رہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے بھی تو بے مرد کے اولاد ہو گئی تھی۔ یا کوئی مرد صاحب اس بھروسہ پر کسی عورت کو نکاح کے لئے تلاش نہ کریں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے حضرت حوا علیہا السلام بدون عورت پیدا ہو گئی تھیں۔ میری پسلی سے بھی ایک حوا (چھوٹی ہ سے) نکل آئے گی۔

یہ دونوں بالکل احمق ہیں ۔ میاں خدا نے ایک دفعہ یوں بھی کر دیا کہ بلا نکاح کے عورت کو اولاد دیدی اور ایک مرتبہ یہ بھی قدرت دکھلادی کہ مرد کی پسلی سے عورت پیدا کر دی اب یہ تو نہیں کہ روز روز ایسا ہی ہوا کرے ۔ اور لوگ اس شاذ ونادر ہی کے منتظر بیٹھے رہیں ۔ نہ عورت مرد سے نکاح کرے نہ مرد عورت کی فکر کرے آجکل یہ عجب واہیات ہے کہ طالبین شاذ ونادر پر بیٹھے رہتے ہیں کہ پیر ایک نظر کر دیگا تو بس بیڑا پار ہو جائیگا اور خود کچھ کرتے کراتے نہیں ۔ کیوں جی وہ تمہارے باوا کا نوکر تو ہے نہیں ۔ اگر نظر نہ کرے تو کیا کر لوگے ۔ یہ کیا بیوقوفی کی بات ہے ۔ نیز اس کے قبضہ کی بھی تو بات نہیں اگر کسی کے اختیار میں ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کے قلب میں ضرور اسلام ڈالدیتے بھائی بلا کام کئے بھی کہیں کامیابی ہوتی ہے ۔ اصل طریق تو یہ ہی ہے کہ ؎

کار کن کار بگذار از گفتار　　کاندریں راہ کار باید کار

؎ قدم باید اندر طریقت نہ دم　　کہ اصلے ندارد دم بے قدم

نری آرزوؤں اور ہوسوں سے کام نہیں چلتا ۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال　　صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

تو کیا ہوتا ہے نری آرزوؤں اور تمناؤں سے کام تو کام کرنے سے ہی ہوتا ہے اور کام بھی ایسا جس میں کام ہی کو ثمرہ سمجھا جاوے ۔ گو اور کوئی ثمرہ نہ ملے ۔ جب کام اور ثمرہ ایک ہی چیز ہے تو بدون کام کئے ثمرہ کا حصول چہ معنی جب کام نہیں تو ثمرہ بھی نہیں کیونکہ ثمرہ تو وہی کام تھا ۔ حضرت سرمد رحمت اللہ علیہ اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد　　یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن بہ رضائے دوست می باید داد　　یا قطع نظر ز یار می باید کرد

ثمرات میں ناکامی کی شکایت کرنے والوں سے کہتے ہیں کہ میاں ان حکایات شکایات کے دفتر کو تو طے کرو۔ زیادہ قیل وقال کی حاجت نہیں۔ ہم تو ایک مختصر سی بات کہتے ہیں کہ بس ان دو کاموں میں سے ایک کام کو اختیار کر لو۔ یا تو یہ کرو کہ جس بات میں محبوب حقیقی راضی ہو خواہ وہ ناکامی ہی کیوں نہ ہو اس پر راضی رہو یعنی کام ہی کو ثمرہ سمجھو کیونکہ یہ تسلیم ورضا جب ہی ہو سکتی ہے۔ جبکہ عطائے حق کو کہ توفیق عمل ہے ثمرہ سمجھے اور اگر یہ پسند نہیں اور اس سے تم خفا ہوتے ہو تو بھائی سیدھی بات یہ ہے کہ پھر اپنے لیے کوئی دوسرا خدا ڈھونڈھ لو۔ اس خدا کو چھوڑ دو۔ یہ حضرت سرمد نے خوب دوٹوک بات کہی۔ واقعی یہ مجذوبوں والی ہی بات ٹھیک ہے کہ ؎

یاتن بہ رضائے دوست می باید داد ۔۔۔ یا قطع نظر زیار می باید کرد

غرض کام ہی کو مقصود سمجھکر اس میں لگا رہے کام کر کے بھی ثمرات کا انتظار نہ کرے نہ کہ بے کام کیے ثمرات کی توقع رکھے۔ ایں خیال ست ومحال ست وجنوں۔ بہرحال کام کرنا چاہیئے کہ ثمرات بھی حسب سنتہ اللہ کام ہی سے ملتے ہیں۔ لیکن کبھی خدا تعالیٰ اپنی یہ قدرت بھی دکھلا دیتے ہیں کہ بلا اسباب بھی مقصود کو پیدا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں بھی اپنی ایسی ہی قدرت کا بیان فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے فسوف یاتی اللہ یعنی تمہارے مرتد ہو جانے سے خدائی کام میں کچھ فتور واقع نہ ہوگا۔ جیسے کوئی یہ غلط قیاس کر لے کہ ساری رعایا کے باغی ہو جانے سے سلطنت کا کام تو نہیں چل سکتا۔ تو خدا کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ وہ کسی سے مجبور نہیں۔ ان کی ذات قادر مطلق ہے۔ دم میں جو چاہیں کر دیں فسوف یاتی اللہ بقوم عنقریب ایک ایسی قوم پیدا کر دیں گے جسکی شان ایسی ایسی ہوگی۔ آگے اس کی حالت کا بیان ہے یحبھم ویحبونہ الخ تو اس

موقع پر جس قوم کا ذکر فرمایا ہے وہ قوم ظاہر ہے کہ بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ہو گی۔ اسواسطے
کہ مقابلہ کے موقع پر سنا رہے ہیں کہ بجائے تمہارے ان کو تیار فرما دیں گے تو لازمی طور پر
وہ قوم ایسی ہونی چاہیئے جو ہر طرح کامل اور اعلیٰ درجہ کی ہو۔ تاکہ مرتد ہونے والوں کو
معلوم ہو جائے کہ ہمارے پھرنے ہٹنے سے کیا ہوا۔ ہماری جگہ دوسری قوم ہم سے بھی بڑھ
چڑھ کر اسلام میں داخل ہو گئی تو گویا اس قوم کا اعلیٰ درجہ کی صفات سے متصف ہونا
خود سیاق کلام سے ثابت ہوتا ہے۔ غرض جو صفات اس مقام پر مذکور ہونگی وہ نہایت
عظیم الشان اور قابل اعتبار ہوں گی۔ اب ان صفات کو سنیئے کہ وہ کیا ہیں سب سے
اول جو صفت بیان کی گئی وہ یہ ہے کہ یحبھم و یحبونہ یعنی خدا کو ان سے محبت ہو گی
اور ان کو خدا سے۔ دیکھیئے حضرت سب سے پہلے حق تعالیٰ نے یہی صفت بیان فرمائی کہ
وہ لوگ اہل محبت ہوں گے۔ اس تقدیم ذکر سے صفت محبت کا سب سے زیادہ مہتم
بالشان ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اسی سے میں نے استدلال کر کے یہ عرض کیا تھا کہ بس
دین میں محبت ہی اساس ہے۔ راس ہے۔ جڑ ہے۔ اصل ہے اور بنیاد ہے۔ جب
بات ہے تو اے صاحبو! آپ نے کیا کوشش کی اپنے اندر محبت پیدا کرنے کی۔ نمازی بھی
ہو گئے روزہ دار بھی ہو گئے حاجی بھی ہو گئے مگر محبت جو اصل چیز ہے آخر اس کی بھی کچھ
کوشش کی۔ کچھ بھی نہیں۔ کوشش تو کیا اور الٹا یہ کیا ہے کہ جو محبت کرنیوالے ہیں
ان پر ہنستے ہیں ان کو پاگل اور مجنوں اور نہ جانے کیا کیا خطاب دے رکھے ہیں۔ اور
ان کی بھی بڑی کوتاہی ہو گی اگر وہ پاگل اور مجنوں کا لقب سنکر برا مانیں۔ کچھ خبر بھی
ہے یہ لقب تو بہت بڑا ہے ارے یہ تو ایسا لقب ہے کہ اس کو سن کر تمہیں خدا کا شکر
کرنا چاہیئے نہ کہ برا مانو۔ کیونکہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مخالف بھی تمہارے اعلیٰ درجہ

کے محب خدا ورسول ہونیکی شہادت دینے لگے ۔ بات یہ ہے کہ مخالف یہ لقب اسی کو دیتے ہیں جو اعلیٰ درجہ کا محب ہو ۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ جو شخص اعلیٰ درجہ کا محب ہوتا ہے اس کے افعال عقل معاش اور دنیوی مصلحتوں کے خلاف ہونے لگتے ہیں اور یہی تو وجہ ہے کہ جو لوگ محض عقل معاش رکھتے ہیں وہی ایسے شخص کو مجنوں اور بیوقوف کہتے ہیں اور یہ لقب بہت پرانا ہے ۔

صحابہ چنانچہ کلام مجید اس پر شاہد ہے ۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے واذا قیل لھم اٰمنوا قالوا انؤمن کما اٰمن السفھاء دیکھئے حضرات صحابہ کو جو اعلیٰ درجہ کا ایمان رکھتے تھے منافقین نے نعوذ باللہ سفہاء کا لقب دے رکھا تھا کیونکہ وہ حضرات اپنے سب اعزہ واقربا کو چھوڑ کر اور مال ومتاع کو خیر باد کہہ کر ایمان لائے تھے جو بظاہر عقل معاش کے بالکل خلاف تھا ۔ اسی لئے منافقین کہتے تھے کہ ان کی عقل ماری گئی ہے ۔ کہ اپنا اتنا بڑا نقصان کر کے ایمان لائے ہیں ۔ یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے ۔ کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جسطرح یہ بیوقوف ایمان لے آئے ہیں ۔ تو دیکھئے ان احمقوں نے حضرات صحابہ کو بھی نعوذ باللہ بیوقوف بنایا ۔ اس زمانہ میں بھی یہی حال ہے ۔

ایک نو مسلم ہمارے قصبہ میں ایک شخص نو مسلم ہیں وہ پہلے بہت امیر کبیر گھرانے کے تھے ۔ جب وہ مسلمان ہو گئے تو ظاہر بات ہے کہ پھر ظالم لوگ بھلا وہ دولت وثروت ان کو کہاں دیتے ۔ بیچارے ہمارے بھائی کے ہاں دس بارہ روپے کے نوکر ہیں ۔ یا تو خود صاحب جائیداد تھے یا اب نوکری کرتے ہیں اور اپنا پیٹ پالتے ہیں ۔ مگر جس جگہ نوکر ہیں وہاں پر ہیں بہت عزت اور آرام کے ساتھ

جس جگہ کے رہنے والے ہیں وہاں ایک مرتبہ کسی کام سے ان کا جانا ہوا۔ وہاں ان کے عزیز و قریب سب ہی ہیں مگر اب ان سے کیا علاقہ۔ لہٰذا وہ جاکر کسی موقعہ پر ٹھہر گئے۔ ان کے عزیز و قریب سب ملنے آئے اور ان کی بڑی خاطر کی۔ وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ میں لیٹا ہوا تھا اور وہ لوگ بھی پاس بیٹھے تھے۔ وہ سمجھے کہ یہ سو رہا ہے لیکن میں جاگ رہا تھا۔ ایک بولا کہ ارے سنا ہے یہ بڑے آرام میں ہے۔ ایک شیخ کے یہاں کارندہ ہے۔ اس کی بہت بڑی حویلی ہے۔ نوکر چاکر گائیں بھینسیں سبھی کچھ ہے اور یہ سب پر حکومت کرتا ہے۔ بڑی عزت ہے۔ بڑے مزے میں ہے۔ دوسرا بولا کہ بھائی سب کچھ سہی مگر اس نے کی بہت کھوٹی بات (یعنی بُری بات) کہ اپنے عزیز قریب بیوی بچے سب چھوڑ دیئے اور مسلمان ہوگیا۔ لیجئے یہ اُن کو لقب ملا تو سمجھنے کی بات ہے کہ باپ بھائی جائداد بیوی سب کو چھوڑ دینا آسان کام نہیں انکی پہلی بیوی مسلمان نہیں ہوئی وہ اب بھی موجود ہے اور اب بھی کبھی کبھی جب ساس نندوں سے پریشان ہوتی ہے۔ اُن سے کہلا بھیجتی ہے کہ تم میری مدد نہیں کرتے۔ اب بھی اتنا بڑا ناز ہے۔ بہر حال انھیں بیوقوف اس بنا پر قرار دیا کہ عزیز و قریب سب کو چھوڑ دیا۔ اور ایمان کے مقابلہ میں کسی چیز کی پروانہ کی تو صاحب یہ شان ہوتی ہے اعلیٰ درجہ کے محب کی۔ اور یہ لقب اسکو ملتے ہیں۔

حضور رسول اکرمؐ

سب سے بڑھکر عاقل سید العقلاء حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضور کو بھی کفار نعوذ باللہ مجنوں کہتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جابجا ان کے یہ اقوال موجود ہیں ام یقولون بہ جنۃ ویقولون انہ لمجنون اور خدا تعالیٰ نے اس کی نفی فرمائی ہے۔ ما انت بنعمت ربك بمجنون۔ گو یہ احتمال بھی ہے کہ اور کچھ توبن نہ پڑتا تھا محض جلکر یہ کہدیتے ہوں کوئی اور منتشار

نہ ہو اس قول کا مگر یہ ظاہر کے خلاف ہے چنانچہ شاعر اور ساحر بھی تو کہتے تھے۔ تو وہ لوگ یہ تینوں لقب حضور پر اطلاق کرتے تھے۔ یعنی شاعر ساحر اور مجنون۔ اور شاعر اور ساحر کا منشاء ہمیں معلوم ہے چنانچہ میں ابھی عرض کرونگا۔ جب دو کا منشا معلوم ہے تو ظاہر یہ ہے کہ تیسرے لقب کا منشا بھی ضرور ہوگا۔ شاعر اور ساحر کہنے کا منشا سنیئے وہ ایسا ہے جیسا کسی نے کہا ہے۔ معشوق من آنست کہ نزدیک تو زشت است۔ شاعر اور ساحر اسلئے کہتے تھے کہ حضور کے کلام مبارک میں ایسا اثر تھا کہ جب کفار سنتے تھے تو ان کے خیالات میں عظیم الشان تبدیلی واقع ہو جاتی تھی۔ پس طرز بیان کی تاثیر کو تو شاعری اور مضمون کی تاثیر کو ساحری کہتے تھے۔ اسی لئے کوششیں کرتے تھے کہ کسی طرح لوگ حضور کا کلام نہ سنیں۔ چنانچہ ڈرتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو ان کا کلام مت سنو لاتسمعوا لھذا القرآن۔ خبردار قرآن مت سننا بس اس کا سننا ہی غضب ہے۔ والغوا فیہ اور اگر وہ پڑھنے ہی لگیں تو تم شور و غل مچانا۔ گڑبڑ کرنا شروع کر دو لعلکم تغلبون شاید اسی سے جیت جاؤ (اس طرح سے کہ وہ مجبور ہو کر خاموش ہو جائیں) یہ تہذیب تھی ماشاءاللہ۔ غرض وہ بہت ہی ڈرتے تھے کہ یہ تو شاعر اور ساحر ہیں۔ ان کا کلام سنا نہیں اور اثر ہوا نہیں۔ بس اسی واسطے شاعر اور ساحر کہتے تھے۔ غرض کلام کی قوت تاثیر اس کا منشاء تھا۔ اسی طرح مجنون جو کہتے تھے تو اس کا بھی ایک منشا تھا۔ وہ یہ کہ حضور نے حق کے مقابلہ میں ساری دنیا کی مصلحتوں کو چھوڑ دیا۔ یعنی ان بیوقوفوں کے نزدیک نعوذ باللہ حضور نے یہ عقل کے خلاف بات کی۔ چنانچہ سب نے ملکر ایک بار حضور کی خدمت اقدس میں ایک سفیر بھیجا جو حاضر ہو کر آپ کی خدمت میں منافع و مصالح پیش کرے اس نے آکر عرض کیا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

اگر آپ سردار بننا چاہتے ہیں تو ہم لوگ سب آپ کو بخوشی اپنا سردار بنالیں۔ کیونکہ آپ نہایت شریف النسب ہیں۔ آپ جس قبیلہ میں پیدا ہوئے ہیں وہ حسب نسب میں سب سے بڑھکر ہے۔ آپ کو اپنا سردار بنا لینے میں ہم کو کوئی عار نہیں۔ مگر ہمارے بتوں کو برا نہ کہیے اگر آپ عورتیں چاہتے ہیں تو قریش کی ساری لڑکیاں حاضر ہیں ایک سے ایک حسین موجود ہے۔ جتنی چاہیں پسند کرلیجیے۔ اپنی بہنیں اور لڑکیاں آپ کے نکاح میں دینا ہمارے لئے فخر ہے۔ بلکہ انھیں خود آپ کی لونڈیاں بننا باعث عزت ہے اور اگر مال کی خواہش ہے تو ہم ابھی ایک بڑا خزانہ آپ کے لئے فراہم کردیں بس آپ قرار وسکون سے بیٹھے رہیئے۔ اور ہمارے بتوں کو برا کہنا چھوڑ دیجیے۔ جب سفیر یہ سب باتیں کہہ چکا۔ تو آپ نے بجائے جواب دینے کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ پڑھکر سورہ حٰم سجدہ کا شروع کا حصہ تلاوت فرمایا۔ حٰم تنزیل من الرحمٰن الرحیم۔ کتاب فصلت آیاتہ قرآناً عربیاً لقوم یعلمون۔ بشیراً ونذیراً فاعرض اکثرھم فھم لا یسمعون الی آخر الآیات اور اس کی یہ حالت تھی کہ بالکل ساکت اور صامت تھا جیسے کہ نقش دیوار۔ جب حضورؐ نے پڑھتے پڑھتے یہ آیت تلاوت فرمائی فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد وثمود تو گھبرا کر کہنے لگا بس کیجیے بس کیجیے اب سننے کی تاب نہیں اس قدر اثر ہوا کہ سنا نہیں گیا اور اٹھکر بھاگا اور بھاگ کر اپنے ساتھیوں میں پہونچا جنھوں نے اسے بھیجا تھا یعنی ابوجہل وغیرہ۔ وہ سب منتظر بیٹھے تھے۔ ابوجہل بڑا ذہین تھا اس نے دور ہی سے دیکھکر تاڑ لیا کہا کہ بھائی یہ گیا تو تھا اور چہرہ سے ایسا شریر تھا کہ دور ہی سے پہچان گیا کہ ارے یہ تو ڈھیلے ڈھیلے گھٹنوں سے آرہا ہے۔ اس کے چہرہ کا تو کچھ رنگ ہی بدلا ہوا ہے۔ گیا تھا

اور چہرہ سے آرہا ہے اور چہرہ سے۔ جب پاس پہونچا تو سب نے پوچھا ارے یار کہہ تو سہی کیا گذری اس نے کہا کہ اجی کیا پوچھتے ہو جب میں سب باتیں پیش کر چکا تو انہوں نے ایک ایسا کلام پڑھا کہ واللہ اگر میں وہاں تھوڑی دیر اور بیٹھا رہتا تو سخت اندیشہ تھا کہ کوئی بجلی میرے اوپر آگرتی۔ کیا پوچھتے ہو کیا کیفیت تھی اثر کی۔ جب انھوں نے یہ کہا کہ میں تم کو ایک ایسی کڑک سے ڈراتا ہوں جیسی کہ عاد اور ثمود پر گرائی گئی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس اب بجلی گری۔ خدا جانے کیا کلام تھا اور کس غضب کا اس میں اثر تھا۔ واللہ اگر اور تھوڑی دیر بیٹھوں اور سنوں تو بجز اس کے مسلمان ہو جاؤں اور کوئی صورت نہ تھی۔ مشکل سے اپنا پیچھا چھڑا کر آیا ہوں۔ تو یہ حال تھا حضورؐ کے اثر کا۔ چونکہ وہ لوگ رات دن دیکھتے تھے کہ یہ الٹ پلٹ کر دیتے ہیں ایک جلسہ میں تمام قوموں کو (قوموں جمع ہے قومہ کی بمناسبت مقابلہ لفظ جلسہ جامع ۱۲) اسواسطے حضورؐ کو نعوذ باللہ شاعر اور ساحر کہتے تھے۔ جب اس قوم نے دیکھا کہ حضورؐ کو سرداری مل رہی ہے وہ نہیں لیتے۔ اونٹ مل رہے ہیں وہ نہیں لیتے۔ مال مل رہا ہے وہ نہیں لیتے۔ حسین حسین عورتیں مل رہی ہیں وہ نہیں لیتے۔ تو وہ نامعقول سمجھے کہ بھلا یہ کونسی عقل کی بات ہے۔ جب دنیا کی ساری نعمتیں مل رہی ہیں تو پھر خواہ مخواہ انکار ہے۔ عقل کی بات تو یہ ہے کہ میاں جب چندہ اور روپے مل رہے ہیں تو لیلو کام آویں گے۔ احمقوں نے اپنے اوپر قیاس کیا حضورؐ کو۔ ایک مقام پر میری ایک انگریز سے جو کہ جنٹ تھا اس کی خواہش پر ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو میں اس نے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے آپ نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے۔ میں نے کہا ہاں صاحب لکھی ہے۔ تو آپ کیا کہتے ہیں آپ کو کتنا روپیہ ملا۔ میں نے دل میں کہا کہ

واہ واہ بس یہ ہے آپ کا مبلغ پرواز اور مطمح نظر۔ جب میں نے کہا کہ کچھ بھی نہیں ملا۔ تو بڑے تعجب سے پوچھا کہ آپ نے اتنی بڑی کتاب لکھی اور کچھ بھی نہ ملا تو پھر کیا فائدہ ہوا۔ اتنی محنت ہی پھر کیوں کی اس کے نزدیک جسے روپیہ نہ ملے وہ کوئی دین کا کام ہی نہ کرے خیر میں نے اسی کے مذاق کے موافق اسے سمجھایا۔ میں نے کہا کہ اس سے مجھے دو فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ علاوہ اس زندگی کے ہم مسلمانوں کے اعتقاد کے موافق ایک دوسری زندگی بھی ہے۔ جس کو ہم لوگ آخرت کہتے ہیں۔ وہاں ایسے کاموں کا عوض ملنے کی ہمیں توقع ہے۔ اور دوسرا فائدہ دنیا کا بھی ہے وہ یہ کہ میں نے جو یہ تفسیر لکھی ہے اپنے بھائی مسلمانوں کے فائدہ کے لئے لکھی ہے۔ اور یہ ایک قومی خدمت ہے۔ جب میں اس تفسیر کو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں دیکھتا ہوں تو مجھے اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ میری قوم کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے۔ چونکہ یہ تقریر اس کے مذاق کے موافق تھی اس کو سنکر اس کی نظر میں میری بڑی وقعت ہوئی تو جو روپیہ پیسے اور جاہ کو مقصود سمجھے گا۔ وہ ضرور ایسے شخص کو کہے گا کہ بڑا بیوقوف ہے کہ اس نے محض دین کے لئے اپنا جاہ مال سب برباد کر دیا۔ ہمارے ایک دوست نے ناجائز ہونے کی بنا پر ڈپٹی کلکٹری چھوڑ دی ہے (یہ واقعہ ضابطہ واعظ کا ہے) تو اب سب لوگ انھیں تنا‌رتے ہیں کہ عقل ہی ماری گئی ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ تمہاری ہی عقل ماری گئی ہے۔ جو اس کو خلاف عقل کہتے ہو۔ ع اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد + جو لوگ جاہ اور مال ہی کو مقصود سمجھے ہیں اور جنہوں نے فقط دنیا ہی کو اپنا قبلۂ توجہ بنا رکھا ہے وہ ہم پر ہنستے ہیں لیکن اگر وہ ہم پر ہنستے ہیں تو ہم ان پر ہنستے ہیں فانا نسخر منکم کما تسخرون۔ حضرت نوح علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب حسب ارشاد خداوندی کشتی بنائی تو انکی قوم ان پر

ہنستی تھی۔ کوئی پوچھتا کہ یہ کشتی کیوں بنائی جا رہی ہے۔ آپ فرماتے ایک بڑا سخت طوفان آنے والا ہے۔ اسوقت یہ کام آوے گی۔ لوگ یہ سنکر کہتے کہ قحط تو پڑ رہا ہے اور آپ کو طوفان کی سوجھ رہی ہے۔ لوگ ان پر ہنستے کہ بس نبوت تو ختم ہوئی اب نجاری شروع کی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نہایت متانت سے فرماتے ان تسخروا منا فانا نسخر منکم کما تسخرون۔ فسوف تعلمون من یاتیہ عذاب یخزیہ ویحل علیہ عذاب مقیم۔ تم اسوقت ہم پر ہنستے ہو۔ ہم اسوقت تم پر ہنستے ہیں اس میں تو دونوں برابر۔ کل فرق معلوم ہوگا کہ کس پر عذاب آتا ہے اور کون ذلیل ہوتا ہے۔ تو لوگ احمق ہوئے ہیں جو ایسوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ ایک بزرگ تھے حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی قصبہ رامپور کے ایک رئیس کے بیٹے ان کے مرید ہو گئے۔ یعنی حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دونوں بزرگوں کی خدمت میں آنے جانے لگے۔ ان کے فیض صحبت سے ان کی حالت بدل گئی۔ دنیا کی طرف سے بے رغبتی اور آخرت کی جانب رغبت پیدا ہو گئی ان کے باپ کے پاس ایک دفعہ کچھ گنوار آئے اور کہنے لگے کہ تھارے (یعنی تمہارے) بیٹے کا بڑا افسوس ہے فقیر ہو گیا۔ وہ بولے خیر بھائی۔ تو ایک گنوار کیا کہتا ہے۔ اجی بری صحبت ایسی ہی ہووے ہے (یعنی ہوتی ہے) جبھی تو بڑے بوڑھے بری صحبت سے کریں (کرتے ہیں) دیکھئے بگڑ گیا۔ فقیر ہو گیا۔ تو گو بیوقوف نے دینداروں کی صحبت کو بری صحبت سمجھا۔ استغفر اللہ ان ہی حضرت حافظ صاحب کا ایک اور واقعہ ہے۔ کوئی نوجوان شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا اس کی حالت بدلنے لگی۔ ایک بار اس کا باپ حاضر ہو کر نہایت بیباکی سے کہنے لگا کہ جب سے میرا

بیٹا آپ کے پاس آنے لگا بگڑ گیا۔ حضرت تھے بڑے جلالی فرمایا اپنے بیٹے کو ہمارے پاس نہ آنے دو۔ روک دو۔ ہمارے پاس جو کوئی آئے گا ہم تو اسے بگاڑیں ہی گے۔ جس کو لاکھ مرتبہ غرض ہو اور بگڑنا چاہے وہ ہمارے پاس آئے۔ ہمیں تو لگاڑنا ہی آتا ہے ہمیں بھی تو کسی نے بگاڑا ہی ہے۔ ہم نے تو اپنے پیر سے بگاڑنا ہی سیکھا ہے۔ اجی جو بگڑنے سے ڈرے وہ ہمارے پاس آوے ہی کیوں۔ ایسے کے پاس جائے جسے سنوارنا آتا ہو ہمیں تو لگاڑنا ہی آتا ہے۔ اللہ اکبر ایک شخص کی جیب میں کوڑیاں تھیں اس نے ان کو نکالکر پھینکدیا۔ اور ان کی جگہ اشرفیاں بھرلیں۔ تو کیا وہ بیوقوف ہے۔ وہ ہرگز بیوقوف نہیں۔ البتہ جو لوگ اشرفیوں کی قیمت سے واقف نہیں وہ کوڑیاں پھینکتے وقت اسے ضرور برا بھلا کہیں گے کہ لوجی بھری ہوئی جیب ہی خالی کردی۔ ارے تمہیں کیا خبر اس نے کوڑیوں سے جیب خالی کر کے اشرفیوں کے لئے جگہ کی ہے۔ اگر ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ موجود ہے اس سے کوئی کیمیا سکھانے والا کہے کہ مجھے ایک لاکھ روپیہ دیدو۔ میں کیمیا بنانا سکھا دوں گا۔ اور وہ وعدہ کرنے والا نہایت معتبر ہو تو وہ فوراً لاکھ روپیہ دے دیگا۔ پھر اس نے ایک لاکھ روپیہ لے کر کیمیا سکھلا دی تو اب وہ سیکھنے والا اسقدر خوش ہے کہ پھولا نہیں سماتا۔ اسے اس کا مطلق افسوس نہیں کہ میں نے ایک لاکھ روپیہ کیوں دیا بلکہ وہ زبان حال سے کہتا ہے ؎

بحمد اللہ عجب ارزاں خریدم
جہاں دے چند دادم جاں خریدم

مگر اس کا پڑوسی جو کیمیا کا قائل اور اس فن کو جانتا نہیں وہ اسے بیوقوف بناتا ہے کہ میاں تم بھی بڑے احمق ہو ایک لاکھ روپیہ یوں ہی دیدیا۔ اتنی بڑی رقم فضول ہی ضائع کردی جب وہ کہتا ہے کہ بھائی میں نے یہ رقم ضائع نہیں کی بلکہ اس کے بدلے

کیمیا بنانا سیکھ لیا ہے تو کہتا ہے جاؤ میاں بیٹھو بھی۔ بیوقوف ہوئے ہو کیسی کیمیا۔ لاکھ روپیہ دیدیا ایک وہمی اور فضول سی چیز کیمیا کے لئے یہ حضرت صرف لاکھ روپیہ کو رو رہے ہیں مگر وہ ایک ہی دن میں لاکھ روپیہ بنالے گا۔ بلکہ جسے کیمیا بنانا آتا ہے وہ دل کا اسقدر غنی ہو جاتا ہے کہ اُسے بنانیکی بھی ضرورت نہیں رہتی وہ ہر وقت مطمئن ہے کہ جب چاہونگا اور جتنا چاہوں گا لاکھ دو لاکھ بنالونگا۔ تمہیں کیا خبر کہ جس نے مال اور جاہ کو چھوڑا ہے اسے کیا کیمیا مل گئی ہے ؎

کیمیائیست عجب بندگی پیر مغاں　　خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند　　واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

یہ ہے وہ کیمیا اور وہ دولت جو حاصل ہوتی ہے اور جسکے حصول کے بعد جوش میں آکر یہ کہتے ہیں ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند　　واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

دوسروں کو کیا خبر اس دولت کی۔ اندھے مادر زاد کو کیا خبر کہ نظر کسے کہتے ہیں اور روشنی کیسی ہوتی ہے۔ عنّین کیا جانے کہ نکاح میں کیا مزہ ہے اور منکوحہ کیسی قابل قدر چیز ہے اسی طرح جن کی باطنی آنکھیں پٹ ہیں وہ باطنی دولت کی حقیقت کیا سمجھیں۔ وہ تو ظاہری جاہ و مال چھوڑنے والوں کو بیوقوف ہی بنا دیں گے کہ لو صاحب روپیہ پیسہ ملتا تھا نہیں لیا۔ سرداری مل رہی تھی نہیں قبول کی اب دیکھئے کہ یہ کس کی حالت تھی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی۔ تو اعلیٰ درجہ کی حالت یہ ہے کہ عقلاء زمانہ بیوقوف کہا کریں اور دیوانہ سمجھا کریں۔ یہ تو بڑے فخر کی بات ہے ایسی دیوانگی تو مطلوب ہے۔ یہ دیوانگی تو وہ ہے جس کے بارہ میں کہا گیا

ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد
مرعسس را دید و در خانہ نشد

اور ؎ ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم
مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

اور حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

ایدل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی
بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

بلکہ اگر وہ جنون کم ہوجائے تو غم ہوتا ہے۔ اور جب وہ پھر عود کرتا ہے تو خوش ہوکر فرماتے ہیں ؎

باز دیوانہ شدم من اے طبیب
باز سودائی شدم من اے حبیب

باز آمد آب من در جوئے من
باز آمد یارمن در کوئے من

خوش ہوتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ دیوانگی پھر آگئی اور عقل کو یوں خطاب کرتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

فہم وخاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

تو یہ حالت ہوتی ہے۔ تو حالت مطلوب کیا ہوئی۔ یہ ہوئی کہ طلب میں ایسی حالت ہوجائے کہ لوگ دیوانہ سمجھنے لگیں۔ حدیث میں بھی تو آتا ہے حصن حصین میں ہے اذکر واللہ حتی یقولوا انہ لمجنون اللہ تعالیٰ کی اتنی یاد کرو کہ لوگ تم کو پاگل کہنے لگیں اور واقعی ایسی حالت ہوجاتی ہے۔

ذکرِ حق

ایک بزرگ تھے۔ وہ خط بنوا رہے تھے مگر زبان سے ذکرِ اللہ جاری تھا۔ نائی نے لبیں لیتے وقت عرض کیا کہ حضور تھوڑی سی دیر کے لئے خاموش ہو جائیں ورنہ ہونٹ کٹ جائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر ہونٹ کٹ جائے گا تو کیا ڈر ہے پھر جڑ جائیگا۔ لیکن اگر اللہ کی یاد کو میں نے منقطع کر دیا تو جو سانس غفلت میں گزریگا اس کا کوئی تدارک نہیں۔ بس میں اپنا کام کروں تم اپنا کام کرو۔ اگر ہونٹ کٹتے ہیں تو کٹنے دو۔ چاہے سارے ہی کٹ جائیں میں ذکر کو منقطع نہ کرونگا۔ ہائے مولانا نے بھی ایک ایسی ہی حکایت لکھی ہے ؎

زاہدے را گفت یارے در عمل　　　کم گری تا چشم را ناید خلل

ایک زاہد تھے جو رویا بہت کرتے تھے ان کے ایک رفیق طریق نے کہا کہ کم رویا کرو ورنہ آنکھیں خراب ہو جائیں گی ؎

گفت زاہد از دو بیروں نیست حال　　　چشم بیند یا نہ بیند آں جمال

زاہد نے کہا کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ آنکھیں وہ جمال دیکھیں گی یا نہ دیکھیں گی ؎

گر بہ بیند نور حق خود چہ غم است　　　در وصال حق دو دیدہ کے کم است

اگر ان آنکھوں سے میں نے جمال حق دیکھ لیا تو پھر ان آنکھوں کے نہ رہنے کا کیا غم۔ یہ دو آنکھیں کیا ایسی ایسی لاکھوں آنکھیں بھی ہوں تو اس جمال پر نثار ہیں ؎

ور نہ بیند نور حق را گو برو　　　ایں چنیں چشم شقی گو کور شو

اور اگر اس جمال کو نہ دیکھا تو ایسی کمبخت آنکھوں کا پھوٹ جانا ہی بہتر ہے وہ آنکھ ہی کیا جس کو وہ جمال نہ دکھائی دے اور وہ کان ہی کیا جس کو وہ خطاب نہ سنائی

دے ایسی آنکھ اور ایسے کان ہی کو میں کیا کروں گا۔ حضرت یہ لوگ آنکھ کو کان کو جان کو مال کو سب کو محبت حق میں فنا کر دیتے ہیں۔ ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے | تیری ہستی کی رنگ و بو نہ رہے

جتنا تعلق ذات حق سے بڑھتا جاتا ہے اور سب کو فنا کرتے جاتے ہیں۔ تو ایسوں کو لوگ بیوقوف تو بناویں ہی گے۔ کہیں گے اچھے متقی ہوئے ہونٹ ہی کٹا بیٹھے اور کرد اللہ اللہ کوئی ان سے کہے کہ میاں تمہیں کیا ہونٹ کٹے تو ان کے کٹے تم سے تو شکایت نہیں ایک بزرگ صرف ستو ہی گھول کر پی لیتے کہ کھانا کھانے میں دیر لگتی ہے۔ حرج بہت ہوتا ہے۔ ستو گھولا اور جلدی سے ایک گھونٹ پی لیا۔ پھر اپنے اللہ کی یاد میں لگ گئے۔ ان کی غذا تو بس یہ ہے ایسے شخص کو ظاہر ہے کہ لوگ بیوقوف ہی کہیں گے چونکہ ہر وقت توجہ حق کی طرف رہتی ہے۔ ایک استغراق کا سا عالم طاری رہتا ہے اور جب توجہ ہی کسی اور طرف نہیں تو بہت سی باتوں میں بھول ہو جاتی ہے۔ محبوب حقیقی کے سوا انہیں اور کچھ یاد ہی نہیں رہتا (بقول اخفر جامع ۱۲) ؎

گم گشتہ حیرت کوئی مجھسا بھی نہیں ہے | میں خود ہوں کہیں دل ہے کہیں ہوش کہیں ہے

؎ ہمیشہ رہتا ہوں اک بیخودی کے عالم میں | جہاں نہ میرے لئے ہے نہ میں جہاں کیلئے

تو ایسے شخص کو اہل دنیا پاگل نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔ میں نے اپنے استاد علیہ الرحمۃ سے خود سنا ہے۔ مولانا علاوہ زبردست عالم ہونے کے بڑے درویش اور صاحب باطن شیخ تھے۔ فرماتے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ خط لکھ کر آخر میں دستخط کرنے چاہے تو اپنا نام ہی بھول گیا بہت یاد کیا مگر یاد ہی نہ آیا۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے استغراق کا کہ اپنا نام ہی یاد نہ رہا۔ ایسا حیرت ناک واقعہ ہے کہ اگر میں نے

خود حضرت سے یہ سُنا ہوتا تو یاد رکھنا بھی مشکل تھا۔ حضرات صحابہ میں بھی اس رنگ کے ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن آپکی صاحبزادی صاحبہ بھی ساتھ جارہی تھیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ لڑکی آپکی ہے۔ تو آپ بہت غور سے اسے دیکھکر فرماتے ہیں کہ ہاں گھر والے کہتے تو تھے کہ یہ لڑکی میری ہے۔ یعنی یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ میری لڑکی ہے۔ گھر والوں کے قول سے استدلال کیا۔ میں نے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ کی زیارت کی ہے ان کا بھی یہ ہی رنگ تھا۔ ایک بار مولانا کے پوتے کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ مجمع کو دیکھکر پوچھا ارے بھائی یہ لوگ کیوں جمع ہیں۔ عرض کردیا گیا کہ حضرت کے پوتے کا نکاح ہے فرمایا اچھا ان کا نکاح ہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر فرماتے ہیں ارے بھائی یہ لوگ کیوں جمع ہیں۔ پھر عرض کردیا گیا کہ پوتے صاحب کا نکاح ہے فرمانے لگے ہاں میاں ہاں ابھی تو تم نے کہا تھا کہ نکاح ہے۔ ہم بھول ہی گئے تمہارا کیا قصور ہے ہماری ہی یاد خراب ہے۔ یاد ہی نہیں رہتا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہی سوال کہ میاں یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ لوگ کس لئے جمع ہوئے ہیں۔ پھر کہدیا گیا کہ حضرت نکاح ہے فرمایا ارے بھائی ہم تو بھول بھول جاتے ہیں کیا کریں۔ اب ہم پوچھیں بھی تو مت بتانا کوئی کہاں تک بتائے۔ اجی ہوگا ہمیں پوچھنے ہی کی کیا ضرورت ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کا حال حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اسقدر استغراق تھا کہ ہمیشہ تو نماز جماعت سے جامع مسجد میں پڑھتے تھے لیکن راستہ عمر بھر بھی یاد نہ ہوا یہ کیفیت تھی استغراق کی کہ حضرت کے ایک خادم تھے بختیار وہ آگے آگے چلتے اور حق حق کہتے جاتے بس اس آواز پر چلتے جاتے اور مسجد تک پہونچ

جانے کیا ٹھکانا ہے استغراق کا کہ تیس برس تک ایک ہی مسجد میں نماز پڑھی مگر راستہ ہی یاد نہ ہوا اس قدر تو استغراق تھا مگر اتباع سنت کا یہ حال تھا کہ کسی ادنیٰ سنت کو بھی کبھی ترک نہیں کیا۔ غرض تیس برس تک نماز باجماعت جامع مسجد میں ادا کی لیکن پھر بھی راستہ یاد نہ ہوا۔ وجہ یہ کہ ایک دل میں دو چیزیں نہیں سما سکتیں۔ اہل اللہ کے قلب میں ایک ایسی چیز بس گئی ہے کہ کسی دوسری چیز کی اسمیں گنجائش ہی نہیں رہی۔ حضرت ایسوں کو عقلاء مجنون نہ کہیں تو کیا کہیں۔ جنھیں نہ راستہ یاد نہ اولاد یاد نہ خادم یاد۔ عقلاء تو ایسوں کے بارے میں یہی کہیں گے کہ معلوم ہوتا ہے دماغ میں خلل ہے۔ ارے نادانوں تمہارے ہی دماغ میں خلل ہے۔ جو چیز ان کے اندر ہے اگر تمہارے اندر ہو تو کلیجہ پھٹ جائے۔ بقول احقر جامع ؎

در دیہ اور کو ملتا تو وہ مر ہی جاتا   کر کے نالے بھی مجھے ناز شکیبائی ہے

یہ ان کے دماغ ہی کی تو صحت و قوت ہے اس قدر ضبط ہے۔ چنانچہ حضرت مخدوم عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ باوجود اس قدر مغلوب الحال ہونے کے فرماتے ہیں منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بہ فریاد آمد اینجا مرد انند کہ دریا ہا فرو برند و آروغ نزنند ہم کو تو نقل کرتے بھی جھجک ہوتی ہے۔ لیکن ان کو حق حاصل ہے فرماتے ہیں۔ منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ میں شور مچانے لگا۔ یہاں مرد ہیں کہ سمندر کے سمندر چڑھا جائیں اور ڈکار نہ لیں بقول جامع ؎

کر چکے زندگی بس اے مجذوب تم   ایک چلّو میں یہ حالت ہو گئی

تو معلوم ہوا کہ ان کے اندر ایک ایسی چیز تھی جس کو منصور بھی ضبط نہ کر سکے۔ جب منصور سے وہ چیز ضبط نہ ہو سکی تو اوروں سے تو کیا ہو سکتی ہے۔ ایسی چیز جس کے

اندر ہو گیا اُسے جامع مسجد کا راستہ یاد رہ سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی استقامت ایسی تھی کہ نماز تو نماز جماعت بھی کبھی نہ چھوٹی۔ یہ تھا اتباع حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس اتباع ہی کی برکت سے اس درجہ تک پہونچے اور یہ رتبہ پایا۔ اور اتباع میں ایسی برکت ہونے کا ایک راز ہے جس کے متعلق پہلے ایک حکایت سُن لیجئے قنوج میں ایک وکیل ہیں۔ شیخ محمد عالم وہ خود مجھ سے اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک مرتبہ کسی اور بستی میں جا رہا تھا راستہ میں ایک مکان کی دہلیز میں سے ایک بڑی بی کی آواز آئی۔ انھوں نے مجھکو بلا کر بڑی محبت سے میرے سر پر اور میری کمر پر ہاتھ پھیرا۔ اور پیار کیا اور بٹھلا کر میرے لئے حلوا تیار کیا اور کہا کہ اگر کبھی تمہارا آنا ہوا کرے تو میرے پاس ہو کر جایا کرو۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بڑھیا سے میری نہ جان نہ پہچان یہ کیوں ایسی محبت سے پیش آرہی ہے آخر میں نے پوچھا کہ بڑی بی تم میری کیوں اتنی خاطر کر رہی ہو۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور کہا کہ تمہاری شکل کا ایک میرا بیٹا ہے وہ بہت دن سے پردیس میں ہے اس کی ایسی ہی شکل ہے جیسی تمہاری۔ تمہیں دیکھکر مجھے وہ یاد آگیا۔ اور اس کی سی شکل ہونے کی وجہ سے مجھے تم سے محبت ہو گئی۔ تم میرے بیٹے کی شکل پر ہو اس لئے تم پر پیار آگیا۔ یہ ایک مثال ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کے محبوب جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو شخص آپ کی سی ہیئت بناتا ہے اس پر خدا تعالیٰ کو محبت اور پیار آتا ہے کہ یہ میرے محبوب کا ہمشکل ہے یہ راز ہے حضور کی اتباع میں خاص برکت کا اور یہ ایسا طریق ہے وصول کا جو سب سے زیادہ نزدیک ہے۔ اس کو جو اختیار کریگا وہ بہت جلد پہونچیگا۔ اور وہ بہت جلد کامیاب ہوگا ورنہ ۵

خلاف پیمبر کسے رہ گزید | کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید
مپندار سعدی کہ راہ صفا | تواں رفت جز در پئے مصطفےٰ

بدون حضور کے اتباع کے کچھ نہیں ہوسکتا۔ خود حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ۔ کہدیجئے یارسول اللّٰہ کہ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو۔ خدا کو تم سے محبت ہو جائے گی۔ ظاہری نسق کلام کا یہ متقضا تھا کہ یوں فرماتے کہ تم کو خدا سے محبت ہو جاویگی مگر یوں نہیں فرمایا۔ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ تم تو کیا خدا سے محبت کرتے تمہارا تو کیا منہ ہے۔ ہاں خدا ہی کو تم سے محبت ہو جاۓگی۔ اگر رسول ؐ کا اتباع کرو گے۔ اللّٰہ اکبر۔ ہم اگر چاہتے اور کوشش کرتے کہ ہم سے خدا کو محبت ہو جائے تو قیامت تک بھی یہ دولت نصیب نہ ہو پاتی کیونکہ کہاں ممکن کہاں واجب چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ لیکن اتنا بڑا رتبہ پیغمبر خدا صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے اتباع سے حاصل ہو جاتا ہے۔ تو صاحبو بڑی چیز یہ ہے۔ یعنی حضورؐ کا اتباع۔ حضرت شیخ عبدالحق ردولوی کو بھی اتنا بڑا رتبہ حضور ہی کے اتباع سے حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ آپ سے کبھی کوئی سنت ترک نہ ہوتی تھی۔ مگر استغراق اتنا رہتا تھا کہ تیس برس تک جامع مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے جاتے آتے رہے لیکن راستہ یاد نہ ہوا۔ تو ایسا استغراق تھا۔ ایک دن ردولی سے باہر بہت دور ایک ندی کے کنارے جارہے تھے۔ یہ جگہ بہت پسند آئی۔ فرمایا کہ یہ تو بڑے لطف کی جگہ ہے اب یہیں رہا کریں گے۔ بختیار خادم تھے عاشق۔ عرض کیا بہت بہتر۔ اور دونوں وہیں رہنے لگے۔ بہت زمانے کے بعد ایک دن کچھ افاقہ ہوا تو دفعتاً دریا پر نظر پڑی خادم سے فرمایا کہ ارے میاں ردولی میں تو پہلے کوئی دریا نہ تھا اب یہاں دریا بھی

بہنے لگا۔ سیر و تفریح کی جگہ ہوگئی۔ خادم نے عرض کیا کہ حضرت یہ ردولی کہاں ہے۔ یہ تو فلانے مقام کا دریا ہے ردولی سے آئے ہوئے تو حضور کو بہت دن ہو گئے تب فرمایا کہ اگر یہ ردولی نہیں ہے تو چلو بھائی یہاں سے۔ گھر سے بے گھر ہونا ٹھیک نہیں۔ لیجئے یہ بھی خبر نہیں کہ یہ ردولی ہے یا کوئی اور مقام۔ ایسے شخص کو عقلاء زمانہ لیکن جہلا ر آخرت کیا پاگل نہ کہیں گے۔ مگر مقبول ہے یہ لقب اور مطلوب ہے یہ حالت اس واسطے کہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ ہی کہا گیا ہے۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ اور اولیاء اللہ کو بھی یہ ہی کہا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے ویسخرون من الذین اٰمنوا والذین اتقوا فوقھم یوم القیامہ کفار اہل ایمان کو ذلیل سمجھ کر ان پر ہنستے ہیں اور ان کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں لیکن ایمان والوں کو اس سے دلگیر نہ ہونا چاہیئے۔ ہنسنے والے یہاں ایمان والوں پر ہنس لیں اور اپنے آپ کو ان سے بڑھا ہوا سمجھ لیں لیکن قیامت کے روز اہل تقویٰ اُن سے بڑھے ہوئے رہیں گے۔ اور یہ گھٹے ہوئے ہوں گے۔ (القول

حضرت سعدی علیہ الرحمتہ ؎

بسا سوار کہ آنجا پیادہ خواہد شد — بسا پیادہ کہ آنجا سوار خواہد بود

یا بقول ملا در رسالہ مناظرہ مسٹر و ملاّ ؎

یہاں رکھتی ہے میری کامرانی شکل حرمانی — وہاں اپنی حقیقت تجھکو دکھلاؤں گا اے مسٹر

مطلب میرا یہ ہے کہ شریعت کا اتباع کرنیوالے مصالح دنیویہ کو پیش نظر کیوں رکھتے ہیں۔ وہ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ مصالح دینیہ و دنیویہ دونوں کو جمع رکھیں۔ یعنی اس معنی کر کہ دنیا بھی خوب کماؤ کھاؤ اور دین کے بھی بھلے بنے رہو۔ ادھر مخلوق کو

بھی راضی رکھو ادھر خدا کو بھی اگر خدا کو معبود اور مقصود سمجھتے ہو تو مخلوق کو راضی یا ناراضی کرنے سے قطع نظر کر لو۔ قصداً تو کسی سے لڑو بھڑو نہیں۔ لیکن اس کی بھی کوشش نہ کرو کہ مخلوق ہم سے راضی ہی رہے۔ بس اس شان کا ہونا چاہیئے مسلمان کو۔ لیکن یہ ضروری بات ہے کہ یہ شان جبھی پیدا ہو سکتی ہے جب حضور کا پورا پورا اتباع کیا جائے گو یہ بھی ضرور ہے کہ اس حالت میں لوگ ملامت کریں گے مگر تمہارا یہ مذہب ہونا چاہیئے

نسازد عشق را کنج سلامت | خوشا رسوائی کوئے ملامت

اور خوش ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں ایک راز ہے وہ یہ کہ جس میں ملامت ہو جاتی ہے اس میں آدمی پکا ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی نے داڑھی رکھ لی تو داڑھی منڈوانے والے اس پر ہنسیں گے کہ آئیے مولانا صاحب۔ آئیے حضرت قبلہ یہ ضرور ہوگا۔ اور یہ ناگوار بھی ہوگا۔ لیکن اس کا اثر یہ ہوگا کہ اگر کبھی جی بھی چاہے گا منڈانے کو تب بھی اس غصہ میں اگر نہ منڈائیگا۔ اور ان کی ضد میں داڑھی رکھنے کا اور بھی پختہ عزم کر لیگا۔ تو یہ نفع ہے ملامت میں۔ غرض حضورؐ کے اتباع میں ملامت کی ہرگز پرواہ نہ کرنی چاہیئے اگر لوگ تم پر ہنسیں یا طعن کریں تو دلگیر ہونے کی کیا وجہ ہے۔ سبحان اللہ میاں۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ یہ تو وہ رتبہ ہے جو حضرات صحابہؓ کو حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اس وقت بھی اہل ایمان پر یوں ہی لوگ ہنسا کرتے تھے۔ تو جب حضور کا اتباع کرو گے لوگ ہنسیں گے ضرور۔ لیکن اس کی کچھ پروانہ کرو۔ اب فرض کرو تم نے کوئی شادی کی بلا رسم۔ تو لوگ طعنے دینا شروع کریں گے۔ اور سینکڑوں لتاڑ پڑنی شروع ہونگی کہ یہ بڑے متقی نکلے ہیں کہ باوا دادا سے بھی بڑھ گئے۔ باوا دادا سے جو رسمیں چلی آرہی تھیں سب ناجائز ہی قرار دیدیں ایسے کنجوس ہیں کہ برادری کا کھانا بھی اڑا دیا۔

یہ سب طعن و تشنیع سنکر بھی تم خوش رہو اور کچھ پرواہ مت کرو۔ عشق میں بھلا رسوائیوں سے بھی کوئی سلامت رہا ہے لہٰذا تم کو خوش ہونا چاہیئے اور یہ کہنا چاہیئے ؎

نسازد عشق را کنج سلامت   خوشا رسوائی کوئے ملامت

اور سنو اگر لباس شرع کے موافق پہنو گے تو جنٹلمین لوگ ہنسیں گے کہ یہ کیا دقیانوسی لباس پہنا ہے۔ اول جلول کتے کی جھول۔ چہرہ دیکھو تو وحشت برستی ہے۔ ارے عاشقوں کے چہرہ پر تو وحشت ہی زیب دیتی ہے۔ مانگ پٹی تو زنانوں کا شعار ہے۔ واللہ وہ عاشق نہیں جو کوٹ بوٹ سے درست ہو۔ خدا کی قسم جن کے دلوں میں محبت گھس گئی ہے انھیں اپنے سر اور پاؤں کی بھی خبر نہیں۔ کوٹ بوٹ تو کیا پہنتے۔ اگر ان کے پاس پھٹی جوتی اور پھٹا لباس بھی ہوگا تو انہیں عار نہ ہوگی۔ اور اب تو یہ حالت ہے کہ بھلا مرد تو مرد عورتوں نے باریک کپڑے پہننے شروع کردیئے ہیں۔ اگر کوئی اچھے کپڑے شریعت کے موافق پہنے تو کہتی ہیں کہ یہ کیا کنجڑنوں اور قصائینیوں کے سے کپڑے پہنے ہیں۔ اسقدر چست اور منڈھا ہوا لباس پہنتی ہیں کہ بدن کی ساخت اور ساری ہیئت ہی ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اگر اتفاق سے کسی غیر محرم کی نظر پڑ جائے تو کس قدر بے غیرتی ہے اور پائنچے ایسے چست کہ پنڈلی میں چپکی لیں تو کھال بلکہ گوشت کی بوٹی تک اکھڑ آئے پھر اوپر سے کھڑے جوتے حالانکہ حرام ہے۔ عورتوں کے لئے مردوں سے مشابہت حدیث میں لعنت آئی ہے ایسی عورتوں پر جو مردوں سے مشابہت کریں۔ اور اس قدر چست پائنچے بازار والی فاسق فاجر عورتوں کا شعار ہے۔ اور مشابہت فساق فجار کی بھی ناجائز ہے۔ اس کا منشا رفقط تفاخر ہے مقصود یہ ہے کہ ذرا آن بان سے رہیں اور خوبصورت معلوم ہوں اور کوئی یوں نہ کہے کہ

یہ کیسے باؤلوں کے سے ڈھیلے پائینچے ہیں۔ جیسے جھلی مارنی پہنے پھرتی ہیں (یعنی سینگی لگانے والیاں) تو اب عورتیں بھی اسطرح سے طعن کرنے لگی ہیں۔ غرض عورتوں نے بھی اب آپسمیں مردوں کا سا تفاخر کرنا شروع کر دیا ہے۔ بینڈ کی کو بھی نور کام ہوا۔ مردوں کو تو یہ مرض تھا ہی عورتوں کو بھی ہوا اور مردوں کا تفاخر تو خیر چل بھی سکتا ہے۔ کیونکہ ایک کو دوسرے کی اندرونی حالت معلوم نہیں۔ جیسا چاہو اپنے کو ظاہر کر سکتے ہو۔ مگر عورتیں گھروں میں آتے جاتے والیاں ایک کو دوسرے کے گھر کی خبر۔ یہ ایک دوسرے سے کیونکر اپنا اصلی حال چھپا سکتی ہیں۔ اس لئے مرد اگر تفاخر کرتے ہیں تو ان کی اتنی بیوقوفی نہیں کیونکہ ایک کو دوسرے کا حال معلوم نہیں کہ گھر میں چوہے قلابازی کھا رہے ہیں۔ قلعی نہیں کھلتی۔ بس ایک جوڑا انگریزی بنا لیا۔ اور ہر موقع پر اچھے خاصے جنٹلمین بن گئے جو غریب ہیں انھوں نے بھی بس ایک اچکن بڑھیا بنوالی۔ اور ہر موقع پر وہی اچکن ڈاٹ لی۔ اور نواب کے بچے بن گئے حالانکہ گھر میں خاک بھی نہیں بعض لوگ انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں جانتے لیکن جنٹلمین کا سارنگ و روغن بنائے ہیں۔ روغن پر ایک حکایت یاد آئی۔ کوئی ایسے ہی تھے شیخی باز۔ ظاہری وضع تو نہایت امیرانہ اور گھر میں کھانے تک کو نہیں۔ روز گھر سے آکر اپنے دوستوں میں شیخی بگھارا کرتے کہ آج گوشت بہت مزیدار پکا تھا پلاؤ بھی اچھا تھا۔ چاہے گھر میں دال اور خشکہ بھی میسر نہ آیا ہو میاں فاقہ ہی سے ہوں۔ اور ترکیب یہ کرتے کہ گھر میں جو جلنے کا چراغ تھا اس کا تیل انگلیوں اور مونچھوں کو لگا لیتے تاکہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ واقعی نواب صاحب بہت مرغن گوشت اور پلاؤ کھا کر آئے ہیں۔ ایک دن عجب دل لگی ہوئی۔ حسب دستور چراغ میں سے تیل لیکر جو مونچھوں

کو چھیڑنے لگے تو اتفاق سے بتی بھی مونچھوں میں لپٹ گئی۔ اور چونکہ وہ جلتے جلتے چھوٹی سی رہ گئی تھی اس لئے ان حضرت کو وہ محسوس بھی نہ ہوئی۔ باہر آکر حسب عادت دوستوں میں ڈینگیں مارنے لگے کہ واللہ آج کا پلاؤ تو بہت ہی مزیدار تھا ایک صاحب کی نظر جو مونچھوں پر پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ چراغ کی بتی لپٹی ہوئی ہے۔ بس ساری قلعی کھل گئی کہ حضرت چراغ کا تیل مونچھوں میں لگا لگا کر آتے ہیں تاکہ لوگوں پر ظاہر ہو کہ بہت مرغن کھانے کھاتے ہیں۔ فوراً انہوں نے کہا جناب بجا ہے اور دیکھئے پلاؤ کا ایک چاول بھی مونچھوں میں لپٹ آیا ہے۔ ہاتھ پھیر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ چراغ کی بتی ہے۔ بہت ہی خفیف ہوئے۔ تو اس شیخی بازی سے فائدہ کیا۔ خیر یہ تو اتفاق کی بات تھی کہ لوگوں کو پتہ چل گیا۔ ورنہ مردوں کی شیخی تو کچھ چل بھی جاتی ہے۔ کیونکہ گھر کے اندر کا حال مردوں کو کیا معلوم۔ لیکن عورتوں کو تو ایک دوسری کا حال معلوم ہے کہ اتنے پانی میں ہے۔ پھر شیخی کیسی۔ پھر بیگم صاحبہ خواہ مخواہ ہی اینٹھ مروڑ میں مری جاتی ہیں پھر ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ اگر لباس قیمتی ہی پہننے کا شوق ہے پہنو۔ تو شریعت کے خلاف نہ ہونا چاہیئے۔ دوسرے زینت میں غلو نہ ہو۔ بس اتنا تجمل کافی ہے کہ کوئی ذلیل نہ سمجھے۔ کوئی باولا جھلا نہ کہے (یعنی پاگل) اور اصل بات تو یہ ہے کہ نہ ذلت کی پروا ہو۔ نہ بدنامی کی یہ دونوں نشانیں عشق کے لوازم میں سے ہیں یحبھم ویحبونہ ولا یخافون لومۃ لائم اسی طرف اشارہ ہے۔

پھر پردہ

محبین پر تو ملامت ہوتی ہے۔ مثلاً پردہ ہی ہے بعض عورتیں جو متشرع ہیں وہ سب نامحرموں سے پردہ کرتی ہیں۔ حتی کہ چچازاد بھائی سے

بھی۔ ان کے اوپر بڑے طعن ہوتے ہیں کہ بھلا بھائی سے بھی کہیں پردہ ہوتا ہے عورتوں کے نزدیک چچا کا لڑکا ایسا ہے جیسے سگا بھائی۔ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سگا بھائی ہے لیکن ایسا سگا ہے جو سگ سے ماخوذ ہے اور الف جو آخر میں ہے وہ ایسا ہے جیسے کسی بڑی ہانڈی کو ہنڈا کہتے ہیں۔ اسی طرح یہاں سگا کے معنی ہیں بڑا سگ۔ ایک شہری بچہ سے کسی نے پوچھا کہ فلانا تمہارا سگا بھائی ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ وہ میرا حقیقی بھائی ہے سگ تو کتے کو کہتے ہیں۔ چھوٹا سا بچہ تھا لیکن کسی سے سُن لیا ہوگا کہ سگ کتے کو کہتے ہیں۔ تو کہتا ہے کہ حقیقی بھائی کہیے سگ نہ کہیے۔ تو غرض یہ کہ عورتیں چچا زاد بھائی کو مثل حقیقی بھائی کے سمجھتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ اس سے کیا پردہ۔ عورتیں تو عورتیں ایسے پردہ سے مرد بھی خفا ہیں۔ کسی نے ہمت کرکے اپنے قریبی نامحرم رشتہ داروں سے ی پردہ کرنا شروع کیا تو اب چاروں طرف سے اعتراض کی بھرمار ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ میاں کچھ نہیں اب عزیزوں میں آپس میں محبت ہی نہیں رہی۔ دوسرے صاحب بھی اینٹھ گئے کہ ان کے گھر جاویں تو کیا دیواروں سے بولیں۔ اب ہم ان کے یہاں جانا ہی بند کر دیں گے۔ سبحان اللہ کیا عزیزوں کے تعلقات اور آپس کا میل جول بے پردگی ہی پر موقوف ہے اگر یہ معنی ہیں تو بہ نعوذ باللہ اللہ میاں پر اعتراض ہے کہ ایسے قریبی رشتہ داروں کو بھی نامحرم قرار دیدیا۔ استغفر اللہ مگر اسی میں بعضی ایسی بھی ہمت والیاں ہیں کہ چاہے کوئی ہو وہ کسی نامحرم کے سامنے نہیں آتیں۔ چاہے کوئی برا مانے یا بھلا مانے اور اکثر جگہ تو پردہ کی ایسی کمی ہے کہ محرمیت نہیں کچھ نہیں دور دور کے رشتہ داروں کو بے تکلف گھر میں بلا لیتی ہیں اور بے محابا ان کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ بالکل ناجائز ہے اور گناہ ہے مردوں

کو چاہیئے کہ وہ انہیں تنبیہ کریں اور سب نامحرموں سے پردہ کرائیں۔ اگر کسی کو ناگوار ہو تو بلا سے ہو۔ کچھ پرواہ مت کرو۔ ہرگز ڈھیلا پن نہ برتو۔ بلکہ مردوں کو چاہیئے کہ اگر کوئی نامحرم رشتہ دار عورت ان سے پردہ نہ کرے تو وہ خود اس سے چھپا کریں میری ایک خالہ تھیں یعنی میرے والد صاحب کی سالی یہ دستور ہے ہی کہ عموماً سالیاں بہنوئی سے پردہ نہیں کرتیں۔ چنانچہ وہ بھی والد صاحب کے سامنے آتے لگیں۔ والد صاحب اگرچہ عمر میں ان سے بہت بڑے تھے اور باپ کے برابر تھے۔ لیکن ان کو غیرت آئی اور سامنے آنے سے منع کر دیا انھوں نے مانا نہیں اور پھر بھی سامنے آئیں۔ گو والد صاحب دنیا دار تھے مگر غیرت دار بڑے تھے۔ ایک بار خوب ڈانٹا کہ خبردار جو کبھی میرے سامنے آئیں ٹانگیں توڑ دونگا۔ بہت بُرا مانا اور بہت روئیں کہ بھائی نے مجھے ایسا ایسا کہا۔ مگر پھر کبھی سامنے نہیں آئیں۔ پردہ کرنے لگیں تو انہوں نے بُرا مانا۔ مگر والد صاحب نے کچھ پرواہ نہ کی۔ پردہ کرا کر چھوڑا۔ اسی طرح تم کرو۔ اگر کوئی بُرا مانتا ہے مانا کرے کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ بُرا مان کر کوئی کریگا کیا۔ اچھا تو ہے سب چھوڑ دیں۔ کوئی اپنا نہ رہے یوں ہی تعلق خلق سے گھٹے۔ جب کوئی اپنا نہ رہیگا اور سب سے توقع منقطع ہو جائیگی۔ تب تو سوچے گا کہ بس جی اب تو اللہ میاں ہی سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے۔ بقول کسیکے

ع جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا۔

اب سمجھے گا کہ اعزہ اقربا یار دوست یہ سب حجاب تھے اب کوئی حجاب نہ رہا۔ اب خدا کے بنو جتنے تعلقات کم ہوں اتنا ہی اچھا۔ ہمارے ایک بزرگ تھے ماموں امداد علی صاحب ویسے تو ایک آزاد منش درویش تھے مگر باتیں بڑی حکمت کی فرمایا

کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ تارک الدنیا تو ہونا بہت مشکل ہے مگر ہاں جب کسی پر میاں کا فضل ہوتا ہے تو اس کو متروک الدنیا بنا دیا جاتا ہے یعنی ایسے اسباب غیب سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ خود دنیا اس کو چھوڑ دیتی ہے یہ صورت ہوتی ہے ترک دنیا اور ترک تعلقات کی یعنی جب متروک الدنیا ہو گیا تو دنیا سے نفور ہو کر تارک الدنیا بھی ہو ہی گیا۔ اور بھائی یہ تو سوچو کہ کیسے کیسے راضی کرو گے۔ راضی تو ایک ہی ہوتا ہے۔ کئی تو راضی ہوا نہیں کرتے۔ تو حضرت یہ کیجئے کہ صرف ایک اللہ کو راضی رکھئے بہت سے آدمیوں کو کہاں تک راضی رکھئے گا۔ ضرب اللہ مثلاً رجلاً فیہ شرکاء متشاکسون ورجلاً سلما لرجل ھل یستویان مثلاً۔ ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص ہے جس میں کئی ساجھی ہیں جن میں باہم ضد اضدی ہے اور ایک اور شخص ہے کہ پورا ایک ہی شخص کا ہے۔ کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہے ؎

دلارامے کہ داری دل درو بند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

میں کہتا ہوں کہ ایک مردار بازاری عورت کی محبت میں اس کی رضامندی کی خاطر اپنی آبرو جائداد خاندان کی عزت سب برباد کر دیتے ہیں۔ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔ تو کیا خدا کی محبت اس سے بھی کم ہو گئی۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولا کے کم از لیلے بود گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

کیا عشق مولا عشق لیلیٰ سے بھی کم ہو گیا۔ دیکھو لیلےٰ کی محبت میں مجنوں کی کیا کیفیت تھی پھر تم خالقِ لیلیٰ کے مجنوں ہو۔ تمہاری تو اس سے بھی بڑھکر حالت ہونی چاہیئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رضا کے مقابلہ میں کسی کی ناراضی کا خیال نہ کرو۔ یہ میں نہیں کہتا کہ باؤلے بنو۔ بلکہ مستقیم رہو۔ شریعت پر اور پختہ کار ہو جاؤ۔ محبت میں

اگرچہ سارا جہاں خلاف بلکہ ملامت سے تو عشاق خوش ہوتے ہیں۔ اور ایک راز ہے خوش ہونیکا۔ ایک تو اس سے خوش ہوتے ہیں کہ الحمدللہ ہمیں لوگ اللہ میاں کا عاشق سمجھتے ہیں۔ ایک یہ کہ ضد میں دین اور پختہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً شادی کی اور بارات میں صرف چار آدمی لیگئے۔ پھر اس پر چاروں طرف سے لتاڑ پڑنا شروع ہوا تو اس سے اور بھی چڑ پیدا ہو جائیگی۔ اور ضد میں آکر کہیگا کہ ابکی بار اس سے بھی مختصر لو۔ اب کے تو چار آدمی بھی تھے اب کے دیکھنا انشاء اللہ جو چار آدمی بھی ہوں۔ کرلو میرا کیا کرتے ہو۔ اگر لتاڑ نہ پڑے تو اتنے پختہ نہ ہوں جتنے لتاڑ میں پختہ ہو جاتے ہیں اس لئے لتاڑ بھی اللہ میاں کی بڑی رحمت ہے بس تو نیک کام پر اگر لتاڑ پڑے تو خدا کا شکر کرو۔ خلاصہ یہ کہ طریق محبت ہے اصل لیکن اس کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے اسواسطے کہ اگر عمل نہ کیا تو محبت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ گھٹ جاتی ہے۔ اور گھٹتے گھٹتے بالآخر بالکل ہی فنا ہو جاتی ہے۔ (جیسے چراغ میں اگر تیل ڈالنا چھوڑ دیں تو لَو کم ہوتی چلی جائیگی۔ اور رفتہ رفتہ چراغ گل ہو جائیگا) چنانچہ اسی طریق محبت کی طرف اشارہ ہے آیت کے اس جزو میں یحبھم ویحبونہ یعنی وہ لوگ ایسے ہوں گے جنسے اللہ تعالےٰ محبت کریں گے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے۔ آگے اُن کی علامت مذکور ہے کہ وہ کیسے ہیں۔ وہ ایسے ہیں کہ اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین یعنی اللہ کے ماننے والوں کے سامنے تو نرم ہیں۔ کیونکہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کے متعلقین سے بھی محبت ہوتی ہے۔ اور اللہ کے مخالفین کے سامنے سخت ہیں۔ یعنی فقط یہی نہیں کہ ان سے محبت اور میل جول نہیں بلکہ ان سے اعراض ہے اور ان کے ساتھ سختی کا

برتاؤ ہے۔ محبت کا تو یہی مقتضا ہے کہ محبوب کے مخالفین سے اعراض ہو۔ صاحب یہ کیسی محبت ہے کہ محبوب کی نافرمانی کرنیوالوں سے بھی محبت ہے۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں لا تجد قوما یومنون باللّٰہ والیوم الاٰخر یوادون من حاد اللّٰہ و رسولہ ولو کانوا آباءھم او ابنائھم او اخوانھم او عشیرتھم اولئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ ویدخلھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنہ اولئک حزب اللّٰہ الا ان حزب اللّٰہ ھم المفلحون آپ نہ پاویں گے اُن لوگوں جو اللّٰہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتے ہوں کہ وہ دوستی کریں اللّٰہ رسول کے مخالفوں کے ساتھ چاہے وہ ان کے باپ ہوں یا اولاد ہوں یا بھائی ہوں۔ یا چاہے ان کا کنبہ ہی کیوں نہ ہو۔ ان سب کو مخاطب کر کے صاف کہدیا ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد فدائے یک تن بیگانہ کآشنا باشد

اور صاف کہدیا کہ سن لو صاحب ہم میں تم میں میل نہیں ہے۔ ہمارا تمہارا مذہبی اختلاف ہے ہم سے تم سے کوئی تعلق نہیں بس معاف کرو۔ خیر اگر اتنی ہمت نہ ہو تو کم از کم محبت اور دوستی تو نہ ہو مثلاً میل جول شادیوں میں شرکت وغیرہ اور بات ہے مصرعہ مل گئے صاحب سلامت ہو گئی۔ حدیث شریف میں بھی اہل باطل کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنیکا حکم ہے ارشاد ہے لا تصلوا علی جنازتھم ولا تعودوھم یعنی اگر بیمار پڑیں تو جا کر انکی عیادت مت کرو۔ اور اگر مر جائیں تو ان کے جنازہ کی نماز مت پڑھو۔ اگر مخالفین حق سے قطع تعلق ہی ہو گیا تو ہو جانے دو۔ آخر یہ علاقے کیا کام آئیں گے۔ بلکہ ان علاقوں کے تو قطع ہو جانے پر حق سبحانہٗ تعالیٰ ایسی ایسی بشارتیں دے رہے ہیں۔

فرماتے ہیں۔ اولٰئک کتب فی قلوبھم الایمان یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان کو راسخ کر دیا ہے آگے سبحان اللہ کیا وعدہ ہے وایدھم بروح منہ یعنی خدا نے مدد دی ان کو ایک روح کے ساتھ وہ روح کیا ہے نسبت باطنی خدا کے ساتھ۔ اس سے ایسی قوت قلب میں پیدا ہوتی ہے کہ اگر سارا عالم بھی مخالف ہو جائے تو بھی کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ تعلق مع اللہ سے ایک نور قلب میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نور کو روح اس لئے کہہ دیا کہ اس سے قلب میں حیات پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق بڑھتا ہے کہ بس یہ شان ہو جاتی ہے ؎

موحد چہ برپائے ریزی زرش | چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
اُمید و ہراسش نباشد زکس | ہمین است بنیادِ توحید و بس

اور بھی بشارت سنئے ویدخلھم جنت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا یعنی ان کو ایسی جنتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی۔ اور اس سے بھی بڑی نعمت یہ ہوگی رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔ خدا اُن سے راضی ہوگا اور وہ خدا سے راضی ہونگے۔ پھر فرماتے ہیں اولٰئک حزب اللہ یہ خدا کی جماعت ہے یہ خدائی پارٹی ہے الا ان حزب اللہ ھم المفلحون۔ اور سُن لو کہ خدا ہی کی پارٹی کے لوگ فلاح پانے والے ہیں تو حضرت اب کیا تو برادری اور کیا رشتہ داری دور دور کی۔ کہتے ہیں کہ صاحب برادری کو تو چھوڑا نہیں جاتا۔ کیا کریں۔ بہت اچھا صاحب برادری کو نہیں چھوڑا جاتا تو پھر اللہ میاں کو چھوڑ دو۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک دل میں اللہ بھی ہو اللہ کا مخالف بھی ہو۔ تو حضرت نماز روزہ تو ہے مگر محبت نہیں جس کے آثار آگے مذکور ہیں۔

محبت کا اظہار

یہ آثار مسلمانوں میں کم ہیں الا ماشاء اللہ محبت کے آثار یہ ہیں اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین۔ اللہ والوں کے ساتھ نرم ہیں اور اللہ کے مخالفوں کے ساتھ سخت ہیں۔ ایک تو یہ آثار ہیں دوسرے آثار کیا ہیں یہ ہیں۔ یجاھدون فی سبیل اللہ۔ بڑی محنت کے عمل کرتے ہیں۔ تو دیکھئے محبت کے آثار میں سے عمل بھی ہے اور صاحب کیوں نہ ہو اگر محبت ہو تو وہ ظاہر کیوں نہ ہو گی (بقول شخصے ع۔ ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو) میں بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر کہیں تمہارا محبوب مدتوں کے بعد ترستے ترستے تم کو مل جائے تو بھائی ایمان سے کہو تمہارا کیا جی چاہیگا۔ کیا یہ جی نہ چاہے گا کہ اس کو فوراً سلام کریں اور دوڑ کر اس کے پاس پہونچیں۔ اور جا کر اس سے لپٹ جائیں اور کیا مزے لے لیکر اس سے گفتگو نہ کروگے اور کیا زبان سے یہ نہ کہو گے کہ اللہ کا شکر ہے مدتوں کی آرزو پوری ہوئی۔ اور کیا دعائیں نہ دوگے کہ خدا عمر دراز کرے اور زیادہ ہمت ہوئی تو کیا اس کی جوتیاں بھی ہاتھ میں لے لیکر سر آنکھوں پر نہ رکھوگے۔ اور کیا اسکے تلووں سے آنکھیں نہ ملوگے غرض کیا کیا نہیں کروگے۔ اگر اس سے محبت ہے۔ اور ایک عاشق ایسا ہے کہ معشوق ملا اور یہ منہ پھیر کر بیٹھ گئے کسی نے پوچھا یہ کیا۔ کہا تم کیا جانو ہم اہل باطن ہیں ہمارے باطن میں محبت بھری ہوئی ہے۔ ہمارا باطن لبریز ہے محبت سے مگر اظہار کی ضرورت نہیں بھائی دنیا میں کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسکو محبت ہے۔ بلکہ ہر شخص یہی کہے گا اور بالکل سچ کہیگا کہ جھوٹا ہے مکار ہے ؎

تعصی الالٰہ وانت تظہر حبہ ہذا لعمری فی الفعال بدیع

لو کان حبک صادقاً لاطعتہ　　　ان المحب لمن یحب مطیع

(ترجمہ) نافرمانی کرتا ہے تو خدا کی اور ظاہر کرتا ہے اسکی محبت کو یہ قسم ہے میری جان کی کہ عجیب بات ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اسکی اطاعت کرتا۔ کیونکہ محب جس سے محبت کرتا ہے اسکا مطیع ہوتا ہے تو صاحبو ایسے شخص کو بھلا کوئی بھی عاشق کہدیگا جو کوئی سنے گا یہی کہیگا کہ واہ صاحب اچھے عاشق ہیں اور اچھی محبت ہے کہ معشوق نے پکار اٹھا لولے ہی نہیں۔ بلایا تھا گئے ہی نہیں۔ یہ شخص ہرگز عاشق نہیں جھوٹا ہے۔ نالائق ہے۔ خواہ مخواہ شیخی بگھارتا ہے۔ کیا عاشق ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اجی حضرت یہ تو بڑی بات ہے کہ کہنا نہ مانا اہل صدق نے تو ذرا سی بات سے عاشق کو اہل وفا کے زمرہ سے خارج کر دیا ہے۔ چنانچہ کسی ہوسناک کا شعر ہے ؎

اس کے کوچہ سے جب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں　　تا نظر کام کرے رو بقفا جاتے ہیں

اب سنیے ایک عاشق نے اسکا کیا خوب جواب دیا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

اسکے کوچہ سے کب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں　　وہ ہوسناک ہیں جو رو بقفا جاتے ہیں

جو عاشق ہوگا وہ کوچہ محبوب سے اٹھ کر ہی کیوں جائیگا۔ محبوب ہی اٹھکر چلا جائے تو یہ دوسری بات ہے۔ تو دیکھئے اس کو بھی خلاف محبت کہا ہے۔

عشق الٰہی کا دعویٰ

اللہ رسول کی محبت کا تو دعویٰ اور حال یہ کہ جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اقیموا الصلوٰۃ نماز پڑھو تو آپ کہتے ہیں نہیں صاحب میں تو نہیں پڑھتا۔ جب زکوٰۃ کا حکم دیتے ہیں تو کہتے ہیں میں نہیں دیتا۔ جب روزہ کے لئے کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں میں نہیں رکھتا اسی طرح جب خلاف شرع لباس۔ شرک سے۔ بدعت سے منع کیا جاتا ہے تو جواب

ملتا ہے کہ نہیں صاحب میں تو نہیں مانتا۔ اور کہنے کو اللہ کے عاشق ہیں۔ زبان پر ہے ہائے اللہ ہائے اللہ۔ یہ اچھے عاشق ہیں صاحب میں کہتا ہوں کہ جیسے مخلوق کی محبت تھی کہ محبوب کو دیکھتے ہی رہ نہ سکا بدون ہاتھ پاؤں چومے بدون لپٹے۔ بدون قدموں پر گرے۔ بدون تلوے چاٹے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جانے سے۔ گر پڑنے سے تعریف کرنے سے کیسے رہا گیا۔ اگر محبت ہوتی تو تعظیم کے کلمات بھی کیوں نہ زبان سے نکلتے جھک بھی کیوں نہ جاتا۔ سجدہ میں بھی کیوں نہ گر پڑتا۔ اسی کا تو نام نماز ہے تو نماز پڑھتے نہیں اور اللہ کے عاشق ہیں اچھے عاشق ہیں۔ کوئی شعر سنا تھا یا گانا بجانا سنا تھا اس پر کودنے لگے۔ بس عاشق ہیں۔ اگر یہی ہے تو پھر سانپ بھی اولیاء اللہ ہیں کیونکہ جب بین کی آواز سنتے ہیں تو وہ بھی مست ہو جاتے ہیں۔ آدمی کیا بہت سے جانور بھی گانے بجانے پر عاشق ہیں۔ بھلا یہ کوئی محبت ہے۔ محبت تو وہ چیز ہے کہ خدا کی قسم نہ گانے کی ضرورت نہ بجانے کی ضرورت اور بے چین ہیں ؎

کسانیکہ یزداں پرستی کنند	برآواز دولاب مستی کنند

بلکہ اسکی بھی ضرورت نہیں ان کی تو ہر وقت یہ شان ہے ؎

خوشا وقتِ شوریدگان غمش	اگر ریش بینند وگر مرہمش
؎ دمادم شراب الم درکشند	وگر تلخ بینند دم درکشند
؎ گدایانے از پادشاہی نفور	بامیدش اندر گدائی صبور

حضرت انکے سر پر ہر وقت آرے چلتے ہیں انکی حالت کی دوسرے کو کیا خبر۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست	حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

کسی کو کچھ خبر نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ وہاں تو ہر وقت یہ حالت ہے ؎

کشتگان خنجر تسلیم را — ہر زماں از غیب جانے دیگر است

ان کی حالت تو یہ ہے کہ ان سے ذرہ برابر نافرمانی نہیں ہوتی۔ حضرت عشق اور محبت تو یہ ہے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یجاھدون فی سبیل اللہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں۔ یعنی صرف عمل نہیں بلکہ سخت سے سخت محنت کے کام کرتے ہیں۔ پھر ایسوں کو بھلا کہاں بھوک پیاس۔ کہاں چین آرام۔ کہاں حظوظ و لذائذ کا اہتمام۔ کہاں مرغن کھانوں کی رغبت ہاں خدا دے تو کھا بھی لیتے ہیں مگر اہتمام نہیں نہ ان چیزوں سے انکو دلچسپی بلکہ ان کا مذہب یہ ہوتا ہے ؎

عاقبت سازد ترا از دیں بری — ایں تن آرائی و ایں تن پروری

وہ تو ان سب خرافات سے یکسو ہو چکے ہیں اور ہر وقت خدا جانے کس شغل میں ہیں چونکہ وہ اہل محبت ہیں اسواسطے سخت سے سخت کام بھی کر لیتے ہیں۔ مشکل سے مشکل کام بھی انکے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ تو دیکھیے خود حق تعالیٰ کے ارشاد یجاھدون فی سبیل اللہ سے معلوم ہوا کہ محب کے واسطے عمل معاف نہیں۔ بلکہ اس پر اور زیادہ محنت پڑتی ہے۔ نیز محبت کے آثار میں سے یہ بھی ہے کہ لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ کوئی کچھ کہے پروا نہیں کرتے۔ اپنے کام میں مشغول ہیں کوئی کچھ ہی کہا کرے ذرہ برابر التفات نہیں کرتے۔ آگے فرماتے ہیں ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں واللہ واسع علیم اور اللہ میاں بڑی وسعت والے ہیں چاہیں تو سب کو یہ نعمت عطا فرما دیں مگر وہ علیم بھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ کون دینے کے قابل ہے

کون نہیں۔ جو مانگتا ہے اسی کو دیتے ہیں۔ کسی کے سر نہیں منڈتے۔ یہ ہے آیت کا ترجمہ اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ کن لوگوں کی [illegible]ح ہے اور مدح کا کیا حاصل ہے۔ مدح کا حاصل یہ ہے کہ خدا سے کامل محبت [illegible] خدمت اور طاعت میں پوری مشقت اٹھاتے ہیں۔ اور کسی کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ بس اسی شان کے شخص کو قلندر کہتے ہیں۔ اور یہی معنی قلندر کے حضرت عراقی کے اس شعر میں ہیں ؎

شمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی   کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

تو گویا عراقی کا شعر خلاصہ ہے قرآن مجید کی آیت کا اور قرآن مجید کی آیت تفصیل ہے عراقی کے قول کی۔ پس قلندر وہ ہے جس میں عمل اور محبت دونوں جمع ہوں۔ اور جسکی یہ شان ہو ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق   ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

اور رہِ پارسائی وہ ہے جس میں نرا عمل ہو بلا محبت۔

قلندرانہ طریق عمل

اب میں صرف پانچ منٹ اور بیان کرونگا پھر ختم کر دونگا چونکہ بہت دیر ہو گئی ہے نیت تو یہیں ختم کر دینے کی تھی لیکن اصل مقصود بیان کرنے سے رہ گیا ہے یعنی رہ قلندر کی حقیقت تو بیان ہو گئی مگر اس کا طریق عمل بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ محض حقیقت کا حال معلوم ہو جاتا عمل کے لئے کافی نہیں۔ لہذا رہ قلندر کی تحصیل کا طریق بھی بیان کرتا ہوں۔ اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایسا طریق ہے جو محبت اور عمل دونوں کا جامع ہے۔ پس ان دونوں چیزوں کی تحصیل کا طریق معلوم ہونا چاہیئے۔ سو عمل کے متعلق تو خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمت کرو عمل ہو جائیگا۔ پس اس کا یہی طریق ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ

محبت کیونکر پیدا ہو۔ تو لیجئے میں اس کا ایک نسخہ لاکھوں روپیہ کا مفت بتلائے دیتا ہوں وہ نسخہ مرکب ہے چند اجزاء سے اور وہ سب چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں۔ غور سے سنئے وہ چند چیزیں ہیں۔ سب سے اول عمل کیونکہ میں اول ہی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ عمل میں خاصیت ہے محبت پیدا کر دینے کی۔ اور اس کو بہت بڑا دخل ہے محبت پیدا کرنے میں جا ہے تجربہ کر لو۔ روز روز کسی کے پاس جایا کرو دیکھو محبت ہو جاویگی پہلے تھوڑی ہو گی پھر جاتے جاتے ایسا تعلق ہو جاویگا کہ بہت ہی زیادہ۔ غرض یہ مسلم امر ہے کہ میل جول جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی زیادہ محبت ہو گی۔ وہ جو کہتے ہیں پہلے کی محبت اس کی بیبی تو اصل ہے غرض نیک عمل میں یہ برکت ہے کہ اس سے محبت حق پیدا ہو جاتی ہے۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم تو مدت سے نیک عمل کر رہے ہیں مگر محبت پیدا نہیں ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ نیک عمل کے مفہوم میں ایک یہ ہی نہیں کہ بس عمل کر لیا بلکہ وہ مرکب ہے اور اجزا سے بھی۔ ایک جزو تو عمل کرنا ہے دوسرا جزو یہ ہے کہ عمل کو اس کے طریق کے مطابق کیا جائے۔ مثلاً صرف ٹکریں مارنے کو نماز نہیں کہتے۔ نیک عمل جسطرح کیا جاتا ہے اور جو اس کا مامور بہ طریق ہے اس طریق سے اس کو کرو۔ پھر دیکھو محبت کیسے نہیں پیدا ہوتی۔ تیسری وجہ اثر نہ ہونیکی یہ ہے کہ تم نے عمل کو صرف عادت سمجھکر کیا۔ اس نیت سے نہیں کیا کہ اللہ کی محبت بڑھ جاوے۔ عمل میں یہ نیت نہیں کی کہ اے اللہ آپ کی محبت پیدا ہو جائے۔ سو اس نیت سے عمل کرو پھر دیکھو انشاء اللہ کیسا اثر ہوتا ہے۔ بہر حال ایک جزو تو اس نسخہ کا یہ ہے کہ نیک عمل میں بہ نیت ازدیاد محبت استقامت کے ساتھ مشغول ہو۔

اہل محبت کی صحبت

دوسری بات ضروری یہ ہے کہ اللہ کا نام لو جی لگا کر یعنی تھوڑا اللہ اللہ بھی کر د۔ تیسری بات یہ ہے اور یہ بہت ہی ضروری ہے کہ اہل محبت کی صحبت اختیار کرو۔ اس سے لوگ بھاگتے ہیں اول تو اسطرف توجہ ہی نہیں کہ کسی بزرگ کی خدمت میں جاکر رہیں۔ بس تھوڑی سی کتابیں پڑھ لیں اور سمجھ لیا کہ ہم کامل مکمل ہو گئے۔ بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل مکمل ہوا ہے۔ ہاں تم کمبل تو ہو گئے یعنی کمبل پوش باقی نہ کامل ہوئے نہ مکمل۔ ارے بھائی موٹی بات ہے کہ بلا بڑھئی کے پاس بیٹھے کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا۔ حتیٰ کہ اگر بسولہ بھی بطور خود ہاتھ میں لیکر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھایا جاسکے گا۔ بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی کے پکڑنے کا انداز بھی نہیں آتا۔ بلا خوشنویس کے پاس بیٹھے ہوئے اور بلا قلم کی گرفت اور خط کی کشش کو دیکھے ہوئے ہرگز خوشنویس نہیں ہو سکتا۔ غرض بدون صحبت کامل کے کوئی کامل نہیں بن سکتا۔ لہذا پیر کامل کی صحبت لازمی ہے۔ پھر تو ایسا ہوتا ہے کہ کبھی مرید پیر سے بھی بڑھ جاتا ہے مگر ابتدا میں تو کسی شیخ کامل کی صحبت کے بغیر چارہ نہیں۔ اور آجکل اسی کی ضرورت کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اصلاح

کبھی کسی مصلح کے پاس گئے بھی تو وہاں تو ہوتی ہے اصلاح پہونچتے ہی لتاڑ پڑنا شروع ہو گئی۔ تو اب یہ حضرت گھبرائے کہ میاں کس مصیبت میں آ پھنسے۔ ہم تو آئے تھے بزرگ سمجھکر انھوں نے لتاڑنا ہی شروع کیا۔ یہ کیسے بزرگ ہیں۔ یہ کیسے اللہ والے ہیں اسکی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی معدہ کا مریض طبیب کے پاس جاکر کہے کہ دیکھو جی ہم اپنے گھر حلوے کھایا کرتے تھے حلوے ہی ہمارے لئے تجویز کرنا۔ ذرا حماقت تو دیکھئے حالانکہ خدا کے فضل سے آپ کو دست بھی ہو رہے ہیں

معدہ بھی خراب ہے۔ ہضم بھی درست نہیں یہ تو حضرت کی حالت اور حلوے کی فرمائش طبیب بھلا اسکی کیوں رعایت کرتا اس نے اسکی حالت کے مناسب کڑوا مسہل جوز کیا۔ اور جب اُس نے پینے سے انکار کیا اور تین پانچ کی تو گرا کر زبردستی چمچوں کے ذریعہ سے پلا دیا۔ لیکن اس نے قصداً قے کر کر کے سارے پئے ہوئے مسہل کو پیٹ سے نکال دیا۔ آپ قے کرتے جاتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ واہ جی ہم تو اپنے گھر میں حلوے کھایا کرتے تھے حکیم جی نے نہ جانے کیا الابلا پلا دی کاش کوئی خیر خواہی سے کہتا کہ ارے بیوقوف تو کیا سمجھے تجھے جو وہ اسوقت کڑوا مسہل پلا رہا ہے تو تیرے ساتھ وہ دشمنی نہیں کر رہا ہے بلکہ دراصل وہ تجھے حلوے کھانے کے قابل بنا رہا ہے۔ ابھی تیرا معدہ حلوے کے قابل نہیں ایسی ہی حالت میں حلوہ کھانے سے تو تجھے دست ہو رہے ہیں۔ تو حضرت اصلاح تو اصلاح ہی کے طریقہ سے ہوتی ہے۔ مولانا نے مثنوی میں اسی مضمون کو ایک حکایت کے ضمن میں لکھا ہے۔ حکایت یہ لکھی ہے کہ ایک قزوینی نے ایک دلاک سے کہا کہ تم میرے شانہ پر ایک تصویر شیر کی گود دو۔ چنانچہ اس نے گودنا شروع کیا اور سوئی لیکر کچ سے کر دیا۔ قزوینی کو بہت تکلیف ہوئی تو ہائے وا ویلا کرنے لگا اور کہنے لگا کہ ارے میاں یہ کیا کر رہے ہو اُس نے کہا کہ کر کیا رہا ہوں شیر کی شکل بنا رہا ہوں۔ پوچھا کس عضو سے شروع کیا ہے۔ کونسی چیز بنا رہے ہو۔ کہا دُم کی طرف سے شروع کیا ہے۔ دُم بنا رہا ہوں کہا میاں اس شیر کے لئے دُم کی کیا ضرورت ہے۔ بے دُم ہی کا سہی۔ ارے چھوڑو بھی اس دم کو خیر تو اس نے دُم ہی نکال دیا۔ پھر اس نے دوسری طرف سے شروع کیا۔ پھر کچ سے سوئی چبھوئی۔ پھر وہ چیخنے چلانے لگا اور پھر پوچھا اب کونسا عضو بنا رہے ہو کہا ابکی دفعہ کان بنا رہا ہوں وہ بولا کہ ارے میاں لیجئے شیر بوچے بھی تو ہوتے ہیں۔ کان بھی چھوڑ دو۔ بوچا ہی شیر سہی

پھر تیسری جگہ سوئی لگائی تو پھر چلانے لگا اور پوچھنے لگا کہ بھائی اب کیا بنا رہے ہو۔ کہا پیٹ۔ کہا میاں تم بھی عجب آدمی ہو اجی وہ سسر اکھلائے پیٹ کا تھوڑا ہی۔ جو پیٹ بنا رہے ہو۔ یہ بھی رہنے دو۔ اب تو دلاک کو بڑا غصہ آیا۔ سوئی اٹھا کر زمین پر پھینک دی اور جھلا کر کہا ؎

شیر بے گوش و سر و اشکم کہ دید ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

میاں ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں بنایا۔ جس کے نہ سر ہو نہ کان نہ پیٹ۔ پھر مولانا اس سے نتیجہ نکالتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

چوں نداری طاقت سوزن زدن از چنیں شیر ژیاں پس دم مزن

تم جو شیخ کے پاس اصلاح کی غرض سے آئے ہو تو اس کی سختی اور لتاڑ کو برداشت کرو اور اگر قزوینی کی طرح سوزن کی برداشت نہیں ہے تو شیر کا نام ہی مت لو۔ اصلاح کی درخواست ہی نہ کرو۔ بھائی وہاں تو اصلاح اصلاح ہی کے طریقہ سے ہوگی۔ پھوڑا لیکر گئے ہو تو نشتر لگے ہی گا۔ اب وہاں تو نشتر لگانا ضروری اور یہاں یہ حال ؎

تو بیک زخمے گریزانی ز عشق تو بجز نامے چہ می دانی ز عشق

بس نام ہی نام ہے عشق کا۔ ایک ہی زخم لگا تھا کہ بھاگ گئے وہاں کا تو ادب یہ ہے کہ ؎

چوں گزیدی پیر نازک دل مباش سست و ریزندہ چو آب و گل مباش

ور بہر زخمے تو پر کینہ شوی پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

یہ مصیبت ہو گئی ہے۔ تو حضرت نرا وظیفہ اصلاح کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ نرے وظیفے والے پیروں سے واللہ ثم واللہ ثم واللہ جو کبھی اصلاح ہو۔ اصلاح تو ہوتی ہے اصلاح کے طریقے سے تو اہل محبت کے پاس جاؤ اور وہ جو کہیں وہ کرو۔ تھوڑے دنوں میں دل

نور سے معمور ہو جائیگا۔ اور خدا کی قسم اس قدر محظوظ ہوگے کہ تمہاری نظر میں پھر سلطنت کی بھی کچھ حقیقت اور وقعت نہ رہیگی (حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

چو بیخود گشت حافظ کے شمارد — بیک جو مملکت کاؤس کے را

نتیجہ جناب میرے پاس قسم سے زیادہ کوئی ذریعہ یقین دلانے کا نہیں۔ اے صاحب مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو اس طریق سے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کر لیگا وہ ایسا ہو جائیگا کہ پھر اس کو نہ موت کا خوف ہو گا نہ ذات الجنب کا نہ نمونیہ کا۔ نہ بخار کا۔ نہ قحط کا۔ نہ وبا کا۔ کوئی غم نہ رہیگا۔ بس بالکل جنت کی سی حالت ہو جائیگی۔ ہاں غم ہو گا تو ایک کہ اللہ میاں تو ناراض نہیں۔ خدا کے نزدیک میں کیسا ہوں۔ نہ جانے وہ مجھ سے راضی ہیں یا ناراض۔ بس اس غم کے سوا اور کوئی غم نہ ہو گا۔ مگر یہ غم ایسا لذیذ ہے کہ ہزاروں خوشیاں اس پر نثار۔ اس شخص سے اگر کوئی کہنے لگے کہ لاؤ تمہارا یہ غم تو ہم لے لیں اور اس کے عوض اپنی ساری خوشیاں تمہیں دیدیں۔ تو کبھی نہ بدلیگا۔ تو حضرت یہ دولت ملے گی۔ اہل اللہ کے پاس جانے اور ان کا اتباع کرنے سے تو حاصل طریق کا یہ ہے کہ اعمال میں ہمت کر کے شریعت کے پابند رہو ظاہراً و باطناً۔ اور اللہ اللہ کرو۔ اور کبھی کبھی اہل اللہ کی صحبت میں جایا کرو۔ اور ان کی غیبت میں جو کتابیں وہ بتائیں ان کو پڑھا کرو۔ لو جی یہ چار چیزیں ہیں۔ میں ٹھیکہ لیتا ہوں کہ جو ان چار پر عمل کر کے دکھلا دیگا وہ یحبہم ویحبونہ کا مصداق یعنی اللہ تعالیٰ کا محبوب اور محب ہو جاویگا ضرور ہو جاویگا۔ ضرور ہو جاویگا۔ ضرور بالضرور ہو جاویگا۔ لو صاحب اب اختیار ہے۔ جو چاہے عمل کر کے دیکھ لے اور تجربہ کرلے۔ اور اس کی ضرورت نہیں کہ مرید ہو جاوے۔ اجی کس کی پیری مریدی لئے پھرتے ہو یہ تو پکھنڈ ہے۔ بیعت کی صورت ضروری نہیں اصل چیز بیعت

کی روح یعنی اتباع ہے۔ جیسے طبیب سے رجوع کرتے وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ تحقیق نیت کرتا ہوں میں کہ آج سے بناؤں گا تم کو طبیب اپنا اللہ اکبر۔ اسی طرح اس کی کیا ضرورت ہے کہ پیر کہے کہ میں نے تمہیں مرید کیا اور مرید کہے میں نے تمہیں پیر بنایا۔ اس پٹہ اور قبولیت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر پکے کاشت کار ہو گے اور طریقہ سے کاشتکاری کرو گے تو بلا پٹہ و قبولیت کے بھی غلہ پیدا ہو گا۔ غرض مرید ہونے کی ضرورت نہیں۔ پیر کے مطابق کام شروع کر دو۔ بس ہو گیا تعلق۔ واللہ وہی نفع ہو گا جو پیری مریدی میں ہوتا ہے۔ اب لوگوں کا عجب حال ہے کہ کام بناؤ تو نہ کریں بس بیعت کا نام کرنا چاہتے ہیں۔ بیعت کیا ہے۔ محض رسم ہی رسم رہ گئی ہے۔ چنانچہ جو پیر ایسے ہیں کہ مرید تو کر لیتے ہیں لیکن کام کچھ نہیں بتلاتے ان سے تو لوگ بہت خوش ہیں اور میں مرید تو کرتا نہیں لیکن کام بتلاتا ہوں۔ تو مجھ سے ناراض ہیں۔ یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ جو بھید ہیں فقیری کے وہ جو انچھر ہیں۔ پریم کے وہ مریدوں ہی کو بتائے جاتے ہیں یہ خیال ہے کہ مرید کرتے ہی پیر بس پریم کے دو انچھر بتا دیگا۔ اور اللہ والے ہو جائیں گے۔ دہرے تھے انچھر دہرے تھے بھید ڈلے پتھر۔ میاں خدا رسول کا نام لو۔ اور احکام بجالاؤ۔ بس یہی انچھر ہیں۔ اصلاح نفس کے طریقے پیر سے پوچھو یہی بھید ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ کیا باطنی طریق بس یہی ہے تو ہم بہ آواز دہل کہیں گے کہ ہاں یہی ہے۔ اور اس طریق میں کبھی بڑے بڑے حالات بھی پیش آئیں گے۔ بڑی بڑی کیفیت بھی طاری ہو نگی یہ سب ہو گا مگر یہ مقصود نہیں ہے۔ بھائی حالات تو سڑک کے درخت ہیں۔ پھولوں کے نظر آئے تو کیا نہ نظر آئے تو کیا سڑک تو بہر حال قطع ہو گی۔ درختوں اور پھولوں کا نظر آنا نہ آنا سڑک کے قطع ہونے کے لئے ضروری نہیں نظر پڑیں گے۔ تب قطع ہو گی۔ نہ نظر پڑیں گے تب قطع بس چلتے رہنا شرط ہے۔ اور بعضوں کو یہ درخت اور پھول عمر بھر بھی نظر نہیں آتے واللہ جن حالات کو آپ بڑا

کمال سمجھتے ہیں۔ طریق میں بس ایسے ہیں۔ جیسے سڑک پر دو طرفہ درخت لگے ہوں۔ گلاب اور بیلے کے۔ کبھی نظر نیچی کر کے چلتے ہیں تو کیا راستہ قطع نہیں ہوتا۔ راستہ تو برابر قطع ہوتا ہے۔ چاہے درخت نظر پڑیں یا نہ پڑیں۔ افسوس ہے تصوف کا ناس کر دیا ہے۔ ان جاہل صوفیوں نے اور فقیری کو ہوا بنا رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ چلّے کھینچو۔ بیوی کو طلاق دیدو اولاد کو عاق کر دو۔ دروازہ کو تیغا کر دو۔ چالیس چنے رکھ لو اور ایک چنا روز کھاؤ۔ بدون اس کے اصل فقیری ملتی ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں واللہ دو شالوں میں گدے تکیوں میں سلطنت میں۔ مرغن کھانوں میں فقیری ملتی ہے۔ مگر گھر میں نہیں شیخ کامل کی خدمت میں ملتی ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ جن کی شان اتنی بڑی ہے کہ مولانا رومؒ جیسے عارف کی ان کے بارہ میں یہ رائے ہے ؎

هفت شهر عشق را عطار گشت ... ما هنوز اندر خم یک کوچه ایم

وہ فرماتے ہیں ؎

گر هوائے این سفر داری دلا ... دامنِ رهبر بگیر و بس بیا

؎ در ارادت باش صادق اے فرید ... تا بیابی گنج عرفاں را کلید

؎ بے رفیقے هر که شد در راهِ عشق ... عمر بگذشت و نشد آگاهِ عشق

شیخ کامل مگر شیخ ہونا چاہیئے کامل۔ اور کامل شیخ کی پہچان یہ ہے کہ شریعت کا پورا متبع ہو۔ بدعت اور شرک سے محفوظ ہو۔ کوئی جہل کی بات نہ کرتا ہو۔ اس کی صحبت میں بیٹھنے کا یہ اثر ہو کہ دنیا کی محبت گھٹتی جائے اور حق تعالیٰ کی محبت بڑھتی جائے اور جو مرض باطنی بیان کرو اس کو بہت توجہ سے سنکر اس کا علاج تجویز کرے اور جو علاج تجویز کرے اس علاج سے دمبدم نفع ہوتا چلا جائے اور اس کے اتباع کی بدولت

روز بروز حالت درست ہوتی چلی جائے۔ یہ علامت ہے شیخ کامل کی۔ ایسا شخص اگر ملجائے تو وہ اکسیر اعظم ہے۔ تو یہ ہے طریقہ محبت پیدا کرنیکا۔ اس سے تو ہو گی محبت آگے رہا عمل تو اس کے لئے ضرورت ہو گی ہمت کی۔ اب ایک اور غلطی میں لوگ مبتلا ہیں کہ پیر بنا کر اس کو بلیہ دار اور ذمہ دار اعمال کا سمجھتے ہیں۔ اسمیں ان کا قصور نہیں۔ کیونکہ ان کو بہکایا ہے دکانداروں نے۔ چنانچہ ایک گاؤں میں ایک پیر صاحب آیا جایا کرتے تھے۔ ایک بار آئے تو کچھ دُبلے ہو رہے تھے۔ گھر پر مرغن کھانے نہ ملے ہوں گے۔ ایک چودھری نے جو مرید تھا دیکھکر کہا کہ اے پیر یہ کیا بات ہے۔ توں (یعنی تو) دُبلا بہت ہو رہا ہے۔ اب کیا تھا انھیں موقع مل گیا۔ کہا کہ چودھری جی دُبلا نہ ہوں تو کیا ہوں۔ تمہاری طرف سے کام بھی تو مجھے بہت کرنے پڑتے ہیں۔ تم نماز نہیں پڑھتے۔ تمہاری طرف سے مجھے نماز پڑھنی پڑتی ہے۔ تم روزے نہیں رکھتے تمہاری طرف سے مجھے روزے رکھنے پڑتے ہیں۔ اور سب سے مشکل کام یہ ہے کہ تمہاری طرف سے مجھے پلصراط پر چلنا پڑتا ہے۔ جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ بس اسی فکر میں جان سوکھی جاتی ہے۔ اب تو معلوم ہو گیا کہ کیوں دُبلا ہو رہا ہوں۔ ان ہی دھیوں سے دُبلا ہو گیا۔ یہ سُنکر چودھری کو بڑا رحم آیا۔ کہنے لگا وہ وہ (کلمہ تاسف) ارے پیر تجھے تو بڑے کام کرنے پڑ رہے ہیں۔ تیرے اوپر تو بڑی محنت پڑے ہے۔ جا میں نے تجھے اپنا موٹھی کا کھیت دیا۔ پیر صاحب نے سوچا کہ یہ گاؤں کے لوگ ہیں ان کا کیا اعتبار ہے ابھی چلکر کھیت پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ ورنہ ممکن ہے بعد کو رائے بدل جائے فوراً کہا کہ چودھری جی میں نے تمہارا وہ کھیت کبھی دیکھا نہیں چل کے مجھے دکھا دو اور قبضہ کرا دو۔ اس نے کہا چل۔ اب یہ صاحب تو آگے آگے اور مرید صاحب پیچھے پیچھے کھیتوں میں راستہ نہیں ہوتا پتلی پتلی ڈولیں ہوتی ہیں۔ خاص طور سے موٹھی اور دھان کے کھیتوں کی ڈول بہت

اونچی اور پتلی ہوتی ہے۔ اور کھیتوں میں پانی بھرا رہتا ہے اور یہ دونوں بھی ایک پتلی سی ڈول پر چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً پیر صاحب کا پیر پھسلا اور دھڑام سے نیچے آ رہے کیونکہ پانی کی وجہ سے مٹی بھی چکنی ہو رہی تھی۔ چودھری نے کود کر اوپر سے ایک لات رسید کی اور کہا کہ سُسرے تو تو کہے تھا کہ میں پُل صراط پر چلوں ہوں جو بال سے بھی باریک ہے۔ تُو بالکل جھوٹا ہے ایک بالشت چوڑی مینڈ پر تو تجھ سے چلا ہی نہ گیا۔ بال سے باریک پلصراط پر تو تُو ضرور چلتا ہوگا۔ جائیں کھیت نہیں دیتا۔ میں تو پل صراط کے بدلے دوں تھا۔ اب کیوں دوں جائیں اب نہیں دیتا۔ کھیت کا کھیت بیچارے کے ہاتھ سے گیا۔ پانی میں جدا گرا۔ اور اوپر سے لات پڑی سو الگ۔ تو جناب ان جاہلوں کو ایسے دکانداروں نے یہ پٹی پڑھا رکھی ہے کہ تمہیں کچھ عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب ہمیں کرلیں گے۔ بس اب وہ سچے پیروں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ چنانچہ میرے پاس خطوط آتے ہیں کہ صاحب تہجد کے لئے آنکھ نہیں کھلتی دعا کر دو کہ آنکھ کھلا کرے۔ میں لکھ دیتا ہوں کہ اچھا میں اس شرط پر دعا کروں گا کہ آپ میرے لئے یہ دعا کر دیجئے کہ میری ایسی ٹانگیں ہو جائیں کہ میں روز کلکتہ پہنچکر اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو اٹھا دیا کروں۔ بیوقوف ہوئے ہو۔ اگر آنکھ نہیں کھلتی تو میں کیا کروں۔ میاں اٹھو کسی طرح۔ اور اگر کسی طرح نہیں اٹھا جاتا تو عشاء کے بعد ہی تہجد کی رکعتیں پڑھ لیا کرو غرض ہر چیز کا علاج ہے۔

توجہ کی حقیقت

بعضے کہتے ہیں کہ وظیفہ پورا نہیں ہوتا کوئی ایسی توجہ دیجئے کہ وظیفہ پورا ہو جایا کرے۔ پس سارے کام توجہ ہی سے چلانا چاہتے ہیں۔ لاؤ میں توجہ کی حقیقت ظاہر کردوں۔ صاحبو کہیں دوسروں کی توجہ سے بھی کام چلتا ہے جب تک کہ خود توجہ نہ کرے۔ اور ہمت سے کام نہ لے سارا کام ہمت پر موقوف

ہے۔ بیوقوف یوں سمجھتے ہیں کہ بس سب کچھ پیروں کے ہاتھ میں ہے۔ پیر تو بیچارے کیا چیز ہیں خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو طالب کے لئے بہت چاہا کہ مسلمان ہو جائیں۔ مگر ہدایت نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا آپ کو ارشاد ہوا انک لا تھدی من احببت یعنی آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔ لیجئے جب خود حضورؐ ہی اپنی توجہ سے ہدایت نہ کر سکے تو پیر بیچارے تو کیا کرتے۔ دیکھا آپ نے۔ اتنو صاحبو آپ کو توجہ کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ پھر ایک اور غضب یہ ہے کہ دین تو دین دنیا کے کام بھی پیر ہی کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ ایک صاحب نے مجھے خط لکھا کہ یہاں اتنے آدمی ابتک طاعون میں مر چکے ہیں۔ خیر جو مر چکے وہ تو مر چکے اب جو زندہ ہیں انکی خیریت چاہیئے۔ ایسی دعا کیجئے کہ وہ نہ مریں۔ میں نے لکھا کہ حضور آپ کو تو ماشاء اللہ وہاں کی انسپکٹری مل گئی ہے۔ جو وہاں کے انتظامات کی فکر ہے لیکن مجھے ابھی ٹھیکیداری نہیں ملی۔ تم تو انسپکٹر ہو گئے ہو مگر میں تو ٹھیکہ دار نہیں ہوا۔ یہ درخواست تو ایسی ہے کہ گویا حوالات سے اتنے مجرم تو بھاگ گئے بقیہ کا میں پہرہ دوں۔ سو مجھے اس چوکیداری سے معاف رکھیئے۔ اس قسم کی حماقتیں کرتے ہیں نعوذ باللہ شرک میں مبتلا ہو گئے لوگ۔ غرض یہاں تو جو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اور تم چاہتے ہو کہ کچھ کرنا نہ پڑے پیر کی توجہ ہی سے سب کام بن جائیں اور کمال حاصل ہو جائے۔ ارے بھائی جن سے یہ درخواست ہے پہلے اُن سے تو تحقیق کر لو۔ کہ انہیں جو کمال حاصل ہوا ہے وہ کاہے سے حاصل ہوا ہے۔ حضرت پِسا پینے سے پہلے چکی پیسی۔ پھر آٹا نکل آیا۔ پھر پانی ڈال کر آٹا گوندھا۔ پھر روٹی بنا کر توے پر ڈالی پھر وہ پک گئی پھر کھالی۔ اب تم چاہتے ہو کہ کرنا تو کچھ نہ پڑے اور پیٹ بھر جائے۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی دو شخص ہم سفر تھے کسی مقام

پر روٹی پکانے کے لئے ٹھہرے۔ تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ آٹا تو میں لے آؤں لگا لکڑی تم لے آؤ۔ اس نے کہا بھائی مجھ سے تو نہیں اٹھا جاتا۔ میں تو بہت تھک گیا ہوں تمہیں دونوں چیزیں لے آنا۔ خیر وہ آٹا بھی لے آیا۔ لکڑی بھی لے آیا۔ پھر اس نے کہا کہ میں آگ جلاؤں تم آٹا گوندھ لو۔ کہا اجی صاحب معلوم نہیں پتلا ہو جائے سخت ہو جائے پھر تم خفا ہونے لگو۔ بس تمہیں گوندھ۔ بیچارے نے آٹا بھی گوندھ لیا۔ پھر اس نے کہا کہ تم تو بے پر روٹی ڈالتے جاؤ۔ میں سینکتا جاؤں۔ کہا میں نے تو بھائی کبھی روٹی پکائی نہیں۔ کچی رہ جاوے۔ جل جائے تمہیں اچھی پکاؤ گے خیر اس نے روٹی بھی پکالی۔ جب سب ہو ہوا چکا اور روٹی پک پکا کر تیار ہو گئی۔ تو اس نے ساتھی سے کہا کہ آؤ روٹی تیار ہے کھالو۔ کہنے لگا بھائی تمہارے خلاف کرتے ہوئے بہت دیر ہو گئی اب کہاں تک خلاف کروں اور کب تک انکار کرتا رہوں۔ شرم آتی ہے۔ اچھا لاؤ کھالوں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بس احسان جتا کر کھانے بیٹھ گئے۔ خیر غنیمت ہے ایک بات تو مانی۔ تو اب تم بھی چاہتے ہو کہ ایسا پیر ملے جو پکی پکائی کھلا دے۔ لیکن ایسا نہ ہوگا۔ ع ایں خیال است و محال ست و جنوں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو پکی پکائی کھلائی ہی نہیں اور کسی کی تو کیا ہستی ہے۔ اور کیا مجال ہے حضورؐ تو غایت شفقت سے بہت چاہتے تھے۔ کہ پکی پکائی ہی کھلا دیں مگر غیرت حق اور مصلحت دین کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت نہ دی۔ تو بھائی خوب سمجھ لو کہ کام کرنے ہی سے کام چلیگا بس طریق یہی ہے کہ کام کرو اور محنت کرو۔ خدا برکت دیگا۔ اگر کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ کام کرو اور محنت کرو جیسا کہ جاھدوا فی سبیل اللہ سے بھی ثابت کر چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ جو پیر ایسا کامل مکمل ہو اور جس میں مذکورہ علامتیں

ہوں اس کی خدمت میں رجوع کرو۔ لیکن بیعت پر اصرار نہ کرو۔ درخواست پر اگر وہ کر لے اس کی عنایت ہے۔ باقی تم اس کو دق نہ کرو پھر جو وہ کہے کرو۔ اگر محنت کراوے محنت کرو۔ ذکر و شغل کراوے ذکر شغل کرو۔ غرض اس کی فکر میں لگ جاؤ۔ کہ کسی کامل مکمل کی صحبت میسر آئے۔ اب آخر میں یہ عرض ہے کہ مقصود میں کوتاہی کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو عمل میں کوتاہی کرتے ہیں ان کو چاہیئے کہ اپنے قصد کو پختہ کریں اور ہمت سے کام لیں۔ دوسرے وہ ہیں جن میں محبت کی کمی ہے۔ وہ اہل محبت کی صحبت اختیار کریں۔ غرض یہ دونوں چیزیں لازم طریق ہیں۔ ایک عمل دوسری محبت اول میں ہمت کی ضرورت ہے۔ دوسرے میں اہل اللہ کی صحبت اور ان کے اتباع کی۔ اس سے ان صفات کے جامع اور ان ثمرات کے مستحق ہو جاؤ گے جو اس وقت بہ ضمن آیت قرآن بالتفصیل بیان کیئے گئے۔ جو کچھ مجھے کہنا تھا میں کہہ چکا۔ اب میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں اور اس کا نام اس کی خصوصیات کے لحاظ سے جو کہ ظاہر ہیں طریق القلندر رکھتا ہوں۔ اس نام میں یہ بھی مصلحت ہے کہ قلندر کے متعلق چونکہ عموماً لوگ بہت غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اس نام کو سن کر یا دیکھ کر بے اختیار ان کو اشتیاق ہوگا کہ لاؤ دیکھیں اس وعظ میں طریق قلندر کی کیا حقیقت بیان کی گئی ہے اور جب دیکھیں گے تو عمر بھر کے لئے ساری غلط فہمیوں سے محفوظ ہو جائیں گے اور حضرت حافظ کے ان اشعار کی حقیقت کی تحقیق اور حقیقت کی تصدیق ہو جاوے گی ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ۔۔۔ نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہزار نکتۂ باریکتر ز مو اینجاست ۔۔۔ نہ کہ سر بتراشد قلندری داند

اب دعا کیجیئے کہ اللہ تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائیں اور قلندر کی جو صفت اس وقت کتاب و سنت اور اقوال مشائخ و ائمہ طریق سے بیان کی گئی ہے۔ اس کا پورا پورا مصداق بنائیں

اور ہر قسم کی گمراہی اور کجی سے ہمیشہ محفوظ و مامون رکھیں ۔ چونکہ یہ بیان حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کے قریب ہوا ہے ۔ جس میں حضرت کا روحانی فیض شامل ہونا بھی بعید نہیں ۔ اس لئے میں اس کا ثواب حضرت کی روح مبارک کو پہنچاتا ہوں ۔ (پھر سارے مجمع نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی ۔ اور بعد دعا حضرت نے فرمایا کہ مصافحہ سے معافی چاہتا ہوں ۔ مجھ کو بھی تکلیف ہوگی اور سب کو تکلیف ہوگی ۔ گیارہ بج چکے ہیں ۔ رات زیادہ ہوگئی ۔ سب صاحب آرام فرمائیں "فقط)

اوجِ قنوج

تواضع کی حقیقت، ضرورت اور فوائد کے متعلق یہ وعظ قنوج کی جامع مسجد میں ۳ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ بروز جمعہ ہوا جو ۲ گھنٹہ ۲۲ منٹ میں ختم ہوا، جسے حکیم محمد مصطفیٰ صاحب مقیم میرٹھ نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ
ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یہدہ اللہ
فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ
وحدہ لاشریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ
ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک
وسلم، اما بعد فقال علیہ الصلوٰۃ والسلام من تواضع
للہ رفعہ اللہ

تمہید رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے واسطے تواضع اختیار کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ رفعت و بلندی عطا فرماتا ہے میرا ارادہ بیان وعظ کا نہ تھا؛ اس سفر میں کئی جگہ فرمائش کی گئی ہے مگر جواب نفی میں دیا گیا یہ سفر اسی ضرورت سے کیا ہے کہ طبیعت عرصہ سے مضمحل ہے؛ وطن میں رہ کر فراغ ملنا مشکل تھا؛ اس واسطے یہ سفر کیا تاکہ کاموں سے فراغ رہے۔ اور راحت ملے اور وعظ کہنے میں تعب ہوتا ہے جو مقصود سفر کے خلاف ہے مگر مجھے پہلے سے احتمال تھا کہ قنوج میں ضرور استدعا کی جائے گی؛ لیکن غالب یہی ارادہ تھا کہ بیان نہ کروں گا؛ جیسا اس سفر میں اور کہیں بھی بیان نہیں ہوا؛ اور رات نیند بھی خراب رہی اس وجہ سے بھی طبیعت مضمحل ہے پھر کوئی مضمون بھی ذہن میں حاضر نہ تھا؛ یہ تو عذر تھا؛ مگر میرے بھائی اختر نے لوگوں کی طرف سے خواہش ظاہر کی اور درخواست اس طرح کی گئی کہ اگر طبیعت متحمل

ہو سکے تو کچھ بیان ہو جاوے۔ نیز مقدار وقت کو میری رائے پر چھوڑ دیا گیا اس گنجائش دینے نے زیادہ اثر کیا؛ اس کے بعد یہ حدیث دفعتہً قلب پر وارد ہوئی شاید منظور خدا ہو جو مضمون بے ساختہ آ گیا؛ اور شاید وہ مضمون یہاں کے مناسب ہو؛

کبر اور اس کا علاج

یہ حدیث چھوٹی سی ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت بڑی تعلیم ترغیب کے عنوان سے ارشاد فرمائی ہے ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے واسطے تواضع اختیار کرتا ہے اس کو حق تعالیٰ رفعت اور بلندی عطا فرماتے ہیں یہ مضمون ایسا ہے؛ کہ یہاں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت، اس کی ضرورت ہے۔ یہ جگہ بھی اس کے مواقع میں سے ہی عام ضرورت اس کی یہ ہے کہ وہ امراض جو انسان سے تعلق رکھتے ہیں؛ بہت، ہیں ان سب کا بیان تفصیل کے ساتھ اس وقت تو نہیں ہو سکتا؛ اس لئے ایک وہ مرض جو اکثر دیگر امراض کی جڑ ہے اور لوگوں میں غالب بھی ہے بیان کے لئے اختیار کیا گیا؛ اسی کا بیان اس حدیث میں ہے؛ وہ مرض کبر ہے جو عام طور سے اکثر طبیعتوں میں مرکوز ہے شاید ہی کوئی اس سے خالی ہو؛ ہر انسان میں اس کا مادہ اور اکثر میں اس کا اثر بھی موجود ہے کوئی عقل میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور کوئی تمول میں اور کوئی حسن میں غرض کوئی طبیعت اس سے مستثنےٰ نہیں؛ دنیا داروں کی تو کیا شکایت دیندار بھی اس سے خالی نہیں؛ کوئی علم میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے؛ اور کوئی عمل میں اکثر اہلِ علم کو دیکھ لیجئے کہ وہ عوام کو حقیر سمجھتے ہیں اگر کوئی عام آدمی راستے میں مل جاوے تو خود تو یہ اس کو کیا سلام کریں گے اور اگر وہ

سلام کرے تو بعض اوقات جواب بھی نہیں دیتے اس کی وجہ سوا اس کے اور کیا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بڑا اور اس کو حقیر سمجھتے ہیں اور بعض کا جہل تو ایسا مرکب ہے کہ اپنی اس نامعقول حرکت پر قرآن و حدیث سے شہادت لاتے ہیں مثلاً قرآن شریف میں ہے: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ جس کے معنی یہ ہیں: کہ عالم اور غیر عالم برابر نہیں اور احادیث میں جا بجا علماء کی فضیلت آئی ہے اور فضیلت کے معنی یہ ہیں: کہ دوسروں سے بڑھا ہوا ہو تو قرآن و حدیث سے جاہلوں کا چھوٹا ہونا اور ہمارا بڑا ہونا ثابت ہو گیا: پھر اگر ہم اپنے آپ کو بڑا سمجھیں تو کیا بیجا ہے: یہ ثبوت ہیں ان کے خیال خام کے ان لوگوں نے وہ آیتیں نہیں دیکھیں جن میں عالم بےعمل کی مذمت آئی ہے مثلاً آیت وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (اللہ تعالیٰ نے اس کو باوجود علم کے گمراہ کر دیا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ علم کے ساتھ بھی گمراہ ہیں اور احادیث میں تو بالتصریح ایسے علماء کی سخت مذمت اور ان کے سخت وعید موجود ہے جو عالم ہو کر عمل نہیں کرتے ایسی حدیثیں بہت اور ہر حدیث کی کتاب میں موجود ہیں پس جب کہ ان میں بدترین عمل موجود ہے: جس کا نام تکبر ہے تو یہ عالم بےعمل کے مصداق ہوئے اور ان وعیدوں اور مذمتوں کے مورد ہوئے: جو قرآن و حدیث میں موجود ہیں پھر کس بات پر بھولے ہوئے ہیں قطع نظر اس کے جن عوام کو یہ حقیر سمجھتے ہیں کیا معلوم ہے کہ حق تعالیٰ کا ارادہ ان کے ساتھ کیا ہے ع تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد: دیار کس کو چاہتا ہے اور میلان اس کا کس طرف ہوتا ہے) ممکن ہے خدا تعالیٰ ان کو تم سے بھی اچھی حالت میں پہنچا دیں اور ممکن ہے

کہ تم کو مردود کردیں اور ان کو مقبول بنالیں، خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں، کیا خبر تمہارا خاتمہ کیسے ہو، اور ان کا خاتمہ کیسا ہو؛

امید اور خوف

بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ کیا خدا تعالیٰ کے یہاں کوئی قاعدہ قانون نہیں ہے یہ تو بالکل اندھیر ہے کہ کوئی اعمال صالحہ کرتا ہو اور مؤمن ہو، اور باوجود اس کے اس اندیشہ میں رہے کہ جانے عند اللہ مقبول ہوں یا مردود اس کے تو معنی ہوتے کہ ایمان اور اعمال صالحہ بیکار چیز ہیں کیوں کہ اس کے بعد بھی نتیجہ یہی کہ ہر وقت یہ خوف لگا ہوا ہے؛ ع تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد؛ یہاں تک کہ یار کس کو چاہتا ہے اور اس کا میلان کس طرف ہے اسی طرح بد اعمالیوں میں کچھ حرج نہیں کیوں کہ بد اعمالی کرنے والا بھی امید کر سکتا ہے ع تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد (یہاں تک کہ یار کس کو چاہتا ہے اور اس کا میلان کس طرف ہو جائے) اس طرح تو دین کا کارخانہ ہی سب درہم برہم ہو جاتا ہے نہ وعدہ کوئی رہا نہ وعید؛

اور یہ بات نصوص کے بھی بالکل خلاف ہے؛ وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيعَادَ (اللہ کا وعدہ ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ وعدہ خلاف نہیں کرتے) وغیرہ سینکڑوں آیتیں موجود ہیں جو دونوں طرف سے یقین دلانے والی ہیں نیک اعمال کرنیوالے کے لئے جنت کا وعدہ ہے جو خلاف نہیں ہو سکتا؛ اور عصاۃ و کفار کے لیے جہنم کی وعید ہے جو خلاف نہیں ہو گی؛ پھر اس کے کیا معنی کہ نیک اعمال کر کے بھی اس اندیشہ میں رہو؛ ع تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد (یار کس کو چاہتا ہے اور اس کا میلان کس طرف ہو جاتا ہے) اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ قانون

خداوندی میں کچھ اندھیر نہیں، مگر تم نے اس میں غور نہیں کیا، جن آیتوں میں بیان وعمل صالح پر وعدہ ہے اس میں شرط یہ ہے کہ ایمان وعمل صالح موت تک مستمر رہے چنانچہ حدیث میں ہے اَلْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِیْمِ، اعمال کا دارومدار خاتموں پر ہے، اور جن آیتوں میں کفر ومعصیت پر وعید ہے اس میں بھی یہی شرط ہے، کہ اسی حالت میں موت ہو تب وعید ہے چنانچہ ارشاد ہے فَیَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (پھر کافر ہونے کی حالت میں مرجائے تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہوجاتے ہیں) پس قاعدہ تو یہی ہے کہ کسی پر میلان جو میلیش بکہ باشندہ میں مذکور ہے، بلا وجہ نہیں ہوتا، بلکہ اعمال کی وجہ سے میلان ہوتا ہے اعمال صالحہ پر میلان رحمت کے ساتھ ہوتا ہے اور بداعمالیوں پر نقمت کے ساتھ ہوتا ہے، اور یہی حاصل ہے ان نصوص کا جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ مومن کے لئے اعتقاد رکھنا چاہیے، جنت کا اور کافر کے لئے اعتقاد رکھنا چاہیے دوزخ کا۔

توفیق اور سلب کا اختیار

یہ بات تو یقینی ہے کہ عمل صالح پر نتیجہ اچھا مرتب ہوگا، اور برا نتیجہ مرتب نہ ہوگا، اور بداعمالی پر نتیجہ برا مرتب ہوگا، اچھا مرتب نہ ہوگا، لیکن ایمان وعمل صالح استمرار ودوام الی الموت کی ایک شرط ایسی ہے جو کمر توڑ دینے والی ہے کیوں کہ عمل نیک اور عمل بد گو آپ کے ارادہ پر ہے اور یہی مدار تکلیف ہے، لیکن ارادہ کا پلٹ دینا حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے وہ اس پر قادر ہیں کہ ایک ایسے شخص کو جو آج کافر ہے کل کو ایسا مومن کامل کردیں، کہ غوث وقطب ہوجائے اور ایک غوث اور

قطب کو دم بھر میں ایسا کافر کردیں کہ شیطان سے بھی بدتر ہو جائے خود شیطان ہی
کی حالت آپ کو معلوم ہو جائے کہ داخل ملائکہ تھا؛ مگر حق تعالیٰ کا ارادہ اس کے
خلاف تھا؛ اور وہ ذرا دیر میں ظہور میں آگیا؛ لیکن اس سے اعمال کا بیکار ہونا یا قدرت
سے خارج ہونا لازم نہیں آیا؛ کیوں کہ وہ کافر کفر کی حالت میں مقبول نہیں ہوا
بلکہ توفیق ایمان کے بعد مقبول ہوا؛ اور توفیق کے بعد اس کا صدور اختیار سے
ہوا؛ اور وہ غوث و قطب ایمان و عمل صالح کی حالت میں مردود نہیں ہوا بلکہ سلب
ایمان و سلب اعمال کے بعد مردود ہوا اور خذلان کے بعد اس سلب کا صدور
اختیار سے ہوا؛ پس یہ بات یقینی ہے کہ بقاء ایمان کی حالت میں کوئی مردود
نہیں ہو سکتا؛ اور بقاء کفر کی حالت میں کوئی مقبول نہیں ہو سکتا؛ مگر یہ بقاء انتہاء
سلسلہ علل کے درجہ میں کس کے قبضہ میں ہے۔ یہ ہے اصل اس بات کی کہ بندگان
خدا خوف سے کانپا کرتے ہیں؛ باوجود اس کے کہ وہ حق تعالیٰ کے وعدہ وعید
پر بالکل یقین رکھتے ہیں؛ یقین تو اس بات کا رکھتے ہیں کہ اعمال پر نتیجہ مرتب کرنا
وعدہ ہے جو خلاف نہیں ہو سکتا؛ اگر اخیر تک ہم ایمان و عمل صالح پر جمے رہے
تو یقیناً نجات ہے اور اگر اخیر تک کوئی کفر پر جما رہا؛ تو یقیناً جہنم کا عذاب ہے
اس کا تو پورا یقین ہے مگر کانپتے ہیں اس واسطے کہ دل حق تعالیٰ کے قبضہ میں
ہے؛ ارادہ کا پلٹ جانا ہر وقت ممکن ہے؛ جس کے لئے کوئی قاعدہ مقرر نہیں
ہو سکتا کیوں کہ وہ ایک ایسے فاعل مختار کے قبضہ میں ہے؛ جس پر کسی بات کی
روک ٹوک نہیں ہو سکتی؛ ہاں وہ کریم و رحیم بھی ضرور ہے جس سے بہت کچھ امیدیں
ہیں؛ غالب یہی ہے کہ جو ایمان و عمل صالح کا ارادہ کرتا ہے حق تعالیٰ اس پر رحم

و کرم فرماتے ہیں اور اس کو دوام و استمرار کی توفیق دیتے ہیں، لیکن جب دقت نظر اس کے اجتہاد اور حکومت علی الاطلاق پر پڑتی ہے اس وقت سب امیدیں فراموش ہو جاتی ہیں، کسی نے خوب کہا ہے ؎

غافل مرو کہ مرکب مرداں راہ را | در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش | ناگہ بیک خروش بہ منزل رسیدہ اند

(غافل ہو کر نہ چل اس لیے کہ مردان راہ کے گھوڑے سخت جنگل میں چلنے سے عاجز رہے ہیں، ناامید بھی مت ہو، اس لئے کہ رند شرابی اچانک ایک نالہ سے منزل تک پہنچ گئے ہیں ؛

اور یہ صرف شاعری نہیں، بلکہ ایسے واقعات ہوئے ہیں خدا تعالیٰ کی شان یہ ہے ؎

گنہ آمرز رنداں قدح خوار | بطاعت گیر پیران ریاکار

(رندان شراب خوار کے گناہ بخشنے والے ریاکار پیروں سے طاعت پر مواخذہ کرنے والے ہیں ؛)

حق تعالیٰ کی عظمت

گو ایسا کم ہوا ہے، لیکن ہوا ضرور ہے کہ ایک مومن کافر اور زندیق بن گیا، اور ایک کافر ملحد مشرک مومن کامل بن گیا، جب ایک بات ممکن الوقوع ہے گو کم ہی ہو، تب بھی ڈرنے کی چیز ہے۔ لوگ کچہری میں جاتے ہیں تو ڈر معلوم ہوتا ہے کیوں کہ ان کو اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی پیچ ایسا نہ آن پڑے کہ قانون بھی ہمارے خلاف ہو جائے، اسی طرح اچھے اچھے ماہران قانون کو بھی حاکم سے خوف

ہوتا ہے، حالانکہ ان کو قانون معلوم ہوتا ہے پھر حق تعالیٰ سے کیسا کچھ خوف ہونا چاہیئے، اس کو خود سمجھ لو کیوں کہ حق تعالیٰ حاکم مطلق ہیں، جن کے اوپر کوئی کسی قسم کا حاکم نہیں، تمہاری حالت کا بدل دینا اور قانون کو تمہارے خلاف کر دینا ہر وقت ان کے اختیار میں ہے، کاہے کا ناز اور کاہے کا انداز ناز و انداز اس وقت تک سوجھتے ہیں، جب تک حق تعالیٰ کی عظمت نظر میں نہ ہو، اور اگر عظمت نظر میں ہو تو پتے پانی ہو جائیں، حق تعالیٰ کی عظمت وہ چیز ہے اس کے انکشاف کے وقت عقل و ہوش سب رخصت ہو جاتے ہیں سمجھنے کی بات ہے کہ ناز انداز کسی عمل ہی پر ہو سکتا ہے، اور عمل کیسا ہی اعلےٰ درجہ کا ہو، مگر حق تعالیٰ کی شان کے موافق نہیں ہو سکتا، کیا بندہ اور کیا اس کا عمل جس کو خدا کی شان کے موافق کہا جاوے نیز ناز تو مکتسب چیز پر ہو سکتا ہے اور اعمال جن پر آپ کو ناز ہے گو وہ مکتسب ہے لیکن اکتساب بھی اس کی صدور کی ایک علت ہے، عِلَّةُ الْعِلَلِ نہیں ہے بلکہ اس کی علت حقیقتاً مشیت حق ہے، پس چوں کہ اکتساب علت قریبہ ہوتی ہے اس لیئے اعمال کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، مگر اس کے لیئے بھی ایک دوسری شئے علت ہے یعنی مشیت حق چنانچہ معلوم ہے،
وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللهُ (اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہیں)، صاحبو! ادھر کی مشیت سے سب کچھ ہوتا ہے۔ اور آپ کو جو دخل ہے، وہ برائے نام ہے ایک بزرگ کی حکایت ہے جو قابلِ عبرت ہے گو یہ حکایت خواص کے خطاب کے قابل تھی، مگر مسلمان خواص ہی ہیں، اس لیئے بیان کرتا ہوں۔

امثالِ عبرت

حکایت یہ ہے کہ ان بزرگ نے ایک دفعہ ذکر اللہ کا ارادہ کیا، تو بڑی دیر تک چاہتے رہے کہ زبان سے خدا کا نام لیں مگر زبان پر نہ آیا، حیرت کی بات ہے لوگ کہیں گے، کہ کیسے ہو سکتا ہے مگر یہ حالات اہل حال پر گذرتے ہیں، جن پر گذرتے ہیں وہ جانتے ہیں دوسرے کیا جانیں سے

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی چیست
حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو، جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

اہل حال کو سخت سے سخت حالات ناقابل برداشت پیش آتے ہیں، کتنی سخت بات ہے کہ خدا تعالیٰ کا نام بھی زبان پر نہ آیا، اس سے جو حالت ان کے دل پر گذری ہو گی، وہی جان سکتے ہیں یہ تو بہت بڑی بات ہے سالک کے قلب پر تو ذرا سا میل بھی آتا ہے، وہ تو جان کھونے کو تیار ہو جاتا ہے، سے

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود گر ز باغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم وارد ہوتے ہیں اگر ذرہ بھر بھی اس کی باطنی حالت میں کمی ہوتی ہے)

ان کو سخت حیرت ہوئی کہ ایسا کیوں ہوا، بس یاد آ گیا کہ ایک دفعہ جوانی میں لاابالی پن سے ایک بے ہودہ کلمہ زبان سے نکلا تھا، جس سے توبہ نہیں کی گئی آج اس کا وبال پڑا ہے وہ حجاب ہو رہا ہے کہ کلمہ کو زبان پر نہیں آنے

دنیا ؛ حضرت یہ دشوار گذار گھاٹیاں حق تعالیٰ کے راستہ میں پیش آتی ہیں جو راستہ طے کرتے ہیں ان سے پوچھو مگر ہم لوگوں نے تو سہل طریقہ اختیار کیا ہے کہ اس راستہ میں قدم ہی نہ رکھو، نہ پڑھو نہ قضا ہو۔ اس حکایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا، کہ حق تعالیٰ جو کسی سے اعمال صالحہ کی توفیق سلب کر لیتے ہیں، اس کی بھی کوئی وجہ ہوتی ہے یوں ہی بلا وجہ بے قاعدہ توفیق سلب نہیں کرتے گو قدرت یہ بھی ہے کہ بلا وجہ بھی سلب کر لیں مگر وہ ایسا کرتے نہیں بلکہ جب کسی سے کوئی نعمت سلب ہوتی ہے اس کا سبب اس شخص کا کوئی عمل اختیاری ہوتا ہے جس کو خدا نے یاد رکھا، اور بندہ نے بھلا دیا۔ بندہ نے اس کو معمولی سمجھا اور خدا کے نزدیک وہ بڑی بات تھی، اس لئے مواخذہ کے وقت جہل کے سبب یوں گمان کر لیا جاتا ہے کہ بلا وجہ مواخذہ ہوا اس لئے کسی گناہ کو معمولی نہ سمجھنا چاہیئے اور نہ کسی سزا کو بلا وجہ سمجھنا چاہیئے۔

حضرت جنید بغدادیؒ ایک بار چلے جا رہے تھے، ایک مرید ساتھ تھا راستہ میں ایک خوبصورت لڑکا عیسائی کا نظر پڑا مرید کی نظر اس پر پڑ گئی مرید نو آموز یا نا آموز تھا، اس کو نظر بھر کر دیکھا شیطان نے اس بہکا دیا۔ کہ صنعت خدا دیکھ لے اس نے نظر کر لی پھر حضرت جنید سے کہتا ہے، کہ کیا خدا تعالیٰ اس صورت کو بھی دوزخ میں ڈالے گا؟ حضرت جنید نے کہا کیا تو نے اس کو دیکھا ہے اچھا اس کا وبال سامنے آئے گا، اس وقت تو بات رفع دفع ہو گئی، بیس سال بعد وبال کا ظہور ہوا کہ وہ مرید قرآن بھول گیا، ہم لوگوں کی نظر ان باتوں پر کہاں پہنچ سکتی ہے ہم کسی سزا کو بیس سال کے فعل کی طرف کیسے منسوب کریں مگر یہ بات

بصیرت نہ ہونے کی وجہ سے ہے درحقیقت یہ سزائیں کسی عمل کی ہوتی ہیں اور یہ کوئی ضرورت نہیں کہ سزا عمل کی اسی وقت ہی مرتب ہو جائے دیکھیے آموں کے موسم میں آم زیادہ کھائے جائیں تو اس کا اثر کئی مہینے کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ پھوڑے پھنسی زیادہ نکلتے ہیں یہاں کوئی نہیں کہتا کہ پھوڑے پھنسی آموں کا اثر نہیں اس طرح ترتب وبال میں دیر ہونے سے لازم نہیں آتا کہ وہ کسی گذشتہ عمل کی سزا نہیں، یہ حضرت جنیدؒ کی حکایت تو درمیان میں آگئی تھی میں ان بزرگ کی حکایت بیان کر رہا تھا، کہ دیر تک ذکر کی توفیق نہیں ہوئی ان بزرگ کو یاد آیا کہ جوانی کے زمانہ کا ایک کلمہ بے ہودہ حجاب ہو رہا ہے انہوں نے توبہ کی بس توفیق ہو گئی، تو اگر کوئی نیک عمل کرتا ہے یا زبان سے ذکر کرتا ہے، تو وہ محض خدا کی نعمت ہے اس پر ناز کیسا؟ وہ تو خدا ہی کی رحمت [illegible] کیا کیا؟

علم پر ناز

اگر کسی کو علم پر ناز ہو تو سن لیجیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر تو کسی کو علم عطا نہیں ہوا، حق تعالیٰ آپ کو ارشاد فرماتے ہیں: وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ یعنی اگر ہم چاہیں تو وہ تمام علوم جو آپ کو دیئے ہیں دفعتہً سلب کر لیں، ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ بِہٖ عَلَیْنَا وَکِیْلًا؛ یعنی پھر کوئی آپکا کارساز بھی نہیں ہو سکتا دیکھیے کتنا ہولناک خطاب ہے آپ ڈر ہی تو گئے ہوں گے، اور تعجب نہیں کہ یاس کی نوبت آجاتی اس واسطے حق تعالیٰ نے یہ جزو بڑھا دیا، اِلَّا رَحْمَۃً مِّنْ رَّبِّکَ یعنی بس رحمت خدا ہی ساتھ دے سکتی ہے اور کوئی ساتھ نہیں دے سکتا، ان الفاظ کے جوڑ سے پتہ چلتا

ہے اُس حالت کا جو اس آیت کے اترنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر گذری ہو گی کہ اتنے لفظ پر بھی اکتفا نہیں کیا گیا: اِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ کیوں کہ اس سے اتنا معلوم ہوا کہ رحمت دستگیری کر سکتی ہے؛ مگر اس کا وقوع ہوگا یا نہیں اس لفظ سے اس کا اطمینان نہیں ہوتا؛ اس واسطے ایک جملہ اور بڑھا دیا: اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا یعنی چونکہ خدا تعالیٰ کا فضل آپ کے شامل حال ہے اس لئے بالفعل رحمت آپ کی دستگیر ہے۔ آپ کسی طرح کا اضطراب نہ کریں بس اس لفظ سے یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اطمینان ہو گیا: کہ ایسا واقعہ نہ ہو گا؛ کہ علوم سلب کر لئے جائیں؛ صرف اظہار قدرت اور تصحیح عقیدہ کے لئے ایسا فرمایا گیا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ گفتگو ہے؛ تا بدیگراں چہ رسد دوسروں کی تو کیا حقیقت ہے، ہم کو ذرا ہوش سنبھالنے کی ضرورت ہے کسی کو علم پر ناز ہے تو حماقت ہے؛ عمل پر ناز ہے تو حماقت ہے؛ ان میں سے کوئی چیز بھی اس درجہ میں مکتسب نہیں جس پر ناز کیا جائے؛ جس کو کوئی چیز حاصل ہے وہ سب عطائے الٰہی ہے اس کو اپنی چیز سمجھنا اور تزکیہ نفس کرنا کبر ہے اور کبر وہ عیب ہے جو گند در گند ہے اب تو سمجھ میں آ گیا ہو گا۔ کہ کبر کس درجہ بری چیز ہے؛ مگر ہم لوگوں میں بہت کم قلوب اس سے پاک ہوں گے؛ اس حدیث میں اسی کا علاج ہے اس وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا؛ ایک وجہ تو یہ ہوئی اس کے اختیار کرنے کی؛ دوسرے یہ کہ یہ مرض عام ہونے کے ساتھ ام الامراض و بیماریوں کی جڑ بھی ہے اکثر شدید امراض باطنی کی جڑ یہی ہے اور اکثر عیوب کا سلسلہ کبر ہی پر منتہی ہوتا ہے؛ مثلاً غصہ کہ یہ ایک بڑا مرض ہے مگر پیدا ہوتا ہے؛ کبر

ہی) سے بعض وقت تو اس کا ظہور خود غصہ والے کے منہ سے ہونے لگتا ہے، مثلاً بعض بد دماغ آدمی غصہ کے وقت اپنی زبان سے کہنے لگتے ہیں کہ تو نہیں جانتا ہم کون ہیں ؟

انسان کی اصلیت

ایک بزرگ نے اس کا خوب جواب دیا انہوں نے ایک شخص کو ٹوکا کہ غرور سے نہ چلو وہ غصہ میں آکر کہنے لگا : اَتَدْرِیْ مَنْ اَنَا یعنی جانتا نہیں میں کون ہوں ان بزرگ نے کہا جانتا ہوں اَوَّلُکَ نُطْفَۃٌ مَذِرَۃٌ + وَاٰخِرُکَ جِیْفَۃٌ قَذِرَۃٌ + وَاَنْتَ بَیْنَ ذٰلِکَ تَحْمِلُ الْعَذِرَۃَ + یعنی پہلے تو تو ایک پلید نطفہ تھا، اور انجام کار ایک گندہ مردار ہو جائے گا، اور اس کے بیچ میں یہ حالت ہے کہ پیٹ میں نجاست کو لئے پھرتا ہے، واقعی انسان کی حالت تو یہی ہے ہم ظاہر میں کیسے پاک و صاف ستھرے بنتے ہیں نہاتے ہیں دھوتے ہیں، صابون ملتے ہیں عطر لگاتے ہیں اور نفیس مزاج بنتے ہیں میل کچیل سے گھن کرتے ہیں میلے کپڑے تک پہننا گوارا نہیں کرتے مگر حالت یہ ہے، کہ جس چیز سے گھبراتے ہیں وہ ایک کافی مقدار میں پیٹ کے اندر ہر وقت بھری رہتی ہے کوئی تول کر دیکھے تو پانچ سیر تین سیر دو سیر پائخانہ ہر وقت پیٹ کے اندر ساتھ رہتا ہے، جس چیز سے گھنیاتے ہیں وہی لادے پھرتے ہیں، صاف ستھری مجلسوں میں جاتے ہیں، مگر یہ تبرک ساتھ ہے آدمی ذرا غور کرے تو اس سے تمام ناز جاتا رہے، یوں کہیئے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے، کہ سب کا عیب ڈھک رکھا ہے، جس سے ہم ستھرے بنے پھرتے ہیں اگر پیٹ کی نالی نالی میں تو ذرا ما سکہ نہ ہوتی جس سے

پیخانہ رکا رہتا ہے اور خاص وقت پر نکلنے کا تقاضا ہوتا ہے اور بہ ...لی ہر وقت
بہا کرتی یا کم از کم اس راستہ سے اس کی بدبو ہی ہر وقت آیا کرتی تو کوئی پاس بھی
نہ بیٹھنے دیتا۔ سب صفائی اور نفاست بھول جاتے ہیں چنانچہ جن لوگوں کی یہ
قوت ماسکہ کمزور ہو جاتی ہے اور ہر وقت دست بہنے لگتے ہیں۔ تو دیکھ لیجئے ان سے
کیسی نفرت کی جاتی ہے مگر حق تعالیٰ نے اپنی شان ستاری سے پیٹ کو ایسا ڈھکا
ڈھول بنایا کہ کسی کو خیال بھی نہیں آتا کہ تمہارے پیٹ میں پاخانہ ہے یا کیا ہے۔
گندہ دہنی ایک مرض ہے۔ اس میں دیکھ لیجئے کہ کوئی پاس بھی نہیں آنے دیتا۔
جس کے نزدیک جائیں وہی نفرت کرتا ہے۔ حق تعالیٰ نے وہ حالت دکھلانے کے
لئے اس قسم کے بعض امراض پیدا کر دیئے ہیں۔ تاکہ ان کو دیکھ کر حق تعالیٰ کی رحمت
کو یاد کر لیا کریں۔ کہ یہ بھی ممکن تھا کہ غلاظت پیٹ میں اس طرح پڑی ہوتی جس
کی بو آیا کرتی مگر خدا تعالیٰ نے اس کو چھپا دیا۔

امام کی خصوصیات

زمانہ طالب علمی میں ایک گندہ ذہن آدمی میرے ہی
پاس جماعت میں کھڑا ہوا تھا۔ اس بھلے مانس کو بھی
کچھ ضد تھی کہ جب میرے پاس کھڑا ہوتا مجھے سخت ایذا ہوتی جماعت کے خیال سے
میں کھڑا رہتا مگر جان پر بن جاتی۔ دیکھئے گندہ دہنی ایسی بری چیز ہے اگر
خدانخواستہ آنتوں میں سے ایسا سوراخ کھلا ہوا ہوتا۔ جس سے بدبو آتی
تو کیا حالت ہوتی کیا کرتے۔ اس کو کس طرح بند کرتے کیا اس کے منہ کو ڈاٹ
سے باندھا کرتے۔ غرض اس کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے یہاں ایک بات
درمیان میں یاد آئی جو فقہاء نے بیان کی ہے واقعی وہ جامع حقیقت شناس

ہیں دین کی، صوفیہؒ اور فقہاءؒ۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ جس شخص سے جماعت کو ایذا ہو، جیسے کوڑھ کا مریض یا خارش کا مریض یا گندہ دہن وغیرہ اس کو جماعت معاف ہے کیوں کہ ایک کی وجہ سے دس کی جماعت جاتی ہے بعض لوگوں کو اس ایذاء پر صبر نہ ہوگا، تو وہ جماعت سے بیٹھ رہیں گے، فقہاء نے تکثیر جماعت کو مہتم بالشان سمجھا جاتا ہے اسی تکثیر کی وجہ سے امام کی صفات لکھی ہیں ان سب کی بنا، اسی پر ہے کہ جماعت میں تکثیر ہو اور نفرت نہ ہو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر علم و فضل میں چند آدمی برابر ہوں تو ایک وجہ ترجیح کی خوبصورت ہونا بھی ہے جو ان میں سب سے زیادہ خوبصورت ہو، اس کو امام بنایا جائے، مگر امرد نہ ہو کیوں کہ امرد کے پیچھے نماز مکروہ ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی طرف زیادہ رغبت ہوگی اور ایک وجہ ترجیح کی یہ بھی لکھی ہے، کہ جو نسب میں بڑھا ہوا ہو، نسب سے بھی آدمی کی عزت ہوتی ہے اور مقتدیوں کو اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں عار نہیں آتی تو اس سے تکثیر ہوگی، جماعت کی یہاں تک لکھا ہے، کہ جس کی بیوی زیادہ خوبصورت ہو، اس کو امام بنایا جائے کیوں کہ ایسا آدمی عفیف زیادہ ہوگا، اور غیر عفیف سے عفیف کے پیچھے جماعت زیادہ جمع ہوگی، اور اس سے کوئی یہ سمجھے کہ امام صاحب کی بیوی کو جا کر جھانکا کریں تاکہ اس کا حسین ہونا معلوم ہو، بلکہ یہ بات آپس میں ملنے جلنے والوں کو معلوم رہتی ہے کہ کس کے گھر کی کیا حالت ہے مطلب یہ ہے کہ اگر مقتدیوں کو یہ بات معلوم ہو کہ فلاں شخص کی عورت حسین ہے تو یہ بھی کسی درجہ میں وجہ ترجیح کی ہوسکتی ہے، فقہاء شرعی مذاق نہایت صحیح رکھتے ہیں، شریعت کی

تاکید میں جماعت کے متعلق دیکھ کر تکثیر جماعت کی صورتیں تجویز فرمائی ہیں شریعت کو تکثیر جماعت کا خاص اہتمام ہے اس لئے امام کو تطویل قرأت سے منع فرمایا ہے اور تطویل کرنے والے کو فتّان فرمایا ہے تاکہ جماعت میں تقلیل نہ ہو۔ امام کے متعلق ان جملہ احکام کی بناء تکثیر جماعت ہی ملے گی اس طرح شریعت نے مقتدیوں میں رعایت کی ہے کہ اُن باتوں سے منع کیا ہے جو تکثیر جماعت میں خارج ہوں مثلاً حدیث میں ہے جو شخص لہسن کھا دے وہ مسجد میں نہ آوے ہوں کہ اس سے ایذاء ہوتی ہے جو مخل فی التکثیر ہے (کثرت میں خلل انداز)

حاکم کی اطاعت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مجذوم عورت کو طواف کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا یَا اَمَةَ اللّٰہِ اُقْعُدِیْ فِیْ بَیْتِكِ وَلَا تُؤْذِی النَّاسَ یعنی اے خدا کی بندی اپنے گھر بیٹھ اور لوگوں کو تکلیف مت دے وہ طوعاً کرہاً چلی گئی! چند سال کے بعد دیکھا گیا کہ پھر آرہی ہے یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت عمرؓ کا انتقال ہو چکا تھا! مگر اس کو خبر نہ تھی ایک شخص نے اس سے کہا اِبْشِرِیْ فَقَدْ مَاتَ ذَاكَ الرَّجُلُ یعنی اب دل کھول کر طواف کر لے کیونکہ عمر (جنہوں نے منع کیا تھا) وفات پا چکے ہیں اس نے بہت تاسف کیا اور اناللہ پڑھا! اور کہا میں اب آئندہ طواف نہ کروں گی! اگر عمرؓ زندہ ہوتے تو طواف کرتی میں ان کو مردہ سمجھ کر نہیں آئی تھی بلکہ زندہ سمجھ کر آئی تھی طواف کے شوق نے مجھے مجبور کیا اور میں نے جی میں کہا کہ طواف کر دوں گی بہت سے بہت یہ سزا ہو جاوے گی! عمر ایسا شخص نہ تھا کہ زندگی میں تو اس کا حکم مانا جاوے اور مرنے کے بعد نہ مانا جاوے یہ کہہ کر چلی گئی یہ تھی اطاعت

حاکم کی اور یہ تھا مسلمانوں کا باہم ارتباط اور تعلق جس کی نظیر ملنا مشکل ہے حتیٰ کہ ایسے ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ بعض لشکروں کے امیر نے حکم دیا کہ سپاہی آگ میں کود پڑے اور وہ کودنے کے لیے تیار ہوئے (یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کا ہے) اس لشکر میں فقہاء صحابہ بھی تھے؛ انہوں نے اُن کودنے والوں کو پکڑا اس قاعدہ کے موافق لَا طَاعَةَ لِلْمَخْلُوْقِ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ (اللہ تعالیٰ کی معصیت میں مخلوق کی طاعت نہیں ہے) اور مجمع مرکب از مجاذیب وسالکین تھا؛ پھر یہ مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سالکین مانعین کی تصویب فرمائی؛ غرض وہ بی بی واپس چلی گئی؛ تقریر اس کے متعلق تھی؛ جس شخص کے مسجد میں جانے سے دوسروں کو ایذا ہو اس کو چاہیئے؛ کہ نماز گھر میں ادا کرے؛ یہاں سے ایک مسئلہ اور بھی نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص مفسد ہو؛ جس کے مسجد جانے سے بہت سوں کو تکلیف پہنچتی ہو اگر قابو چلے تو اس کو مسجد میں آنے سے روک دینا جائز ہے کیوں کہ جب کہ اتنی ایذا کی وجہ سے کہ منہ میں سے بدبو آنے سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے شریعت نے مسجد میں آنے سے روک دیا ہے تو جن سے دینی یا دنیاوی فتنہ کا اندیشہ ہو؛ ان کی ممانعت بطریق اولیٰ نکلتی ہے یہ کلام اس پر چلا تھا؛ کہ غصہ کی اصل تکبر ہے چنانچہ بعضوں کی زبان پر غصہ کے وقت یہ بات آجاتی ہے کہ جانتا نہیں کہ ہم کون ہیں اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو معلوم ہو ہم کون ہیں؛ اگر یہاں پردہ اٹھا دیں تو ساری مسجد کے آدمی بھاگتے نظر آدیں؛ [1]

[1] رائے کی درستی

حکمت اور مصلحت

حق تعالیٰ نے حیات میں بھی پردہ ڈھکا رکھا ہے اور بعد ممات کے بھی کیسی ستاری کی ہے حکم دیا ہے کہ لاش نہلا دو تاکہ کوئی گندی چیز مرض کی حالت میں لگ لگا گئی ہو، جس سے لوگوں کو نفرت ہو تو وہ دھل جائے اور جنازہ کا لے چلنا ان پر بار نہ ہو۔ اور صاف ستھرے کپڑوں میں لپیٹو اور خوشبو لگاؤ اور خوشبو میں سے بھی کافور کو اختیار کیا، جو مانع تعفن بھی ہے ان سب میں یہی حکمت ہے کہ اس سے کسی کو نفرت نہ ہو اور عیوب ڈھکے رہیں ایک مقتول کی لاش کی تشریح ڈاکٹر نے کی اس کے بعد اس کی تجہیز تکفین کی گئی میں بھی اس کے غسل و نماز میں شریک تھا۔ واللہ اس قدر تکلیف ہوئی ہے کہ بیان میں کی جا سکتی۔ واجب ہونے کی وجہ سے شرکت تو کی مگر دماغ قلب کی جو حالت تھی اس کو وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو اس وقت شریک تھے۔ اگر ایسی حالت ہر مردہ کے ساتھ پیش آ دے تو عجب نہیں کہ لوگ دفن کرنا بھی چھوڑ دیں اور ویسے بھی چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ اور کتے بلی اس کو خراب کرتے پھریں۔ اس مقتول کی حالت دیکھ کر قدر معلوم ہوئی۔ اس حدیث کی جس میں ہے کہ تین چیزوں کو مؤخر نہ کرو۔ ایک تو ان میں سے جنازہ بھی ہے سبحان اللہ شریعت کے کیا احکام ہیں ان ہی کی بدولت مسلمانوں کا مردہ کیسی عزت و احترام کے ساتھ جاتا ہے۔ کہ کسی کو ذرہ بھی ناگواری نہیں ہوتی اس مقتول کی لاش کا کفن دفن سب کچھ ہوا، مگر کس درجہ ناگواری کے ساتھ کہ الامان الامان اس دیر نہ کرنے میں حکمت یہ بھی ہے کہ مقبول کو منزل مقصود پر جلدی پہنچاؤ۔ اور مردود کو اپنی گردنوں سے جلدی پھینکو۔ احکام شرعی میں ایک ایک نہیں سینکڑوں حکمتیں ہیں اہل

ظاہر کے لئے بھی حکمتیں ہیں اور اہل باطن کے لئے بھی حکمتیں ہیں ۔

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد

برنگ ارباب صورت را ببو ارباب معنی را

(اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

مردہ کو تجہیز و تکفین کے جلدی کرتے ہیں باطنی حکمت تو یہ ہے جو ابھی مذکور ہوئی اور جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی بیان فرمایا؛ اور ظاہری حکمت یہ ہے کہ بدبو آنے سے پہلے اس کو ڈھانک دیا جائے اس کے عیب نہ کھلیں اور لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے زندوں کا نفع اور مردہ کا بھی نفع ؛

تدابیر نجات

یہاں سے ایک بات اور نکلتی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے ساتھ اتنی شفقت ہے کہ اتنی بات بھی گوارا نہیں کہ ہمارے دماغ سے بدبو سے تکلیف پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے جسم کو جہنم میں کیسے چھوڑیں گے ؛ انشاء اللہ بہت کچھ امیدیں ہیں ؛

نماند بعصیاں کسے در گرو   کہ دارد چنیں سید پیش رو

(جو شخص ایسا سردار پیش رو رکھتا ہو وہ گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں نہ رہے گا)

اس کے معنی یہ نہیں کہ جہنم میں جانے نہ دیں گے جس سے ہم لوگ تکیہ کر بیٹھیں کہ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سروں پر موجود ہیں فرشتوں کے ہاتھ سے ہم کو چھڑا لیں گے ؛ اور عذاب نہ ہونے دیں گے ؛ بلکہ اس کا تتمہ یہ ہے

کہ آپ نے دوزخ میں جانے کے اسباب سے منع فرمایا ہے جیسے بدبو سے بچنے کی تدبیر بتائی ہے کہ جلدی دفن کردو مردہ کو سڑنے نہیں دیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ آپ حق تعالیٰ سے دعا کر دیتے کہ مسلمانوں کا مردہ سڑا نہ کرے مگر یہ نہیں ہوا۔ بلکہ تدابیر تعلیم فرمائیں جن کے ذریعہ سے سڑنے سے حفاظت رہے اسی طرح وہ اعمال تعلیم فرمائے جن کے ذریعے دوزخ سے نجات رہے ہر تعلیم سے یہ بات ٹپکتی ہے۔ کہ ایسی شفقت ہے جیسے باپ کو بیٹے کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہر موقع پر بیٹے کو وہی تدبیریں بتلاتا ہے جو اس کے نزدیک اعلیٰ سے اعلیٰ ہوں اور ذرا سی بھی تکلیف بیٹے کی نہیں دیکھ سکتا۔ تو گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس نہیں ہیں۔ مگر تدابیر نجات سب بتا گئے ہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت موجود نہیں۔ حالتِ حیات ہی کے ساتھ خاص تھی۔ نہیں بلکہ آپ کی شفقت سب کو عام ہے حاضرین کو بھی غائبین کو بھی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اب تک ویسی ہی موجود ہیں۔ اور قیامت تک رہیں گی۔ یہ تو زندوں کا نفع بیان ہوا۔ تعجیل تجہیز و تکفین میں اور ایک فائدہ کا کافی بیان ہوا کہ اگر مقبول ہے تو جلدی اپنے ٹھکانے پہنچا دیا جائے گا۔ اور مردہ کا ایک نفع اور بھی ہے اور وہ ایک ذرا باریک بات ہے اس کے لئے اول ایک مقدمہ کی ضرورت ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باذن اللہ خبر دی ہے کہ مردہ کو ایصال ثواب صدقہ خیرات وغیرہ کا ہو سکتا ہے۔ اس طرح زندہ مردہ کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور ایک دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ ارادہ ایصال ثواب کا جب ہوتا ہے جب مردہ سے محبت ہو۔ اور مردہ میں تاخیر میں بدبو آجاوے گی۔ تو آپ کو اس سے اذیت اور نفرت ہو گی۔ پھر ہرگز ہرگز اس کے تصور کو بھی جی نہ چاہے گا۔ ایصال ثواب تو کیسا۔ تو وہ

غریب ایصال ثواب سے محروم رہے گا، اس واسطے حکم دیا گیا، کہ نفرت پیدا ہونے سے پہلے ہی دفن کر دو، بلکہ مسلمانوں کے مُردوں کو خوب دھونی دینی چاہیئے، خوشبودار کافور بھی ملا جاتا ہے کافور میں یہ بھی حکمت کہ اس سے کیڑے بھاگتے ہیں، اس کا خاص طور پر حکم ہے، تاکہ کچھ دیر تک تو حفاظت رہے اور نظروں سے پوشیدہ ہونے کے وقت تک کوئی بات موجب نفرت نہ ہونے پائے غرض سینکڑوں مصلحتیں ہیں، جلدی دفن کرنے میں سب کی سب واقعی مصلحتیں ہیں، لے چلنے میں بھی جلدی کا حکم ہے اور نماز میں بھی جلدی کا حکم ہے دیکھئے حق تعالیٰ نے ہماری کتنی حفاظت کی ہے اور ہمارے عیوب کس طرح ڈھانکا ہے اور زندگی میں گندگیوں کو ہمارے جسم ہی میں اس حفاظت سے رکھا ہے، کہیں کو پھوٹنے نہیں دیا، اگر اتنی حفاظتیں نہ ہوں تو ہم کو اپنی حقیقت نظر آجاوے غرض یہ ہے کہ اگر اپنے یہ حالات ہم کو محفوظ رہیں تو کبھی کبر نہ آوے،

تفکر کی ضرورت

مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگوں کو تفکر کی عادت نہیں اگر گاہ گاہ بھی غور کر لیا کریں تو یہ باتیں چھپی ہوئی یا دلیل کی محتاج نہیں ہیں، بلکہ از قبیل مشاہدات ہیں، جو ہر شخص کے نزدیک مسلم اور مشاہد ہیں ہاں انکے استحضار کے لئے کچھ نہ کچھ قصد شرط ہے، سو قصد کرنا چاہیئے کہ اس تفکر سے اتنے بڑے مرض کا علاج ہوتا ہے جو ام الامراض ہے اور کچھ مشکل بھی نہیں، نہ اس میں کچھ حرج ہوتا ہے اور اگر اتنا سا کام اختیار ارادہ سے کرنے میں بھی آپ کو تکلیف ہے تو میں آپ کو ایک مراقبہ بتاؤں جس کا بالاضطرار روزمرہ موقع پیش آتا ہے وہ یہ کہ پیخانہ میں ایک دفعہ ہر شخص کو جانا پڑتا ہے ذرا وہاں کی ہیئت کو خیال کیجئے، کہ سب سے علیحدہ اپنے عیوب کو کھولے بیٹھے ہیں ہیئت وہ ہے کہ کسی کے سامنے

اس کے ساتھ نہیں آسکتے کام وہ ہے جس کے تصور سے بھی دل گھبراتا ہے گو کرنا ہر شخص کو روز پڑتا ہے ذرا اس ہیئت کو آئینہ سامنے رکھ کر دیکھئے! آپ کو خود ہی تعجب ہوگا، کہ ہم چیز ہی کیا ہیں، جو دوسرے وقت کتنے پھرتے ہیں، کہ ہم جانتے نہیں ہم کون ہیں آپ یہ ہیں، جو اس خاص حالت سے آئینہ کے اندر ہیں پاخانہ میں بیٹھ کر اسکو سوچا کیجیے، اور آج کل تو ایک مذاق یہ بھی نکلا ہوا ہے، کہ پاخانہ میں بھی بے کار نہیں بیٹھتے اخبار لیجا کر وہاں دیکھتے ہیں کیوں کہ وقت بڑی فرصت کا ہے! تو جب وہ وقت بھی بیکار ضائع جانا پسند نہیں تو اس کو اس مراقبہ میں صرف کرنا خلاف وضع کیوں ہے یہ بھی ایک کام ہے پاخانہ کے وقت اسی کو کر لیا کیجیے، ہاں جس کا یہ مذاق ہو کہ خاص خبر ہی سے دل بہلانا چاہتا ہو تو اور بات ہے اس کو اس مراقبہ کی فرصت کہاں ہوگی یہ لوگ بھی کیا مذاق والے ہیں! اخبار بینی کے لئے کیسا وقت تجویز کیا ہے کہ اگر کبھی اخبار میں کوئی دلچسپ مضمون نظر پڑ گیا، تو دیر سویر کا بھی خیال نہ رہے گا، گھنٹوں وہیں قید رہیں اور واقعی ان کی سزا یہی ہے، کہ ایسی جگہ میں قید رہیں ورنہ قاعدہ عقلی یہ ہے: الضرورۃ تتقدر بقدر الضرورۃ ضروری بقدر ضرورت ہی ضروری ہے، پاخانہ میں تو صرف اتنی دیر بیٹھنا چاہیئے، جس میں قضائے حاجت ہو جاوے، پاخانہ بھی صاف کھل کر جب ہی ہوتا ہے، جب آدمی دوسرے شغل میں نہ لگے، اور جب دوسرے شغل میں لگ گیا، قضائے حاجت بہ تکلیف دیر ہو گی، یہ دیر اس شغل کی سزا ہے، اور میں نے جو مراقبہ تجویز کیا ہے اس میں یہ خرابی نہیں، کیوں کہ اس میں تو پاخانہ کی حاجت ہی کا مراقبہ ہے اور اس کے وقت میں امتداد کا بھی احتمال نہیں کیوں کہ وہ پاخانہ کے ساتھ ختم ہو جاوے گا، پاخانہ کی قید پر ایک حکایت یاد آئی ایک عہدہ دار

ریل کے تیسرے درجہ میں سفر کر رہے تھے، تیسرے درجے میں معمولی آدمی بیٹھتے ہیں یہ سفید پوش آدمی تھے، اس واسطے سب لوگ ان کا لحاظ کرتے تھے انھوں نے بستر کھول کر تمام بینچ کو گھیر لیا اور اس روز مسافر زیادہ تھے بہت لوگ کھڑے کھڑے جا رہے تھے، یہ پیر پھیلائے مزے سے لیٹے تھے، بعض مسافروں نے خوشامد کی کہ منشی جی ذرا بیٹھ جاؤ انھوں نے ڈانٹ دیا، غرض سب کو پریشان کر رکھا تھا، خدا کی قدرت ان کو پاخانہ کی ضرورت ہوئی اور وہ ریل کے پاخانہ میں گئے اتفاق سے ایسی صورت ہوئی کہ کواڑ بند کرنے میں چٹخنی باہر سے ایسی بند ہوئی کہ اندر سے کھل نہ سکی اول تو انھوں نے اپنے تکبر کو نبھایا کہ خود کھٹ کھٹ کرتے رہے اور چٹخنی کے ساتھ زور لگاتے رہے مگر کہاں تک جب نہ کھلی تو آخر اندر سے آواز دی اور سخت لہجہ میں کہا کہ ذرا یہ چٹخنی کھول دینا لوگوں نے آپس میں کہا کہ اب بدلہ لینے کا موقع ہے سسرے کو بند پڑا رہنے دو، ذرا دیر بیٹھنے کو جگہ تو ملے گی، جب کسی سخت لہجہ سے نہ سنا تو انھوں نے کہا کہ کوئی صاحب یہ چٹخنی تو کھول دے، اس پر بھی کسی نے نہ سنا تب آپ کا تکبر ٹوٹا اور خوشامد کی، غربا رحم دل ہوتے ہیں کسی نے کہا کہ میاں کھول دو بہت دق کر لیا ہے دوسرے نے کہا کہ یوں نہیں، توبہ کرا کے کھولنا جب خوب توبہ کرائی تب کھول دی اب تو ان کا شیطان اتر گیا اور بستر سمیٹ کر الگ بیٹھ گئے، وعدہ کے سچے نکلے یہ قید تو مجبوری کی تھی، اور بعضے ہمارے بھائی ایسے ہیں کہ اپنے ہاتھوں پاخانہ کی قید میں بند رہتے ہیں قصداً اخباروں کو لے جاتے ہیں، کیا مذاق ہے خیر یہ تو مذاق تو تقلید بے جا سے حاصل ہوا ہے، میں وہ کام بتاتا ہوں جو آپ کیلئے مفید ہو، اور اتنے وقت کے لیے شغل بھی ہو جاوے وہ یہ کہ پاخانہ میں بیٹھ کر اپنی خوبصورتی اور شان کو ملاحظہ کیجئے

یہ مراقبہ آپ کے کام کا ہے جو سامان تکبر کے ہیں، وہ وہاں سب ندارد ہوتے ہیں، نمایش بھی
ختم ہو جاتا ہے نہ پتلون ہے نہ لنگی وہاں تو ساری ہستی ٹھنگی رہ جاتی ہے آجکل تو لوگ
کپڑوں سے بڑے بنتے ہیں، اور پاخانہ میں اتر ہی جاتے ہیں، اس وقت اپنی ہئیت کو
دیکھیے، کہ وہ واقعی وہ نقشہ ہے کہ بالقصد اس تماشا کبھی بھی کوئی گوارا نہ کرے، لباس
انسان کے لیے زینت ہے، وہ اترا ہوا ہے سب سے نکمی اور گندی جگہ میں بیٹھے ہوئے
ہیں: خلاصہ یہ ہے کہ یہ وہ حالت ہے کہ اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہو سکتی، اور
اگر مجبوری نہ ہوتی تو کوئی بھی اس کو اختیار نہ کرتا پھر ٹانگوں کے درمیان سے جس چیز کا
خروج ہو رہا ہے وہ وہ چیز ہے جس کا نام لینے سے بھی گھن آتی ہے، جس سے
وہ لوگ بھی گھبراتے ہیں جو اٹھاتے ہیں یعنی بھنگی، چنانچہ دیکھ لیجیے پاخانہ کے بعد آبدست
وہ بھی لیتے ہیں گو وہ میں سنار رہنا وہ بھی گوارا نہیں کرتے ان سب باتوں میں غور کیا کیجیے
گو یہ مراقبہ تو بڑا بے ڈھب ہے مگر اخبار دیکھنے سے اچھا ہے کیوں کہ وہ کار آمد
نہیں اور یہ کار آمد ہے ان سب باتوں کو نظر میں رکھ کر سوچیے کہ کیا میں بڑا ہوں کسی
جاہل کا شعر ہے کہ ؎ اللہ جسے کہتے ہیں واللہ میں ہی ہوں گا

ایک حقیقت

مولوی عبدالحق صاحب کانپور میں تھے وہ بڑے ظریف تھے! انہوں نے سنا تو فرمایا کہ کوئی پاخانہ میں جا کر اُس ننگے کو سلام کیسے
کہ واہ میاں تم ہی اللہ ہو جو اس خوبصورت حالت سے تک رہے ہو، واقعی خوب جواب
دیا، حق تعالیٰ نے نفی الوہیت مسیح پر اسی مضمون سے استدلال کیا ہے مگر اللہ اکبر قرآن
کی کیا بلاغت ہے کہ نہایت پاکیزہ پیرایہ میں اس کو بیان کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں، کَانَا
یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ یعنی مسیح اور ان کی والدہ خدا کیسے ہوتے یہ تو دونوں کھانا کھاتے

تھے : اس میں اول تو یہ بات بتلائی کہ کھانا کھانے والا بھوک سے زیادہ عاجز ہو کر غذا کا محتاج ہوتا ہے اور خدا محتاج اور عاجز نہیں ہوتا، دوسرے اس میں اس طرف سے بھی اشارہ ہے کہ کھانا کھانے والے کو بول و براز کی حاجت ہوتی ہے اور بول و براز کا کرنے والا خدا کیا ہوتا خدائی کی شان کے لائق یہی حرکات ہیں تو دیکھیے حاجت بول و براز کو کیسے لطیف پیرایہ میں اشارۃً ادا فرمایا صراحتاً ذکر نہیں کیا، مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایک عیسائی کے سامنے یہ مضمون پیش کیا تھا، تو اس نے کہا کہ پیشاب پاخانہ کا نام نہ لو، حضرت مسیح کے ذکر میں ایسی گندی باتیں لانا بے ادبی ہے مولانا نے کہا پیشاب پاخانہ کا نام بے ادبی ہے تو بول و براز سہی الفاظ کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی : اس حقیقت کا وجود الوہیت کے منافی ہے غرض پاخانہ میں بیٹھ کر اصلی حالت انسان کی کھل جاتی ہے اس وقت اپنے آپ کو دیکھ کر سمجھ جاؤ کہ ہم کیا چیز ہیں جو شخص دن رات میں دو تین مرتبہ نجاست میں آلودہ ہوتا ہے تو وہ کیا بڑا ہو سکتا ہے : صفائی ستھرائی بھی جو کچھ نظر آتی ہے وہ بھی حق تعالیٰ کی ایک کارسازی ہے : کہ پانی جیسی ایک ایسی چیز پیدا کر دی ہے جس سے گندگی کا ازالہ کر لیا جاتا ہے اگر پانی نہ ہو تو : ہر وقت سنے ہی رہیں : اس وقت بڑائی معلوم ہو اب تو یہ ہے کہ پاخانہ میں تھوڑی دیر رہنا پڑتا ہے سب سے علیحدہ ہو کر جو کچھ گت بن گئی پھر پانی سے صاف ہو کر آبیٹھے اگر نجاست دور کرنے کی کوئی ترکیب نہ ہوتی تو بدبو ہر وقت آیا کرتی اس وقت یہ بات خوب سمجھ میں آ جاتی کہ ہم کون ہیں : اگرچہ اس زمانہ میں سنا رہنا ہی بعض لوگوں کے نزدیک معیوب نہیں جو لوگ فیشن کے دلدادہ ہیں ان کو دیکھ لیجیے :

فیشن پرستی

فیشن ایک عجیب بلا ہے جو آدمی کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے بعض لوگوں کو تو اس میں شغف ہے کہ دن بھر اور رات بھر ان کو فیشن بنانے سے فرصت نہیں، ایک صاحب دیکھا کہ دن بھر فیشن ہی بناتے پاخانہ جانے کے کپڑے الگ تھے، اور ملاقات کے کپڑے الگ تھے، اور گھر میں بیٹھنے کے کپڑے الگ تھے، کام پر جانے کے کپڑے الگ تھے، ہر وقت کپڑے بدلنے میں رہتے تھے پاخانہ جانے کی وردی عجیب تھی ان کو دیکھ کر مجھے بڑا رحم آتا کہ کس بیگار میں پکڑے ہوئے ہیں، ایک واقعہ یہ ہوا، کہ جہاں میرا قیام تھا اس کے سامنے ایک ایسے شخص بھی ٹھہرے ہوئے تھے، مجھ سے وہ ان ہی قیود کی وجہ سے کئی دن تک نہ مل سکے میں بیٹھا بیٹھا یہ تماشہ دیکھا کرتا،

صاحبو! یہ کیا تہذیب ہے اور یہ کیسی زندگی ہے تقلید نے ایسا اندھا کیوں کر دیا ہمارے پاس کیا نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سب کچھ سکھا دیا، افسوس ہے کہ اس کو چھوڑ کر ان خرافات میں پڑ گئے، یہ لوگ اس قدر تو صاف ستھرے بنتے ہیں کہ پاخانہ جانے کے کپڑے الگ تک ہوتے ہیں، لیکن ان کی صفائی کی حقیقت سنیئے، کہ پاخانہ میں سے اخبار رخبار سے پونچھ کر آجاتے ہیں اول تو اس سے صفائی ایسی نہیں ہوتی، جیسی ڈھیلے سے ہو سکتی ہے، کیوں کہ ڈھیلے میں قوت جاذبہ ہے اور کاغذ میں یہ بات نہیں ایک تو فیشن کی یہی غلطی لیجیئے، اگر بجائے کاغذ کے کپڑا ہی اختیار کرتے تب بھی کچھ عقل کی بات تھی، کاغذ کا اختیار کرنا تو صریحاً بیوقوفی ہے کیوں کہ کاغذ سے نجاست کی صفائی نہیں ہو سکتی پھر طرہ یہ کہ اس کے بعد پانی سے استنجا کرتے نہیں ہاں یہ صفائی بہت ہے کہ نہانے روزمرہ ہیں اب اس صفائی

کی حقیقت دیکھیے اس نہانے سے نہ نہانا اچھا تھا، کیوں کہ پہلے تو نجاست ایک ہی جگہ لگی ہوئی تھی، اب سارا بدن اس میں بس گیا، کیوں کہ یہ لوگ ٹب میں بیٹھ کر نہاتے ہیں، جس میں جسم سے پانی انفصال نہیں ہوتا، اور مقام استنجا پہلے ہی سے دونوں جگہ سے ناپاک ہے، تو ٹب میں بیٹھتے ہی وہ نجاست ساری پانی میں پھیل جاتی ہے جس سے وہ پانی سب ناپاک ہو گیا، اسی کو اٹھا کر بدن پر ڈالتے ہیں، حتیٰ کہ منہ میں بھی آدمی کو لیتے ہیں، اور اس سے کلی کرتے ہیں اس کے تصور سے بھی گھن آتی ہے یہ آج کل کا تمدن اور تہذیب ہے اور اسی کا نام صفائی ہے إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

بے حسی کی انتہا

خدا جانے حس کہاں گئی، اگر کسی سے یوں کہہ دو کہ تم گوہ موت کھاتے ہو تو وہ لڑ پڑے اور فوجداری ہو جائے مگر کیا یہ گوہ موت کھانا نہیں ہے جب گوہ موت میں ملا ہوا پانی منہ میں چلا گیا تو گوہ موت کھانا اور کس کو کہتے ہیں، افسوس پاخانہ میں بھی دوسروں کی تقلید کرتے ہیں، اور تعجب یہ ہے کہ پوری تقلید بھی نہیں، کیوں کہ وہ تو ان افعال کے کرنے میں اس بات کے پابند نہیں کہ دوسروں کی دیکھا دیکھی کوئی کام کرنے لگیں، اور تم اس کے پابند ہو پوری تقلید تو جب ہوتی ہے کہ تم بھی ان کی طرح آزاد ہوتے اور بدون کسی کے دیکھا دیکھی کے ایسا کرتے مگر ان لوگوں نے تو ایسی آنکھیں بند کر کے تقلید کی ہے کہ اس چیز کے کھانے پینے کی نوبت آ گئی، جس کے نام سے بھی آدمی گھنیاتا ہے نہا کر تولیے سے بدن پونچھتے ہیں اور اسی تولیہ سے کھانے کے بعد منہ پونچھتے ہیں صاحبو تعجب ہے آپ کو گھن نہیں آتی دیکھئے یہ تو صفائی کی یہ حد ہے کہ چینی کے برتنوں میں پاخانہ پھرتے ہیں اور ڈھکا رہتا ہے تاکہ بدبو نہ پھیلے اور بدبو سے بھی نفرت ہے

لیکن تعجب ہے کہ ٹب میں نہاتے ہوئے جب نجاست پھیلتی ہے تو علیٰ اس شئے سے آپ کو نفرت نہیں، افسوس حضور کی سنت کو چھوڑ کر کن گندیوں میں جا پھنسے ذرا اُن صفائی کے طریقوں اور طریقۂ سنت کو ملا کر تو دیکھئے اصل یہ ہے کہ سنت سے انحراف کی سزا یہی ہے کہ جس غرض سے انحراف کیا تھا یعنی صفائی وہ بھی نصیب نہ ہوئی بلکہ اس کی ضد یعنی گندگی میں پڑ جائیں بعض خدمت گاروں سے تحقیق ہوا کہ چونکہ یہ لوگ کاغذ سے استنجا کرتے ہیں، جس میں قوت جاذبہ نہیں اس لئے ان کی پتلونوں میں پاخانہ سنا ملتا ہے افسوس نیلٹین ایبل لوگ عام طور سے اس مبتلا ہیں افسوس مسلمانوں نے سب چیزیں اپنے یہاں کی چھوڑ دیں اور دوسروں کی اختیار کر لیں اور پھر مسلمان اگر اسی کا نام اسلام ہے تو یہ وہ اسلام ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آپ فرما دیجئے کہ یہ افعال بہت برے ہیں جن کی تعلیم تمہارا ایمان تم کو کر رہا ہے اگر تم اب بھی اہل ایمان ہو) کیوں صاحبو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی یہی اسلام تھا (نعوذ باللہ) کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی معاشرت تعلیم کی تھی، اسلام نے تو اس کی جڑ کاٹ دی تھی اور وہ کبر ہے اس تقلید کی اصل یہی ہے کہ بڑا بننے کے لئے بڑوں کی معاشرت ہر کام میں اختیار کی جاتی ہے محض ان کی ریس کرتے ہیں حتیٰ کہ ہگتے اور موتتے بھی ہیں، ان ہی کی طرح تاکہ جیسے وہ بڑے ہیں یہ بھی بڑے کہلائیں اور شریعت اسلامی میں بڑا بننے کی گنجائش ہی نہیں شرعی اصول سے معلوم ہوتا ہے کہ کبر اور ایمان گویا دو متضاد چیزیں ہیں، جب اس تقلید متکبرین کی شریعت نے جڑ ہی کاٹ دی ہے جس پر یہ سب متفرع ہیں پھر ہم کو فرداً فرداً ایک ایک فرع پر کلام کرنا بے کار ہے آپ

کو معلوم ہو گیا ہوگا، کہ یہ معاشرت کی تبدیلی درحقیقت اسلام سے کس قدر دور ہے اور یہ درحقیقت اس چیز کا نتیجہ ہے جو اسلام اور ایمان کے گویا مقابل ہے یعنی کبر یہ ام الامراض ایسا عام ہوا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ بھی اس سے خالی نہیں گو بعض آحاد خالی ہوں یہ وہ مرض ہے کہ تمام بڑے چھوٹے امراض اسی کے نیچے ہیں ؛

غصہ اور اس کے مضرات

اسی کبر سے غصہ پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ آدمی کو ہوش نہیں رہتا اور وہ مرض جو دل میں زبان پر آجاتا ہے ؛ جیسا کہ اس شخص نے کہا تھا کہ جانتا نہیں کہ ہم کون ہیں ؛ دیکھیے بعض وقت وہ مرض اتنا بڑھ جاتا ہے کہ دل میں سما نہیں سکتا ؛ اور ابل کر زبان تک نوبت آجاتی ہے یہ بات اس شخص نے ضرور کبر سے کہی ہوگی ؛ کیوں کہ ایسے شخص سے کہی جس کو اپنے آپ سے چھوٹا سمجھا کوئی یہ نہ سمجھے کہ غصہ میں ہوش نہیں رہا تھا ؛ اور یہ بات بے ہوشی کے اندر منہ سے نکل گئی ؛ کیوں کہ اگر وہ مخاطب کو بڑا سمجھتا تو کبھی یہ بات منہ سے نہ نکلتی ؛ مشہور ہے کہ غصہ عقلمند ہے چھوٹے پر ہی آتا ہے اور یہ واقعی بات ہے حضرت بڑے کی بات پر ناگواری تو ہو سکتی ہے ؛ جب کہ اس سے کوئی بات اپنے خلاف مزاج دیکھیں ؛ مگر جوش انتقام جو غضب کی تعریف میں داخل ہے وہ چھوٹے ہی پر آتا ہے بڑے کے مقابلہ میں جو ناگواری ہوتی ہے اس کا نام حزن اور صدمہ ہے باقی غصہ جب آتا ہے اسی پر آتا ہے جس کو اپنے سے چھوٹا سمجھے اور جب کسی کو اپنے سے کم سمجھا تو اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھا اسی کا نام کبر ہے غرض غصہ کبر ہی سے ہوتا ہے ؛

نتائج اس کے یہ ہیں اگر ہم میں قدرت انتقام ہے تو بلا انتقام لئے دل ٹھنڈا نہیں ہوتا اور اکثر حالتوں میں ظلم ہو جاتا ہے سزا بمقدار عمل پر بس نہیں ہوتی اور اس وقت

نفس یہ توجیہ کرتا ہے کہ قصور تو اسی کا ہے ہم تو برائی کے مقابلہ میں برائی کرتے ہیں اس میں کیا حرج ہے خود قرآن میں موجود ہے: جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ (برائی کا بدلہ برائی ہے) حالانکہ یہ محض نفس کی تسویل ہے قرآن میں جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ کے ساتھ مِثْلُهَا (اس کی مثل) کی قید بھی ہے کہ اتنا ہی بدلہ لینا جائز ہے جتنی زیادتی اس نے کی ہو اب بتلائے کہ کیا کوئی ایسا مستقل مزاج ہے جو غصہ میں اتنا ہوش رکھے کہ اس نے اتنی برائی کی ہے اور میں اتنا بدلہ لوں اول تو اسے سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے کہ دوسرے کی طرف سے زیادتی ہے بالخصوص غصہ کے وقت دوسرے کی بھلائی بھی برائی معلوم ہونے لگتی ہے پھر اس کی مقدار کا اندازہ رکھنا گو امکانِ عقلی کے درجہ میں تو ہے لیکن امکان عادی سے یقیناً خارج ہے غصہ میں یہ کسی کو ہوش نہیں رہتا کہ کتنی زیادتی ہم پر کی گئی ہے اور ہم جو سزا دیتے ہیں وہ اس کی برابر ہی ہوگی اور اگر واقعی اس میں غلطی نہ کی گئی ہو اور دوسرے نے واقعی زیادتی کی ہو اور صاحب غضب کو اتنی قدرت بھی ہو کہ غصہ سے مغلوب نہ ہو جائے اور سزا بقدر عمل پر بس کرنے کی پوری طاقت ہو تب قرآن شریف کا حکم یہ ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی کے ساتھ لینا جائز ہے اور یہ فتویٰ بھی ہمارے ضعف کی وجہ سے ہے!

عفو و درگذر

ورنہ عزیمت تو یہ ہے جو اس کے آگے مذکور ہے فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللهِ (پس جس نے معاف کر دیا اور درگذر کی پس اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے) یعنی اعلیٰ درجہ اس وقت بھی یہی ہے کہ درگذر کرے اور اس کو مؤکد کیا ہے إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (اللہ تعالیٰ حد سے گذرنے والوں کو پسند نہیں کرتے) سے گویا تہدید کر دی کہ بدلہ لو تو اس کا اہتمام کر کے لینا

کہ ذرا بھی زیادتی نہ ہونے پائے اگر انتقام میں زیادتی ہوئی تو تم بھی ظالم ہو گے اور ظالم حق تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے اس کو سننے کے بعد جس کے دل میں حق تعالیٰ کی محبت ہے وہ ڈر ہی جائے گا؛ اور رخصت پر عمل کرنے کی اسے جرأت ہی نہ ہو گی؛ ایسا نہ ہو کچھ میری طرف سے زیادتی ہو جاوے اور میں محبوب حقیقی کے نظروں سے گر جاؤں بہت مشکل ہے کہ غصہ میں آدمی قابو میں رہے اب سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا (برائی اس کی مثل) کی صورت صرف یہی ہے جو اس حکایت میں ہے ایک بزرگ سے ان کے مرید نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ بزرگوں کے شیون مختلف ہوتے ہیں؛ میں اس کو دیکھنا چاہتا ہوں انہوں نے کہا کہ فلاں مسجد میں جاؤ وہاں تین بزرگ مشغول بیٹھے ہیں؛ ایک ایک دھول سب کے مارو اس نے ایسا ہی کیا؛ ایک صاحب کے جو دھول ماری تو وہ اٹھے اور اس کا بھی ہاتھ پکڑ کے ایک دھول اسی طرح ماردی اور زبان سے کچھ نہ کہا اور جا کر بدستور ذکر میں مشغول ہو گئے؛ یہ ہے مثلہا ایک بات بطور جملہ معترضہ یہ بھی بیان کئے دیتا ہوں کہ یہ ان کا بدلہ لینا اس وجہ سے نہ تھا؛ کہ ان سے ضبط نہ ہوا؛ اور انہوں نے رخصت پر عمل کیا او عزیمت کو چھوڑ دیا؛ کیونکہ کاملین کو ضبط نفس پر کامل قدرت ہوتی ہے اور ان سب حضرات کا کامل ہونا ایک شیخ طریقت کی شہادت سے معلوم ہو چکا ہے بلکہ اصل یہ ہے؛ کہ بعض دفعہ بدلہ لے لینا ہی مصلحت ہوتا ہے کیوں کہ بدلہ نہ لینے کی صورت میں دل میں غبار رہ جاتا ہے اور کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ نہایت ذمیم خلق ہے جس سے اولیاء اللہ بہت ڈرتے ہیں اور کبھی یہ ہوتا ہے؛ کہ وہ بدلہ نہ لیں؛ تو حق تعالیٰ بدلہ لیتے ہیں اور جب حق تعالیٰ بدلہ لیں گے؛ تو اچھی طرح لیں گے؛ تو وہ حضرات شفقت کرتے ہیں کہ خود بدلہ لے لیتے ہیں؛ اور اس شخص کو خدا تعالیٰ کے غصہ سے بچاتے ہیں یہ مصلحت ہے بعض

بزرگوں کے بدلے لینے میں جو میں نے بطور جملہ معترضہ بیان کردی، دوسرے بزرگ کے جو دھول ماری تو انہوں نے اس طرف دیکھا بھی نہیں ان کی نظر اس پر تھی، کہ ہر چہ از دوست میرسد نیکوست تیسرے صاحب کے جو دھول ماری تو انہوں نے یہ کیا کہ اٹھ کر اس شخص کا ہاتھ پکڑ لیا، اور سہلانے لگا، اور دم کیا کہ بھائی تمہارے ہاتھ میں چوٹ تو نہیں لگی، وہ اس شان کے تھے، یہ بزرگوں کے شیون ہیں جن میں مثلہا کی صورت میں وہ ہے جو پہلے صاحب نے کیا، ہم جیسوں کے ساتھ یہ بات پیش آوے تو بدلہ میں چار پانچ لگائے کہ بائیں پھر اگر اپنے برابر کے ساتھ ایسا کیا جاوے کہ مثلہا پر اکتفا نہ کی جاوے بلکہ جوش ختم ہونے تک برابر مارے جائیں تب بھی خیر ہے کیوں کہ وہ بھی کچھ بدلہ ضرور لے گا، تو کچھ ادھر کی زیادتی رہے گی اور کچھ ادھر کی، غضب تو یہ ہے،

بچوں پر ظلم

کہ بعض دفعہ چھوٹوں پر بھی بڑی طرح غصہ کیا جاتا ہے اور وہ بالکل بے بس ہوتے ہیں ان کی طرف سے کچھ بھی بدلہ نہیں ہو سکتا، بچوں پر جو ظلم ماں باپ سے یا میاں جی صاحبان سے ہوتا ہے، وہ اسی قبیل سے ہے، بعضے ماں باپ ایسے قصائی ہوتے ہیں، کہ بچوں کو اس طرح مارتے ہیں جیسے کوئی جانوروں کو مارتا ہے بلکہ جیسے کوئی چھت کوٹتا ہو، اور جو کوئی کہے تو کہتے ہیں، ہمیں اختیار ہے ہم اس کے باپ ہیں، یاد رکھئے باپ ہونے سے ملک رقبہ حاصل نہیں ہوتی ورنہ یہ بھی ہوتا ہے کہ باپ بیٹے کو بیچ لیا کرتا، باپ کا رتبہ حق تعالیٰ نے بڑا بنایا ہے نہ اس واسطے کہ چھوٹے اس کی ملک ہوں اور اس سے چھوٹوں کو تکلیف پہنچے بلکہ اس واسطے کہ چھوٹوں کی پرورش کرے اور ان کو آرام دے ہاں کبھی اس آرام دینے ہی کی ضرورت سے سزا اور تادیب کی حاجت بھی پڑتی ہے اس کی اجازت ہے اور اَلضَّرُوْرِیُّ یَتَقَدَّرُ

بِقَدْرِ الضَّرُوْرَةِ (ضروری بقدر ضرورت ہی ضروری ہوتا ہے) کے قاعدہ سے اتنی ہی تادیب کی اجازت ہو سکتی ہے جو پرورش اور تربیت میں معین ہو نہ اتنی جو درجہ ایلام تک پہنچ جائے اور ماں باپ سے ایسی زیادتی قطع نظر گناہ ہونے کے انسانیت اور فطرت کے بھی خلاف ہے ماں باپ کو تو حق تعالیٰ نے محض رحمت بنایا ہے ان سے ایسی زیادتی ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ شخص انسانیت سے بھی خارج ہے اور میاں جی صاحبوں کی تو کچھ پوچھئے ہی نہیں، انہوں نے تو ایک مثل یاد کرائی ہے کہ ہڈی ماں باپ کی اور چمڑی استاد کی، نہ معلوم یہ کوئی قرآن کی آیت ہے یا حدیث ہے یا فقہ میں کہیں لکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ بعض دفعہ غصہ تو آتا ہے بیوی پر کیونکہ گھر میں لڑائی ہوئی تھی، اب بیوی پر تو کوئی بس چلا نہیں وہ غصہ باہر بچوں پر اترتا ہے، یہ تو عیسائیوں کا کفارہ ہو گیا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی، میاں جی صاحبان یاد رکھیں کہ قیامت کے دن اس کا دینا ہوگا، یہاں بچوں کی چمڑی آپ کی ہے وہاں آپ کی چمڑی بچوں کی ہوگی، کیا تماشہ ہوگا کہ وہ بچے جو ان کے محکوم بنتے علی رؤس الخلائق ان کو پیٹ رہے ہوں گے، قطع نظر اس سے ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ زیادہ مارنا تعلیم کے لئے بھی مفید نہیں ہوتا، بلکہ مضر ہوتا ہے ایک تو یہ کہ بچے کے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں دوسرے یہ کہ ڈر کے مارے سارا پڑھا لکھا بھی بھول جاتا ہے تیسرے جب بچہ پٹتے پٹتے عادی ہو جاتا ہے تو بے حیا بن جاتا ہے پھر پٹنے سے اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا، اس وقت یہ مرض لاعلاج ہو جاتا ہے اور ساری عمر کے لئے ایک خلق ذمیم یعنی بے حیائی اس کی طبیعت میں داخل ہو جاتی ہے الغرض غصہ میں کبھی تو ظلم ہوتا ہے جب کہ انتقام کی قدرت ہو اور جب انتقام کی قدرت نہ ہو تو کینہ

پیدا ہوتا ہے پھر اس سے طرح طرح کے امراض پیدا ہوتے ہیں مثلاً حسد پیدا ہوتا ہے اِس سے ایذا رسانی کی فکر ہوتی ہے پھر مکر و فریب کی عادت پڑ جاتی ہے یہ سب امراض ایک سے ایک بڑھ کر ہیں اور یہ سب اولاد ہے اسی ایک مرض کی جس کا نام کبر ہے اب تو آپ کو اس برائیاں معلوم ہو گئی ہوں گی؛

تکبر کی صورتیں سب سے بڑھ کر بڑی بات تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کی برائی جا بجا بیان فرمائی ہے فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (اللہ تعالیٰ متکبر فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے) اور اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ (اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہیں) یہ تین صیغے ہیں مُخْتَالٌ اور فَخُوْرٌ اور مُسْتَکْبِرِیْنَ اور تینوں کی نسبت لَا یُحِبُّ (نہیں پسند کرتے) کا لفظ ہے کیا یہ جامع کلام ہے ان تین لفظوں کی شرح یہ ہے کہ کبر کے آثار کبھی تو ظاہر ہو جاتے ہیں اور کبھی تہذیب کی وجہ سے دل میں رہتے ہیں تو یہ متکبر ہیں کیوں کہ استکبار کے معنی ہیں بڑا سمجھنا اور یہ دل سے ہوتا ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ یعنی جن لوگوں کے دل میں تکبر ہے خواہ وہ ظاہر نہ ہو خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ بھی مبغوض ہیں اور کبھی تہذیب کم ہوئی تو کبر کا اثر ظاہر بھی ہو جاتا ہے مثلاً کوئی آدمی فیشن بناتا اور طرح طرح کی وضع اختیار کرتا ہے جن سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنا چاہتا ہے اس کے متعلق ارشاد ہے لا یحب کل مختال ایسا آدمی بعض دفعہ اس دھوکے میں رہتا ہے کہ مجھ میں تکبر نہیں ہے کیوں کہ ان لوگوں نے اسی کا نام تکبر رکھا ہے کہ زبان سے بڑائی کا کلمہ کہا جائے، حالانکہ یہ فیشن اور وضع بنانا سب تکبر ہی ہے زبان سے

نہ سہی مگر ان کی ہر ہر ادا سے تکبر ٹپکتا ہے بعضوں کی چال تو بنیش میں آ کر بالکل ایسی ہو جاتی ہے جیسے لقا کبوتر اپنی دُم کو سنبھال سنبھال کر حرکت کرتا ہے۔ ایسی ہی چال یہ لوگ چلتے ہیں۔ کہ قدم قدم پر دیکھتے جاتے ہیں کہ کہیں سے بنیش تو نہیں بگڑ گیا۔ غرضکہ ان افعال کا کرنے والا گو خود ان کو تکبر نہ سمجھے لیکن واقع میں ہیں سب تکبر ہی اور ان کے تکبر ہونے کو کیسا ہی چھپاوے مگر اہل فہم کو معلوم ہو جاتا ہے یہ سب مختال کے اندر داخل ہیں۔ اور بعضوں کی زبان سے بھی تکبر کے کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ ان کو فخور فرمایا۔ پس مختال تو وہ ہے جس کے دل میں تکبر ہو۔ اور افعال سے بھی ظاہر ہو۔ مگر اقوال سے ظاہر نہ ہو۔ اور فخور وہ ہے جس کی زبان سے بھی ظاہر ہونے لگے۔ تو تین مرتبہ ہوئے ایک متکبر ہیں ایک مختال اور ایک فخور تینوں کے واسطے لفظ لَا یُحِبُّ فرمایا۔ خلاصہ یہ کہ تکبر کا ظہور ہو۔ یا نہ ہو۔ یعنی زبان سے تکبر ہو یا قلب سے افعال سے سب کو اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (اللہ تعالیٰ متکبر فخر کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتے) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ (اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے) سے منع فرما دیا۔ ان میں سے ایک درجہ کی بھی اجازت نہیں دی اب یہ سمجھئے کہ اس مقام پر اس پر کسی عذاب کی وعید نہیں فرمائی۔ صرف لَا یُحِبُّ (نہیں پسند کرتے ہیں) فرما دیا ہے۔ سو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ اس آیت میں نہ سہی دوسری آیتوں میں تکبر پر عذاب کی وعید بھی موجود ہے مثلاً اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًی لِّلْمُتَکَبِّرِیْنَ (کیا غرور کرنیوالوں کا دوزخ میں ٹھکانہ نہیں ہے) دوسرے یہ کہ یہ وعید کیا تھوڑی وعید ہے کہ لَا یُحِبُّ فرمایا یہ تھوڑی بات ہے کہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہو۔ غور سے دیکھئے تو وعید کی اصل یہی ہے کیونکہ وعید آتی پر ہوتی ہے جو حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔ مرضی کیخلاف

ہونا کسی کام کا اور ناپسند ہونا ایک ہی بات تو ہے پس لا یحب اصل ہو گئی وعید کی بلکہ دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کو دشمنی ہے اس شخص سے جو متکبر ہے یا مختال ہے یا فخور ہے کیوں کہ محبت کو لغت کے اعتبار سے عداوت کی ضد ہے نقیض نہیں، لیکن محاورات میں جس پر اطلاقات قرآنیہ مبنی ہیں وہ عداوت کی نقیض ہے لا یحب میں محبت کی نفی کر کے اس کی نقیض کا اثبات ہے تو یہ کہنا کہاں صحیح رہا کہ اس پر کوئی وعید نہیں آئی کیا عداوت کا اثبات وعید نہیں، بلکہ یہ تو وعیدوں کا اصل الاصول ہے اگر کسی ایک معین عذاب کی وعید ہوتی وہ وعید کا ایک فرد خاص ہوتا اور اس میں تو کسی فرد کو عذاب کی خصوصیت نہیں رہی، بلکہ وہ وعید فرمائی جو جڑ ہے تمام وعیدوں کی یعنی عداوت تو اس سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ اس کی جزا میں کسی فرد عذاب کی خصوصیت نہیں ہر قسم کا عذاب بلکہ بڑے سے بڑا عذاب اس جرم پر ہو سکتا ہے۔

حب و بغض

رہی یہ بات کہ لا یحب سے اگر عداوت کا ثابت کرنا مقصود ہے تو پھر بجائے لا یحب کے یبغض (بغض رکھتے ہیں) کیوں نہ فرما دیا تاکہ تصریح ہو جاتی سو اس میں ایک نقطہ ہے جو اسی وقت قلب پر وارد ہوا کہ جو زیادہ تر طالب علموں کے کام کا ہے اور اگر سمجھ میں آ جائے تو سب کے کام کا بھی ہے بات یہ ہے کہ افعال کے تین مرتبے ہیں، ایک محبوب، ایک غیر محبوب گو مبغوض بھی نہ ہو، ایک مبغوض یعنی ایک تو کسی کام کا پسند ہونا، اور ایک ناپسند ہونا گو ناگوار بھی نہ ہو اور ایک ناگوار ہونا ظاہر ہے کہ بجز قسم اول کا عمل تو ہے نہیں یعنی محبوب قسمیں اخیرین میں سے کسی ایک قسم کا عمل ہے اور دوسری آیتوں اور نیز حدیثوں پر نظر کرنے کے

بعد یہ ظاہر ہے کہ قسم اخیری کا عمل ہے یعنی مبغوض ہے اس   لئے کوئی طالب علم یہ
کہہ سکتا ہے کہ اس جگہ لایحب کے مبغض ہونا چاہیئے تھا، سو اتنا تو مفسرین نے بھی لکھا ہے
کہ بناءً علی المحاورات مراد لایحب سے مبغض ہے مگر یہ کہ اس میں نکتہ کیا ہے یہ دہا لفظ
مبغض ہی کیوں نہ لایا گیا، یہ کہیں نظر سے نہیں گذرا وہ نکتہ اس وقت سمجھ میں آیا جس کو
وہ شخص سمجھ سکتا ہے، جو مذاق محبت رکھتا ہو، دوسرا کوئی سمجھ نہیں سکتا اور مرتبہ علم
میں کوئی سمجھ بھی لے تو اس کو حظ نہیں آسکتا، اس کا پورا حظ وہی شخص پا سکتا ہے جس
کے دل میں محبت کی آگ لگی ہوئی ہو، اس ہلکے لفظ کو اختیار کرنے میں اشارہ اس طرف
ہے کہ مبغوض ہونا تو بڑی بات ہے عاشق کے لئے تو لَا یُحِبُّ کا لفظ بھی مرجانے کی بات
ہے، ہائے وہ بندہ کیسے زندگی بسر کرتا ہے جس سے خدا تعالیٰ محبت نہیں   ذٰلکَ
مرجانے کی بات ہے، دنیا میں آدمی حکام کی اور محبوبین کی نظر میں محبوب ہونے کے
لئے کیا کچھ مصیبتیں اٹھاتا ہے، دیکھئے سپاہی بادشاہ کے حکم سے جانبازی کرتے ہیں اور سر
کٹواتے ہیں، صرف اس امید پر کہ بادشاہ ہم سے خوش رہے کسی نمک حلال نوکر کو
جب یہ بات معلوم ہو جائے، کہ آقا کو مجھ سے آج کل ہمدردی اور محبت نہیں ہے، تو
کیسا قلق ہوتا ہے، خاص کر اس نوکر کو جس سے آقا کو پہلے محبت رہی ہو، اس کو جب
یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اب مجھ سے محبت کچھ کم ہو گئی تو دیکھئے اس پر کیا گذرتی ہے حالانکہ
ابھی یہ تھوڑا ہی ثابت ہو گیا ہے کہ مجھ سے آقا کو دشمنی ہو گئی ہے، بلکہ صرف اسی مرتبہ
کی نوبت آئی ہے جس کے واسطے لفظ لَا یُحِبُّ بولا جاتا ہے مگر یہی درجہ اس کی پریشانی
کے لئے کافی ہے تو ایسے شخص کو اگر آقا کسی فعل سے منع کرنا چاہتا ہے تو ایسا لفظ
نہیں اختیار کرنا چاہتا جو مبغض کا مرادف ہو، بلکہ یہی لفظ انتہائی لفظ ہے کہ ہم کو.

یہ کام پسند نہیں اور انتہائی اس واسطے کہ اکثر تو ایسے نوکر کے لئے جس سے محبت کا برتاو رہا ہو، اس لفظ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کسی لفظ کی بھی ضرورت نہیں صرف آقا کی نظر کا پھرا ہوا ہونا کافی ہوتا ہے اسی سے اس کا دم فنا ہو جاتا ہے یہ واقعات دن رات نظروں میں ہیں؛ دیکھئے ایک پیش کار ایسا ہو جس سے کلکٹر کو کسی قدر انس ہو وہ اگر ایک دن اجلاس میں صرف اتنی بات نئی دیکھے کہ آج کلکٹر صاحب نے انس سے بات نہیں کی تو سہم کر رہ جاتا ہے؛ اور احباب میں کہتا پھرتا ہے کہ آج صاحب کی نظریں کچھ پھری ہوئی معلوم ہوتی ہیں؛ خدا خیر کرے معلوم نہیں کیا بات خلاف طبع ہوئی؛ اس صورت میں اگر کلکٹر صاحب زبان سے کہہ دیں کہ ہم کو تمہارا فعل پسند نہیں پھر تو کیا کہنا مرہی تو جاوے گا؛ اور کبھی بھی اس کام کے پاس نہیں جائے گا اور یہ لفظ کہ ہم کو تمہارا فلانا کام پسند نہیں لا یحب ہی تو ترجمہ ہے جو حقیقت لغویہ کے اعتبار سے بغض سے کم مرتبہ کا لفظ ہے؛ مگر یہ اتنا اثر کیوں رکھتا ہے بات یہی ہے کہ جس کو تعلق ہے اس کے لئے تو یہی لفظ سب کچھ ہے اور تعلق نہ ہو تو کوئی لفظ بھی موثر نہیں؛ یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ باتیں تو بڑے لوگوں کی ہیں؛ جن کے دل میں خدا تعالی کی محبت ہے ان کے واسطے تو یہ لفظ بیشک ایسا ہی ہے مگر ہم جیسے عوام کو اس لفظ سے کیا اثر ہو سکتا ہے؛

اللہ کی محبت

میں کہتا ہوں کہ بندہ کی غذا خواہ کسی قسم کا بندہ ہو، خدا تعالی کی محبت ہے خواہ مصدر کی اضافت فاعل کی طرف لے جاوے؛ یعنی حق تعالی کا بندہ کے ساتھ محبت کرنا؛ خواہ مصدر کی اضافت مفعول کی طرف لے جاوے یعنی بندہ کا حق تعالی کے ساتھ محبت کرنا دونوں بندہ کی غذائیں ہیں اور ان

بس بھی اصل اول یہی ہے اور ثانی اس پر مرتب کیوں کہ غور سے معلوم ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ بندہ کا محبت کرنا بعد میں ہے اس کے پہلے یہی درجہ ہے کہ اس کے ساتھ محبت ہوئی دیکھ لیجئے، صاف موجود ہے، "وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ" (اور تم کچھ نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہیں) یہ ثبوت تو آیت سے ہے کہ مشیت حق مقدم ہے، مشیت عبد پر اور مشیت عبد میں مشیت محبت بھی داخل ہے وہ بھی موقوف ہوگی، مشیت حق پر پس اول حق تعالیٰ کی مشیت ہوئی کہ عبد مجھ سے محبت کرے اور حق تعالیٰ کا عبد کے ساتھ اس کی خیر کا ارادہ کرنا یہی محبت ہے حق تعالیٰ کی عبد کیساتھ میں ایک ثبوت اور دیتا ہوں اس بات کا کہ بندہ کو خدا تعالیٰ سے محبت ہونا اس بات پر موقوف ہے، کہ اول حق تعالیٰ کو اس کے ساتھ محبت ہو، وہ ثبوت یہ ہے کہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور معرفت تامہ خدا تعالیٰ کی ہو نہیں سکتی کیوں کہ نہ خدا کو کسی نے دیکھا نہ خدا کے نمونہ کو کیوں کہ نمونہ ہے ہی نہیں، "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" (کوئی شئے اس کی مثل نہیں ہے) مگر باینہمہ بہت آثار سے پتہ چلتا ہے کہ محبت، بالحق کا وجود ضرور ہے، ایک ادنیٰ سا نمازی مسلمان لیا جائے، اور اس سے کہا جائے، کہ تجھے ایک لاکھ روپیہ دیں گے، ذرا ایک وقت کی نماز چھوڑ دے تو ہرگز منظور نہ کریگا اس سے بخوبی سمجھ میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت اس کے دل میں لاکھ روپے سے زیادہ ہے ورنہ لاکھ روپیہ کیوں چھوڑتا، کوئی شاید یہ کہے کہ صلحاء مسلمین میں تو یہ بات ہے کہ جو نماز و دیگر عبادات کے پابند ہیں، لیکن جو نماز ہی نہیں پڑھتے ان کی حالت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو محبت حق تعالیٰ کی ہوا بھی نہیں لگی، کیوں کہ لاکھ روپے تو دور رہے وہ تو بلا کسی لالچ کے ہی نماز چھوڑے بیٹھے ہیں، میں کہتا

ہوں ان میں بھی محبت خدا تعالیٰ کی ایسی ہے، جیسے نماز پڑھنے والوں میں صرف ظہور میں فرق ہے ترک نماز کی عادت نے نماز سے غافل بنا دیا۔ اس لئے نماز کے معاملہ میں تو ان سے محبت کا ظہور نہیں ہوتا مگر اس سے زیادہ کسی دوسرے موقع پر اس کا ظہور ہو جاتا ہے مثلاً دین کے لئے جان دینے کا موقع آن پڑے تو چاہے مسلمان کیسا ہی بے نمازی اور فاسق اور فاجر کیوں نہ ہو ہرگز تامل نہ کرے گا۔ وہاں تو لاکھ روپیہ تھے یہاں تو جان کی پرواہ نہیں۔ بلکہ بعض واقعات سے تو اس کا ثبوت ملتا ہے کہ نماز روزہ کرنے والوں سے زیادہ عام مسلمانوں نے جانبازی کی ہے یہ تو سوچنے ہی میں رہے کہ جان دینا چاہیے یا نہیں، اور انہیں کچھ پرواہ نہیں ہوئی۔ اندھے باؤلے ہو کر کود پڑے۔ نیز ہر شخص کو اپنی اولاد اور بیوی سے کیسی محبت ہوتی ہے لیکن اگر ان میں کوئی خدا اور رسول کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہہ دے تو فاسق سے فاسق مسلمان کو بھی تاب نہیں رہتی اور وہ اپنی اولاد کی گردن اتارنے پر تیار ہو جاتا ہے غرض ان سب حالات کے دیکھنے سے یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ مسلمان کو حق تعالیٰ کے ساتھ ضرور محبت ہے اور معمولی محبت نہیں بلکہ شدید محبت ہے جو بیوی بچوں سے کہیں زیادہ ہے جس کا ظہور اس وقت ہوتا ہے۔ جب کوئی خدا کی شان میں کچھ کہہ دے اس وقت مسلمان کو بچوں کی بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ سو اتنی محبت بلا دیکھے اور بلا نمونہ دیکھے اور بلا آواز سنے کیوں کر ہوئی۔ یہ تو ظاہر کہ خدا تعالیٰ کو کسی نے دیکھا نہیں اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ نمونہ بھی نہیں دیکھا کیوں کہ خدا تعالیٰ کا نمونہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ حق تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ جیسا کہ دہریوں سے بتایا گیا ہے حتیٰ کہ ملحد نے کہا تھا کہ مسلمان جیسا خدا کو مانتے ہیں وہ تو نہ ماننے کے حکم میں ہے کیوں

کہ جب اس کا کوئی نظیر ہی نہیں ؛ تو اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا ؛ کیوں کہ تصور نظیر ہی پر موقوف ہے اور جس کا تصور نہ ہو سکے ؛ اس کا ماننا ہی کیا ہے ؛ ہائے وہ اُلو کیا جانے خدا کیا چیز ہے یہ کیا ضرور ہے کہ جس کی نظیر نہ ہو ؛ اس کا وجود بھی نہ مانا جائے آفتاب کی نظیر کون سی ہے کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے ؛ کہ کسی جگہ دوسرا آفتاب بھی ہے ؛ یا کسی نے دیکھا ہے یا کسی زمانہ میں ہوا تھا ؛ اسی طرح جس بات کو دلیل ثابت کرتی ہے اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ ہم نے دیکھا ہی نہیں اس لئے نہیں مانتے البتہ اگر اس پر اعتراض کرنا ہی ہے تو اس طرح کرو کہ دلیل کے کسی مقدمہ کو باطل کرو اور اگر مقدمات باطل نہ ہو سکیں ؛ تو نتیجہ کا ثبوت یقینی ہے بخیر اس وقت اس ملحد کا کا جواب بتانا مقصود نہیں ؛ اس واسطے کلام کو کیوں طول دیا جائے ؛ خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ ما خطر ببالک فهو هالک والله اعلیٰ من ذٰلک ،

(ہر وہ وسوسہ جو تمہارے دل میں گذرتا ہے فنا ہونے والا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے برتر ہیں)

اسی کا ترجمہ یہ ہے ؛

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم — و ز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم

(اے اللہ آپ ہمارے خیال و قیاس گمان وہم سے برتر ہیں اور اس سے بھی جو کچھ ہم نے پڑھا ہے اور سنا ہے ؛)

مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر — ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(وقت ختم ہو گیا ؛ اور عمر آخر کو پہنچی ہم ایسے ہی تیرے وصف اول کے بیان میں ہیں)

اور دوسرا ایک شعر ہے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش — حسن این قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ، سیاہی کو پھینک کاغذ کو جلا اور خاموش رہ، اے حسن یہ عشق کا قصہ ہے دفتر میں نہیں سما سکتا۔)

ایسی شان ہے حق تعالیٰ کی پھر جو چیز خیال میں بھی نہ آوے اس کی محبت کیسے ہو سکتی ہے حتی کہ بعض اہل ظاہر نے تو کہہ دیا ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت بالمعنی الحقیقی نہیں ہو سکتی بس ارادہ طاعت ہی محبت ہے اس لئے مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ ارادہ عقلی سے عبادت کئے جائیں۔ اس پر امام غزالیؒ بہت خفا ہو کر کہتے ہیں کہ ان لوگوں کی مثال عنین کی سی ہے جو کہتا ہے کہ عورت میں کچھ لذت نہیں۔ سو جب کہ واقعات اور آثار اس بات کے شاہد ہیں کہ قلوب میں محبت خداوندی موجود ہے پھر اس کا کیسے انکار کیا جائے آخر ہم جو ایک انسان کی نسبت حکم لگا دیتے ہیں کہ اس کو کسی انسان سے یا کسی چیز سے محبت ہے تو یہ حکم کیسے لگا دیتے ہیں۔ کہ محبت ایک قلبی شئے ہے اس کے باوجود حکم لگا دینا صرف آثار ہی دیکھ کر تو ہوتا ہے پھر جب محبت خداوندی کے آثار موجود ہیں اور ایسے آثار موجود ہیں جو کسی دوسری چیز کی محبت میں نہیں ہو سکتے تو وجود محبت خداوندی کا حکم لگانا غلط کیسے ہو سکتا ہے اور اگر یہ غلط ہے تو حیوانات اور انسانوں میں باہمی محبت کا حکم لگانا بھی غلط ہے کیوں کہ اس کا مبنیٰ بھی آثار ہی ہیں۔ کسی نے دل چیر کر تو دیکھا ہی نہیں۔ اگر دھوپ دیکھ کر کوئی حکم لگا دے کہ آفتاب نکل آیا ہے تو اس کی تغلیط کیسے کی جا سکتی ہے یہ تو بداہت بلکہ حس کا انکار ہے اسی طرح محبت خداوندی کا وجود اہل اللہ میں تو اس طرح پایا گیا ہے کہ ان میں

تو اس کے آثار تھے ہی بعض دفعہ ان سے متعدی ہو کر آس پاس تک کو گھیر لیا ہے

اثر محبت

حضرت سمنون محب کا قصہ ہے کہ یہ کچھ محبت کا بیان کر رہے تھے کہ ایک چڑیا ان کے قریب آ بیٹھی اور تھوڑی دیر کے بعد ان کی گود میں آ بیٹھی اور تڑپنے لگی اور مر گئی دیکھئے کس درجہ محبت کا اثر ہے اب جو لوگ انکار کرتے ہیں وہ بتائیں کہ کاہے کا اثر تھا جس نے جانوروں میں بھی آگ لگا دی وہ انسان میں آگ لگا دے تو کیا بعید ہے غرض اس کا انکار بالکل مکابرہ ہے ضرور اس کا وجود ہے اور ہر شخص میں ہے پھر اس کا ایک درجہ تو فطرۃً ہر چیز موجود ہے مگر انسان اس کا مکلف کہ اس درجہ کو حاصل کرے جو اس کے اختیار پر رکھا گیا ہے جو لوگ اس سے محروم ہیں کیسے ہی متقی ہوں ان کا تقویٰ ذراسی بات میں ٹوٹ جاتا ہے بخلاف اہل محبت حضرات کے کہ ان کا تقویٰ بہت مستحکم ہوتا ہے کیونکہ محبت کے اثر سے اعمال ان کی عادت بن جاتے ہیں پھر عادت سے طبیعت ثانیہ اور ... روح بن جاتے ہیں اور جن میں یہ نہیں وہ جہاں رہ گئے وہاں رہ گئے محبت کے ساتھ خدا کا رستہ بہت قریب ہے اور بلا اس کے بہت بعید ہے اسی واسطے عراقی کہتے ہیں ؎

صنمارہ قلندر سزوار بمن نمائی　　　　که دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(مجھ کو تو طریق عشق میں چلائیے زاہد خشک تو بہت دور دراز کا راستہ ہے)

بلا محبت کے بڑے بڑے مجاہدوں سے بھی کبھی تو ایک ضعیف سا اثر ہو جاتا ہے جیسا کہ ادنیٰ درجہ کی محبت والے کو بلا مجاہدہ کے ہوتا ہے اور کبھی اتنا بھی نہیں ہوتا بلکہ ساری عمر اعمال ناقص ہی ادا ہوتے ہیں اس کی نسبت کہا گیا ہے ؎

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمین ندا بر آمد — کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

(جبکہ زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی تو نے سجدۂ ریا کا کر کے مجھ کو بھی خراب کیا)

بہ طواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند — کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

(خانہ کعبہ کے طواف کے لئے گیا تو حرم نے مجھے راستہ نہ دیا۔ اور کہا کہ تو نے حرم کے باہر کیا کیا، جو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے)

یہ تو اعمال کی حالت ہے اور احوال کی حالت یہ ہے کہ جن کو محبت نہیں، وہ بہت جلد گھبرا اٹھتے ہیں ذرا سا ابتلا ہوا اور قدم اکھڑ گئے، اور محبت والے کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت — سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کو یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ اس پر خنجر آزمائی کریں)

کسی کو تکلیف ہوتی ہو گی، ان کو تو مصیبت میں بھی لطف آتا ہے یہ محبت ہی کے آثار ہیں، اگر تم میں محبت نہ ہو تو اس کا انکار تو مت کرو، اہل محبت کے آثار کو دیکھ کر ماننا پڑے گا، کہ محبت الٰہی کا وجود ہے ؎

گر نبودے نالۂ نے را ثمر — نے جہاں را پر نہ کردے از شکر

(اگر نالۂ نے کا ثمرہ جو طلب ہے جس سے معرفت پیدا ہوتی ہے نہ ہوتا تو دنیا میں ہزاروں عارفین بھرے پڑے ہیں کہاں سے آتے)

بندگان خدا محبت والے موجود ہیں، اگر ان میں محبت نہیں، تو دوسرے ان کی محبت سے کیوں کر اہل محبت ہو جاتے ہیں، یہ طاقت محبت ہی میں ہے کہ اس کے پاس تک کو

پلیٹ لینی ہے محبت آگ ہے آگ کے اندر جو کوئی جاتا ہے وہ تو جلتا ہی ہے اور جو کوئی آگ کے ارد گرد ہوتا ہے گرم وہ بھی ہو جاتا ہے عقل میں اتنی قوت نہیں واللہ یہ قوت محبت ہی میں ہے۔ چنانچہ ایک اہل دل نے دونوں کو آزما کر کہا ہے: ؎

آزمودم عقل دور اندیش را　　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں نے عقل دور اندیش کو آزما لیا　　　جب اس سے کام نہ چلا پھر ہم دیوانہ بنے)

آزمودم عقل دور اندیش را　　(۲ بار)　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو آزمانے کے بعد میں نے دیوانگی اختیار کی ہے)

دیوانہ بنیں گے طعن سہیں گے، مصیبتیں جھیلیں گے مگر محبت وہ چیز ہے کہ کسی کا اثر نہ ہوگا، اور یہی کہیں گے ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(اگر ہم مفلس قلاش اور دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ ہے، یہی دولت کیا کم ہے کہ محبوب حقیقی کی محبت سے مست ہیں)

دیکھئے ادنیٰ سی بازاری مرد اور عورت یا ایک امرد کی محبت میں آبرو و غیرت سب فنا ہو جاتی ہے نہ مال کی پرواہ ہے نہ جاہ کی جب ایک نام عشق میں یہ حالت ہے تو حق تعالیٰ کے عشق میں جو واقعی عشق ہے اور سچا عشق ہے کیا حالت ہونا چاہیئے جو کچھ بھی ہو جاوے کم ہے کیوں کہ

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　　گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

(محبوب حقیقی کا عشق لیلےٰ سے کیا کم ہو، اس کی گلیوں میں پھرنا اولیٰ اور بہتر ہے)

آثارِ محبت غرض محبت کے آثار جہاں بھی ہوں، وہاں کیسے قائل نہ ہوں! کہ محبت کا وجود ہے تو یہ قول صحیح نہیں کہ خدا تعالیٰ کی محبت نہیں ہوسکتی؛ دراصل ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی عظمت پر نظر کرکے یہ کہدیا ہے کیوں کہ ظاہر ہے کہ محبت ایک تعلق کا نام ہے جس کے لئے وجود طرفین اور طرفین میں کچھ باہمی مناسبت کی ضرورت ہے اور بندہ اور خدا میں کیا مناسبت کہاں واجب اور کہاں ممکن غالباً یہ اصل ہوگئی ہے متکلمین کے انکار کی مگر اس کا حل یہ ہے کہ بندہ بیشک اس قابل نہیں ہے کہ اس کو واجب کے ساتھ ایک طرف میں رکھا جاوے لیکن محبت کا امکان اس طرح پر ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ بندہ کی محبت اس کے فعل سے نہیں؛ بلکہ اس طرف سے شروع ہوئی حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اس کے دل میں میری محبت ہو، بس ہوگئی؛ حق تعالیٰ کے ارادہ کے سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں اس لئے جس بندہ میں خدا تعالیٰ کی محبت دیکھو سمجھ لو کہ حق تعالیٰ کو بھی اس کے ساتھ محبت ہے مگر ظہور و خفا کا فرق ہے مولانا فرماتے ہیں: ؎

عشقِ معشوقاں نہاں است و ستیر   عشقِ عاشق باد و صد طبل و نفیر

(معشوق کا عشق پوشیدہ اور مخفی ہے   عاشق کا عشق ظاہر اور آشکارا ہے)

لیک عشقِ عاشقاں تن زہ کند   عشقِ معشوقاں خوش و فربہ کند

(لیکن عاشقوں کا عشق دبلا کرتا ہے   اور معشوقوں کا عشق موٹا اور فربہ کرتا ہے)

عاشق کی محبت پتہ دیتی ہے کہ حق تعالیٰ کو بھی اس سے تعلق ہے مگر وہاں کوئی انفعالی اثر نہیں کیوں کہ واجب الوجود پر کیا اثر ہوتا اسی واسطے اس کو ستیر کہا یعنی وجود

تو ہے مگر کوئی اثر ظاہر نہیں ایک جگہ فرماتے ہیں :

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں ۔ کو بہ نسبت ہست ہم این وہم آں

(جس کو عاشق دیکھو اس کو معشوق سمجھو گو نسبت کے ساتھ یہ بھی ہے اور وہ بھی)

عارفین کے ان اقوال سے تائید ہوگئی ہے کہ بندہ کی محبت درحقیقت خدا تعالیٰ کی محبت ہے اور خدا تعالیٰ کی تو بڑی شان ہے اہل اللہ جو مظہر شان خداوندی ہیں ان کی بھی یہی کیفیت ہے کہ اگر تمہیں ان سے محبت ہے تو وہ درحقیقت تمہاری طرف سے محبت ہے ورنہ کیا مجال تھی کہ تم ان کے پاس بھی پھٹک سکتے اگر ان کو تم سے تعلق نہ ہوتا تو قیامت تک تمہیں ان سے تعلق نہ ہوتا بلکہ نفرت ہوتی ع

نفرت فرعون تو میداں از کلیم

(فرعون سے نفرت کرنا اللہ کی طرف سے سمجھتے رہو)

یعنی فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا نفرت تھی ؟ خود حضرت کلیم کو اس سے نفرت تھی ، اگر وہ کشش کرتے تو فرعون کو مجال انکار نہ تھی ، باقی ان کا کشش نہ کرنا ، یہ حکمت الٰہیہ پر مبنی ہے ، ایک بزرگ سے ان کے مرید نے اپنی محبت کا اظہار کیا فرمایا تمہیں کیا محبت ہوتی ہم کو ہی تم سے محبت ہے اگر ہم اپنی توجہ ہٹالیں تو کبھی ہمارے پاس نہیں آسکتے چنانچہ مرید کی تنبیہ کے لئے انہوں نے ایک بار توجہ ہٹالی کئی مہینے تک پاس آنے کی توفیق نہیں ہوئی ، حالانکہ تھا ، اسی شہر میں پھر توجہ کی آموجود ہوا فرمایا دیکھا یہی یہ ہے تمہاری محبت کی حقیقت اس پر ہمارے حضرت فرماتے تھے ، کہ جب ثابت ہوا کہ تمہاری محبت دراصل ان مقبولین ہی کی محبت ہے جو تمہارے ساتھ ہے تو اس میں ایک اور بڑی بشارت ہے وہ یہ کہ معلوم ہوا کہ آپ

ان کے دل میں رہتے ہیں، اور ان کے دل تجلی گاہ حق ہیں تو تمہاری حالت کچھ بھی ہو، مگر انشاء اللہ انوار تجلی سے محروم نہ رہو گے، اس واسطے کوشش کرو کہ کسی کے دل میں جگہ کر لو اور اس بات کا پتہ کہ محبت انہیں کی طرف سے ہوتی ہے ان کے برتاؤ سے پتہ چلتا ہے اتنی محبت مرید کی طرف سے نہیں ہوتی، جتنی انکی طرف سے ہوتی ہے اہل اللہ اپنے منتسبین پر گویا فدا ہوتے ہیں ہمارے حضرت نے ایک دفعہ فرمایا کہ اگر اب میں تھانہ بھون جاؤں تو کہاں ٹھہروں پھر خود ہی فرمایا کہ اشرف علی کے ہاں ٹھہروں، دیکھئے کسی عزیز قریب کا نام نہیں لیا، لیا تو ایک خادم ہی کا نام لیا، یہ شفقت ہوتی ہے بزرگوں کے خدام پر ایک مرتبہ حضرت نے میری اہلیہ کو ایک کپڑا بطور تبرک دیا، اس پر ایک خادمہ نے عرض کیا کہ فلانی آپ کی رشتہ دار پوتی ہے اس کے لئے بھی دیجئے فرمایا ہم کسی بیٹی پوتی کو نہیں جانتے ہمارے پوتے وہی ہیں، جن کو اللہ کے لئے ہم سے تعلق ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ اولاد اور رشتہ داروں سے اُن کو تعلق نہیں ہوتا، ان کو تعلق سب سے ہوتا ہے چنانچہ اگر کوئی ان کے رشتہ داروں سے بدسلوکی کرے تو دل جوش انہیں کو ہوگا، کیوں کہ ادائے حقوق ضروری ہے اور اہل اللہ سے بہتر کوئی ادائے حقوق نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ حقوق کو شریعت کے موافق ادا کرتے ہیں اور شریعت سے بہتر کوئی حقوق کو نہیں جان سکتا اور وہ جوش بجا ہوتا ہے کیوں کہ کسی شخص کے رشتہ داروں کے ساتھ بدسلوکی وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اس شخص کے ساتھ محبت نہ ہو رشتہ دار تو بڑی چیز ہیں ادنیٰ تعلق جس چیز کو محبوب کے ساتھ ہوتا ہے محب کے نزدیک وہ بھی محبوب ہوتی ہے، دیکھے سگ لیلےٰ

کے ساتھ مجنوں نے کیا برتاؤ کیا اس کو گود میں اٹھا لیا. کسی نے کہا کہ یہ کیا حرکت ہے تو وہ کہتا ہے :۔

پاسبان کوچہ لیلے است این (یہ لیلے کے کوچہ کا چوکیدار ہے)

محبت ایسی ہی چیز ہے یہ وجہ اہل اللہ کے اس غصہ کے بجا ہونے کی حضرت شیخ عبد القدوس رحمتہ اللہ علیہ کے ایک بیٹے کے ساتھ بعض خلفاء شیخ نے بد سلوکی کی تو شیخ کو بڑے غصہ کا حظ ان کے پاس گیا ان کا غصہ در اصل ان رشتہ داروں کیطرف داری سے نہیں ہوتا ؛ بلکہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مدعی محبت کا دعوٰی جھوٹا ثابت ہوا اس تصنع سے وہ بھڑک اٹھتے ہیں ؛ تو کوئی یہ نہ سمجھے کہ اہل اللہ کو اولاد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ؛ ان کو ہم سے بھی زیادہ تعلق ہوتا ہے چنانچہ ہمارے وطن میں ایک معلمہ کے پاس ایک لڑکی پڑھنے آئی ؛ وہ لڑکی سید کی تھی ؛ تو اس معلمہ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں اور کہا ہماری بچی آئی ہے اس پر اچھی طرح توجہ رکھنا دیکھئے کتنے بعید رشتہ کا یہ خیال ہے ؛ غرض اہل اللہ کو عزیز و اقارب سے بھی محبت ہوتی ہے اور منتسبین سے بھی ہوتی ہے اور انہیں کی محبت کا عکس منتسبین کی محبت میں دکھائی دیتا ہے ان کے ساتھ تمہاری محبت در اصل ان کی محبت تمہارے ساتھ ہے تو گو اس وجہ سے کوئی ظاہر پرست محبت کا انکار کر دے کہ کہاں بندہ اور کہاں خدا بندہ کا کیا منہ ہے کہ خدا سے تعلق جوڑے لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ تعلق بندہ نے نہیں جوڑا بلکہ خدا تعالیٰ نے جوڑا ہے تو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے غرض خدا کی محبت کا وجود قلوب میں ہے اور ضرور ہے اور خدا کی محبت تو بندہ کی غذا ہے خواہ محبت کو معتذر معروف کہو یا مجہول کہو کوئی صورت بھی محبت خدا بندہ

کا حیات روحانی کے لئے شرط ہے جیسے غذا حیات بدنی کے لئے شرط ہے بے غذا
کے زندگی نہیں رہ سکتی، جب محبت بندہ کی غذا ٹھہری تو اس کی ضد یعنی بغض تو بڑی
چیز ہے بلکہ عدم محبت بھی مرنے کے لئے کافی ہے جیسے مرنے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں
کہ زہر کھالیا جاوے بلکہ غذا کا بند کردینا کافی ہے تو جس چیز کے لئے یہ کہا جائے کہ یہ
محبت کی ضد یعنی بغض پیدا کرنے والی ہے وہ تو سب سے بدتر چیز ہو گی، وہ چیز کبر
ہے یہ حق تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے؛

تواضع

انّ اللہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ (اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو
پسند نہیں فرماتے) میں اسی کو بیان فرمایا گیا ہے لَا یُحِبُّ بمعنی یُبْغِضُ ہے
اور نکتہ اس میں وہ ہے جو بیان ہوا کہ اپنی محبوبیت اور بندہ کی محبت پر نظر کرکے
یبغض کی ضرورت ہی نہیں لائے۔ بلکہ اسی کو کافی قرار دیا گیا؛ خلاصہ یہ کہ کبر مبغوض ہے اور
اور بدترین چیز ہے جب یہ ایسا ہے؛ تو اس کا مقابل بہترین اشیاء اور حق تعالیٰ کے
نزدیک محبوب ہوگا؛ اور وہ تواضع ہے تواضع فی نفسہ بھی محبوب ہے اور اس وجہ
سے بھی ضروری ہے کہ تواضع کبر کا علاج ہے اور کبر کا علاج ضروری ہے کیونکہ یہ
بدترین مرض اور ام الامراض ہے اور یہ مرض عام ہے تو بیان تواضع کا اختیار کرنا مفید
عام مضمون ہوا؛ اس واسطے اس حدیث کو اختیار کیا گیا ہے؛ حاصل یہ کہ کبر کا علاج
تواضع ہے اب ضروری ہے کہ تواضع کے معنی بیان کئے جائیں۔

تواضع کی حقیقت

میں مختصراً اس کی حقیقت بیان کرکے ختم کرتا ہوں؛
تواضع کی حقیقت عوام جہلاء میں تو یہ ہے کہ مہمان کی
خاطر کی جاوے پان، چا اس کے سامنے رکھا جاوے کھانا کھلایا جاوے نرم زبان

سے بولا جائے اس کے لئے دوسرا لفظ خاطر کرنا ہے کہتے ہیں: فلاں آدمی بڑی خاطر کا آدمی ہے اسی کو ذرا پڑھے لکھے مگر جاہل ہی یوں کہہ دیتے ہیں کہ فلانے کے یہاں مہمان کی بڑی تواضع ہوتی ہے: بہر حال یہ معنی تو عرفی ہیں: اور حقیقی معنی سے یہ معمولی لیاقت کے لوگ بھی واقف نہیں حتیٰ کہ ان لوگوں میں جو اعلیٰ درجہ کے نئے تعلیم یافتہ ہیں بی اے اور ایم اے والے وہ بھی اس حقیقی معنی سے بے خبر ہیں بلکہ وہ تو لفظ بھی صحیح نہیں بولتے: کیوں کہ اردو زبان کی شائستگی فارسی سے پیدا ہوتی ہے جس سے یہ لوگ بے بہرہ ہیں: بلکہ اردو کا املا تک ان کا غلط ہوتا ہے چنانچہ ایک تعلیم یافتہ سب جج نے ایک فریق کے اظہار علمبار کرنے میں اعتراض ز سے لکھا تھا: اس فریق نے دیکھ کر اعتراض کیا کہ اعتراض ز سے نہیں ہے کہا ہاں غلطی ہوئی ظ سے ہے تو یہ لوگ الفاظ تک غلط بولتے ہیں: تواضع کو توازے بولتے ہیں: غرض اس کے صحیح معنی سے یہ لوگ سب کے سب ناآشنا ہیں: جن میں بعضے تو ایسے ہیں کہ لفظ سے بھی ناآشنا ہیں اور بعضے لفظ جانتے ہیں مگر معنی سے ناآشنا ہیں اچھی طرح جان لیجئے کہ تواضع لفظ عربی ہے: اور جن معنوں میں عوام نے استعمال کیا ہے اُن معنوں میں تو عربی زبان میں یہ لفظ کہیں آیا ہی نہیں: اس پر ایک قصہ یاد آگیا: ایک دیہاتی لڑکا تھا اس نے ایک استاد سے کریما شروع کی جب یہ شعر آیا: ؎

دلا گر تواضع کنی اختیار | شود خلق دنیا ترا دوستدار

(یعنی اے دل اگر تواضع اختیار کرے | تو تمام مخلوق تیری دوست بن جائے)

استاد نے پوچھا جانتے ہو تواضع کس کو کہتے ہیں کہا اجی ہاں یہی یا دا، تیہ دے تیا یہ تو ایک گنوار کی بات ہے پڑھے لکھوں کے نزدیک جو معنی ہیں وہ بھی اسی کے قریب

قریب ہیں صرف لفظ دوسرے ہیں ان کے نزدیک تواضع کے معنی ہیں: نرمی سے بولنا؛ جھک جھک کر سلام کرنا، جھوٹی باتیں بنانا، حقیقت سے دونوں دور ہیں؛ صاحبو! اس کے معنی حقیقت میں اپنے آپ کو پست سمجھنا ہیں؛ نہ پست بنانا، یہ جھک جھک کر سلام کرنا اور باتیں بنانا تکلف پست بنانا ہے؛ یعنی بناوٹ ہے نہ حقیقت بلکہ حقیقت میں تو آج کل تواضع تکبر ہے جو تواضع کی ضد ہے اور اس سے تعجب نہ کیجئے کیوں کہ میں ایک امتحان بتاتا ہوں جس کسی کو آپ بہت متواضع دیکھیں جو بار بار جھک جھک کر سلام کرتے ہوں اور بہت ہی منکسر النفس ہوں اور ہر شخص سے آپ اور جناب سے بات کرتے ہوں اور اپنے آپ کو یہ کہتے کہ میں کس قابل ہوں میں تو محض نالائق ہوں تو جس وقت وہ یہ کہیں کہ میں نالائق ہوں اس وقت آپ ذرا کہہ دیجئے ہاں صاحب واقعی آپ تو نالائق ہیں پھر دیکھیے وہ کتنا ناچتے ہیں؛ اور امید تو ہے کہ ساری عمر کیلئے دشمن ہو جائیں گے اگر یہ بناوٹ نہ تھی اور جھوٹ نہیں تھا اور وہ دل سے یہ الفاظ کہتے تھے تو یہ غضب اور کینہ کیوں ہوا معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو نالائق صرف اس واسطے کہا جاتا ہے تاکہ دوسرا ان کی زیادہ تعریف کرے کہ فلانے بڑے متواضع ہیں؛ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں؛ تو صورت تو تواضع کی ہے مگر حقیقت میں بڑا بننا اور تکبر کرنا مقصود ہے جو تواضع کی ضد ہے اور جو واقعی متواضع ہیں، وہ ایسے تصنع کے الفاظ کبھی نہیں کہتے اس لئے ان کی نسبت اکثر لوگ یہی کہتے ہیں؛ کہ انہیں تواضع اور اخلاق نہیں ہیں کسی کو منہ ہی نہیں لگاتے؛ صاحبو! ان میں بناوٹ نہیں؛ سچے اخلاق ہیں جھوٹے نہیں ان کا تو حکیمانہ قول یہ ہے کہ اگر کوئی منہ پر تعریف کرے تو اس تعریف سے نہ انکار کرو نہ اس کو منع کرو؛ کیوں کہ اس سے اور زیادہ تعریف کریگا، اور دوسرے دیکھنے والے

بھی تمہارے معتقد ہو جائیں گے، بلکہ خاموش ہو رہو وہ اپنا سا منہ لے کر خود خاموش ہو جاوے گا، اور سب سمجھیں گے کہ یہ بے حس آدمی ہے جو تعریف سے کچھ بھی خوشی ظاہر نہیں کرتا، بت بن کر بیٹھ گیا، پھر آئندہ نہ کوئی تعریف کرے گا، نہ عقیدت مند ہو گا، یہ ہے حقیقی تواضع،

آجکل کا دستور

آجکل ایک اور طریقہ نکلا ہوا ہے پہلے لوگ تو جب کوئی ان کی تعریف کرتا تھا، انکسار کے الفاظ کہتے تھے، کہ جناب میں اس قابل کہاں ہوں آپ بناتے ہیں، من آنم کہ من دانم یہ اگرچہ بناوٹ ہی تھی مگر خیر صورت تو تواضع کی تھی، اور اب طریقہ نکلا ہے کہ اپنی تعریف کا شکریہ ادا کرتے ہیں، کہ میں اس عنایت کا نہایت شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ کو ان القاب سے نوازا مطلب یہ ہے کہ ایسے ہی الفاظ سے مجھے یاد کیا کیجئے، اور میں اسی قابل ہوں، اس میں صورت بھی تواضع نہیں رہی کھلا ہوا تکبر ہے، غرض تکبر کھلا ہوا ہو یا ڈھکا ہوا چھپتا نہیں ہے، برتاؤ سے حال معلوم ہی ہو جاتا ہے پھر جیسا واقع میں ہوتا ہے ویسا ہی حکم کیا جائے گا، اگر واقع دل میں بڑا بننے چاہتے ہو تو چاہے نالائق بنو یا خاکسار بنو تکبر ہی کا حکم ہو گا، اور اگر دل میں پستی اور انکسار ہے تو خواہ کوئی لفظ بھی زبان سے نہ کہو اور مدح سن کر متکبرین کی طرح خاموش ہی بیٹھے رہو، تب بھی تکبر نہیں تواضع ہی ہے ہمارے ایک بزرگ استاد تھے ان کی عادت تھی، کہ جب کوئی انکی تعریف منہ پر کرتا تو خاموش محض ہو جاتے اسکی ناواقف دیکھنے والا یوں سمجھتا کہ یہ اپنے آپ کو اس تعریف کا اہل سمجھتے ہیں، اور یہ تکبر ہے مگر دوسرے وقت ان کی یہ حالت تھی کہ دیوبند کے قریب اِملیا ایک گاؤں ہے اس میں آموں کی دعوت ہوئی،

داعی نے سواری تک نہیں بھیجی یہ بزرگ مع رفقاء کے پیدل چلے گئے جب وہاں سے
آم کھا کر چلنے لگے تب بھی بلانیوالے نے سواری کو نہ پوچھا پیدل ہی چلے چلتے وقت گھر والوں
کے واسطے اس نے آم دیئے، ظاہر ہے کہ مولانا کو اوروں سے زیادہ حصہ دیا ہوگا؛
مولانا نے اپنا حصہ لنگی میں باندھ لیا، مولانا دہلی میں شہزادوں کی گودوں میں پلے ہوئے
تھے، اور بہت نازک بدن تھے، بوجھ لے چلنے کی عادت کہاں، اس گٹھری کو کبھی اس
ہاتھ میں لیتے اور کبھی اس ہاتھ میں لیتے بمشکل دیوبند کے قریب پہنچے، جب بازار کے
قریب پہنچے تو تھک کر اس گٹھری کو سر پر رکھ لیا تو بڑا آرام معلوم ہوا؛ تو فرماتے ہیں
کہ میاں پہلے سے یہ ترکیب سمجھ میں نہ آئی بڑے آرام سے آتے سر پر گٹھری رکھے ہوئے
چلے جاتے ہیں اور دونوں طرف سے سلام ہوتے جاتے ہیں اور مصافحے ہوتے جاتے
ہیں اور مولانا بے تکلف چلے جاتے ہیں؛ مدرسہ تک اسی طرح چلے گئے راستہ میں
معتقدین نے لینا بھی چاہا مگر کسی کو نہیں دیا، ہشاش بشاش ذرا طبیعت پر بار نہیں
تھا، لوگ عموماً وضع کی پابندی کو اچھا سمجھتے ہیں؛ اور اس کو ضروری کہتے ہیں؛ اور
کہتے ہیں؛ کوئی عادت نا وقتیکہ خلاف شرع نہ ہو؛ گناہ کیا ہے میں کہتا ہوں اکثر
اوضاع کی بنا ترفع پر ہے البتہ اگر کسی میں ترفع نہ ہو اور اس میں یہ بات پیدا ہو گئی
ہو، جو مولانا میں تھی؛ کہ کسی وقت اپنی وضع کے خلاف کام کرنے پر نفس کو ذرا رکاوٹ
نہ ہو؛ تو وہ شخص متکبر نہیں اور اس کے عادات بھی بری نہیں؛ ورنہ پابند وضع
زیادہ متکبر ہے میں یہ نہیں کہتا کہ سب پانچ پانچ سیر بوجھ ہی لادو، مگر کچھ تو کم از کم اخلاق
کی اصلاح کی طرف کسی کو توجہ نہیں؛

صحبت بزرگان

ہماری طرف ایک بزرگ مولانا مظفر حسین صاحب تھے
وہ اپنے معمولات کے بہت پابند تھے تہجد سفر میں بھی قضا
نہ کرتے تھے اس وقت ریل نہ نکلی تھی لوگ بہلیوں میں سفر کیا کرتے تھے۔ مولانا اس میں بھی
تہجد پڑھتے تھے۔ مگر کبھی اس ضرورت سے بہلی کو ٹھہرایا نہیں کیونکہ اس
سے دوسرے رفقاء کا حرج ہوتا۔ یا کم از کم گاڑی بان کا تو حرج ہوتا اور عارفین
کسی کی کلفت کو کبھی گوارا نہیں کرتے بس یہ کرتے کہ گاڑی سے آگے بڑھ جاتے
اور دو رکعت پڑھ لیتے جب گاڑی نزدیک آتی آگے بڑھ جاتے پھر دو رکعت
پڑھ لیتے اسی طرح تہجد ختم کرتے۔ بھلا آج تو کوئی شیخ صاحب کر کے دکھادیں
اور تو سفر میں تہجد ہی کون پڑھتا ہے اور کسی کو شوق ہوا تو بس بہلوان کم بخت کی مصیبت
ہے کہ گھنٹہ بھر تک گاڑی کو روکے کھڑا رہے۔ تہجد اور راحت رسانی مخلوق دونوں
کو جمع کر کے دکھادو تو جانیں یہ مولانا مظفر حسین صاحب ہی کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ
مولانا دہلی سے کرایہ کی ایک بہلی میں چلے گاڑی بان سے دیہاتیوں کی طرح باتیں
کرتے رہے تاکہ وہ مانوس ہو۔ کیونکہ رفیق سفر کو مانوس کرنا بھی حق رفاقت
ہے پھر اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہو گیا کہ یہ بہلی رنڈی کی ہے مولانا کو بڑی
وحشت ہوئی۔ کیونکہ آپ بڑے متقی تھے۔ ان کا تقویٰ مشہور ہے وہ ایسی گاڑی
میں کیونکر سوار ہو سکتے ہیں۔ جو حرام کمائی سے تیار کی گئی ہو۔ مگر کمال یہ ہے کہ
آپ نے اترنے میں جلدی نہیں کی۔ سنتے ہی فوراً نہیں اتر پڑے اس خیال سے
کہ گاڑی بان کی دل شکنی نہ ہو۔ تھوڑی دور جا کر پیشاب کے بہانے سے اترے
پھر اس سے کہا کہ اب تو پیدل چلنے کو جی چاہتا ہے گاڑی بان سمجھ گیا۔ اور

عرض کیا کہ میں سمجھ گیا ہوں، اب بہتر ہے کہ مجھ کو رخصت فرمایئے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا میرے کرایہ کے سبب ممکن ہے کہ کوئی کرایہ لوٹ گیا ہو تو یہ خسارہ مجھ کو گوارا نہیں اسی طرح کاندھلہ تک بہلی لائے اور خود پیادہ تشریف لائے یہاں پہنچ کر پورا کرایہ دیکر رخصت کیا، یہ کمال یہ باتیں بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہیں: حضرت صحبت میں رہ کر دین آتا ہے میں بقسم کہتا ہوں کہ کتابوں سے دین نہیں آتا: ضابطہ کا دین تو کتاب سے آسکتا ہے مگر تحقیقی دین بلا کسی کی جوتیاں سیدھی کیے: بلکہ بلا جوتیاں کھائے نہیں آسکتا، دین کسی کی خوشامد نہیں کرتا، دین ان ہی نخروں سے آتا ہے! اب جس کا جی چاہے لے اور جس کا جی چاہے نہ لے اکبر ایک اچھے شاعر تھے ان کا کلام حکیمانہ ہوتا ہے ان کا مصرعہ ہے:

ع دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

یہ بات بالکل سچ ہے اہل اللہ میں ایک کمال یہ ہوتا ہے کہ تقوی کے ساتھ کسی کی دلشکنی نہیں کرتے ان سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی ہاں اگر کوئی اصلاح کی استدعا کرے تو اس کی ضرورت سے تنبیہ اور پوری سیاست کرتے ہیں کیونکہ بلا اس کے اصلاح نہیں ہو سکتی یہ ایسا ہے جیسے فصاد زخم کا علاج کرتا ہے۔۔۔ کہ جہاں چیرے کی ضرورت ہے اگر وہاں وہ زخم کرے تو باعث ضرر ہے: اور ایسے زخم کی صورت میں فصاد کو رحمدل نہ کہا جائے گا: بلکہ ظالم کہیں گے اس لئے جہاں اصلاح میں سیاست کی ضرورت ہو، وہاں اہل اللہ پوری سیاست کرتے ہیں مگر سیاست میں بھی امکان بھر نرمی کا پہلو نہیں چھوڑتے: ان ہی بزرگوں کا یعنی مولانا مظفر حسین صاحب کا قصہ ہے انہوں نے کہا کہ ایک پہلوان مسجد

میں آیا، اور غسل کرنا چاہتا تھا، موذن نے اس کو ڈانٹا اور کہا نماز کے نہ روزے کے مسجد میں نہانے کے لیے آجاتے ہیں ان بزرگ نے ڈانٹنے والے کو منع کیا، اور خود اس کے نہانے کے پانی بھرنا شروع کر دیا، اور اس سے کہا ماشاء اللہ تم تو بڑے پہلوان معلوم ہوتے ہو، ایسے تو زور بہت کرتے ہو، ذرا نفس کے مقابلہ میں بھی تو زور کیا کرو، نفس کو دبایا کرو، اور ہمت کر کے نماز پڑھا کرو، پہلوانی تو یہ ہے بس وہ شخص پانی پانی ہو گیا، اور بہت شرمایا، اسی وقت سے نماز کا پابند ہو گیا، اسی طرح ان ہی مولوی صاحب کا قصہ ہے کہ انہوں نے ایک رئیس سے کہا کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے انہوں نے کہا کہ نماز تو پڑھ لیں مگر وضو کی ہیچ ایسی ہے کہ ہمارے بس کی نہیں بار بار داڑھی کو اتار کر کون چڑھائے یہ رئیس داڑھی چڑھانے کے عادی تھے، مولوی صاحب نے کہا آپ بے وضو نماز پڑھ لیا کریں، مگر پابندی کے ساتھ پڑھیے، رئیس نے کہا کہ بے وضو نماز پڑھنے سے گناہ تو نہ ہوگا، فرمایا آپ بے فکر رہیں اگر گناہ ہوگا تو مجھے ہوگا، آپ تو میرے کہنے سے تو پڑھیں گے اب کیا تھا مجبوراً نماز شروع کرنا پڑی اور مولوی صاحب کی یہ برکت تھی کہ اول ہی وقت یہ بات خیال میں آئی کہ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ بدون وضو نماز نہیں ہوتی یہ تو ان کی شفقت تھی، کہ مجھ کو راہ پر لگایا اور قطع حجت کے لیے یہ گنجائش دے دی تو بے وضو پڑھنے کی نوبت نہیں آئی اور خود مولوی صاحب کو بھی یہی مقصود تھا، اور ان رئیس کے فہم پر اعتماد تھا، تو وہ گنجائش صرف صورۃً تھی، حقیقتاً نہ تھی، پھر جب بار بار داڑھی چڑھانے میں دقت معلوم ہوئی، داڑھی بھی چھوڑ دی، بس اہل اللہ میں اس قدر شفقت

ہوتی ہے کہ خلق خدا کو اولاد کے برابر اور بھائیوں کے برابر سمجھتے ہیں یہ بات یاد رکھو کہ غیروں سے ہرگز سختی نہ کرو۔ ہاں جس پر تمہاری حکومت ہو اس کے ساتھ سیاست سے کام لو ہر جگہ سختی نہ کرو۔ یہ شفقت ہی کا اثر ہے کہ اسلام اس قدر پھیلا۔

حقانیت اسلام

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کے متعلق ارشاد ہے وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ یعنی اگر آپ بدگو اور سخت ہوتے تو کوئی بھی آپ کے پاس نہ بیٹھتا سب ادھر ادھر بھاگ جاتے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ آپ کے پاس مسلمانوں کا بہت اجتماع تھا۔ تو معلوم ہوا کہ آپ بدگو اور سخت نہ تھے۔ جیسا کہ تاریخ سے بخوبی ثابت ہے یہ وجہ ہے اجتماع کی اور حیرت ہے کہ آجکل بعض لوگ تاریخ کو بھی نہیں دیکھتے اور بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا اس کا جواب مولانا محمد قاسم صاحب نے خوب دیا تھا کہ شمشیر کے لئے شمشیر زن کہاں سے آئے تھے۔ اگر وہ شمشیر زن بھی بزور شمشیر آئے تھے تو یہ سلسلہ تسلسل کو مستلزم ہے لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ شمشیر زنوں میں اسلام بلا زور شمشیر آیا تھا۔ جب کچھ لوگوں میں اسلام بلا زور شمشیر آیا تو اوروں میں اس طرح آنے سے کون چیز مانع ہے۔ پس ثابت ہوگیا کہ اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا اسلام تو اصلاح کے لئے ہے۔ اور تلوار دفع شر کے لئے ہے نہ کہ اصلاح کے لئے جہاد سے اشاعت اسلام مقصود نہیں۔ بلکہ حفاظت اسلام مقصود ہے لوگ ان دونوں میں فرق نہیں سمجھتے اس کے لئے خواہ مخواہ اعتراض کرتے ہیں جن لوگوں کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بزور شمشیر اسلام پھیلایا۔ ان کے حالات دیکھئے تو معلوم

ہو گا: کہ اسلام تلوار سے پھیلایا یا اپنی پاکیزہ تعلیم سے: حضرت علیہ رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کے سردار تھے: ایک جگہ جنگ میں عیسائیوں سے عارضی صلح ہوئی ایام صلح میں لشکر اسلام کے سپاہی کے ہاتھ سے ان کے بادشاہ کی تصویر کی آنکھ پھوٹ گئی عیسائیوں کو سخت ناگوار ہوا: حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے شکایت کی: اس وقت تو مسلمانوں کا پلہ ہر طرح سے غالب تھا: یہ ممکن تھا کہ سماعت بھی نہ کرتے بلکہ اس تصویر کو بھی اکھاڑ کر پھینک دیتے مگر اسلامی تعلیم کا اثر دیکھئے کہ انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا: اور کہا کہ ہم نے قصداً ایسا نہیں کیا: اور ہم اس کا بدلہ دینے کو تیار ہیں: حضرت ابوعبیدہؓ کھڑے ہو گئے کہ اس تصویر کے بدلے تم میری آنکھ پھوڑ لو: بس فوراً ہی مخالفوں کی گردنیں جھک گئیں: یہ اخلاق تھے جنہوں نے اسلام کو پھیلایا اور آنکھیں بند کر کے تو جس کا جی چاہے کہہ دے: میں کہتا ہوں کہ تلوار کے زور سے اگر اسلام پھیلایا بھی جائے اور بزور کسی کو مسلمان بھی کیا جائے تو اس کا اسلام ایسا ہونا چاہیئے: کہ تلوار ہٹتے ہی نادارد ہو جائے وہ کون چیز تھی جو تلوار ہٹنے کے بعد بھی اسلام کو قلوب میں برقرار رکھتی تھی وہ اسلام کی حقانیت ہی تھی: کہ ایک دفعہ کلمہ پڑھنے کے بعد جان جاتی رہے: مگر اسلام نہیں چھوٹ سکتا: اور پھیلانے کا ذریعہ اخلاق تھے: جس کا نمونہ مولانا مظفر حسین صاحب کے بعض واقعات سے معلوم ہوا ہے انہی بزرگ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ راستہ میں ایک بڈھے کو دیکھا کہ بوجھ سر پر لئے ہوئے آ رہا ہے اور تھک گیا ہے آپ سے نہ رہا گیا: اس سے کہہ سن کر اس کا بوجھ اپنے سر پر رکھ لیا: حالانکہ خود بھی جوان نہ تھے: اس نے کہا بھی کہ میاں جی تم بھی بڈھے ہی ہو: کہا کہ میں اول تو تجھ

سے کم بڈھا ہوں، دوسرے تازہ دم ہوں، اس کا بوجھ لئے دور تک چلے گئے اور اس سے باتیں کرتے رہے۔ اس نے کہا کہ میں مولوی مظفر حسین سے ملنے کا بہت مشتاق ہوں، سنا ہے کہ وہ آجکل ادھر آئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں میں ان سے ملادوں گا، یہاں تک کہ جب اس کے گاؤں میں پہنچ گئے، وہاں پہنچ کر پھر اس نے کہا کہ بھائی یاد رکھو مجھ کو مولوی مظفر حسین سے ضرور ملائیو۔ اس وقت فرمایا کہ مظفر حسین تو میں ہی ہوں وہ نہایت شرمندہ ہوا اور ان کے قدموں میں لوٹنے لگا، مولانا نے کہا کہ بھائی شرمندگی کی کیا بات ہے ایک مسلمان کا کام کر دیا تو کیا ہو گیا، اور انہی مولانا کی حکایت ہے جو بالکل اس کی مصداق ہے۔

شنیدم کہ مردان راہِ خدا | دل دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام | کہ با دوستانت خلاف است وجنگ

(یعنی میں نے سنا ہے کہ مردانِ راہِ خدا نے دشمنوں کے دل کو بھی رنجیدہ نہیں کیا، تجھ کو یہ مرتبہ کب حاصل ہو سکتا ہے اس لئے کہ دوستوں کے ساتھ بھی تیری لڑائی اور ان سے مخالفت ہے)

ایک قصہ ہے بیڈولی کسی سفر میں مولانا وہاں پہنچے اور سرائے میں ٹھہرے وہاں ایک مہاجن بھی مع اپنے لڑکے کے ٹھہرا ہوا تھا، لڑکے کے ہاتھ میں سونے کے کڑے تھے اس نے مولانا سے سب پتہ وغیرہ پوچھا، جیسے آپس میں مسافر پوچھتے ہیں کہ آپ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے، مولانا نے فرمایا کہ بھائی صبح کو فلاں جگہ جاؤں گا، چنانچہ مولانا شب کو تہجد پڑھ کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گئے، اس بنئے کی جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا تو لڑکے کے ہاتھ میں کڑے

ندارد حضرت مولانا نہایت غریبانہ حالت سے دیکھ رہے ہیں بنیئے نے خیال کیا: کہ ضرور یہی غریب سا آدمی جو یہاں ٹھہرا ہوا تھا: کپڑے اتار کر لے گیا: اس نے پتہ تو مولانا سے پوچھ ہی لیا تھا: بس اٹھ کر سیدھے اس کی طرف کو ہو لیئے مولانا جا ہی رہے تھے بنیئے نے آواز دی حضرت نے فرمایا کہ بھائی کیوں کیا ہے کس کے پاس جا کر ایک گھونسا لگایا اور کہا کپڑے لے کر چلے آئے: اور کہتے ہیں کیا ہے چلو تھانہ کو اس پر حضرت نے جی میں کہا کہ توں کیوں ایسی حالت میں رہتا ہے جو اس کا تیری طرف ایسا خیال ہوا: تیرا علاج یہی ہے: پھر حضرت نے فرمایا کہ بھائی چل چنانچہ چلتے چلتے جھنجانہ کے قریب آئے تھانہ آبادی کے باہر تھا: تھانہ دار مولانا کا معتقد تھا جوں حضرت مولانا کو دور سے دیکھا سر زنار تعظیم کے لیئے کھڑا ہو گیا: اب تو بنیا گھبرایا اور سمجھا یہ کوئی بڑے آدمی ہیں مولانا نے فرمایا ڈرو مت میں تجھے کچھ نہ کہنے دوں گا چنانچہ تھانیدار نے جب اس کی خبر لینی چاہی تو مولانا نے کہا اگر اس سے کچھ بھی کہو گے: تو مجھے سخت تکلیف ہو گی اور بنیئے سے کہہ دیا جا بھاگ جا بھاگ جا: پھر مولانا فرمایا کرتے تھے: کہ مجھے اس واقعہ سے بڑا نفع ہوا: جب لوگ مجھ مصافحہ کرتے ہیں اور ہاتھ چومتے ہیں تو میں خیال کرتا ہوں: کہ مظفر حسین اللہ پاک کا تجھ پر بڑا فضل ہے کہ تجھے ان لوگوں کی نظر میں معزز بنا دیا ہے ورنہ تیری حیثیت تو وہی ہے جو اس بنیئے کی نظر میں تھی: یہ ہیں اخلاق اہل اللہ کے اور یہ ہیں تواضع کہ دل دشمناں ہم نکردند تنگ (دشمنوں کے دل کو بھی رنجیدہ نہیں کیا:) کتاب میں تو پڑھا ہی ہو گا۔ مگر یہ اس کی نظیریں اس زمانہ تک موجود ہیں:

عزت کی قیمت

اب تو کسی کو ایک سخت لفظ کہہ دینے سے توہین کی نالش ہوتی ہے کہ میری ہتک عزت کی گئی ایک لاکھ روپیہ معاوضہ دلایا جائے آجکل ان چیزوں کی بھی قیمت مقرر ہوئی ہے جو متقوم نہیں بس بات یہ ہے کہ ہر طرح روپیہ کی کمائی چاہیئے، روپیہ ایسا مقصود بالذات ہوا ہے کہ ہر چیز کا عوض بن سکتا ہے عزت کا عوض بھی روپیہ ہو گیا، کیا ادنیٰ چیز کو عزت کا عوض بنایا، حالانکہ عزت تو بے بہا چیز ہے کیونکہ وہ عظمت خداوندی کی ایک جھلک ہے اس کو بھی اہل اللہ ہی سمجھ سکتے کہ عزت کی قیمت کیا چیز ہے مگر آجکل یہ مذاق ہو گیا ہے، کہ مال کو عزت کی قیمت اور عوض بناتے ہیں: ایک مذاق تو یہ ہے اور اہل تحقیق کا دوسرا مذاق یہ ہے انہوں نے ایک اور چیز کو اس کا عوض سمجھا، وہ عوض یہ ہے کہ اس سے صفت تواضع کی تکمیل ہو گئی اور اس میں یہ فائدہ سمجھے کہ پھر ان کو ہاتھ واتھ چومنے سے عجب نہ ہو گا، یہ کس قدر گراں بہا چیز ہاتھ آئی، یہ نعمت ملنا کس قدر رحمت خداوندی ہے اور جب مال عزت کی قیمت بن سکتا ہے تو رحمت خدا اس کی قیمت کیوں نہیں بن سکتی رحمت خدا تو بڑی چیز ہے بس دونوں مذاقوں میں فرق یہ ہے کہ آپ لوگ تو مال ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اور وہ رحمت خدا کو سب کچھ سمجھتے ہیں ان کی عزت تو ایسی ہے کہ مال کی کوئی مقدار بھی اس کا عوض نہیں بن سکتی اور رحمت خدا اتنی بڑی ہے کہ قلیل جزو بھی بڑی سی بڑی عزت کا عوض بن سکتا ہے! اس لئے انہوں نے اس کو کافی معاوضہ سمجھا، اس واسطے اور کوئی تدارک نہیں کیا بلکہ اور کوئی تدارک کرتے ہوئے یہ خوف تھا، کہ وہ معاوضہ نہ جاتا رہے تو اب

اسکی مثال ایسی ہو گی کہ ایک بچہ کے ایک تھپڑ ماریں پھر اس کو راضی کرنے کے لئے ایک پیسہ اور ایک اشرفی اس کے سامنے رکھیں؛ اور اس سے کہہ دیں! ان دونوں میں سے ایک لے لیں تو میں اب پوچھتا ہوں؛ کہ اس کی عقلمندی کس صورت میں ہے جس شخص نے کبھی اشرفی نہیں دیکھی وہ تو یہ رائے دیگا کہ پیسہ لے لو کیونکہ پیسہ کام کی چیز ہے اس کی جلیبی آسکتی ہے اور اشرفی اور ٹھیکرا اس کے نزدیک برابر ہے اور جس نے اشرفی دیکھی ہے وہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ پیسہ لے لے؛ وہ تو یہی کہے گا؛ کہ ایسے ایسے صدہا پیسے اور بھی دے کر اشرفی مل جائے تو مت چھوڑنا سو آج لوگوں کی نظر پیسے پر ہے کیوں کہ پیسہ دیکھا ہے اشرفی کبھی دیکھی ہی نہیں، جب کریں گے پیسہ ہی پر کریں گے؛ صاحبو! رحمت خدا وہ چیز ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے لوگوں نے سلطنتیں چھوڑ دیں؛ پیسہ اور روپیہ کیا چیز ہے ایک خلق حسن کا حاصل ہونا بندگانِ خدا کے نزدیک دنیا اور مافیہا سے بھی زیادہ قیمتی ہے ان کو ایک گھونسا کھانے کے بعد یہ عوض مل گیا تو کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کو کھو دیتے اور اس سے بدلہ لے لیتے بلکہ وہ اس کے ممنون احسان ہوئے ہوں گے؛ دنیا کچھ کہا کرے ان کی نظر حق تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جو حق تعالیٰ کو اچھی لگے وہی ان کے نزدیک اچھا ہے؛ ورنہ کچھ بھی نہیں خلاصہ یہ ہے کہ تواضع ایک صفت حسن ہے اور نہایت ضروری کیوں مقابل کبر کا ہے اس کو جس طرح ممکن ہو حاصل کرنا چاہیئے: مبتدی کے لئے اس کی تحصیل کا طریقہ یہی ہے کہ بہ تکلف وہ افعال کئے جاویں جو عرف کے خلاف ہوں بازار سے سودا خود خرید لایا کرو؛ آج کل یہ بھی امیری کا جزو ہو گیا ہے کہ اپنا ہیچ

بنے بیٹھے رہو، اور تکلیف اٹھاؤ، مگر خود سودا خریدنے بازار نہ جاؤ اور امیر تو امیر معمولی آدمی بھی اس کے عادی ہو گئے ہیں جس کے نتائج سے خود بھی نالاں ہیں اور زیر باری کے مارے مرے جاتے ہیں اور کہتے ہیں خرچ پورا نہیں ہوتا، اور اسی وجہ سے مال حرام لینا پڑتا ہے، صاحبو! یہ کیا خرافات ہے چھوڑو ان تکبر کی رسموں کو یہ عادت خود شریعت کے بھی خلاف ہے بازار میں جانا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے خود قرآن شریف میں موجود ہے مَالِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ (اس رسول کو کیا ہوا کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے) اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بازار جایا کرتے تھے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ بازار جانے پر اعتراض کرنا مسلمانوں کا کام نہیں، کیوں کہ اس کو حق تعالیٰ نے مقولہ کفار کا بتلایا ہے اور کفار کی سی عادتیں اختیار کرنا، اور ان کی باتیں کہنا معمولی بات نہیں کیوں کہ آدمی کو جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے اسی کی بات پر تقلید کیا کرتا ہے اور حدیث شریف میں آچکا ہے کہ آدمی اسی کے ساتھ ہوگا، جس کے ساتھ اسے محبت ہو، چنانچہ ارشاد ہے المرء مع من احب تو نتیجہ یہ ہوا کہ جس کے افعال کی تقلید کی جائے گی، قیامت میں اسی کے ساتھ ہوگا، اب آپ سوچ لیجیے کہ یہ معمولی بات ہے یا خطرناک ہے،

خدا کا حق

صاحبو! اس کو معمولی بات نہ سمجھئے گو دیکھنے میں یہ ذراسی بات ہو، لیکن بہت بڑی بات ہے! علاوہ تقلید کفار کے اسکا دوسرا منشا کبر ہے جس کی نسبت حق تعالیٰ حدیث قدسی میں فرماتے ہیں اَلْعَظَمَۃُ

اِزَارِیْ وَالْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ مَنْ نَازَعَنِیْ فِیْھِمَا قَصَمْتُہٗ (عظمت میرا تہ بند اور بڑائی میری چادر ہے جو کوئی ان دونوں کے بارے میں مجھ سے جھگڑا کرے گا، میں اس کی گردن توڑ دوں گا) یعنی عظمت اور بڑائی میری خاص صفت ہے، جو کوئی اس میں میرا شریک بننا چاہے گا، میں اس کی گردن توڑ ڈالوں گا، مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی کا قصہ ہے کہ حجام خط بنانے کو آیا تو مولانا اس وقت چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھے تھے، مولانا نے سرہانے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ بھائی بیٹھ جا، اس نے سرہانے بیٹھنے سے انکار کیا، مولانا نے فرمایا تو تو کھڑا ہے تیرے ساتھ سب جگہوں کی برابر نسبت ہے پھر تو خالی جگہ میں نہیں بیٹھتا اور میں بیٹھا ہوا ہوں مجھے کیا ضرورت ہے کہ بیٹھا ہوا اٹھوں، حجام نے عرض کیا کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ سرہانے بیٹھوں مولانا نے فرمایا کہ پھر بھائی تو مجھے سرہانے بیٹھا دیکھے اس وقت آ کر خط بنا دیجیو، آخر کار لوگوں نے کہا کہ بھائی تو حجامت بنا بھی دے، یہ تو اٹھیں گے نہیں، اب تو یہ حالت ہے کہ سرہانے بٹھانا کیسا اگر حجام السلام علیکم بھی کہے تو جوتیاں پڑیں، حجام کو سرہانے بٹھانا تو بڑوں کا کام ہے ہر شخص سے اتنا نہیں ہوسکتا، مگر جن باتوں میں شریعت نے سب کو برابر رکھا ہے، ان میں حدودِ شرعیہ کے اندر رہنا چاہیئے، جیسے سلام ومصافحہ وغیرہ کہ ان امور میں شریعت نے چھوٹے بڑے میں تفصیل نہیں کی ان میں اپنی طرف سے فرق کرنا گویا شریعت میں اصلاح دینا ہے جس کا اصل منشا تکبر ہے، مثلاً جماعت میں چھوٹوں کے ساتھ کھڑے ہونے سے عار کرنا بعض لوگ

مسجد میں نماز اس لئے نہیں پڑھتے کہ گھٹیا لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا۔
یہ کیا خرافات ہے ان کو چاہیئے کہ پھر اس دنیا میں نہ رہیں جس میں گھٹیا لوگ
آباد ہیں اور قیامت کے دن اس جنت میں بھی نہ جاویں، جسمیں گھٹیا لوگ "غرباء"
جاویں گے، بلکہ امراء سے زیادہ جاویں گے، کچھ حد ہے اس خودداری کی
آج کل ایسا مذاق بگڑا ہے کہ ایک حکیم صاحب کے بچے نے ان کی گود میں ہم
لوگوں کے آنے کے وقت کہا السلام علیکم تو اس پر اس کو سرزنش کی گئی کہ آداب
عرض کہا کرو، اس کا مقابلہ تو دیکھئے جی تو چاہتا ہے کہ یوں کہو کہ خدا کی مار ہو
اس تعلیم کرنے والے پر مگر خیر بجائے اس کے یہ کہتا ہوں کہ خدا کی سنوار ہو،
اللہ اصلاح کرے، شریعت نے صیغۂ سلام میں چھوٹے بڑے میں کچھ تفصیل
نہیں رکھی، ہاں لہجے میں فرق ہونا چاہیئے، یہ تو قیر کبیر میں داخل ہے، جس کی
تعلیم شریعت میں ہے جس کی ایک جزئی یہ بھی ہے کہ چھوٹے بڑے کے
سامنے دبی ہوئی آواز سے اور نیازمندانہ لہجہ سے بولے اور کچھ سلام ہی پر
موقوف نہیں ہر قسم کے کلام میں اس کا خیال رکھے، پس جب کوئی تم سے
عمر میں یا رتبہ میں چھوٹا ابتداء بالسلام کرتا ہے اور اپنے رتبہ کے موافق نیاز
مندانہ لہجہ سے سلام کرتا ہے تو یہ فرق حفظ مراتب کے لئے کافی ہے،
اتنے فرق کی شریعت نے اجازت دی ہے اس سے آگے بڑھنا تکبر ہے
اب حجام چھوٹا بنتا ہے اور نیازمندی سے سلام کرتا ہے تب بھی اس پر
اعتراض ہے واللہ تکبر نے قلوب کو چیر لیا، آج کل کے لوگ یہ چاہتے ہیں
کہ دوسرے ہمارے سامنے ایسے رہیں، جیسے جماد محض، اخاہ لئے تو ان کو

انسان بنایا اور یہ ان کو جماد بنانا چاہتے ہیں یہ تو حق تعالیٰ کے کام میں اصلاح دینا ہے حجام تو آپ کی اصلاح سے گھٹیا ہو یا نہ ہو، مگر آپ اس اصلاح سے ضرور گھٹیا ہو جاویں گے، اور عند اللہ شر الخلائق قرار دیئے جاویں گے حجام کو سرہانے نہ بٹھایا، نہ سہی پائنتی ہی بٹھاؤ مگر جس بات میں شریعت نے فرق نہیں کیا تو اس میں تو فرق نہ کرو، بلکہ ہر جگہ چھوٹوں کو سرہانے بٹھانا مناسب بھی نہیں، کیوں کہ اس میں ان کا بھی نقصان ہو گا، ان میں تکبر پیدا ہو جاوے گا، اس سے ان کا دین بھی غارت ہو گا، اور دنیا کا بھی نقصان ہو گا، کہ کہیں سرہانے بیٹھنے سے پٹ نہ جاویں، ہاں اگر اس کا اطمینان ہو کہ وہ سرہانے بیٹھنے سے متکبر نہ ہو جاویں گے، تو مضائقہ نہیں غرض تکبر ایسا مرض ہے جس کے علاج سے غفلت نہ چاہیئے، یہ مرض صرف جہلا اور عوام ہی میں نہیں بلکہ اچھے اچھے ثقہ لوگوں میں بھی موجود ہے اور اس کا علاج تواضع ہے اور اس مرض اور علاج کی ہر وقت نگرانی کرنا چاہیئے، بعض باتیں بہت خفیف ہوتی ہیں مگر منشاء ان کا بھی ام الامراض یعنی کبر ہوتا ہے اس وقت اس کے معالجہ کے لئے کوئی صورت تواضع کی بالقصد اختیار کرنا چاہیے!

تدابیر اصلاح

میں ہر شخص کے لئے تواضع کی تدابیر کہاں تک بتاؤں علاج مشترک یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی محقق مبصر کے سپرد کر دو، اور اس کو تمام حالات کی اطلاع کیا کرو، اور وہ جس موقع و محل میں جو تدبیر کرے اس کو اختیار کرو، اس طرح تواضع حاصل کرو، یہ کبر ایسی چیز نہیں ہے جس سے غفلت کی جائے اللہ اللہ نے اس کے علاج کے لئے

بڑے بڑے مجاہدے کیے ہیں ؛ مولانا اسماعیل صاحب مسجد میں سو جاتے مسافروں کے پیر دبایا کرتے تھے صرف اس واسطے کہ تواضع اور تذلل پیدا ہو ایک دفعہ مولانا سفر میں لشکر سے نکل کر شہر کی کسی مسجد میں جا ٹھہرے مؤذن عام طور سے مسافروں سے جھلا کرتے ہی ہیں ان کو بھی منع کیا ؛ مولانا نے اس کا کہنا نہ مانا۔ اس نے دھکے دے کر ان کو نکال دیا ؛ مولانا تھوڑی دیر میں پھر اسی مسجد میں آ گئے اس نے پھر نکال دیا ؛ کئی دفعہ ایسا ہی ہوا ؛ آخر اس نے تنگ ہو کر کہا اچھا بھائی بیٹھ رہ تھوڑی دیر میں لشکر سے دو سوار مولانا کو ڈھونڈتے ہوئے آئے اب تو مؤذن کے ہوش خطا ہوئے اور سمجھا کہ اب پٹوں گا ؛ یہ کوئی بڑے آدمی ہیں ؛ مولانا نے کہا کہ ڈر مت تجھے کوئی کچھ نہ کہے گا ؛ میں جاتا ہوں تجھے کھانا بھی بھجواؤں گا ؛ وہ پیروں میں گر گیا اور معافی چاہی پھر پوچھا آپ نے ایسا کیوں کیا فرمایا یہ میں نے اپنا علاج کیا ؛ مجھے کسی وجہ سے خیال ہو گیا تھا کہ لوگ مجھ کو بڑا سمجھتے ہیں اس کبر کا یہ علاج کیا کہ دھکے کھائے یہ اس مادہ فاسدہ کا مسہل ہو گیا ؛ اہل اللہ اس طرح اس کا علاج کرتے ہیں وہ اس کو امراض جسمانی کی طرح بلکہ اس سے بھی اشد سمجھتے ہیں دیکھیے جو لوگ محتاط ہیں اور حفظ صحت کے شوقین ہیں وہ بلا ضرورت بھی ہر فصل میں جاڑے بخار کا علاج بطور حفظ ما تقدم کیا کرتے ہیں اسی طرح اہل اللہ نے ادنیٰ مظنہ کے موقع پر کبر کا علاج ضرور کر لیا ہے تا کہ نوبت اس کے وقوع کی آوے ہی نہیں ؛ حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ دیکھا گیا کہ کمر پر مشک لادے ہوئے مسلمانوں کو پانی پلاتے پھرتے تھے ؛ پوچھا گیا ؛ کہ اے امیر المومنینؓ کیا ہے ؛ کہا کچھ لوگ

بطور وفد آئے تھے میری مدح کی اس سے نفس میں انبساط پیدا ہوا اس کا میں نے یہ علاج کیا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کرتا پہنا وہ اچھا معلوم ہوا تو آپ نے اس کی آستین بالشت بھر کاٹ دیں، تاکہ عیب پڑ جائے اور بدنما ہوجائے یہ وہ حضرات ہیں جن سے زیادہ کامل النفس کوئی نہیں ہوسکتا، ان کو اتنا اہتمام اس مرض کا تھا، اس بھروسہ پر نہ رہتے تھے، کہ ہم نے تہذیب نفس کر لی ہے اور ایک دم بھی غوائل نفس سے غفلت نہ کرتے تھے ہم کس خیال میں کہ ذرا ذکر شغل کر لیا، اور مطمئن ہوگئے، کہ اب ہم نفس و شیطان کے تبدیلیں نہیں آسکتے یاد رکھو کہ جس وقت آدمی اپنے آپ کو اچھا لگتا ہے اس وقت خدا کو برا لگتا ہے یہ حضرات عشرہ مبشرہ میں سے ہیں جن کی نسبت پورا اعتماد ہے کہ جنت میں ضرور جائیں گے، مگر پھر بھی ان کی یہ حالت ہے کہ غوائل نفس سے غافل نہیں تھے، تا بماچہ رسد (ہماری تو کیا حقیقت) اگر ہم مان بھی لیں کہ کسی نے تہذیب نفس کامل ہی کر لی تب بھی اس کو بے فکر ہوجانا کیا معنی، تہذیب کامل ہوجانے کے وقت وہ بے شک تندرست ہے پھر کیا تندرست ہمیشہ کے لئے تندرست رہا کرتا ہے کیا ہم کو تندرستی کے بعد بیماری نہیں آتی کیا ممکن نہیں کہ کسی وقت کامل کو بھی تکبر کا مرض پیدا ہوجائے جیسے ہم کو تندرستی کے بعد بیماری آجاتی ہے اور یہ علی سبیل التنزل کہا جاتا ہے ورنہ ہم تندرست ہی کون سے ہوئے تھے، ہمیشہ بیمار ہی رہے اور بیماری بھی ایک نہیں ہے مرض کے اندر مرض مرض کے اندر مرض بھرے پڑے ہیں، ہم تو بہ تسبیح گند در گند ہیں ان امراض کی شرح کہاں تک کی جاوے بس اس کی اصلاح کی تدبیر یہی

ہے کہ اپنے آپ کو کسی سپرد کردو، وہ تفصیل جانتا ہے ہر موقع و محل پر مناسب تدبیر بتادے گا؛ آپ کو تفصیل وغیرہ یاد رکھنے کے بارے سے سبکدوشی رہے گی، اگر کسی وجہ سے یہ میسر نہ ہو تو اس فن کی کتابیں ہی دیکھو اور متواضعین کی حکایت پڑھتے ہی رہو؛ یہ ہے ابتدائی علاج؛ اس حدیث میں بصورت اخبار اس کی تعلیم دی گئی ہے اس طرح پر کہ اس پر ایک وعدہ بھی کیا گیا ہے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ یعنی جو کوئی تواضع اختیار کرے اس کو حق تعالیٰ رفعت عطا فرمائیں گے؛ اس کے یہ معنی نہیں کہ تواضع عند الشرع کوئی مطلوب چیز نہیں اگر کسی کو رفعت کی خواہش ہے تو وہ ہی اس کو اختیار کرے بلکہ اس کا واقعی نتیجہ بتلایا گیا ہے؛ رہا تواضع کا مطلوب اور مامور بہ ہونا وہ بجائے خود ثابت شدہ چیز ہے؛ ثمرات کا بیان اس واسطے کیا جاتا رہا ہے تاکہ اس سے زیادہ شوق پیدا ہو مطلب یہ کہ قطع نظر اس کے ضروری ہونے سے اگر رفعت چاہتے ہو تو وہ بھی اسی سے پیدا ہوگی کسی شاعر نے کہا ہے ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو — کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا

(اگر تجھ کو شہرت کی ہوس ہے تو گوشہ نشینی اختیار کر اس لئے کہ گوشہ گیری نے عنقا کے نام کو مشہور کر دیا)

پس اگر رفعت کی تحصیل کی خواہش ہے تو اس کی تدبیر بھی تکبر نہیں ہے؛ جیسا کہ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اس کی تدبیر بھی یہی ہے تواضع اختیار کرو؛ مگر اللہ کی قید بھی یاد رہے کہ اللہ کے واسطے تواضع اختیار کرو؛ نہ بقصد شہرت و رفعت وہ دے گا؛ یہ حدیث کا وعدہ ہے اور حدیث میں دنیا و آخرت کی بھی قید

نہیں ہے معلوم ہوا کہ دونوں جگہ رفعت نصیب ہوگی ذوق نے خوب کہا ہے ؎

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا   آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

اللہ تعالیٰ تواضع کرنے والے کو دنیا میں بھی بڑائی دیتا ہے اور آخرت میں تو ہے ہی چنانچہ دنیا میں تعریف ہوتی ہے کہ فلاں شخص بڑے منکسر المزاج ہیں اپنے آپ کو کھینچتے نہیں ہر شخص سے ملے جاتے ہیں اور جب اس میں بناوٹ نہیں دیکھتے تو اس کی محبت اور وقعت قلوب میں ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ بڑے سے بڑے حاکم اور بادشاہ کی بھی نہیں ہو سکتی کوئی اس کا مخالف نہیں رہتا ہر شخص کو اس کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے پھر ایسے شخص کی زندگی کیسی اچھی زندگی ہوگی ؛ چونکہ اس مضمون کی عام ضرورت تھی اس واسطے بیان کیا گیا (یہاں پہنچ کر عصر کی اذان ہوئی تو سکوت کیا اور فرمایا میں بیان کو دو منٹ میں ختم کرتا ہوں) بعد اذان فرمایا میں بیان ختم کر چکا صرف نام رہنا باقی ہے ؛ اس وقت تحصیل رفعت کا طریقہ بیان ہوا ہے ؛ اور مقام کا نام قنوج ہے تو وعظ کا نام رفعت قنوج ہونا چاہیئے تھا ؛ مگر لفظی رعایت کے لئے رفعت کا ترجمہ اوج کر دیا جائے تو اوج قنوج کا نام مناسب ہے اور راز اس نام میں یہ بھی ہے کہ قنوج اس وقت بہت پستی کی حالت میں ہے حالانکہ کسی وقت بہت بڑی جگہ تھی ؛ اور اس پستی کی تمام تر وجہ نا انصافی ہے اور نا اتفاقی کی وجہ کبر ہے اور ظاہر ہے کہ علاج بالضد ہوا کرتا ہے کبر کی ضد تواضع ہے ! جس کا آج بیان ہوا کبر کا اختیار کرنا باعث ہوا پستی کا تو اس کے ضد کا اختیار کرنا باعث ہوگا ؛ رفعت کا تو اس بیان پر عمل کرنا باعث ہے اوج د

رفعت کا زمانہ کے عقلاء ترقی کی دھوم مچاتے ہیں اور اس کی صورتیں سکھلاتے ہیں،
مگر ترقی کی جڑ نہیں سکھلاتے وہ جڑ تواضع ہے جس پر اس وقت مفصل بحث
ہوئی لہٰذا اور ج تقنوج نام رکھا جاتا ہے اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ فہم دین اور
عمل کی توفیق عطا فرمادیں!

خلاصہ وعظ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ (جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی
کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بلندی و رفعت
عطا فرماتے ہیں!) امراض بہت ہیں جن کی تفصیل دشوار ہے: مگر ام الامراض
کبر ہے اس کا علاج اس حدیث میں ہے یہ حدیث اس واسطے اختیار کی گئی
ہے کہ یہ مرض عام ہے ہر قسم کے لوگوں میں حتیٰ کہ اہل علم میں بھی یہاں تک
کہ بعض اپنے جہل پر قرآن و حدیث سے شہادت لاتے ہیں! مثلاً قُلْ هَلْ يَسْتَوِي
الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ، (آپ کہئے کیا عالم اور غیر عالم برابر ہو سکتے
ہیں) ان کو وہ آیات و احادیث بھی یاد کرنی چاہیئے جو عالم بے عمل کی مذمت
میں وارد ہیں! علاوہ بریں کسی عامی کو بھی حقیر سمجھنا چہ معنی ؎ تا یار کرا خواہد
و میلش بکہ باشد! (یار کس کو چاہتا ہے اور اس کا میل کس کی طرف ہو جاتا ہے)
شبہ: کیا خدائے تعالیٰ کے یہاں بھی کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں اس طرح
تو نیکوکار اور بدکار سب برابر ہو جاتے ہیں اور وعدہ وعید کوئی چیز نہ رہا حالانکہ
نصوص اس کے خلاف ہے! جواب: وعدہ اور وعید صحیح ہیں لیکن اعمال اگرچہ
آپ کے ارادہ پر ہیں تاہم ارادہ کا پلٹ دینا حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے!
اور یہی خوف کی وجہ ہے وعدہ اور وعید پر یقین چاہیئے اور قدرت ارادہ سے

خوف (جیسا کہ ایک پابند قانون حاکم کے سامنے جانے سے خوف ہوتا ہے) ناز وانداز انکشاف عظمت خداوندی نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے ورنہ ظاہر ہے؛ کہ ہمارے اعمال حق تعالیٰ کے سامنے کیا ہیں؛ علاوہ ازیں ناز مکتسب چیز پر ہوتا ہے اور ہمارے اعمال کسی درجہ میں مکتسب سہی؛ مگر در حقیقت علت ان کی مشیت حق ہے ایک بزرگ نے ذکر اللہ کرنا چاہا مگر نہ کر سکے یاد آیا کہ جوانی میں ایک کلمہ بے ہودہ زبان سے نکلا تھا؛ یہ اس کی سزا ہے؛

حضرت جنیدؒ بغدادی کا ایک مرید ایک امرد پر نظر کرنے سے قرآن مجید بھول گیا؛ جس کو علم پر ناز ہو؛ وہ اس آیت کو یاد کرے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ہے (وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا (یعنی اگر ہم چاہیں تو وہ تمام علوم جو آپکو دئے ہیں دفعۃً سلب کرلیں پھر آپ کا کوئی کارساز نہیں ہوسکتا؛ بس رحمتِ خداہی ساتھ دے سکتی ہے اللہ کا فضل آپ پر بڑا ہے) غرض مختلف طریقوں سے کبر قلوب میں موجود ہے اور یہ مرض ام الامراض ہے تمام عیوب اسی سے پیدا ہوتے ہیں؛ مثلاً غصہ حتیٰ کہ بعض وقت زبان سے ظاہر ہونے لگ جاتا ہے؛ چنانچہ بعض آدمی کہنے لگ جاتے ہیں؛ تو جانتا نہیں کہ میں کون ہوں؛ ایک ایسے ہی شخص کے جواب میں ایک بزرگ نے کہا کہ جانتا ہوں؛ (اَوَّلُكَ نُطْفَةٌ مَذِرَةٌ وَآخِرُكَ جِيفَةٌ قَذِرَةٌ وَأَنْتَ بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ) تو تو ایک پلید نطفہ تھا اور انجام کار ایک گندہ مردار ہو جائے گا؛ اس کے درمیان یہ حالت ہے کہ نجاست کو

پیٹ میں لئے پھرتا ہے) اور یہ واقعی بات ہے غلیظ سے کسی کا پیٹ بھی خالی نہیں حق تعالیٰ کی ستاری ہے کہ اس کو مستور کر دیا ہے! مرض گندہ ذہنی میں اس مستوری کی قدر معلوم ہوتی ہے!

تفریع بر گندہ ذہنی

دین کے حقیقت شناس دو گروہ ہیں فقہاء اور صوفیہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جس مریض سے جماعت کو ایذا ہو، وہ نماز علیحدہ پڑھ لے تکبیر جماعت مہتم بالشان ہے اسی کی ضرورت سے امام کی صفات میں یہاں تک لکھا ہے کہ خوبصورت بیوی والا بھی گونہ ترجیح کے قابل ہے! اور مقتدی کو لہسن اور پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت ہے حضرت عمرؓ نے ایک مجذومہ کو طواف سے منع کر دیا تھا! حق تعالیٰ نے حیات میں پردہ ڈھکا ہے اور بعد موت بھی جنازہ کی تجہیز و تکفین میں تعجیل اور خوشبو لگانے میں یہی حکمتیں ہیں! ایک نفع اس تعجیل میں یہ بھی ہے کہ مردے سے نفرت نہ ہو! کہ وہ ایصال ثواب سے مانع ہو جاوے! اس سے یہ بات بھی نکلی کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان کے دماغوں کی حفاظت کی ہے تو انکو جہنم میں کیسے چھوڑ دیں گے! اگر ہم کو اپنی گندہ حالت یاد رہے تو کبھی تکبر نہ آئے اگر ویسے یاد نہ رہے تو ایک سہل مراقبہ روزمرہ کا یہ ہے کہ پاخانہ میں بیٹھ کر اپنی حالت کو دیکھا کیجئے! اس وقت کی ہیئت میں غور کیا کیجئے! اس سے یہ معلوم ہو جائے گا! کہ ہم کون ہیں (اگرچہ بعض لوگ اخانہ میں دلچسپی کا سامان لیجاتے ہیں! یعنی اخبار دیکھتے ہیں خیر ان کی سزا یہی ہے کہ پاخانہ میں بند رہیں) آپ بجائے اس شغل دلچسپی کے اپنی حالت کا مراقبہ کیا کیجئے کہ یہ کیا ہیبت ہے اور ٹانگوں کے

نیچ میں سے کیا نکل رہا ہے یہ بات ہے تو بے ہودہ مگر کار آمد اس قدر ہے کہ حق تعالیٰ
نے الوہیت مسیح کی نفی پر آیت کَانَا یَاکُلٰنِ الطَّعَامَ (وہ دونوں کھانا کھاتے تھے
میں اسی استدلال کیطرف اشارہ کیا ہے غرض اپنی اس حالت کو دیکھ کر یہ سمجھے کہ
جو شخص دن میں دو تین مرتبہ نجاست میں مبتلا ہوتا ہے وہ کیا بڑا ہے اگر پانی پیدا
نہ ہوا ہوتا تو ہر وقت سنے ہی رہتے ؛ اگرچہ سنا رہنا بھی بعضے بھدی مذاق والوں
کے نزدیک عیب نہیں رہا، جیسا فیشن والوں میں مشاہدہ ہے کہ کاغذ سے استنجا
کرتے ہیں جس سے صفائی نہیں ہو سکتی ؛ اور ان کی پتلونیں سنی ہوئی ملتی ہیں پھر
ٹب میں بیٹھ کر نہاتے ہیں اور وہ نجاست منہ تک میں جاتی ہے طریقہ سنت
چھوڑنے کی سزا یہی ہے پس جب ہمارے اندر یہ گندگیاں بھری ہوئی ہیں ؛ تو
کیا بڑائی اور کس بات پر غصہ آوے اور غصہ خود بھی بری چیز ہے غصہ کے نتائج
یہ ہیں کہ اگر قدرت انتقام ہو تو ظلم ورنہ کینہ اور حسد اور ایذا رسانی پھر مکر و فریب
غرض یہ غصہ کبر کی فرع ہے تو کبر کا قبح اس سے زیادہ ظاہر ہو گیا ؛ اسی کبر کے
باب میں اور قرآن شریف میں ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (اللہ تعالیٰ
متکبر شیخی باز کو پسند نہیں کرتے) اور اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ (اللہ تعالیٰ
غرور کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے) یہ تین لفظ اس واسطے ہیں کہ کبر قلبی کبھی
تہذیب کی وجہ سے مخفی رہتا ہے ؛ اس کے واسطے لفظ مستکبرین ہے ؛
اور تہذیب کی کمی سے اس کا ظہور ہونے لگتا ہے پھر اگر زبان سے ظہور ہو تو اس
کی نسبت لفظ فخور ہے اور اگر صرف افعال سے ہو ؛ اس کے لئے مختال ہے
فیشن بنانا بھی مختال میں داخل ہے اس تکبر پر وعیدیں بہت ہیں مگر اس آیت

میں لایحب آیا ہے، یہ بھی کچھ کم نہیں بلکہ سب سے زیادہ ہے کیوں کہ تمام وعیدوں کی انتہا اسی پر ہوتی ہے، اور اس میں بجائے یبغض کے لایحب فرمایا گیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ جملہ کاموں میں تین مرتبے ہیں پسند ہونا اور پسند نہ ہونا اور گو برابر بھی نہ سمجھا جائے اور برابر سمجھنا ظاہر ہے کہ کبر قسم اول کا عمل تو یہ ہے نہیں اور قسمیں اخیرین میں سے بھی اخیر کا ہے مگر اس کے واسطے بجائے یبغض کے درمیانی قسم کا لفظ یعنی لایحب فرمایا اس میں اشارہ ہے کہ محب خدا کو تیسری قسم کے لفظ سنانے کی نوبت بھی نہیں آسکتی، درمیانی لفظ بھی اس کے مرجانے کے لئے کافی ہے دیکھئے حکام کی نظر پھری ہوئی دیکھ کر اہل کاروں پر کیا گذر جاتی ہے اور محب خدا ہر مسلمان ہے خواہ وہ کیسا ہی عاصی اور گناہ گار کیوں نہ ہو۔ اس محبت کا ظہور عوام سے بھی جانبازی کے وقت ہوتا ہے کہ خواص سے بھی زیادہ کام کر جاتے ہیں تو مسلمان کے لئے لایحب انتہائی لفظ ہے کیا باعث ہے اور ہر مسلمان کو جو میں نے محب خدا کہا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ اول حق تعالیٰ کو عبد سے محبت ہوتی ہے پھر اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ عبد کو حق تعالیٰ سے محبت ہو جاتی ہے، اور اس اولیت کی دو دلیلیں ہوتی ہیں، ایک نقلی ایک عقلی نقلی تو یہ ارشاد وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ (ہم نہیں چاہ سکتے مگر جو اللہ چاہیں) تو اول ادھر سے توجہ ہوئی اور عقلی اس طرح کہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور معرفت تامہ حق تعالیٰ کی ہو نہیں سکتی، کیوں کہ وہ مرئی نہیں نہ اس کا کوئی نمونہ ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے) اور آثار سے پتہ چلتا ہے

کہ انسان میں محبت خدا ضرور ہے تو ضرور وہ بارادہ و توجہ باری تعالیٰ ہوئی؛ یہاں سے اہل ظاہر کا بھی جواب ہو گیا! انہوں نے محبت خدا کا انکار کیا ہے بدلیل مذکور یعنی وہ مرئی نہیں نہ اس کا کوئی مماثل و مشابہ ہے نیز اس واسطے کہ محبت نام ہے خاص تعلق کا جو موقوف ہے طرفین کی مناسبت پر اور ممکن اور واجب میں مناسبت نہیں تو انکی محبت کیسے ہو سکتی ہے۔ جواب یہ ہوا کہ محبت محال جب ہی ہے کہ بندہ کی طرف سے مانی جاوے اور جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے مانی جاوے تو محال نہیں تو قدرت کے سامنے کوئی چیز محال نہیں اور حق تعالیٰ کی تو بڑی شان ہے! اہل اللہ سے محبت بھی؛ انہی کیطرف سے شروع ہوتی ہے اس کا شاہد یہ ہے کہ مرید کو اتنا تعلق نہیں ہوتا جتنا ان کو ہوتا ہے غرض محبت حق بندہ کی غذا ہے تو اس کی ضد یعنی بغض تو بہت دور ہے بندہ کے مر جانے کیلئے تو عدم محبت ہی کافی ہے جو ترجمہ ہے؛ لایحب کا جیسے مرنے کے لئے یہی ضروری نہیں کہ زہر کھا یا جاوئے بلکہ منع غذا بھی قاتل ہے یہ بیان ہے لایحب کے انتہائی لفظ ہونے کا! پس جب کہ کبر مبغوض ہوا تو اس کی ضد یعنی تواضع محبوب اور محمود ہوئی؛ نیز تواضع علاج بھی ہے کبر کا اس درجہ سے بھی ضروری ہے مگر تواضع کے معنی سے لوگ علی العموم ناواقف ہیں اچھا تو خاطر داری کو کہتے ہیں اور نئے تعلیم یافتہ اکثر تو لفظ تک بھی صحیح نہیں جانتے اور جو جانتے بھی ہیں! وہ تصنع اور جھک جھک کر سلام کرنے کو سمجھتے ہیں حالانکہ تصنع تواضع نہیں بلکہ درحقیقت تکبر ہے جو ضد ہے تواضع کی! تواضع کے حقیقی معنی پستی اور انکسار اختیار کرنا؛

نہ صرف ظاہراً بلکہ قلب سے اسی لئے متواضعین جھک جھک کر سلام نہیں کرتے بلکہ کوئی ان کی مدح کرے تو اس پر بھی انکار نہیں کرتے تاکہ وہ خود ان کو عجیب یا مغرور سمجھ کر خاموش ہو جائے نہ نئے مذاق کی طرح کہ مدح کرنے پر شکریہ کیا جاتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسے ہی مدح کیا کرو! اور اسی کا مستحق ہوں مولانا محمد یعقوب صاحب کا یہی معمول تھا کہ مادح کے مدح پر خاموش ہو جاتے گویا متکبر ہیں کہ مدح پر انکار نہیں مگر تکبر کا نام و نشان نہ تھا ایک بار آموں کو دعوت میں سے سر پر رکھ کر بے تکلف لے آئے مگر اب تکبر کا نام وضع داری رکھا ہے جو حدود شرعیہ کے اندر مستحسن ہے لیکن اکثر اوضاع کی بنا اس وقت کبر پر ہے تاوقتیکہ مولانا کی طرح اصلاح نہ کر لی گئی ہو! مگر آجکل خود اصلاح اخلاق ہی طرف توجہ نہیں ہے! حالانکہ بزرگوں نے اس کا بڑا اہتمام کیا ہے مولانا مظفر حسن صاحب کرایہ کی بہلی میں سے صرف اس لئے اتر پڑے کہ وہ رنڈی کی تھی! لیکن دل شکنی کے خیال سے اس کو واپس نہ کیا اور کرایہ دیا دیہ ہے حقیقی دین! باقی کتابوں سے صرف ضابطہ دین کا آتا ہے! اور ایسا حقیقی دین کسی کی جوتیاں سیدھی کرنے بلکہ جوتیاں کھانے سے آتا ہے چنانچہ اہل اللہ تمام اخلاق کی تکمیل کرتے ہیں تقوی کے ساتھ دل شکنی بھی نہیں کرتے نیز نرمی کے ساتھ کام لیتے ہیں مگر جب کہ اصلاح بغیر سختی کے نہ ہو سکے! اس وقت سختی بھی کرتے ہیں ان ہی مولانا مظفر حسین صاحب نے نرمی سے ایک پہلوان کو نمازی بنا دیا! ان ہی بزرگوں نے ایک رئیس کو بے وضو نماز کی صورۃ اجازت دی مگر وہ ان کی برکت سے

باوضو پڑھنے لگا تو غیروں پر سختی نہ کرنا چاہیئے ہاں جس پر حکومت ہو اس پر بقدر ضرورت مضائقہ نہیں یہی اخلاق ہیں جن سے اسلام پھیلا ہے نہ بزور شمشیر کیونکہ شمشیر زنی کے لئے شمشیر زن کہاں سے آئے تھے! اسی اخلاق سے واقعات اس کے شاہد ہیں جن سے اسلام پھیلا ان کی یہ حالت تھی کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کافر بادشاہ کی تصویر کی آنکھ کے بدلے صلح کی بنا پر اپنی آنکھ پھوڑوانے کیلئے تیار ہو گئے حالانکہ کفار پر غالب تھے پس ان اخلاق سے اسلام پھیلا ہے۔ نہ بزور شمشیر سے رفع شر ظاہر ہوتا ہے! نہ کہ اصلاح قلبی اور اسلام نے اصلاح کی ہے نیز اگر اسلام بزور شمشیر کسی سے قبول بھی کروالیا جائے! تو اس کو بقا کس چیز سے ہو سکتی ہے سوائے حقانیت کے وہ حقانیت اخلاق ہی سے قلب میں گھستی ہے ان ہی مولانا کی تواضع کی یہ حالت تھی کہ ایک بڈھے کا بوجھ اپنے سر پر رکھ کر گاؤں تک پہنچا دیا۔ اور ایک بنیے کی سختی پر صبر کر لیا جس نے ایک شبہ میں سختی کی تھی! اور باوجود قدرت انتقام کے کچھ بھی نہ کہا بلکہ خوش ہوئے کہ اب مجھ میں مصافحہ میں ہاتھ چومے جانے کے وقت عجب پیدا نہ ہوگا! اسی سختی کو یاد کر لوں گا! غرض تواضع کی ایک صفت حسنہ ہے جو کبر کا مقابل ہے اس کی تحصیل کی تدبیر کرنی چاہیئے! بازار سے خود سودا خرید لایا کرو! اور نفس کو عار ہو تو سر پر لادو! امیروں کی طرح اپاہج مت بنو تاکہ تکبر نہ پیدا ہو! اور اس سے دنیوی ضرر بھی تو ہے چنانچہ تکبر کے آثار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خرچ بڑھتا ہے اور مال حرام کمائی کی ضرورت پڑتی ہے جو دنیا میں بھی مضر ہے اور تواضع کی جو تدبیر اوپر بتلائی گئی کہ بازار سے سودا لے آیا کریں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اس پر اعتراض کفار کا کام ہے قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَقَالُوْا مَالِ ھٰذَا الرَّسُوْلِ

یَاکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ (یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے)؛ اور ان باتوں میں کفار کی تقلید کرنا صرف صورت معاشرت ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ محبت کی دلیل ہے؛ اور بموجب حدیث المرء مع من احب قیامت میں کفار کے ساتھ ہونے کا اندیشہ ہے غرض کبر کے احتمال سے بھی بچے خواہ وہ ظاہر میں چھوٹی سی بات ہو، بعض چھوٹی بات کا منشا بھی کبر ہوتا ہے؛ مولانا محمد مظہر صاحب خط بنوانے کے لئے پائنتی سے سرہانے کو نہ بیٹھے آخر حجام نے اس طرح بنایا اگر ہم سے یہ نہ ہو سکے؛ تو حدود شرعیہ کے اندر رہنا چاہیئے؛ اور کبر کے سبب ان باتوں میں تو فرق نہ کرنا چاہیئے جن میں شریعت نے چھوٹے بڑے کو برابر رکھا ہے جیسے لفظ سلام یا جماعت ہاں لہجہ میں فرق ہونا چاہیئے کہ چھوٹے نیاز مندی کے لہجہ سے سلام کریں؛ اور بڑے ان کو حقیر نہ سمجھے لیکن ان کی مصلحت سے ان کو ان کی حد سے بھی نہ بڑھا دیں؛ چنانچہ چھوٹوں کو بعض وقت سرہانے بٹھانے میں ان کی دنیاوی اور دینی مضرت ہے؛ دنیوی تو یہ کہ کہیں پٹ نہ جائیں گے اور دینی یہ کہ وہ متکبر ہو جائیں گے؛ غرض تکبر نہایت سخت مرض ہے اور علاج اس کا تواضع ہے؛ تواضع کی تفصیلی تدابیر کی ہمت نہ ہو تو یہ مشترک علاج کرلے بڑے بڑے مجاہدے کئے ہیں مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید مسافروں کے پیر دباتے تھے؛ ایک دفعہ ایک مسجد میں باوجود دھکے کھانے کے پڑے رہے اور فرمایا کہ یہ مادہ کبر کا مسہل تھا؛ اور مبتلا کو تو علاج ضروری ہی ہے غیر مبتلا کو بھی بطور حفظ صحت کبر کا علاج چاہیئے؛ حضرت عمرؓ نے اسی کے لئے مشک بھر کے پانی پلایا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسی لئے کرتہ کی آستین پھاڑ دی اور حدیث من تواضع اللہ رفعہ اللہ میں بجائے صیغہ امر کے طور پر اخبار

و وعدہ حکم کیا گیا ہے کیوں کہ ایسے وعدہ سے ہمت ہوتی ہے اور رفعت موعودہ تواضع کا لازمی نتیجہ ہے سو اگر کسی کو رفعت ہی مطلوب ہو، اس کے حصول کے لئے بھی تواضع چاہیئے مگر للہ کی قید بھی یاد رہے۔ اور حدیث میں وعدہ رفعت کیساتھ دنیا یا آخرت کی قید نہیں اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ دونوں جگہ رفعت ہوگی۔ اور مشاہدہ بھی ہے کہ متواضع سے ہر شخص کو محبت ہوتی ہے اور اس کا کوئی مخالف نہیں ہوتا، تو اس کی زندگی بہت اچھی ہوتی ہے۔

دستورِ سہارنپورٔ

سہارنپور دار الطلبہ میں تکبر و تذلل سے اجتناب کے عنوان سے ۳ ربیع الاوّل ۱۳۲۵ھ کو یہ وعظ ہوا، سامعین کی تعداد تقریباً ۱۰۰ کے قریب تھی، جن میں سے اکثریت اہل علم کی تھی، اس وعظ کو مولوی اسعد اللہ صاحب مدرس مظاہر علوم سہارنپور نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ وعلیٰ آلہ و اصحابہ وبارک وسلم اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم من تواضع للہ رفعہ اللہ بہ

تمہید یہ ایک مختصر و جامع حدیث ہے جس میں جناب رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے دو مضمون ارشاد فرمائے ہیں یعنی بصیغۂ ترغیب دو باتوں کا امر ہے اور دو باتوں میں جو امرین مذکورین کی ضد ہیں ؛ نہی ہے ہر چند کہ اس حدیث شریف کا بیان اس سفر میں ایک جگہ ہو چکا ہے لیکن چونکہ اس مرض میں جس کا علاج اس حدیث میں مذکور ہے ابتلا رعام ہے ؛ اس لئے ہر موضع اور ہر مقام پر اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کو بیان کیا جائے کیوں کہ شاذ و نادر ہی کوئی خدا کا بندہ ایسا ہوگا کہ اس وبائے عام میں مبتلا نہ ہو ؛ اور اس مرض سے محفوظ ہو ؛ صرف زاہد متقی متورع خالص مخلص مخلص اس مرضِ جانکاہ سے سالم رہ سکتا ہے ورنہ کس کی مجال ہے کہ اس سے بچا رہے بغالب احوال ہر شخص کم و بیش اس مرض روحانی میں ضرور مبتلا ہے اس لئے اس کے بیان کی بار بار حاجت ہے ؛ اور

اس کی ضرورت تا اختتام عمر ختم نہ ہو گی کیوں کہ جب امراض عمر بھر ساتھ نہ چھوڑیں گے، تو ان کے معالجات کی بھی عمر بھر ہی ضرورت و حاجت ہو گی۔ اور چوں کہ ایک بیان و تقریر کے مکرر ہونے کی مختلف اسباب و مختلف وجوہ ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے اس کو تکرار محض نہ کہا جائے گا۔ اور اگر بچشم حقیقت بیں سے دیکھا جائے تو تکرار بھی مضر نہیں غرض یہاں اول تو تکرار ہی نہیں۔ اور اگر تسلیم بھی کر لیں تو کوئی نقصان نہیں کیوں کہ عبث وہ تکرار ہے جس میں کچھ نفع متصور نہ ہو کسی قسم کا نیا فائدہ حاصل نہ ہو۔ اور یہ تکرار ایسا نہیں ہے۔ کیوں کہ اس سے تاکید مزید حاصل ہوتی ہے تکرار علی اللسان سے تقرر فی القلب ہوتا ہے۔

آیات کا تکرار قرآن شریف میں غور و تامل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مقامات پر تھوڑے تفاوت سے بعض آیات کو مکرر بیان فرمایا ہے اور بعض مواضع میں تو مضمون واحد کو بعبارتہ مکرر نقل فرما دیا ہے۔ اور حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اس کی علت بھی بیان فرمائی ہے کہ مضامین کو کیوں مکرر بیان کیا جاتا ہے۔ ولقد صرفنا فی هذا القرآن ليذكروا یعنی تاکہ تم اس سے عبرت حاصل کرو۔ اس کو قلب میں جگہ دو اس کو اپنا پیشوا اور رہنما بناؤ نصیحت حاصل کرو۔ اوامر کو بجا لاؤ نواہی سے پرہیز کرو۔ البتہ یہ طرز مصنفین کا نہیں ہے۔ ان کو تو ایک مضمون کے مکرر بیان کرنے سے عار آتی ہے وہ تکرار سے اپنی شان تصنیف کی ہتک سمجھتے ہیں۔ اسی لئے بعد بار اور نئے مضامین تجویز کرتے ہیں۔ نئی نئی عبارتوں میں مطالب ادا کرتے ہیں ایک مضمون کو دوبارہ کبھی نہیں بیان کرتے اور کسی مقام پر سہواً یا عمداً ایسا ہو جائے تو اس طبقہ میں وہ موجب

اعتراض ہوتا ہے چونکہ مقصود مصنفین کا امر آخر ہوتا ہے اس لئے تصنیف کا طرز قرآن کے طرز سے مختلف ہو گیا، مصنفین کا مقصود محض ضبط مسائل ہے یہ مقصود نہیں کہ مخاطب کے ذہن میں یہ مضامین جم جائیں، اور ظاہر ہے کہ تکرار اس مقصد کے ضرور منافی ہے، اور حق تعالیٰ کا مقصود تنزیل قرآن سے محض ضبط مسائل یا واقعات کا جمع کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود بندوں کی اصلاح ہے اور اصلاح جب ہی ہوتی ہے کہ مخاطب کے ذہن میں نصیحت کے مضامین خوب جم جائیں اور بعضی بات ذہن میں ایک دفعہ کہنے سے نہیں جمتی بلکہ بار بار کہنے سے جمتی ہے، اس لئے قرآن میں تکرار واقع ہوا، اب سمجھ میں آ گیا ہو گا، کہ حق تعالیٰ نے جو بعض جگہ تکرار فرمایا ہے یا احادیث میں مکرر جملے واقع ہوئے ہیں اس کا منشاء محض عطوفت و شفقت ہے کہ مخاطب کے ذہن میں مضمون اچھی طرح جم جائے دل میں بالکل اتر جائے کوئی خارشہ نہ رہے مصنفین اس شفقت سے کالے کوسوں دور ہو جاتے ہیں، ان کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی، اس لئے وہ تکرار سے بچتے ہیں اور فی الحقیقت قرآن و حدیث کا یہ تکرار محض صورۃً ہی ہے کیوں کہ جب اس سے مزید تاکید حاصل ہو گئی تو ایک نیا نفع حاصل ہوا اور جس کلام سے نیا فائدہ حاصل ہو، وہ تکرار محض سے منزہ ہے گویا اس میں دو پہلو ہیں ایک تاسیس کا کہ وہ باعتبار زیادت تاکید و زیادت نفع کے ہیں دوسرا تاکید کا کیوں کہ یہ مضمون لفظاً تو مضمون اول ہی ہے لہٰذا یہ صورت جامع تاکید محض و تاسیس محض دونوں سے اولیٰ ہے کیوں کہ یہ دونوں باتوں کے لئے جامع ہے اور ظاہر ہے کہ مجموعۂ امرین امر واحد سے اولیٰ و انفع ہوتا ہے اور اگر اس تکرار صوری میں مضامین بھی کچھ

بدل جائیں اور مطالب و مآرب بھی مختلف ہو جائیں تب تو وہ تکرار صوری بھی نہیں رہتا اس وقت میرے بیان کی یہی شان ہو گی کہ متن مضمون تو وہی ہو گا جو پہلے بیان ہو چکا ہے مگر اس کی شرح و تفصیل میں مضامین سابقہ کا بعینہ اعادہ نہ ہو گا بلکہ طرز بیان بھی جدا ہو گا اور انشاء اللہ مضامین بھی بہت سے نئے ہوں گے پس یہ تکرار محض سے اس طرح بھی نکل گیا گو مضامین سابقہ کے بعینہ اعادہ سے بھی تکرار محض نہ ہوتا کیوں کہ اس وقت تاکید محض کا فائدہ حاصل ہوتا مگر اب تو بالکل تکرار نہ رہا صرف آیت یا حدیث کی تلاوت کا تکرار رہ جاتا ہے جو کسی درجہ میں بھی موجب جرح نہیں کیوں کہ یہ محض چند الفاظ و کلمات و حروف کا تکرار ہے مضمون کا نہیں لہذا بیان سابق اس بیان لاحق کے لئے مانع نہ ہو نیز میں سفر دور و دراز کی وجہ سے مضمحل بھی ہو رہا ہوں بدن پر تکان بہت ہے اس حدیث کے بیان کرنے میں آسانی و سہولت بھی ہو گی کچھ تکلف نہ کرنا پڑا اور نہ تکلف سوچنا پڑا کہ کس مضمون کو بیان کروں کون سی آیت یا حدیث کے متعلق وعظ کہوں لیکن باوجود اتحاد حدیث کے مضمون بالکل نیا ہو گا وہ پہلا وعظ بھی قلمبند ہو چکا ہے بعد طبع کے موازنہ و مقابلہ سے معلوم ہو جائے گا کہ اس کے مضامین اور اس کے مضامین سے بالکل جدا و ممتاز ہیں صرف تلاوت حدیث ہی کا تکرار ہے جو کہ علاوہ فوائد مذکورہ کے موجب خیر و برکت بھی ہے۔

امراض ظاہری و باطنی

اس حدیث شریف میں امراض عامہ کو بتایا گیا ہے اور ان کے معالجہ کی تعلیم فرمائی گئی ہے خلاصہ یہ ہے کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بظاہر تو ایک ہی بات کی ترغیب فرمائی ہے لیکن اگر فکر سے کام لیا جائے اور عقل پر زور دیا جائے تو دو باتوں کی ترغیب معلوم

ہوتی ہے اسی طرح مقابلہ میں بظاہر ایک امر سے ترہیب معلوم ہوتی ہے، لیکن نظر تعمق و خوض سے دوام مرہوب عنہ معلوم ہوتے ہیں، امر ترغیبی ایک تو تواضع میں مصرح اور دوسری کا انکشاف للہ کی قید سے ہوتا ہے پس من "تواضع سے تو تواضع کا محمود و مرغوب ہونا اور اس کا واجب العمل اور مامور بہ ہونا معلوم ہوتا ہے اور للہ سے اس میں اخلاص کی طلب معلوم ہوتی ہے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے تواضع کو للہ سے مقید فرمایا ہے، اس قید کے اجتماع و ارتفاع کے احتمال سے دو قسمیں پیدا ہو گئیں اول تواضع للہ ثانی تواضع لغیر اللہ اور تواضع کی اس قسم یعنی تواضع لغیر اللہ میں جو لفظ غیر ہے اس سے اس کے لغوی معنی مراد نہیں ہے اور نہ مصطلح مناطقہ و فلاسفہ مراد ہے لغوی معنی بھی اسی اصطلاحی معنی کے قریب قریب ہیں یعنی یہ کہ دو چیزوں کے مفہوم میں تباین ہو، مصداق میں تفارق مانع عن الحمل ہو، بلکہ غیر سے مراد وہ غیر ہے، جو اصطلاح متکلمین میں مستعمل ہے، یعنی جو لفظ غیر کے صفات الٰہیہ کی بحث میں واقع ہوا ہے کہ صفات لا عین و لا غیر ہیں جو اس غیر کے معنی ہیں، اور وہ معنی مذکورہ کے علاوہ ہیں کیوں کہ اگر یہاں غیر سے لغوی یا منطقی معنی مراد کے لئے جاویں۔ تو صریح الاستحالہ ہے بداہتہ قول بارتفاع النقیضین ہے بلکہ یہاں وہ غیر مراد ہے، جو نصوص شرعیہ و آثار نبوی [illegible] واقع ہوا ہے اور وہی محاورات مشہورہ و اطلاقات عرفیہ میں مستعمل ہوتا ہے چنانچہ ہماری زبان اردو ہی میں بولتے ہیں کہ آپ تو بہت فرماتے ہیں، اس کی کیا حاجت ہے ہم اور آپ غیر تو نہیں ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم میں اور آپ میں تغائر ذاتی نہیں ہے اتحاد مصداقی ہے ہمارا آپ کا ایک دوسرے پر حمل ہو سکتا ہے بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ ہم بے تعلق نہیں ہیں ہم سے تمہارا

قوی تعلق ہے محاورات میں غیر کے معنی یہی مراد ہوتے ہیں اور یہی صفات کے لا غیر کہنے میں مراد ہیں یعنی ذات ہے بے تعلق نہیں پھر اسی تعلق سے غیریت کی نفی فلاسفہ کے مذہب کی نفی کے لئے کی گئی اسی طرح تواضع بغیر اللہ میں بھی غیر کے یہی معنی مراد ہیں یعنی ایسی تواضع جس میں حق تعالیٰ جلاجلالہ دعم نوالہٗ سے تعلق نہ ہو اس کی ذات یا برکات سے علاقہ نہ ہو، بلکہ اغیار مقصود ہوں، حق تعالیٰ شانہٗ کا اس میں لحاظ نہ ہو وعلیٰ ہذا القیاس تواضع للہ میں بھی یہی گنجائش اور وسعت ہے کہ تواضع للہ بلا واسطہ ہو، جیسے صوم وصلوٰۃ و حج وغیرہ من الفرائض والواجبات والسنن، یا تواضع للہ بواسطہ ہو، یعنی گو مخلوق کے لئے خفض جناح کیا جاوے لیکن حق تعالیٰ کے واسطے حق تعالیٰ کی امر کی وجہ سے تاکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضا حاصل ہو، اس کا سبب حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات والا صفات سے تعلق ہو، اس کا محرک کوئی غیر نہ ہو، تو وہ بھی حکماً تواضع للہ ہی ہے، اگرچہ بظاہر تواضع لغیر اللہ ہے، جیسے والدین کے ساتھ تواضع استاد کے ساتھ تواضع مرشد وپیر کے ساتھ تواضع ہے اور اپنے ہر بزرگ سناً یا عقلاً کے ساتھ تواضع کرنا اس کے سامنے اپنے آپ کو پست بنانا خفض جناح ونرمی سے کام لینا یہ سب تواضع للہ کے افراد ہیں اور والدین و استاد ومرشد وغیرہ تو بڑے اور بزرگ ہونے کی وجہ سے قابل التعظیم واجب التکریم ہیں

تکبر وتذلل سے اجتناب

حق تعالیٰ نے تو جناب رسول کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کو عام مسلمانوں کے ساتھ بھی خفض جناح اور تواضع کا حکم فرمایا ہے، واخفض جناحك لمن اتبعك من المؤمنين یعنی افادہ میں بھی تواضع مطلوب ہے جیسے استفادہ میں تواضع مرغوب ہے افادہ

اور استفادہ دونوں میں اس کی احتیاج ہے یہ تواضع بھی لغیر اللہ کے نہیں اس میں بھی حق تعالیٰ سے تعلق ہے اس سے بھی اس کی رضا مطلوب ہے اس کا باعث بھی وہی ذات ہے اور تواضع للہ اور تواضع لغیر اللہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ تواضع کا محرک و محرض اگر امر شرعی ہے، تو وہ تواضع للہ ہے اور اگر امر آخر ہے تو وہ تواضع لغیر اللہ ہے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے للہ کی قید سے تواضع لغیر اللہ سے نہی فرمادی اور تواضع للہ کا مامور بہ ہونا بتا دیا، یہاں میں طلبہ کو اس پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس حدیث شریف میں بظاہر امر نہیں معلوم ہوتا محض شرط و جزا ہیں لزوم کا حکم ہے اور وہ موضوع للامر نہیں مگر تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں امر موجود ہے، لیکن وہ امر مضمر و مستتر ہے کنایۃً ثابت ہوتا ہے والکنایۃ ابلغ من التصریح یعنی حدیث شریف سے تواضع للہ کا مرغوب فیہ ہونا مستنبط ہوتا ہے جیسا کہ اس کی ضد تواضع لغیر اللہ کا مرغوب عنہ ہونا معلوم ہوتا ہے اور کسی شئے کا مرغوب فیہ ہونا مستلزم ہے اس کے مامور بہ ہونے کا جیسے کسی کا مرغوب عنہ ہونا اس کے منہی عنہ ہونے کے مستلزم ہے البتہ اس سے نہی و امر کے درجے و رتبے کی تعیین نہیں ہوئی سو وہ ادلہ دلائل و براہین سے معلوم ہو جائے گی، اور عدم تعیین مضرت رساں بھی نہیں ہے کیوں کہ مقصود بہرحال حاصل ہے یعنی ترغیب و ترہیب، رہا یہ کہ جب مقصود امر کرنا تھا، تو اس کے لئے صیغہ امر کیوں نہ اختیار کیا گیا، ترغیب کا صیغہ کیوں اختیار کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ مقاصد کے اختلاف سے ایک ہی شئے کے لئے مختلف عبارات اور مختلف عنوانات اختیار کئے جاتے ہیں، چنانچہ کسی جگہ پر مقصود اظہار شفقت ہوتا ہے کسی مقام پر مقصود ترغیب ہوتا ہے علیٰ ہذا مختلف مواقع ..لم

مختلف مقاصد ہوتے ہیں، مختلف حکمتیں اس پر مرتب ہوتی ہیں کسی امر کے بیان کے لئے گاہے صیغہ امر استعمال کرتے ہیں، گاہے ضد سے نہی کرتے ہیں کبھی مجموعہ امرین کا بیان ہوتا ہے، اس طرح کسی امر کی نہی کے لئے یا تو صراحتاً ممانعت ہوتی ہے یا اس کی ضد کی طلب سے اس کا منہی عنہ ہونا بتلا دیا جاتا ہے یا مجموعہ عامرین کو ذکر کرتے ہیں اور ان عنوانات کے تفنن سے معلم و استاد کی شفقت و عنایت کا حال معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عنان توجہ ہماری جانب منعطف ہے وہ چاہتا ہے کہ ہم کسی طرح کسی عنوان سے بات سمجھ جائیں اور سب سے بڑے ہمارے شفیق معلم جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کا مقصود یہ تھا کہ مخاطبین کسی طرح سمجھ جائیں اس لئے کسی جگہ ایک بات کو شفقت کے عنوان سے فرما دیا کہیں عنوان امر سے آمادہ کیا کبھی ترغیب سے اشارہ فرمایا حالانکہ مآل سب کا واحد ہے، ع عباراتنا شتی وحسنک واحد

تواضع و استغنا کی اہمیت

پس اسی اصل پر یہاں امر بالتواضع کی بصیغہ ترغیب بیان فرمایا گو ترغیب بذاتہ وصیغتہ امر نہیں لیکن مرغوب فیہ کے مامور بہ ہونے کے لئے مستلزم ضرور ہے پس امر حکماً ہے، حاصل یہ کہ اس جگہ ایک امر حکمی تو مقید یعنی تواضع میں ارشاد فرمایا ہے دوسرا امر حکمی قید میں ارشاد فرمایا ہے جو کہ للہ ہے تواضع کو للہ کی قید سے مقید کرنا مشعر ہے کہ مقصود یہ ہے کہ مقید یعنی تواضع میں قید کی رعایت کرو، اس کا لحاظ رکھو، یعنی للہیت کو ہاتھ سے نہ جانے دو، گو وہ تواضع بظاہر لغیر اللہ ہی ہو لیکن اس میں بھی اخلاص لوجہ اللہ وللہیت کی شان پائی جانی چاہیئے، اس سے قطع نظر نہ

کرنا چاہیئے اہل محاورہ اس عنوان سے جو حدیث میں اختیار کیا گیا ہے ان معنی کو خوب جانتے ہیں روزمرہ کی بول چال میں نظر کرنے سے یہ مطالب خوب سمجھ میں آتے ہیں اہل لسان کو کسی قسم کا خدشہ اور کوئی غلجان اس کے سمجھنے میں نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ اس عنوان سے بالکل صحیح مطلب ترغیب کا سمجھتے ہیں؛ بس یہاں پر تواضع کا مع لحاظ للہیت امر ہوا ہے اور امر بالشئی مستلزم ہوا کرتا ہے؛ نہی عن ضدہ کو یعنی جس شئے کا حکم ہوتا ہے؛ اس کے خلاف سے نہی ہوتی ہے پھر جس درجہ کا وہ امر ہے اسی درجہ کی اس متقابل میں نہی ہوگی؛ مثلاً اگر امر وجوب کے لئے ہے تو اس کی ضد اور اس کا خلاف حرام یا مکروہ تحریمی ہوگا اور ان دونوں میں یہ فرق لفظی فرق ہے اور بار احتیاطاً اس کو کراہتہ تحریمہ سے تعبیر کر دیتے ہیں ورنہ درجہ معنون میں اتحاد بالذات ہے دونوں میں کچھ معتد بہ فرق نہیں ہے اور اگر امر استحبابی ہے تو اس کی ضد کے لئے کراہت تنزیہی کا ثبوت ہوگا یا اس سے بھی کم یعنی محض غیر اولیٰ ہونا معلوم ہوگا؛ چنانچہ تواضع کا امر مستلزم ہے کہ اس کی ضد سے نہی ہو اور جس درجہ میں تواضع کا امر ہے اسی درجہ میں اس کی ممانعت ہو گی اور تواضع کی ضد ہے تکبر تو امر بالتواضع سے جیسے تواضع کا مرغوب فیہ اور مامور بہ ہونا معلوم ہوتا ہے ایسے ہی اس سے تکبر کا مرغوب عنہ و منہی عنہ ہونا مستنبط ہوتا ہے اسی طرح جیسے قید للہ سے شان للہیت و اخلاص کا تواضع میں مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے ایسے ہی اسی درجہ میں تواضع لغیر اللہ سے جو کہ تواضع للہ کی ضد ہے ممانعت معلوم ہوتی ہے اور تواضع لغیر اللہ سے ممانعت کا حاصل یہ ہے کہ استغناء عن غیر اللہ مطلوب ہے اور استغناء عن غیر اللہ ایک طویل لفظ ہے

لہٰذا میں اس کو مختصر کر کے اس کے مرادف کے ساتھ تعبیر کرتا ہوں یعنی تذلل کی ممانعت ہے۔ پس حق تعالیٰ کے لئے تواضع اور خفض جناح اختیار کرنا حسب وعدہ رفعہ اللہ موجب عزت باعث حرمت اور سبب وقعت ہے اور تواضع لغیر اللہ باعث ذلت موجب ہتک شان و بے حرمتی ہے جس کو تذلل سے تعبیر کیا جاتا ہے البتہ جہاں شرعی مصلحت ہو وہاں تذلل کی اجازت ہے کیوں کہ وہ فی الحقیقۃ تذلل نہیں بلکہ صورت تذلل ہے۔ اور حقیقت میں باعث ہے کیوں کہ شرعی مصلحت سے اس میں لوجہ اللہ کی شان موجود ہے اور جو کام لوجہ اللہ ہو، اس سے ذلت نہیں ہوا کرتی! بلکہ خدا کے ہاں عزت بڑھتی ہے گو دنیا کچھ بھی کہے! حاصل یہ کہ حدیث میں تواضع و استغناء عن غیر اللہ کی ترغیب اور امر ہے اور تکبر اور تذلل سے تنفیر اور نہی ہے پس وہ دونوں مامور بہ ہیں اور یہ دونوں منہی عنہ ہیں حاصل کلام یہ ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو تواضع کا امر فرمانا اور تکبر سے نہی فرمانا مقصود تھا مگر اس خیال سے کہ کوئی شخص اپنی کج فہمی سے تذلل کو مامور و مرغوب بہ سمجھ لے للہ کی قید کا اضافہ کیا گیا! تاکہ تواضع کا مامور بہ ہونا اور تذلل کا کہ وہ تواضع لغیر اللہ ہے منہی عنہ ہونا ظاہر ہو جائے اسی طرح صرف استغناء کی امر سے یہ اندیشہ تھا کہ لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو! کہیں عوام افتخار کو بھی استغناء سمجھنے لگیں! تکبر کو بھی استغناء عن غیر اللہ میں داخل کر لیں اس لئے امر استغناء کے ساتھ امر تواضع کو بھی جمع کر دیا! اور وجہ اس اندیشہ غلط کی ہے کہ اخلاق حمیدہ اوصاف حسنہ بعض دفعہ اخلاق ذمیمہ و خصال رذیلہ سے مشتبہ ہو جاتے ہیں وجہ یہ کہ بعض جگہ دونوں کی صورت یکساں ہوتی ہے! چنانچہ تواضع اور تذلل کی صورت ایک ہے استغناء اور تکبر بظاہر یکساں نظر آتے ہیں

اسی لئے بعض لوگ تذلل کو تواضع سمجھنے لگتے ہیں، تو تکبر کو استغنار تصور کر لیتے ہیں اتحاد صوری تغایر ذاتی پر پانی پھیر دیتا ہے اور اس کا ادنیٰ اثر یہ ہوتا ہے، کہ اپنی جانب حسن ظن بڑھتا جاتا ہے اور دوسروں کی طرف سے سوٗ ظن ترقی پہ ہوتا ہے اپنے تو تذلل کو تواضع خیال کرتے ہیں اور دوسرے کی تواضع بھی تذلل پر محمول ہوتی ہے؛ اسی طرح اپنا تکبر وافتخار بھی استغنار عن غیر اللہ معلوم ہوتا ہے؛

اخلاق حمیدہ و ذمیمہ

دوسرے کا استغنار بھی افتخار و تکبر سمجھا جاتا ہے حاصل یہ کہ اخلاق حمیدہ واخلاق ذمیمہ کو اخلاق حسنہ خیال کر لیتا ہے دوسری غلطی اوروں کے متعلق ہوتی ہے کہ ان کے امور حسنہ کو امور سیئہ سمجھتا ہے ان کی حسنات کو سیئات خیال کرتا ہے حالانکہ غلطی اور خطا کا احتمال وجود دونوں جانب میں مشترک ہے مگر اس کی کیا وجہ کہ اپنی تو ہر بات بھلی ہو اور دوسروں کی ہر بات بری مثلاً بخل واقتصاد ان دونوں کی صورت ایک ہے اس لئے کبھی تو انسان بخل کو میانہ روی واقتصاد سمجھتا ہے کبھی اقتصاد و میانہ روی کو بخل سمجھ جاتا ہے اسی طرح اسراف وسخا میں التباس ہوجاتا ہے؛ اس لئے کبھی فضول خرچی واسراف کو سخاوت وجود تصور کرتا ہے کبھی سخا بھی اسراف خیال کرتا ہے یہی وجہ ہے، کہ کتب تصوف میں احادیث سے اخذ کر کے اس بحث کو مفصلاً مطولاً بیان کیا گیا ہے مگر باوجود اس قدر تفصیل کے پھر بھی اشتباہ ہونے کی وجہ کیا ہے سو زیادہ وجہ یہ ہے کہ علم اخلاق و معاشرت و تصوف کی کوئی کتاب درس میں داخل نہیں، اور مطالعہ کی نوبت بھی کم آتی ہے نیز محض مطالعہ سے حقیقت کا انکشاف بھی نہیں ہوتا، صحبت کی ضرورت ہوتی ہے جس کا اہتمام

ہی مفقود ہے اور اگر فرض بھی کر لیا جاوئے کہ کوئی شخص اپنی ذہانت و ذکاوت سے حقیقت تک پہنچ بھی جائے مگر پھر اس کو اپنی حالت پر منطبق کرنا بہت مشکل ہوتا ہے انطباق کا حال بغیر معلم و مرشد کے نہیں معلوم ہو سکتا، بعض اوقات اپنی حالت کے مطابق سخت حیرت ہوتی ہے کہ یہ بخل ہے یا اقتصاد ہے سخاوت ہے یا فضول خرچی و اسراف اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ اپنی ذات سے حسن ظن کر کے بخل کو اقتصاد سمجھتے ہیں، اور اسراف کو سخاوت کیوں کہ ہوائے نفسانی غالب ہے شہوت کا غلبہ ہے اتباع نفس محیط ہے اپنے ساتھ حسن ظن ہے مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے اقتصاد کو بخل سمجھتے ہیں اور سخاوت کو بھی اسراف پر محمول کرتے ہیں تحدیث بالنعمۃ کو ریاء سمجھتے ہیں مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اپنی اوصاف حمیدہ کو اخلاق ذمیمہ سمجھیں، زیادہ تو قسم اول ہی کے افراد ہوتے ہیں باقی سب دوم کے جو لوگ ہیں کہ اپنے اخلاق حمیدہ کو بھی اخلاق ذمیمہ سمجھتے ہیں گو ان کی شان میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے، والذین یؤتون ما آتوا وقلوبھم وجلۃ انھم الی ربھم راجعون ان اصحاب کو اپنے نفس پر کبھی حسن ظن نہیں ہوتا کبھی اپنے کو متصف بصفات حمیدہ نہیں سمجھتے ہمیشہ یہ خوف واندیشہ رہتا ہے کہ شاید کچھ بھی مقبول نہ ہو، مگر اس خوف کا بھی ایک درجہ ہے وہ یہ کہ خوف صرف اتنا ہونا چاہیئے! کہ جس سے انسان معاصی سے بچ سکے یہ درجہ تو محمود اور مامور بہ ہے اور ایک درجہ خوف خشیت کا وہ ہے جو مؤدی الی الیاس ہو جاتا ہے یہ درجہ مذموم و منہی عنہ ہے یعنی ایسا شخص نماز پڑھتا ہے روزہ رکھتا ہے حج کرتا ہے زکوٰۃ دیتا ہے ذکر اللہ میں مشغول رہتا ہے، مگر غلبہ خشیت سے یہ سمجھتا ہے کہ مقبول نہیں ابتدا میں تو صرف خوف کے علامات و امارات اس کے بشرے سے ظاہر ہوتے ہیں مگر آخر میں یاس کا غلبہ ہو

جاتا ہے اور سب کچھ چھوڑ بیٹھتا ہے اس کی ابتدائی حالت تو بظاہر محمود معلوم ہوتی ہے کہ اس کو اپنے نفس سے سوءظن ہے مگر انتہا میں اس کے آثار مذموم ہو جاتے ہیں اپنی ساتھ سوءظن بے شک مفید و محمود ہے؛ لیکن جب تک اپنی حد تک رہے جب اپنی حد سے متجاوز ہو جائے گا؛ مذموم ہو جائے گا؛ ہر شئے میں یہی ضابطہ ہے کہ جب تک اپنی حد اور درجہ میں رہے گی محمود ہوگی اور جب متجاوز عن الحد ہوگی مذموم ہوگی؛ اس غلو فی الخوف سے ابلیس شیطان کمبخت راہ پاتا ہے اور عابد و زاہد سے کہتا ہے کہ جب تیرے اعمال مقبول ہی نہیں اور طاعت عبادت سب مردود ہے تو اس عبادت اور مشقت سے کیا فائدہ اس اٹھک بیٹھک کا کیا نتیجہ بھوکے مرنے سے کیا حاصل مال دینے سے کیا نفع سفر سے کیا سود شیطان کے اس مکائد سے رہی سہی آس بھی یاس سے بدل جاتی ہے اور اس کا انجام تعطل ہوتا ہے؛

طہارت ظاہری و باطنی

اور اس غلو فی الخوف کی ساتھ ایک اور سبب بھی تعطل کا یاد آگیا؛ یعنی جیسے ان لوگوں کو یاس معطل کر دیتی ہے اسی طرح بعض لوگ غلبۂ وہم کی وجہ سے معطل ہو جاتے ہیں؛ چنانچہ بعض لوگ بیماری و مرض کی حالت میں نماز چھوڑ دیتے ہیں کیوں کہ احتلام کی وجہ سے ناپاک ہیں اول کے زعم میں تیمم سے ان کی طہارت ہوئی نہیں کیونکہ بدون غسل کے صرف تیمم سے طہارت میں شک رہتا ہے پھر تیمم بھی کرنا چاہیئے تو مٹی میں شک ہوتا ہے کہ پاک ہے یا ناپاک ہے حالانکہ بعض آثار کے اعتبار سے پانی سے تیمم بڑھا ہوا ہے کیوں کہ پانی سے اولاً ظاہر پاک ہوتا ہے اور ثانیاً باطن بھی پاک و صاف ہو جاتا ہے کیوں کہ وضو سے خطائیں بھی جاتی رہتی ہے ہر ہر عضو سے

گناہ نکل جاتے ہیں اور تیمم میں اولاً وبالذات ہی باطن پاک ہوتا ہے اور ثانیاً اعضائے ظاہری سے بھی نجاست حکمیہ دور ہو جاتی ہے کیوں کہ مٹی کے استعمال سے اپنی خاکساری مستحضر ہو جاتی ہے، فنا کا منظر سامنے آ جاتا ہے کہ ایک دن ہم مٹی میں مل جائیں گے، پس تیمم میں بالذات باطن کی طہارت ہے، اور پانی میں بالذات ظاہر کی طہارت ہے کہ باطن ظاہر سے بڑھا ہوا ہے، پس تیمم کی طہارت پر شک کرنا ادل نمبر کی نادانی ہے تمام تر وجہ یہ ہے کہ مسائل شرعیہ تو معلوم ہیں، نہیں اپنی عقل واجتہاد سے کام لیتے ہیں اور احکام جانتے ہیں وہ ذرہ برابر بھی اپنی رائے سے حس وحرکت نہیں کرتے کچھ بھی چوں وچرا نہیں کرتے حدیث میں تصریح ہے کہ جو شخص قیام پر قادر نہ ہو بیٹھ کر فریضہ صلوٰۃ کو ادا کرے جو قعود پر قادر نہ ہو اضطجاع میں نماز ادا کرے یہ بھی نہ ہو سکے اشارہ سے ادا کرے غرض اسی حالت میں نماز پڑھ لے جب خدا کا حکم ہے، کہ ایسی حالت میں نماز ادا کرو، اور ہم اس کے بندے ہیں، پھر تشکیک پیدا کرنا، اور بے فائدہ شبہات وخلجانات میں پڑنا کیا معنی جس کا سبب حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، بعض لوگ انہیں بے بنیاد وہموں کی وجہ سے نماز وغیرہ چھوڑ دیتے ہیں، یہی آثار وثمرات ہیں، نجاوز عن الحد کے، میں یہ نہیں کہتا کہ اپنے نفس سے سوء ظن نہ رکھو اپنے کو بزرگ سمجھو نہیں سوء ظن ضرور رکھو مگر اس کی بھی حد ہے، اتنی بدگمانی نہ ہونا چاہیئے، جو کفران تک مؤدی ہو جائے خوف وخشیت بھی ایک صفت محمودہ ہے مگر اسی شرط سے کہ وہ اپنی حد میں رہے جیسے تفریط مضر ہے اسی طرح افراط بھی موجب مفاسد ہے جو خوف اپنی حد شرعی سے زیادہ ہو گا، وہ واجب الاحتراز اور منہی عنہ ہو گا، اس کی مذمت میں کچھ شبہ نہیں وہ بے شک قابل الترک ہے خوف محمود کے درجہ کی تعیین جناب فخر کائنات باعث موجودات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

نے خود فرمادی ہے چنانچہ ایک دعا میں فرماتے ہیں اسئلك من خشيتك ما تحول به
بيننا وبين معاصيك یعنی اے اللہ میں آپ کا اتنا خوف طلب کرتا ہوں جو مجھے معاصی
سے روک دے اس قید سے صاف صاف معلوم ہوا کہ خوف اسی درجہ تک مطلوب ہے جو
ارتکاب معاصی سے مانع ہو اور یہ بھی معلوم ہوا کہ خوف کا ہر درجہ مقصود بالذات نہیں؛
بلکہ خشیت مقصودہ صرف وہ ہے جس سے ترک آثام و ذنوب پر قادر ہو اپنے دامن عصمت
و عفت کو صغائر و کبائر سے آلودہ نہ ہونے دے ونیز معصیت سے محفوظ رکھے! اور وہ
خوف مقصود نہیں جو یاس پیدا کر دے جس کا اثر بجز تعطل کے کچھ نہیں بلکہ اس خوف
کا ثمرہ کبھی کفر ہو جاتا ہے کیوں کہ اس سے اولاً یاس پیدا ہوتی ہے پھر اعمال و طاعات
کے فضول ہونے کا خیال ہوتا ہے اور یاس خود کفر ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے انه
لا ييئس من روح الله الا القوم الكافرون نص صریح ہے کہ یاس کفر
ہے یاس کے آثار کا ایک واقعہ یاد آگیا؛ ایک شخص میرے ہم نام کانپور میں وکالت
کیا کرتے تھے؛ فارغ اوقات میں احیاء العلوم بھی دیکھا کرتے تھے! ایک مرتبہ کتاب الخوف
کو دیکھا تو ان پر تعطل کے آثار ظاہر ہونے لگے حضرت امامؒ نے سوء خاتمہ کے متعلق ذرا
تیز مضمون لکھا ہے نیز حضرت امامؒ جس مضمون کو بیان کرتے زوردار الفاظ میں بیان
کرتے ہیں؛ اسی لئے اس کتاب کا مطالعہ عوام کا کام نہیں؛ محققین کا کام ہے غرض
وہ میرے پاس کتاب لائے اور کہا کہ بس اس حالت میں صوم و صلوٰۃ سے کیا فائدہ اور وہ
عبارت نکال کر پڑھنا شروع کی مگر خوف کی وجہ سے اس کے منہ سے الفاظ تک نہیں
نکلتے تھے؛ بالکل حواس باختہ ہو رہے تھے؛ غرض میں نے اس مضمون کی سہل اور نرم
الفاظ میں تقریر کی سن کر بہت خوش اور ایک گونہ تسلی ہوئی فرمانے لگے کہ اس مضمون

کو تحریر فرما دیجئے تاکہ اس کو مکرر سہ کرر دیکھوں اور جو شبہ پیدا ہوا اس سے رفع کر دوں چنانچہ میں نے مختصراً لکھ بھی دیا تھا، اور وہ تقریر خاتمہ بالخیر کے نام سے طبع بھی ہو چکی ہے اسی مناسبت سے اس کا نام خاتمہ بالخیر رکھا ہے :

شیطان کی چالیں

خلاصہ یہ کہ آجکل ہمارے اندر دو غلطیاں ہیں ایک غلطی کا منشاً تو حسن ظن میں غلو ہے اور دوسری غلطی سوء ظن کے غلو سے پیدا ہوتی ہے اول غلطی اکثر عوام کو پیش آتی ہے اس مرض میں اکثر وہی مبتلا ہوتے ہیں اور دوسری غلطی یعنی سوء ظن میں غلو میں یہ اکثر خواص اتقیاء کو پیش آتی ہیں اور یہ غلطی اول غلطی سے بھی بدرجہا دشوار و سخت ہے اس میں اکثر خوف رجاء پر مستولی ہو جاتا ہے پھر اس کے شبہات کا رفع ہونا ایک مشکل اور مہتم بالشان کام ہو جاتا ہے اس مرض کا مریض اپنی استغناء کو تکبر سمجھتا ہے اپنی تواضع کو تذلل سمجھتا ہے اپنے وجود کرم کو اسراف خیال کرتا ہے اپنی ہر حمیدہ خصلت کو ذمیمہ پر محمول کرتا ہے یہ سب قصہ شیطان ملعون کی وجہ سے ہوتا ہے یہ کمبخت اپنے حملہ سے کہیں باز نہیں آتا اپنی چال سے کہیں نہیں رکتا، ہر شخص کو اس کے رنگ میں مارتا ہے خواص کو خواص کے رنگ میں مارتا ہے عوام کو عوام کے رنگ میں فریب دیتا ہے اہل اتقاء کو صورت اتقاء میں اپنے مکر سے زیر کرتا ہے اور فساق کو صورت فسق میں مغلوب کرتا ہے اگو محققین اہل اللہ پر اس کا مکر نہیں چل سکتا، وہ اس کی رگ رگ ریشہ سے واقف ہوتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے : انہ لیس لہ سلطان علی الذین آمنوا وعلی ربہم یتوکلون لیکن پھر بھی یہ اپنی کرنی سے نہیں چوکتا خواہ اثر ہو یا نہ ہو یہ کمبخت یہی چاہتا ہے کہ میرے دام فریب سے کوئی فرد بشر نہ نکلے ہر شخص میرے مکر کا شکار ہو جائے ؛ ہ

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں   تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

وار ہر شخص پر کرتا ہے لیکن معصومین و محفوظین حق تعالیٰ کے افعال و انعامات کی وجہ سے محفوظ رہتے ہیں اور اس کے دام تزویر میں نہیں پھنستے اور یہ خود بھی جانتا ہے قطعاً اس کو معلوم ہے کہ معصومین و محفوظین پر میرے اغوار و اضلال کا کچھ اثر نہیں ہوتا چنانچہ اس نے خود ہی کہا تھا: لاغوینھم اجمعین الا عبادك منھم المخلصین کہ اے رب العلمین تیرے سب بندوں کو بہکاؤں گا اور راہ حق سے دور کردوں گا بجز ان کو جو مخلص ہیں جن پر تیرے خاص خاص انعامات ہیں یعنی ان کو گمراہ نہ کرسکوں گا پس یہ استثناء اثر کے اعتبار سے ہے: یعنی شیطان علیہ اللعنۃ کے اغوار و اضلال کا اثر عباد مخلصین پر نہیں ہوسکتا: یہ مطلب نہیں کہ یہ ان کے بہکانے کی کوشش بھی نہیں کرتا: کوشش تو ان پر بھی کرتا ہے مگر ان پر بس نہیں چلتا چنانچہ یہی مطلب ہے حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا انہ لیس لہ سلطان علی الذین الخ کہ اس میں حق تعالیٰ نے کاملین پر سلطان کے غلبہ کی نفی کی ہے ارادہ اضلال و سعی کی نفی نہیں کی ارادہ ان کے گمراہ کرنے کا بھی کرتا ہے مگر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے اس لئے اس نے اپنی عزت قائم رکھنے کے لئے پہلے ہی سے استثنار کردیا تھا کہ تیرے عباد مخلصین کو نہ بہکاؤں گا: اور اس کا یہ کہنا کہ عباد مخلصین کو نہ بہکاؤں گا اس میں بھی ایک قسم کی شیخی ہے گویا ان پر احسان کرکے اس نے چھوڑ دیا ہے: یہ کمبخت احسان کرکے کس کو چھوڑنے والا تھا: وہ خود اس کے بہکانے میں نہیں آتے یہ کیا نہ بہکاتا: بلکہ ان کو بہکا ہی نہیں سکتا: یعنی اس کے بہکانے کا ان پر اثر ہی نہیں

ہوتا اور یہی اس کی مراد بھی تھی؛ ورنہ یہ کمبخت اپنے حملوں سے کہیں باز نہیں رہتا؛ باوجودیکہ انبیاء کی عصمت جانتا ہے مگر اپنی چالوں سے وہاں بھی نہیں چوکا گو ناکام رہا؛ مگر ہمت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا؛ مگر خدا تعالیٰ کی حفاظت ہے کہ اہل اللہ کاملین اس کے قابو میں نہیں آتے البتہ ہم جیسوں پر پوری امید باندھ کر حملہ کی ہمت کرتا ہے مثل مشہور ہے کہ ایک شخص کا ہمزاد اس کے تابع تھا؛ ایک دن وہ جا رہا تھا؛ سامنے سے ایک قصائی جو اس کا دشمن تھا؛ ملا اس نے ہمزاد سے کہا کہ اس کو مار ڈال؛ ہمزاد نے کہا کہ اس کے پاس تو چھریاں ہیں ہاں یہ بنیا جو مردوں کا تھیلہ لئے جا رہا ہے کہو تو اس کی گردن مروڑ دوں اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں؛ اصل کام تو چھریوں والے کا ہے؛ اسی طرح یہ شیطان بھی بنیوں سے یعنی عوام سے نہیں ڈرتا چھریوں والوں سے یعنی خواص اہل اللہ سے ڈرتا ہے مگر باوجود ڈرنے کے ان کے اغوار و اضلال کی کوشش میں بھی مصروف رہتا ہے؛ اس میں شک نہیں کہ ہے بڑا اُلبنار ہمت باوجودیکہ یقیناً و قطعاً جانتا ہے کہ انبیاء کی عصمت میں اولیا کی حفاظت میں میرے اغوار کا برائے نام بھی اثر نہیں ہو سکتا مگر ہمت سے پھر باز نہیں آتا قصد کرتا ہے گو منہ کی کھاتا ہے مگر اپنے عزائم پر جما ہوا ہے اور اس کی یہ ہمت گو اپنے متعلق کے اعتبار سے بری اور واجب الترک ہے لیکن اگر نفس ہمت و عزم کو دیکھا جائے تو اس قابل ہے کہ اس سے سبق لیا جائے اور مصرف کو بدل کر اس سے کام لیا جائے مگر اس نے اس ہمت کو برے کام پر خرچ کیا ہے تم نیک کام میں خرچ کرو؛ یہ قصہ مشہور ہے کہ حضرت جنیدؒ نے ایک شخص کو سولی پر چڑھا ہوا دیکھا؛ دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے اور کیا قصہ ہے؛

لوگوں نے کہا یہ ایک بڑا نامی گرامی چور ہے اول مرتبہ گرفتار ہوا تو اس کا ہاتھ کاٹا گیا پھر باز نہیں آیا، دوبارہ گرفتار ہوا تو پیر کاٹا گیا، پھر بھی چوری کرتا رہا، غرض دست و پا کٹنے کے بعد بھی چوری سے باز نہ آیا، تو اس کو سولی دینے کا حکم ہوا اور دار پر لٹکا دیا گیا کہ اور لوگ خوف کریں، اور اس سے عبرت حاصل کریں حضرت جنیدؒ نے آگے بڑھ کر اس کے قدم چوم لیے لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ کیا کیا یہ فاسق بدکار اس قابل ہے کہ آپ اس کے پیر چومیں فرمایا میں اس کے فسق کے پیر نہیں چومتا ہوں بلکہ اس کی ہمت و استقلال کے پیر چومتا ہوں جو استقلال اس کو عصیاں و نافرمانی میں تھا افسوس ہم کو طاعات میں بھی وہ استقلال نصیب نہیں اگر حق تعالیٰ ہم کو طاعات و عبادت میں یہ استقلال عطا فرمادیں تو ہمارا یہ حال ہو جاوے

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید ۔۔۔ یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

عبرت کا حصول

اہل اللہ حکیم ہوتے جو شے اچھی دیکھتے ہیں اسے اختیار کر لیتے ہیں جو بری ہوتی ہے اسے چھوڑ دیتے ہیں اور جو دونوں سے مخلوط ہو اس میں سے اچھی چیز کا انتخاب کر لیتے ہیں بری سے اجتناب کرتے ہیں، خذ ما صفا ودع ما کدر پر ان کا پورا عمل ہوتا ہے غرض بمصداق کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن۔ اچھی اچھی چیزوں کو خواہ کہیں بھی ہوں حاصل کر لیتے ہیں ؎

نگویند از سر بازیچہ حرفے ۔۔۔ کز اں پندے نہ گیرد صاحب ہوش

کتب ادب میں لکھا ہے کہ ایک حکیم نے دعویٰ کیا کہ میں نے ہر چیز سے کوئی نہ کوئی اچھی چیز اخذ کر لی ہے لوگوں نے پوچھا کہ کتے سے آپ نے کیا اچھی چیز اخذ کی ہے کہا اپنے محسن کا احسان بہت مانتا ہے پوچھا گیا کہ بلی سے کیا اخذ کیا گیا، کہا شکار کے لیے داؤ

خوب لگانی ہے اور یہ طبع سلیم اور عقل کامل کا کام ہے کہ حیوانات سے بھی سبق لے لے۔ کسی اور بزرگ سے دریافت کیا گیا کہ یزید کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے فرمایا شاعر اچھا تھا۔ اہل اللہ کی نظر برائی پر جاتی ہی نہیں۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ محاسن ہوتے ہیں۔ کسی معایب کا خیال بھی نہیں آتا۔ اور بات ہے کہ جس شخص کو کام کرنا ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ محاسن پر نظر رکھتا ہے۔ ساری معایب پر اس کی نظر نہیں جاتی البتہ جس شخص کو کام نہ کرنا ہو، وہ بے شک برائیوں کو جانچے گا۔ نتائج پر نظر ڈالے گا پس ہر شخص کو لازم ہے کہ ہر امر سے عبرت حاصل کرے ہر بات سے نصیحت نکالے ایک شخص نے خوب کہا ہے کہ جب برا آدمی تمہاری نصیحت و وعظ سے اپنی برائی سے باز نہیں آتا۔ تو تم اپنی بھلائی کو کیوں چھوڑو یعنی جب فاسق کو برائی پر اس قدر اصرار ہے تو تم کو نیکی پر اس سے زیادہ اسرار کیوں نہ ہو۔ وہ اپنی ہٹ سے برائی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ تو تم بھلائی کس طرح ترک کرتے ہو۔ وہ شیطان کی محبت کو نہیں چھوڑتا تم رحمٰن کی محبت کو کس طرح چھوڑتے ہو۔ غرض یہ کہ شیطان کمبخت رہزنی ضرور کرتا ہے اور اس میں اس کی ہمت قابل داد ہے لیکن حق تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اس کے داؤ سے محفوظ رکھتا ہے مگر یہ پھر بھی رہزنی سے باز نہیں آتا۔ البتہ رہزنی مختلف طرق سے ہوتی ہے عوام کی نظر میں اخلاق حمیدہ کو اخلاق ذمیمہ کر کے دکھاتا ہے جس کا سبب غلو فی الخشیۃ ہے

نظر و فکر کی ضرورت

جن خواص پر خشیت کا حال حد سے زیادہ غالب ہو جاتا ہے بعض اوقات اخلاق حمیدہ ان پر ملتبس ہو جاتے کہ ان کو اخلاق ذمیمہ سمجھنے لگتے ہیں اور فی الواقع اس میں شک نہیں کہ اخلاق حمیدہ و اخلاق ذمیمہ میں التباس سے محفوظ رہنا ہے بھی بہت مشکل کیوں کہ بعض دفعہ

دونوں کی صورت یکساں ہوتی ہے یہ دونوں بحر زخار ناپیدا کنار ہیں کہ انسان کے نفس کے اندر جاری ہیں اور ملے جلے چل رہے ہیں ظاہر میں دونوں ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں! مگر حقیقت میں دونوں کے درمیان ایک قوی فاصل ہے جو اختلاط حقیقی سے مانع ہے؛ اس فاصل کو کاملین ادراک کرتے ہیں چنانچہ مولانا فرماتے ہیں! سے

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں　　　در میانِ شان برزخ لایبغیاں

اس شعر میں اشارہ ہے آیت مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لایبغیان کی طرف بحر تلخ سے مراد اخلاق رذیلہ ہیں اور بحر شیریں سے مراد اخلاق حمیدہ. مطلب یہ کہ دونوں دریا ساتھ ساتھ انسان کے اندر چل رہے ہیں مگر درمیان میں ایک برزخ اور فاصل بھی ایسا موجود ہے جس سے کسی ایک کی مجال نہیں کہ دوسرے میں مخلط ہو جائے اور مولانا مرحوم نے ان اشعار میں آیت کریمہ کی تفسیر نہیں کی تاکہ من قال برایہ الخ کا مصداق ہو جائے بلکہ محض تشبیہ مقصود ہے کہ انسان کے نفس میں بھی اخلاق ذمیمہ اور اخلاق حمیدہ کا اجتماع ایسا ہی ہے جیسے محسوسات میں بحر تلخ و بحر شیریں کا اجتماع ہوا کرتا ہے اور جیسے کہ حسی دریاؤں کے متعلق بینھما برزخ لا یبغیان میں ارشاد ہے اسی طرح ان معنوی دریاؤں کے درمیان بھی ایک برزخ موجود ہے جو کاملین کو نظر آتا ہے ناقصین کو نظر نہیں آتا ان کو دونوں مخلوط نظر آتے ہیں اس خلط سے محفوظ رہنے کے لئے نظر و فکر کی ضرورت ہے اخلاق کی کتابوں میں غور کرنے سے اس کا حال معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ ہم لوگ ناواقف ہیں حتی کہ درس میں بھی کوئی اخلاقی کتاب داخل نہیں اور غیر درسی کتاب کا مطالعہ کرتے نہیں اس لئے غلط میں پھنسے رہتے ہیں اور بعضے لوگ جو کتب تصوف کا بعد الفراغتہ یا قبل الفراغ

مطالعہ کرتے بھی ہیں ان کے لئے بھی امراض واحوال کا اپنے نفس پر منطبق کرنا مشکل ہوتا ہے یہ انطباق بھی دوسرا ہی کر سکتا ہے اپنے آپ کو اپنے عیوب کم نظر آتے ہیں! اس لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اخلاقی کتابوں میں سے کوئی کتاب ضرور درس میں داخل کی جائے!

مرشد کامل کی رہبری

اسی طرح یہ امر بھی قابلِ توجہ و ضروری العمل ہے کہ تعلیم کے بعد کسی شیخ و بزرگ کی صحبت بھی اختیار کرنا چاہیئے باوجود اس کے کہ یہ امر بہت مہتم بالشان ہے لیکن لوگ اس سے اس درجہ غافل ہیں کہ اس کو امر فضول سمجھتے ہیں اور بعضے لوگ جو کسی درجہ میں ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی محض برائے نام یعنی چار ہی دن کے لئے آتے ہیں! اگر ان سے پوچھیے کہ کس واسطے تشریف لائے ہو! فرمائیں گے اصلاح نفس کے لئے کتنی مدت قیام ہوگا ؟ جواب میں ارشاد ہوتا ہے چار دن یعنی اصلاح نفس کے حرفوں کی برابر بھی نو دن تجویز نہیں کرتے بلکہ دو دو حرفوں کے مقابلہ میں ایک ایک دن مقرر کرتے ہیں نہ معلوم اصلاح نفس کو کچھ کھیل سمجھ رکھا ہے ! یا محض آمد و رفت ہی کا نام اصلاح نفس رکھ لیا ہے بعض آٹھ دن کے لئے آتے ہیں بعض نے بہت ہمت کی تو مہینہ دو مہینہ کو آگئے بھلا تمام عمر کے کہنہ اور جبلی امراض اور ان کے معالجہ کے لئے چار دن یا ایک ہفتہ یا ایک دو مہینہ تجویز ہوتے ہیں، نہ معلوم یہ کس امر کا مقتضاء ہے! دیکھیے کوئی شخص اگر چار سال میں تپ دق میں مبتلا ہو اور طبیب کے پاس علاج کرانے جائے اور کہے کہ چار دن میں چار سال کے مرض کا علاج ہو جائے تو طبیب کیا اس بات کی سماعت کرے گا یا اس کی جانب التفات و توجہ کرے گا ہرگز نہیں بلکہ بات بھی نہ کرے گا کہے گا اس کو

خلل دماغ ہے کہ چار برس کا مرض چار دن علاج کرانا چاہتا ہے جب اطباء ظاہری سے
ان امراض ظاہری میں جو قلیل عرصے سے صحت کو خراب کر رہے ہیں ایسے شخص کے
علاج کرنے کی توقع نہیں تو اطباء روحانی تمہارے ان امراض باطنی کا جو عمر بھر سے
تمہاری صحت روحانی خراب کر رہے ہیں کس طرح چار دن میں علاج کر دیں گے ؛
حیرت ہے کہ تعلیم الفاظ میں تو آٹھ آٹھ دس دس سال خرچ کر دیتے ہیں اور اصلاح
نفس معالجہ روحانی کے واسطے ایک سال رہنا بھی دشوار اور مشکل معلوم ہوتا ہے ؛
حالانکہ علم الفاظ آلہ اور مقدمہ ہے اور اصلاح نفس مطلوب بذاتہ؛ مقصود ہے؛ کہ
مقصود ہمیشہ مقدمات و مبادی سے اولیٰ و افضل ہوا کرتا ہے قیاس کا تو مقتضی یہ تھا کہ اگر
تعلیم رسمی میں ایک سال صرف ہوا ہے تو تعلیم مقصود میں چار سال تو خرچ ہوں گے ؛
لیکن یہاں اس کے عکس کی بھی نوبت نہیں آتی ؛ کہ آٹھ سال میں اگر تعلیم سے فارغ
ہوں تو دو ہی سال اصلاح نفس و مجاہدہ و ریاضت میں صرف کریں بلکہ بعض حضرات
تو اصلاح نفس کے لفظوں کی برابر آٹھ روز مقرر کرتے ہیں کہ بس ایک ہفتہ میں
مشیخیت کی گٹھری ہاتھ آجائے گی ؛ اور بعض اشخاص بھی ذہن متعین فرماتے ہیں کہ ایک
چلہ میں تکمیل ہو جائے گی نہ معلوم یہ زچہ عورت ہیں کہ چالیس روز میں چلہ نہا کر پاک
صاف بن جائیں گے تمام امراض سے صحت بھی ہو جائے گی اور بچہ بھی مل جائے گا
وہ بچہ کیا ہے مجاہدہ و ریاضت کا اثر اور نتیجہ یعنی نسبت مع اللہ افسوس اس گوہر
نایاب کی کیسی بے قدری کی جا رہی ہے اے صاحبو اس کے حاصل کرنے کے لئے
کم از کم اتنی مدت تو تجویز کی ہوتی جس میں رضاعت و فطام وغیرہ کا طریقہ تو معلوم
ہو جاتا لیکن اتنی فرصت کہاں بس چالیس روز میں شیخ کامل ہونا چاہتے ہیں بعض

صاحب چھ ماہ اصلاح نفس کے لئے وقف کر دیتے ہیں جو کہ ادنیٰ مدت حمل ہے!
یعنی چھ ماہ میں بچہ یعنی وہی نسبت مع اللہ ضرور ہو جانا چاہیئے کیا مطلب چھ ماہ میں پیری
ورہبری کی سند مل جانی چاہیئے! میں کہتا ہوں کہ اچھا چھ ماہ میں حمل ٹھہر بھی گیا لیکن
اگر وہ پیٹ کے اندر مر گیا تو اب تبلاؤ اسے کون جنا دے تم تو حمل ٹھہرنے کے بعد
چھ ماہ میں چل دیئے اب وہ مردہ بچہ اندر سے کیوں کر نکلے گا پس وہ تو اپنی سمیت
سے تم کو ہلاک ہی کرے گا! ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے! کہ اصلاح نفس کا
نام بدنام ہی کرنے کے واسطے لیا جاتا ہے اصل مقصود محض ریا، وسمعہ نمود وشہرت
ہوتی ہے کہ وطن جا کر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جناب عالی مولوی مولانا بھی ہو
گئے! اور ساتھ ہی ساتھ درویش وشیخ بھی بن گئے ورنہ حقیقت میں آجکل جو اصلاح
نفس یا تربیت باطن زبان سے کہا جاتا ہے ان لفظوں کا کچھ بھی ملول نہیں محض
بے معنی الفاظ ہوتے ہیں ایک شخص میرے پاس پانی پت سے آئے فرمایا میں قاری
صاحب سے تجوید پڑھتا ہوں آجکل قاری صاحب دو مہینے کے واسطے باہر گئے
ہیں میں بے کار تھا لہٰذا اصلاح نفس کے لئے آیا ہوں دیکھیئے ایسا فضول اور زائد
کام سمجھا کہ آؤ آجکل بے کار ہیں اسے ہی کر لو! تفریح بھی ہو جائے گی افسوس.
میں نے کہا کہ مجھے معاف فرمایئے میں اس کام کو انجام نہیں دے سکتا! جناب کو
یکسوئی نہ ہوگی، کبھی یہاں کا خیال ہوگا، کبھی وہاں کی فکر ہوگی! کشمکش میں اصلاح
نفس نہیں ہوا کرتی دوسری اتنی مدت میں ہو بھی کیا سکتا ہے! سہ

صوفی نشود صافی تا درنکشد جامے   بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

بھائی تم تو اپنی طرف سے اس مہتم بالشان امر کے لئے ایک وسیع وقت نکالو!

گو شیخ کی توجہ اور تعالیٰ شانہ کے فضل و کرم سے تھوڑے ہی دنوں میں کام ہو جائے مطلب بر آئے لیکن تمہارا عزم تو وسیع ہونا چاہیئے۔ اپنی طرف سے تو کوتاہی نہ کرو۔ جب انسان کوئی کام کرنا چاہے تو اول اس کو معلوم کر لینا چاہیئے کہ اس کام کے لئے کس قدر وقت کی ضرورت ہے اور کتنی مقدار زمانہ کی اس کام کے لئے کافی ہے لیکن چونکہ یہاں کام کرنا مقصود ہی نہیں محض نام ہی مطلوب ہوتا ہے اس لئے دل بھی نہیں لگاتا اور زیادہ مدت بھی نہیں دی جاتی۔ الحاصل اخلاقِ حمیدہ و اخلاقِ ذمیمہ کے التباس کے سبب انسان کبھی ایسی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے خلاصی محال معلوم ہونے لگتی ہے۔ پھر کبھی تو اس پریشانی میں صرف ایمان کا اندیشہ ہوتا ہے اور گاہے جان کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ اللہ اکبر اکثر لوگوں نے تو خودکشی کر لی ہے اسی صدمہ و رنج میں جان دے دی ہے لہٰذا ضرور ہے ایک شیخ کامل و مبصر کی کہ اخلاقِ ذمیمہ کو اخلاقِ ذمیمہ بتا دے اور ان کے معالجہ میں کوشاں ہو اور اخلاقِ حمیدہ کو اخلاقِ حمیدہ بتا دے اور ان کے بقاء و دوام کی کوشش کرے دودھ کا دودھ علیحدہ کر دے اور چھاچھ کی چھاچھ کوامر مشتبہ و ملتبس نہ رہے روزِ روشن کی طرح سب معاملہ صاف ہو جائے۔ غور کیجئے مثلاً ایک شخص مرضِ دق میں مبتلا ہے اور اپنے آپ کو مریض نہیں سمجھتا بلکہ صحیح خیال کرتا ہے جس طرح یہ شخص ایک بڑی غلطی میں مبتلا ہے اسی طرح اس کا مقابل بھی اس سے زیادہ غلطی میں گرفتار ہے یعنی جو شخص کہ اچھا خاصا ہو لیکن ایک دن جو گرمی میں زیادہ پسینہ آ گیا اور حرارتِ شمس کیوجہ سے بدن گرم ہو گیا تو وہ یہ سمجھ گیا کہ مجھے بخار ہو گیا لگا ہائے ہو کرنے قبل از مرگ واویلا شروع کر دیا۔ گھر آتے ہی بیوی پر غصہ شروع کر دیا۔ مردار تو اِدھر اُدھر پھرتی ہے۔

میں بخار میں مر رہا ہوں میرا برا حال ہے کوئی دم کا مہمان ہوں اس نے کہا کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ تم کو تو بخار و خار خاک بھی نہیں، محض وہم ہے اس کا کیا علاج جواب میں کہا تیرا کیا ہے اگر میں مرجاؤں گا، تو ظاہر ہے کہ اس شخص کی غلطی پہلے شخص سے بھی زیادہ ہے اور اس کا رفع ہونا بہت مشکل ہے بعض اکابر نے فرمایا ہے، اب تمام مضمون ختم ہوا کسی شاعر نے کہا ہے۔ مزن فال بد کآورد حال بد

بدگمانی سے احتراز

فال بد کی ممانعت اس وجہ سے نہیں کہ اس میں کچھ اثر ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ کے ساتھ سوء ظن و بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ اب اللہ میاں کوئی بلا ضرور بھیجیں گے، انا عند ظن عبدی بی جب اس نے خدا تعالیٰ سے بدگمانی کی وہ بھی بعض دفعہ اس کی سزائیں ویسا ہی کر دیتے ہیں جیسا اس نے گمان کیا تھا، ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دہلی میں مومن خاں شاعر ترا ویح میں قرآن شریف سننے آیا کرتے تھے ایک ڈوم بھی قرآن شریف سننے آیا کرتا تھا، اس نے کہا کہ خاں صاحب جس روز وہ صورت آئے جس کا نام نہیں لیا کرتے جو مردوں پر پڑھی جاتی ہے، تو مجھے بتا دینا میں اسے نہیں سنوں گا، یعنی سورۃ یٰسین، عوام جہلا، سورۃ یٰسین کا نام سننے سے بھی ڈرتے ہیں، اس کو موت کی علامت سمجھتے ہیں خاں صاحب شاعر آدمی تھے، آپ کو مذاق سوجھا اپنی چلبلی اور شوخ طبیعت سے نہ رہ سکے گو وہ بڑے متقی و متورع شخص تھے، خدا معلوم سچ یا جھوٹ کہہ دیا کہ وہ تو رات پڑھی بھی گئی اس کو تو تم نے سن لیا، ان کو ہنسی ہوگئی اور اس کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرنے لگا، ہوش اڑ گئے حواس باختہ ہو گیا روح تحلیل ہونے لگی

لکھ کر ہمارا نام زمین پر مٹا دیا — ان کا تو کھیل خاک میں ہمکو ملا دیا

غرض وہ دوسرے یا تیسرے روز مر گیا؛ غرض صحت کو بیماری سمجھنا بھی غلطی ہے اس غلطی میں جان کا بھی اندیشہ ایمان کا بھی خطرہ روحانی نقصان بھی جسمانی زیاں بھی اس قسم کی غلطیوں سے لوگوں نے خودکشی کر لی ہے ایسے وقت میں مرشد کامل رہبری نہ کرئے تو انسان بجز جان دینے کے اور کچھ چارہ ہی نہیں دیکھتا جان اور ایمان کے لفظ پر محض لفظی مناسبت سے مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا؛ میں مکہ شریف سے واپس آرہا تھا بمبئی میں لکھو سیٹھ کے مسافر خانہ میں قیام ہوا؛ وہاں کے لوگوں کو میرے آنے کی اطلاع ہوئی اور سب نے وعظ کی درخواست کی؛ میں نے کہا کہ مجھے معاف کرو؛ میں یہاں وعظ نہیں بیان کروں گا؛ کیوں کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو ناحق کہوں گا؛ تو ایمان کا اندیشہ یا حق کہوں گا تو جان کا اندیشہ لہٰذا میں جان و ایمان کو خطرے میں نہیں ڈالتا؛ اور بمبئی میں وعظ نہیں کہتا؛ مجھے جان و ایمان دونوں محبوب ہیں اور شرعًا دونوں کی حفاظت ضروری ہے البتہ تم کو اگر ایسا ہی شوق ہے تو یہیں مسافر خانہ میں کہہ دوں گا جس کا دل چاہے آکر سُن لے چنانچہ وہیں مسافر خانہ میں بیان کیا اتفاقًا مجمع بہت زیادہ ہو گیا تھا؛ غرض جان جیسے طبعًا و عقلًا عزیز ہے اسی طرح شرعًا بھی واجب الحفظ ہے کیوں کہ حق تعالیٰ کی نعمت ہے نیز ارشاد ہے لا تقتلوا انفسکم اگر جان ہماری چیز ہوتی تو ہم کو اس میں تصرف کرنے سے منع نہ کیا جاتا

جان و ایمان کی حفاظت

دوسرے مقام پر ارشاد ہے لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کہ اپنی جان کی حفاظت کرو مصائب نوائب سے بچو اپنی نفوس کو قتل مت کرو؛ جان بوجھ کر مصیبت میں نہ پھنسو جناب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ان لنفسک علیک حقاً ان لعینک علیک حقاً جب نفس اور جان کا ہم پر حق ہے تو اس کی حفاظت کیوں نہ ضروری ہوگی انسان جان اور زندگی ہی کے ذریعے سے مدارج کمالات کو طے کرتا ہے ہر دنیوی و دینی طبعی و شرعی ترقی اسی پر موقوف ہے تمام افعال و اعمال کا موقوف علیہ یہی ہے تو اس کی حفاظت کیسی کچھ ضروری ہوگی اس طرح وہ پریشانی بھی ممنوع ہے جس سے اعضاء ظاہری و باطنی قلب وغیرہ پر کچھ برا اثر ہو ان کی حفاظت بھی ضروری ہے! کیوں کہ یہ اعضا مقدمہ و آلہ ہیں روح اور جان کے ساتھ مقصود اصلی مرغوب ہوتا ہو اسی طرح اس کے مقدمات بھی ہوتے ہیں مقدمات کا احترام اور ان کی نگہداشت مقصود ہی کی نگہداشت ہے حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں کسی شخص نے تسبیح دیکھی کہا حضرت آپ کو تسبیح کی کیا حاجت ہے یہ تو مبتدیوں کے واسطے موزوں ہے فرمایا اسی کی بدولت تو ہم کو یہ دولت ملی ہے اسی کی وجہ سے تو آج واصل الی اللہ ہوئے ہیں! اور اسی کو چھوڑ دیں! ایسے رفیق کو نہیں چھوڑا جا سکتا! یہ تو کفران اور ناشکری ہے کہ جس چیز کی وجہ سے نعمت غیر مترقبہ حاصل ہو اس سے ہی اعراض کیا جائے اسی طرح یہ اعضاء اور نفس مطلوب بالذات یعنی قرب حق کے لئے آلہ ہے لہٰذا ان کی حرمت و عزت بھی ضروری ہے خوب کہا ہے ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است — افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را — کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

غرض چونکہ وہ نفس اور اعضاء وسیلہ اور ذریعہ ہیں مقصود کے لئے ان کی حفاظت گو آلہ ہی کے درجے میں سہی لیکن ضروری تو ہے اور ایمان کی حفاظت میں تو کسی قسم

کا شبہ و شک ہو ہی نہیں سکتا ؛ اس کی حفاظت نوجوان سے بھی بدرجہا زیادہ والی ہے کیوں کہ یہ تو خود مقصود ہے اس کی حفاظت مقصود کے درجہ میں ہو گی اور ظاہر ہے کہ مقصود ہمیشہ مقدمات سے ہر اعتبار سے بڑھا ہوا ہوتا ہے اب سمجھ لیجئے کہ اس غلطی سے جو پریشانی ہو گی وہ کس قدر زیادہ سخت ہے حق تعالیٰ شانہ محفوظ رکھیں ؛ اور اس سے معلوم ہو گیا ہو گا : کہ جمعیت شرعاً بھی مطلوب ہے ؛ اور پریشانی سے جس پر یہ مضرتیں مرتب ہوں بچنا ضروری ہے شریعت مقدسہ میں اس کی تعلیم اہتمام سے دی گئی ہے چنانچہ جو شخص محزون و غمگین ہو اس کی تعزیت مامور بہ ہے جس کے معنی تسلی دینے کے ہیں ؛ یعنی اس کو دلاسا دیا جائے ؛ اس کی جمعیت خاطر میں کوشش کی جائے احادیث میں اس کی بہت فضیلت ہے کہ اپنے بھائی مسلمان کی پریشانی دور کی جائے اس کی حاجت رفع کی جائے نیز جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی و طمانیت ہی کے لئے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ایک طویل عریض خط لکھا ؛ ہے وہ خط حصن حصین میں منقول ہے ؛

مصائب سے نجات

اور خود حق تعالیٰ جل جلالہ عم نوالہ فرماتے ہیں وبشر الصابرین الذین اذا اصابتہم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں کو مژدہ سنا دیجئے جو صابر ہیں ؛ اور مصیبت اور سختی کے وقت حق تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں انا للہ پڑھتے ہیں اس میں حق تعالیٰ نے رنج و غم اور پریشانی دور کرنے کا ایک طریقہ بتلایا ہے جس کا عنقریب بیان آتا ہے ؛ معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو مسلمانوں کی پریشانی گوارا نہیں جب ہی تو اس کے رفع کا طریقہ بتلایا ہے اور وہ طریقہ تسلی و تشفی میں دو وجہ سے موثر ہے ایک تو اس

وجہ سے کہ وہ ذکر ہے اور پریشانی کے وقت خدا کی یاد میں لگ جانا پریشانی کے دفع کرنے میں کافی ووافی ہو جاتا ہے جس میں کچھ انا للہ کی تخصیص نہیں بلکہ ہر ذکر میں یہی خاصہ ہے جیسے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سبحان اللہ استغفر اللہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم وغیرہ لیکن مصیبت و پریشانی کے وقت کے ساتھ انا للہ کو ایک تعلق ہے وہ یہ کہ اس میں علاوہ ذکر کے مضمون بھی ایسا ہے کہ اس کا استحضار پریشانی کا استیصال کر دینے والا ہے کیونکہ حاصل آیت کا یہ ہے کہ غم میں دو باتوں کا خیال رکھے ایک تو انا للہ کہ ہم ہر اعتبار سے خدائے قادر کے مملوک بندے ہیں وہ ہم میں جس طرح چاہے تصرف کرے اسے اختیار ہے دوسرے انا الیہ راجعون کہ ہم سب کا مرجع و مآل وہی ایک ذات ہے، انا للہ میں تو اس امر کی تعلیم ہے، کہ اپنے واسطے اپنی عقل ورائے سے کچھ تجویز نہ کرے بس اس پر جما رہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ہیں وہ جو چاہے کرے اس کے فعل میں چون وچرا کا کسی کو حق نہیں، اور جب یہ حالت راسخ ہو جائے گی، تو کبھی بھی رنج نہ ہو گا، پریشانی کا نام بھی نہ آئے گا پریشانی تو جب ہی ہوتی ہے کہ ہم خود اپنے لئے پہلے سے کچھ تجویز کر لیتے ہیں مثلاً یہ کہ ہمارا مال ہمیشہ ہمارے پاس رہے ہماری اولاد ہمیشہ زندہ رہے ہم ہمیشہ تندرست رہیں، ہمیشہ برسر ملازمت رہیں کبھی برخاست نہ ہوں وغیرہ وغیرہ اور اس کے خلاف ہونے غم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہائے یہ کیوں ہوا وہ کیوں ہوا ہائے میری تو ساری امیدیں خاک میں مل گئیں میں تو کیا سوچ رہا تھا اور ہو کیا گیا، صاحبو! قصر آمال کو اتنا بلند ہی کیوں کرتے ہو! اس کے انہدام سے مرجاؤ، حق تعالیٰ کے جناب میں تو تفویض محض ہونا چاہئے اور جن لوگوں کو یہ دولت حاصل ہے ان سے راحت اور سامان راحت کا حال پوچھو

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں فوضت فاسترحت یعنی جب تک سارے کاموں کو اپنے ذمہ رکھا پریشان وحیران رہا؛ اور جب سے سب امور کو حق تعالیٰ شانہ کے سپرد کر دیا ہے راحت وآرام میں ہوں؛ کسی بزرگ نے حضرت بہلول سے دریافت کیا کیا حال ہے کیسے ہو فرمایا اس شخص کی کیا حالت پوچھتے ہو؛ جس کی خواہش کے موافق تمام نظام عالم چل رہا ہو؛ ظاہر ہے کہ ایسا شخص تو خوش وخرم رہے گا؛ سائل نے کہا ذرا اس کی شرح فرمایئے؛ مطلب سمجھ میں نہیں آیا فرمایا میں نے اپنا ارادہ حق تعالیٰ شانہ کے ارادہ میں فنا کر دیا اب جو اس کا ارادہ ہے وہی بعینہ میرا ارادہ ہے اور ظاہر ہے جو کام ہوتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے ارادہ کے موافق ہوتا ہے پس جب میں نے اپنے ارادہ کو اس کے ارادہ میں فنا کر دیا تو جس طرح ہر واقعہ ارادہ حق کے موافق ہے اسی طرح میرے ارادہ کے موافق ہے اس لئے میں ہمیشہ خوشحال فارغ البال رہتا ہوں؛ حضرت سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ عالم ارواح میں سب کو جمع کرکے پوچھا گیا کیا چاہتے ہو کسی نے کچھ مانگا کسی نے کچھ مانگا؛ حتی دارت النوبۃ الی ھذا اللاشئ احمد فقلت یا رب ارید ان لا ارید وانما ارید لا اختار فاعطانی مالا عین رأت ومالا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر من اھل ھذا العصر اور کلمہ استرجاع یعنی انا للہ وانا الیہ راجعون کا حاصل بھی یہی ہے کہ ہم کو کوئی تجویز نہ کرنا چاہیئے بلکہ تمام امور خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینے چاہییں اور ہم کو تجویز کا حق ہی کیا ہے جب خدا تعالیٰ کے محکوم اور غلام ہیں بھلا غلام کو بھی کسی تجویز کا حق ہوتا ہے آقا کے سامنے پس کسی شق کی تعیین کرنا ہمارے لئے مضر ہے ہم سے محض تسلیم مطلوب ہے آگے دوسرا

جملہ ہے انا الیہ راجعون اس میں بہت ہی کام کی چیز مذکور ہے تقریر اس کی یہ ہے کہ جب انا للہ کے سمجھ لینے سے غم تو رفو چکر ہو گیا، طبیعت سے رنج دور ہو گیا، اب حق تعالیٰ صرف غم ہی دور کرنے پر بس نہیں فرماتے بلکہ ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ تم خدا کے پاس جانے والے ہو، اس وقت تم کو دار الجزاء و دار الثواب میں صبر کی وجہ سے درجے ملے گا، ترقی دی جائے گی، ثواب جزیل کے امیدوار ہو اور ثواب کے امید وہ چیز ہے کہ انسان اگرچہ صاحب حال بھی نہ ہو، جس سے غم غالب نہیں آسکتا، لیکن وہ پھر بھی اپنا کیمیائی اثر دکھا کر رہتی ہے اس کا نفع ضرور بالضرور ہوتا ہے آدمی ثواب کی امید میں تمام پریشانیوں سے قطع نظر کر لیتا ہے کوئی مشکل اسکو مشکل نہیں معلوم ہوتی، ہم دیکھتے ہیں کہ دنیاوی منافع کی امید پر لوگ مصائب کو مصائب نہیں سمجھتے، بے تکلف مشقتیں برداشت کرتے ہیں زحمتیں جھیلتے ہیں دیکھئے ملازمین ایک ماہ تک کار ملازمت کو انجام دیتے ہیں محض اس امید پر کہ ختم ماہ پر تنخواہ ملے گی، مزدور دن بھر ڈلیا ڈھوتا ہے کہ شام کو مزدوری ملے گی، قلیوں کو دیکھ لیجئے کہ مسافر کی صورت دیکھتے ہی آگھیرتے ہیں، اور زبردستی اسباب سر پر رکھ لیتے ہیں صرف اس وجہ سے کہ چار پیسے مل جائیں گے، ورنہ بظاہر تو سر پر بوجھ لئے ہوتے ہیں مصیبت میں گرفتار ہیں لیکن پیسوں کی امید اس مشقت پر غالب آجاتی ہے، اور اس کو اس بار گراں کے تحمل پر راضی کر دیتی ہے اسی طرح وانا الیہ راجعون کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے استحضار سے ثواب کی توقع ہو جاتی ہے تو یہ رنج ورنج سب کافور ہو جاتا ہے اور ثواب کی توقع اس رنج پر غالب آنے سے یہ اثر ہوتا ہے کہ جان کو پریشانی سے محفوظ رکھتا ہے، غرض حق تعالیٰ کا یہ مقصود ہے کہ اس کی

مخلوق پریشان نہ ہو، جہاں تک ہو، دارین میں راحت و آرام سے رہیں جو شخص صراط مستقیم پر چلے گا یعنی شریعت مقدسہ طہرہ پر عمل کرے گا وہ ہرگز ابدالآباد تک پریشان و سرگرداں نہ ہوگا۔

وساوس کا اثر جناب فخر دارین رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی مطلوب ہے کہ آپ کا کوئی امتی حیران و پریشان نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص خواہ مخواہ پریشانی میں گھسے مصیبت میں پھنسے تو اس کا کیا علاج مثل مشہور ہے خود کردہ را علاج نیست اسی طرح باطنی معاملات میں بعض دفعہ سالک کو وساوس اور توہمات سے پریشانی ہوتی ہے۔ مثلاً کفر کے خیالات آنے لگتے ہیں۔ جس سے یہ اپنے آپ کو کافر سمجھنے لگتا ہے حالانکہ یہ غلطی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا ہے: ان اللہ تجاوز عن امتی ما وسوست بہ صدورھا

پس کفر کے وسوسہ سے آدمی کافر نہیں ہوتا۔ بلکہ مومن کامل رہتا ہے اس میں مبتلا ہونے والوں کی بالکل ایسی مثال ہے کہ کسی شخص کا دھوپ میں یا چولہے کے پاس بیٹھنے سے ہاتھ گرم ہو جائے بس اسکی روح نکلنے لگے کہ اب جان گئی مصیبت آئی۔ اب بچنا دشوار ہے جھٹ پٹ حکیم صاحب کے پاس جائے۔ کہ میں سخت مرض میں مبتلا ہوں علاج کر دیجئے۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی کہا ارے میاں تم تو اچھے خاصے تندرست ہو تم کو بیمار کس نے کہا ہے یہ تو محض تمہارا وہم ہے۔ کہا واہ صاحب میں تو سخت مریض ہوں بخار چڑھا ہوا ہے۔ مجھے تو خدا کے واسطے جلاب و مسہل دو۔ تاکہ مادہ کا خروج ہو جائے۔ حکیم صاحب نے کہا تم کو تو یہ حرارت عارضی ہے خود جاتی رہے گی۔ کچھ فکر کی بات نہیں۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کو گو مرض

نہیں لیکن خود وہم کیا تھوڑا مرض ہے اور اس وہم کا منشا محض ناواقفیت ہے اس طرح سالک ناواقف کو وساوس سے وہم اور وہم سے غم پیدا ہو جاتا ہے جو کہ گورمیں جا سلاتا ہے۔ صاحبو! وسوسہ کا علاج تو صرف بے فکر اور بے التفات ہو کر مسرور و خوش ہونا ہے نہ کہ غم کو لے کر بیٹھ جانا ہے۔ جتنا فکر کرو گے۔ اتنا ہی غم بڑھتا جائیگا ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جناب سول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے وساوس وخطرات کی شکایت کی آپ نے فرمایا او جدتموہ قالوا نعم قال ذالصریح الایمان سبحان اللہ حضور نے وسوسہ کے غم کا کیا عجیب علاج فرمایا کہ وہ تو پریشان آئے تھے۔ آپ نے بشارت کمال ایمان کی سنا کر مسرور واپس کر دیا۔ عارفین وصوفیہ کرام نے اس سے مستنبط کیا ہے کہ وسوسہ کا علاج مسرور ہونا ہے جس کو یہ مرض لاحق ہو۔ اس کے لئے لازم ہے مخزوں نہ ہو ہمیشہ مسرور وخوش رہے تاکہ حدیث پر عمل ہو۔ اور اس کی حالت سنت کے موافق ہو۔ اور اس مسرور رہنے سے وسوسہ دفع ہونے کا راز یہ ہے کہ شیطان انسان کو محزون وغمگین رکھنا چاہتا ہے۔ جب تم اس کے خلاف کرو گے اور اس کو اسکی سعی وکوشش میں کامیاب نہ ہونے دو گے یعنی اپنے کو خوش وخرم رکھو گے رنج وغم نہ کرو گے۔ تو وہ مایوس ہو جائے گا اور تم کو نہیں ستائیگا۔ سمجھیگا کہ وساوس ڈالنے سے یہ تو الٹا خوش ہوا اور اسے اس کو خوش ہونا گوارا نہیں اس لئے وسوسے ڈالنا چھوڑ دے گا۔ یاد رکھو یہ شیطان وسوسے اس وجہ سے نہیں کہ اپنے نفس سے سوء ظن پیدا ہو اور تم معاصی سے بچنے لگو بلکہ یہ کم بخت پرانی دشمنی کی وجہ سے دل میں اس لئے وسوسے پیدا کرتا ہے تاکہ تم کو یاس ہو جائے پس کافر بن جاؤ۔ اس سے بھلائی کبھی متوقع نہیں

ہو سکتی حتیٰ کہ اگر یہ کوئی اچھا کام بھی کرتا ہے تو اس میں بھی برائی کا پہلو ضرور مضمر ہوتا ہے اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ایک شخص شیطان پر ہر روز ایک ہزار مرتبہ لعنت بھیجا کرتا تھا؛ ایک روز یہ دیوار کے نیچے سو رہا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہا جلدی اٹھو فوراً یہاں سے علیحدہ ہو جاؤ جیسے ہی وہ علیحدہ ہوا معاً دیوار گر پڑی؛ اس نے کہا آپ صاحب کون ہیں نام کیا ہے؛ سہ

چہ نامی کہ مولائے نام توام　　　　درم ناخریدہ غلام توام

اس نے کہا جب آپ کو معلوم ہو جائے گا؛ تو پھر احسان نہ مانو گے میرا نام نہ پوچھو؛ کہا نہیں ضرور نام بتلائیے کہا میرا نام ہے ابلیس جس پر ہر روز ہزار مرتبہ لعنت کیا کرتے ہو؛ اس نے کہا پھر تو تو میرا دشمن تھا؛ تو نے مجھ پر یہ احسان کیوں کیا؛ کہا خدا نہ کرے جو میں تجھ پر احسان کروں؛ میں نے تجھ کو ایک خیر سے روک دیا؛ کیوں کہ اگر وہ دیوار تجھ پر گرتی تو تو مر جاتا اور جو شخص ہدم الجدار سے مر جائے وہ شہید ہوتا ہے؛ اس لئے میں نے تجھ کو بیدار کر دیا تاکہ ایک نعمت عظمیٰ سے محروم رہے اور تجھ کو شہادت نصیب نہ ہو؛ مولانا رومیؒ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکایت لکھی ہے نہ معلوم کہاں نقل فرمائی ہے کہ ایک دفعہ حضرت معاویہؓ کو نماز کے لئے شیطان نے آکر بیدار کیا اور کہا حضرت صلوٰۃ تہجد سے فارغ ہو جایئے وقت جا رہا ہے آپ نے دریافت کیا؛ تو کون ہے کہا میں ابلیس ہوں فرمایا تو نے مجھ کو کیوں بیدار کیا کہا پرانے جذبہ کی وجہ سے بیدار کر دیا کیوں کہ میں بھی عابد تھا؛ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا نہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو؛ یہ صحابی تھے اس کی چال میں کب آنے والے تھے فرمایا بس بس کیوں بہکاتا ہے سچ سچ بتا میں تیری ایک نہیں سنوں گا۔ کہا حق یہ ہے کہ میں نے فلاں روز

آپ کی صلوٰۃ تہجد فوت کرادی تھی: اس پر آپ نے بجد تاسف وافسوس کی ساتھ آہ کی جس کی وجہ سے آپ کے درجات میں بہت ترقی ہوئی جو تہجد سے کبھی نہ ہوسکتی تھی اس لئے میں نے آج اول ہی سے بیدار کر دیا کہ آپ کو دوبارہ ایسی ترقی نہ ہو اور تہجد ہی تک درجہ رہے یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اٹھ بیٹھے سوئے نہیں اور تہجد میں مشغول ہو گئے: اگر کوئی جاہل ہوتا تو مخالفت شیطان کی بنا پر سو رہتا یہ محقق تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یافتہ تھے: حق بات سن کر عمل کرنے لگے تو حاصل یہ ہے کہ شیطان انسان کے پیچھے لگا ہوا ہے جب اسے موقعہ مل جاتا ہے تو نیش زنی کرتا ہے اس کا علاج مخالفت ہے پس جب یہ وسوسہ ڈالے اور محزون وغمگین کرنا چاہے تو زیادہ مسرور وخوش ہونا چاہیئے وہ ناامید ہو کر خود ہی تم کو چھوڑ دے گا:

خلاصہ یہ کہ وسوسہ کا مرض مضر نہیں بلکہ محمود ومرغوب ہے لیکن بعض لوگ شیطان کے دھوکہ میں آکر وسوسہ کو مرض سمجھ کر خود کشی کر لیتے ہیں

غلطیوں کا احساس

اسی طرح صدہا چیزیں اشتباہ والتباس کی ہیں: مثلاً تواضع وتذلل استغفار وتکبر جن کا میں بیان کر رہا ہوں ان میں بھی بعض اوقات التباس ہو جاتا ہے جس کے امتیاز کے لئے سالک کی رائے کافی نہیں بلکہ ضرورت ہے ایک شیخ کامل مبصر کی کہ مراحل سلوک میں جانچ پڑتال کرتا رہے جو غلطی محسوس ہو: اس کا ساتھ دفعیہ کرتا جائے: مگر شیخ کی تنبیہ کے نافع ہونے کی شرط یہ ہے طالب میں انقیاد ہو: جس کو وہ غلطی تبلا دے: طالب اس کو غلطی مان لے تاویل نہ کرے بخصوص علماء طلباء کو اس انقیاد اور تسلیم کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ان میں یہ مرض استنکاف اور تاویل کا زیادہ ہے چاہیئے

تو یہ تھا کہ علم کے بدولت ان میں یہ رذایل کم ہوتے کیوں کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں؛
هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ آجکل ان
امراض میں زیادہ تر مولوی صاحبان ہی مبتلا ہو رہے ہیں خصوصاً کبر میں کہ اپنی خطا اور
غلطی ماننے سے ان کو عار آتی ہے طالب علمی کی ابتدا سے تاویل و توجیہ کی عادت ہوتی
ہے ہر غلطی میں توجیہ کی پیچر لگا دیتے ہیں کبھی غلطی و خطا کا اقرار نہیں کرتے میرے پاس
جو لوگ طالب حق آتے ہیں؛ ان میں مولوی صاحبان بکثرت غلطیوں کی؛
تاویلیں کیا کرتے ہیں خطا کا اقرار کرتے ہوئے موت آتی ہے جہاں کسی امر خلاف شان
پر متنبہ کیا فوراً تاویل گھڑ دی میں تو کہہ دیتا ہوں جب تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو کہ میں
تو ایک بات کو مرض کہوں تم اسکو صحت بتلاتے ہو؛ تو یہاں آنے کی کیا حاجت تھی؛ گھر
بیٹھے تاویلوں توجیہوں سے اصلاح نفس کر لی ہوتی غرض میرا تجربہ و مشاہدہ ہے؛ کہ
عیب پر تنبیہ کرنے کے وقت مولوی صاحبان خطا پر زیادہ اصرار کرتے ہیں یہ کبھی توجیہ
سے نہیں چوکتے گویا ان کے اندر کوئی عیب ہی نہیں پایا جا سکتا بالکل بے عیب ہیں؛
میں یہ بیان کر رہا تھا کہ ہر شے اپنی حد تک پسندیدہ و مرغوب خاطر ہے جب افراط تفریط
سے کام لیا جائے گا؛ ہمیشہ غلطی میں مبتلا ہو گا؛ اور مبنی ایسی غلطی کا اکثر اشتباہ
بین الامرین ہوتا ہے و وصفوں میں تمیز نہ کرنے سے انسان کو غلطی ہوا کرتی ہے مثلاً
تکبر و استغنا میں التباس ہو کر کبھی تکبر کو استغنا سمجھا جاتا ہے اور گاہے استغنا کو تکبر
سمجھا جاتا ہے اسی طرح تذلل کو تواضع سمجھتے ہیں اور تواضع کو تذلل؛ اسراف کو سخاوت
و بالعکس حالانکہ ان میں دن رات کا فرق ہوتا ہے اور اس فرق کا زیادہ تر مدار تعلیم
شیخ و تنبیہ شیخ پر ہے خود بہت کم محسوس ہوا کرتا ہے اس لئے میں نے بقدر ضرورت باب

تواضع کی حقیقت بتلادی باقی پورا انکشاف کسی کی صحبت میں رہ کر ہو سکتا ہے ؛ زیادہ تفصیل وتطویل کی احتیاج نہیں اس وقت اتنا سمجھ لو کہ جناب کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دو اخلاق ذمیمہ سے منع فرمایا ہے ایک تکبر دوسرے تذلل کہ ان سے بچو یہ دونوں منہی عنہ ہیں ؛ اور دو اخلاق حمیدہ کا حکم فرمایا ہے ایک تواضع دوسرے استغنار کہ ان کو اختیار کرو ؛ یہ دونوں ماموربہ ہیں البتہ امر ونہی کا درجہ متعین نہیں ہوا کہ امر وجوب کے واسطے یا استحباب وغیرہ کیلئے ہے ایسے ہی نہی حرمت کے لئے ہے یا کراہت وغیرہ کے لئے ہے تو درجہ کی تعیین دوسرے نصوص و دلائل سے ہو جائے گی ؛ اب تو ان دلائل کو سنیئے ؛

تکبر حرام ہے

حق تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ فرماتے ہیں ان اللہ لا یحب کل مختال فخور نیز صحیح مسلم میں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کے قلب میں رائی برابر تکبر ہو گا وہ جنت میں نہ جائے گا. حق تعالیٰ نے حدیث قدسی میں فرمایا ہے ؛ الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری فمن نازعنی فیہا قصمتہ ان نصوص سے معلوم ہو گیا کہ تکبر حرام ہے اب اس کے مقابلے کو لے لیجئے جب تکبر نہی حرمت کے لئے ہے جیسا کہ ترتب وعید سے معلوم ہوتا ہے تو اس کی ضد کا امر وجوب کے لئے ہو گا ؛ کیوں کہ جیسے امر بالشئی مستلزم ہوتا ہے اس کی ضد سے نہی کو اسی طرح نہی الشئی مستلزم ہے اس کی ضد کے امر کو اور اصولی قاعدہ ہے کہ ایک ضد کے امر کا جو درجہ ہو گا دوسری کی نہی کا بھی وہی درجہ ہو گا ؛ اور جو درجہ ایک ضد کی نہی کا ہو گا ؛ وہی درجہ دوسری ضد کے امر کا ہو گا ؛ پس تکبر کی ضد ہے تواضع اور تکبر کی نہی حرمت کے لئے ہے تو اس کی حرمت سے تواضع

کا وجوب ثابت ہو گیا؛ اب رہا استغفار و تذلل تو اس کی تعیین درجہ ایک چھوٹے سے مقدمہ کے ملانے سے ہو جائے گی؛ یہ دیکھنا چاہیئے کہ تذلل کو کیوں اختیار کیا جاتا ہے اس سے مقصود کیا ہوتا ہے؛

حقیقت مال و جاہ

سو ظاہر ہے کہ تذلل سے تحصیل دنیا اور تحصیل مال مقصود ہوتا ہے چوں کہ اس شخص کو مال کی جانب رغبت ہے؛ اس لیئے اس کے مقابلے میں عزت کو بھی ہیچ سمجھا جاتا ہے آبرو کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی پس تذلل کا سبب حب دنیا اور حب مال ہے اور نصوص سے ثابت ہے کہ یہ سب سے بڑھ کر گناہ اور سب خطاؤں کی جڑ ہے حضرت فخر بنی آدم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں؛ حب الدنیا راس کل خطیئۃ کہ تمام مفاسد کا منشا حب دنیا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی چیز حرام ہو گی پس جو شئے اس سے پیدا ہو وہ بھی اس کے حکم میں ہو گی؛ کیوں کہ ناشی عن الشئی کو شئی ہی کا حکم دیا جایا کرتا ہے گناہ کا بچہ گناہ ہی گا؛ پس اس سے تذلل کی حرمت ثابت ہو گئی اور تذلل کی حرمت سے اس کی ضد یعنی استغفار کا وجوب ثابت ہو گیا؛ تکبر اور تذلل میں حب دنیا مشترک ہے یعنی تکبر میں تو جاہ مطلوب ہے متکبر کا یہی مقصود ہوتا ہے کہ جاہ بڑھ جائے وہ بھی دنیا ہے اور تذلل سے مال متاع مقصود ہوتا ہے؛ اسی لیئے لوگوں کی سخت سست سنتے ہیں خوشامد کرتے ہیں ہر قسم کی ذلت برداشت کرتے ہیں وہ بھی دنیا ہے حالانکہ اذلال النفس منہی عنہ ہے اس لیئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمادیا ہے لا یسئلون الناس الحافا یعنی مانگنے میں اصرار و ابرام نہ کرو لوگوں پر بوجھ نہ ڈالو دیں دیدیں اور نہ دیں تو کچھ زور نہیں اجارہ نہیں آجکل کے مدعی درویشوں کو دیکھئے پیٹ کے لیئے الحاف

کو گوارا کرتے ہیں اکثر لوگ ان کے سوال سے خواہ تہذیب سے ہو یا بے تہذیبی سے
تنگ ہوتے ہیں یہی الحاف ہے میرے خیال میں اگر حاجت بھی ہو تو صلحاء غرباء
سے سوال کرلے اور ان رؤسا امرا کے تو پاس بھی نہ پھٹکے ان سے تو دور ہی رہنا
مصلحت ہے ان میں محض ظاہری تہذیب ہوتی ہے ورنہ دل میں حقیر سمجھتے ہیں
ان کو تو چھوڑنا چاہیئے۔ البتہ اگر ان سے ملنے میں کوئی شرعی مصلحت ہو اور وہ واقع
میں مصلحت ہو تسویل نفس نہ ہو تو ملنے کا مضائقہ نہیں بلکہ اگر ذلت کا احتمال نہ ہو
تو ترغیب چندہ میں بھی حرج نہیں غرض یہ کہ ذل حب مال سے ہوتا ہے اور تکبر
حب جاہ سے ہوتا ہے اور دونوں زہر قاتل ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے
ہیں: ما ذئبان جائعان ارسلا فی قطیع غنم الحدیث کہ اگر دو بھوکے بھیڑیئے
بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیئے جائیں تو وہ بکریوں کو اتنا ضرر نہیں پہنچاتے جتنا
ضرر انسان کو حب مال و حب جاہ پہنچاتے ہیں ۔ ہم لوگ بکثرت ان دونوں مرضوں
میں مبتلا ہیں اسی وجہ سے اس مضمون کو اختیار کیا گیا ہے اور عوام ہی کی کیا
شکایت اس مرض میں بکثرت خواص کو بھی ابتلاء عام ہے عوام الناس کا مبتلا
ہونا زیادہ موجب تعجب نہیں کیوں کہ اس میں رادع کم ہوتا ہے موانع قریب
قریب مفقود ہوتے ہیں بلکہ سب شرائط موجبہ امراض پائے جاتے ہیں علم سے
بھی بے بہرہ ہوتے ہیں ، صحبت سے بھی محروم ہوتے ہیں تعجب تو ان خواص سے
ہے کہ وہ باوجود علم کے ان امراض میں کیوں کر مبتلا ہیں خصوصاً ان لوگوں سے
جو ابھی مخدومیت کی شان کو بھی نہیں پہنچتے ابھی صاحب کمال کہلانے کے
بھی مستحق نہیں تکبر کا کوئی داعی ابھی تک ان میں نہیں بلکہ موانع موجود ہے۔

موانع کی قوت کے مقابلہ میں کسی داعی کو قوت نہیں ہے اگر کوئی مخدوم ہو تو
کسی نہ کسی درجہ میں وہاں داعی تو موجود ہے گو مانع بھی قوی موجود ہے لیکن
خیر ہے یہاں مخدوم بھی نہیں پھر ان میں تکبر کیسا؛ خصوصاً طلبہ تو اس مرض میں
زیادہ مبتلا پائے جاتے ہیں یہی خصوصیت ہے ان ہی کی اصلاح کے متعلق
بیان کرتا ہوں کیوں کہ انہی کی فرمائش سے میں یہ وعظ کر رہا ہوں چنداں وہ احق
بالعلاج ہیں دوسرے بالتبع شامل ہیں جو شخص اپنے مکان پر کسی حکیم کو بلا کے
کے لائے اس کا علاج ضروری ہے؛ ہمسایہ کا حق اس وقت کچھ نہیں اس کو
حاجت ہو تو دوبارہ بلا دے لیکن اگر وہ کوئی نسخہ ہمسایہ کو بھی لکھ دے تو اس
کی عنایت اور اس کی جانب سے تبرع ہے پس میں طلبہ کی عامتہ الورود غلطی پر
متنبہ کرتا ہوں لیکن باوجود اس کے بہت ادب کے ساتھ عرض کرتا ہوں کیوں
کہ یہ لوگ مجھ سے بڑے صاحب رتبہ ہیں واللہ میں ہر طالب علم کا اپنے کو خادم
سمجھتا ہوں چوں کہ انہوں نے خود ایک خدمت کے لیئے مجھے بلایا ہے اس لیئے
میں اپنا کام کیئے دیتا ہوں؛ گو وہ بعد میں تاویلیں توجیہیں کرتے پھریں تاویل
اور توجیہ سے شئے کی حقیقت نہیں بدلا کرتی اس کی ماہیت میں کچھ فرق نہیں
ہوتا محض من سمجھوتی ہی ہوتی ہے اگر کسی مضر شئے کی تاویل کر لو تو اس سے اس
کی مضرت نہیں جاتی رہے گی اگر سنکھیا کی توجیہ کر لو کہ یہ تو نمک ہے یا مصری ہے
تو اس کی سمیت نہیں باطل ہو جائے گی تاویل کر کے مخلوق کو دھوکہ دے سکتا
ہے لیکن حق تعالیٰ کے علم کو تو معاذ اللہ نہیں بدل سکتا مولانا رومی فرماتے ہیں

کہ گہے آہے دروغے میزنی   از برائے مسکہ دوغے میزنی

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام ۔۔۔ در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست ۔۔۔ با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کار با او راست باید داشتن ۔۔۔ رایتِ اخلاص و صدق افراشتن

شرعی وضع کی ضرورت

بھائیو ان تاویلات و توجیہات کو چھوڑنا چاہیئے ؛ صدق و خلوص سے کام لینا چاہیے اہلِ رسم کے اتباع کی حاجت نہیں ہے اپنا نیک و بد خود سمجھنا چاہیئے آپ لوگ اہلِ علم ہیں ؛ جاہل و عوام نہیں ہیں العاقل تکفیہ الاشارہ اگر ہم لوگ فکر صحیح سے کام لیں تو دیکھیں گے کہ ہم لوگوں کی ضمیر میں ضرور تفاخر ہے ؛ الاماشاء اللہ کوئی فرد ایسا ہوگا جو اس وبار عام میں مبتلا نہ ہو ؛ رفتار میں تفاخر گفتار میں تفاخر نشست و برخاست میں تفاخر معاشرت و معاملہ میں تفاخر خوراک پوشاک میں تفاخر محض تفاخر دریار کے لئے قیمتی گراں بہا لباس پہنا جاتا ہے ؛ روٹی تو کھادیں مسجدوں کی خرچ کریں زکوٰۃ وغیرہ کا مال مگر لباس قیمتی ہی ہوگا ؛ گو قرض لے کر ہو مگر شان میں فرق نہ آئے یہ تو اچھا خاصا لباس زور ہے ہر کپڑے میں یکتائی سوجھتی ہے رضائی کے لئے چھینٹ لیں گے ؛ وہ جو محلہ بھر میں بھی کسی کے پاس نہ ہو ؛ بلکہ شہر بھر میں بھی کسی کے پاس نہ ہو ؛ اور گو ہو چھینٹ لیکن مخمل نما ہو ؛ پھر مشورے ہوتے ہیں ؛ کہ اسکو گوٹ کیسی خوبصورت رہے گی ؛ مغزی کیسی خوشنما معلوم ہو گی استر کیسا ہونا چاہیئے ؛ کرتہ ہے وہ ایسا ہی ٹوپی ہے ؛ وہ ایسی ہی یہ تو وہ گ ہیں جو اپنی شان کی موافق شرعی لباس پہنتے ہیں ؛ وضع علمار کی اختیار کرتے ہیں مگر اس میں تفاخر اور بعض حضرات طلبہ عزیز بر آن نئے فیشن پر مٹے ہوئے ہیں ؛ ٹوپی دیکھیے تو ترکی

پاجامہ، پتلون، اچکن، شیروانی، جوتا ہمیشہ گرگابی، کالر، نکٹائی لگی ہوئی ہے جو کہ فی الحقیقت ناک کٹائی ہے نام ہی بڑا خوبصورت ہے، مگر لوگ ان پر مرے ہوئے ہیں، بعض دفعہ لباس قیمتی نہیں ہوتا لیکن اس کو اس طرز سے تراشا جاتا ہے اور ایسے طور پر سلوایا جاتا ہے جس سے بہت قیمتی معلوم ہو، دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ طالب علم نہیں کوئی نواب صاحب ہیں، یا کوئی امیرزادے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ میلے کچیلے رہو، اپنے لباس و بدن کو پاک و صاف نہ رکھو بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اپنی حیثیت سے نہ بڑھو جتنی چادر ہے اتنے ہی پیر پھیلاؤ اپنی وسعت کا خیال رکھو علمی و شرعی وضع کو نہ چھوڑو کتنی شرم کی بات ہے کہ تم عالم ہو کر جاہلوں کا اتباع کرو، ان کی تقلید کرو چاہیئے تو یہ تھا کہ جاہل تمہاری تقلید کرتے نہ کہ وہ الٹا امام و مقتدا بن جائیں یوں تاویلیں تو جتنی کر کے نہ مانو تو اس کا علاج تو کچھ نہیں ذرا تم غور کرو خوض و تاویل سے کام تو لو، کہ تم نے یہ طریقہ کہاں سے اخذ کیا ہے، ظاہر ہے کہ تم نے اس کو اہل باطل سے سیکھا ہے اس لباس میں کفار کو اپنا پیشوا بنایا ہے اس سے مقصد بجز تفاخر و ریا، وغیرہ کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے علاوہ ازیں جس وضع کو تم نے دوسروں سے لیا ہے وہ تمہارے تحمل سے بھی باہر ہے اور عقلاً و شرعاً انسان کو وہ کام کرنا چاہیے جس کی برداشت و تحمل کر سکے، تحمل بقدر تحمل ہونا چاہیئے، پس تم کو ایک معیار و قاعدہ بتاتا ہوں اس سے اس وضع کے جواز و عدم جواز کا اندازہ کر لیا کرو، کہ قیمتی و خوش وضع لباس پہننے کے بعد تمہارے قلب میں کچھ تغیر و تبدل ہوتا ہے کچھ عجب و فخر معلوم ہوتا ہے یا نہیں اگر تمہاری حالت ویسے ہی ہے، جیسے پہلے تھی بے شک قیمتی و خوش وضع لباس میں کچھ حرج

نہیں ہے بشرطیکہ اور کوئی مانع شرعی نہ ہو اور اگر کچھ خودداری و عجب کی بو آئے تو حرام باقی وضع ہر حال میں حرام رہے گی جو کفار سے اخذ کی گئی ہے کیوں کہ اس میں منشا حرمت صرف تفاخر نہیں بلکہ تشبہ بھی علت ہے پس صرف تفاخر کی نفی سے حرمت کا انتفا نہ ہوگا، جب کہ دوسری علت باقی رہے نیز ہر وقت لباس کی فکر ویسے بھی تو مضر ہے جو شخص ہر وقت اسی دھن میں رہتا ہے وہ کسی کام کا نہیں رہتا ایک حکیم فرماتے ہیں ؎

عاقبت ساز دترا از دین بری　　　　این تن آرائی واین تن پروری

حضرات آپ کا کمال آپ کا جمال تو صرف علم و عمل ہے اس کا خیال رکھیئے اس میں مشغول ہو جایئے اس لباس سے زینت حاصل کیجیئے۔ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون آپ کو علم و عمل کے ہوتے ہوئے کسی دوسری شئے کی ایسی احتیاج نہیں ہے، جس کے لئے تشویش اور ذلت میں مبتلا ہو، اس کا حصول تمام اشیاء سے مستغنی و بے نیاز بنا دیتا ہے کسی امر کی ضرورت نہیں رہتی ؎

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است　　　　بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روی زیبا را

نباشد اہل باطن در پئے آرایش ظاہر　　　　بہ نقاش احتیاجے نیست دیوار گلستان را

پس ان زنانے پن کی زینت کو چھوڑنا چاہیئے سادگی سے بود و باش کرنا چاہیئے ؎

غرض از جامہ دفع حر و برد است　　　　ندارد میل زینت ہر کہ مرد است

علامت ایمان حدیث میں ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے البذاذة من الایمان یعنی سادگی سے رہنا ایمان کی علامت ہے آپ لوگ مقتدا ہیں نائب رسول ہیں آپ اگر اس فیشن کے لباس و وضع کو اختیار کریں گے تو عوام کا کیا حال ہو گا، وہ تو اچھے خاصے انگریز ہی ہو جائیں گے:

؎ بہ نیم بیضہ کہ سلطان ستم روا دارد　　زنند لشکریانش ہزار مرغ بسیخ

عوام اس سے غفلت میں پڑ جائیں گے اور ان کو آپ پر حق احتجاج حاصل ہوگا،
اور اس سب کا وبال آپ لوگوں کی گردن پر ہوگا، دیکھ لیجئے احادیث میں قصہ آتا ہے
کہ کوئی خلیفہ باریک کپڑے پہن کر خطبہ جمعہ کو آئے، ایک صحابی نے فوراً اعتراض
کیا کہ انظر والی امیر نا ھذا یلبس لباس الفساق دیکھیئے خلیفۃ المسلمین کو محض
باریک کپڑے پہنے پر جو اس وقت شعار اوباش کا تھا مجمع عام میں کیسا لتاڑا گیا حدیث
شریف میں جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من تشبہ بقوم فھو منھم
اور ظاہر ہے کہ اگر آپ کا طریقہ زینت یا فیشن کا اہل کفر یا اہل غفلت سے ماخوذ ہوگا
تو آپ بھی ان ہی میں شمار ہوں گے، طلبا کے لئے یہ لباس ہرگز شایان نہیں، اس
سے علم کی ناشکری بے قدری ہوتی ہے خصوصاً طالب علمی کی حالت میں تو بالکل فقرا
ومساکین کی طرح سادہ لباس سادہ مزاج رہنا چاہیئے میں قیمتی لباس سے منع نہیں کرتا
خدا تعالیٰ نے جس کو دیا ہے وہ پہنے میں ترفع وتفاخر سے روکتا ہوں، باقی جن لوگوں
میں یہ تفاخر وبڑائی کا مادہ نہ ہو، وہ کیسا ہی بڑھیا لباس پہنیں جب بھی ان کی طالب
علمی کی شان میں ضرر رساں نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ بڑھیا لباس میں بھی ایسے اثول جلول
رہتے ہیں کہ صورت سے آثار طالب علمی صاف نظر آتے ہیں، اور جو لوگ زینت ووضع
کی فکر میں رہتے ہیں یا نئے فیشن کو اختیار کرتے ہیں ان کی صورت پر طالب علمی کی شان
نہیں ہوتی بلکہ افسوس سے کہا جاتا ہے کہ آجکل اس طرز ووضع کو اس لئے اختیار کیا
جاتا ہے کہ کہیں لوگ طالب علم نہ سمجھ لیں گویا یہ چاہتے ہیں کہ عوام ہم کو زمرۂ طلبہ
سے علیحدہ سمجھیں یا ایک شاندار وممتاز طالب علم تصور کریں اور تاویل یہ کرتے ہیں کہ

جہلا اور عوام کی نظروں میں ذلیل نہ ہوں؛ صاحبو! ذرا گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو؛ کہ یہ کیسی عزت ہے جس کی عزت ہونے پر اہلِ جاہل کی نظر سے استدلال کیا جاتا ہے اس جہالت کا بھی کوئی ٹھکانا ہے عزت تو وہ ہے، جس کو اہلِ نظر عزت کہیں اہلِ علم کو چاہیئے کہ اپنے سلف صالحین اہلِ علم کا اتباع کریں ان کی پیروی کو اختیار کر کے اسی میں فلاحِ دارین تصور کریں یہ آپ کے بچپن کا زمانہ ہے؛ اب جس طرح چاہو نفس کو سدھار سکتے ہو، پھر اصلاح مشکل ہو گی؛ ؎

والنفس کالطفل ان تهمله شب علیٰ حب الرضاع وان تفطمه ینفطم

اپنی وضع قدیم کو نہ چھوڑو غربا، مساکین واہل اللہ کے طرز پر رہو اگر تم جہلا کی نظروں میں اس سے ذلیل بھی ہو تو اس پر فخر کرو یہی ذلت عزت ہے اول تو ذلیل ہوتے نہیں عوام میں بھی اسی عالم کی وقعت ہوتی ہے جو سلف کی طرز پر ہو؛ لیکن اگر کوئی ذلیل بھی سمجھے تو تم یہ جواب دو؛ ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم — مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم
او ست دیوانہ کہ دیوانہ نشد — مر عسس را دید و در خانہ نشد

نمعلوم کس وجہ سے آپ لوگ اپنی وضع بدلتے ہیں؛ ہر طرز ہر طریقہ میں کیوں رد و بدل کر لیا ہے؛ خوب دھڑلے سے انگریزی لباس پہنتے ہیں؛ معلوم ہوتا ہے! کہ ابھی لندن سے آئے ہیں اور طرہ یہ ہے کہ انگریزی کا ایک حرف بھی نہ جانتے ہو؛ مگر لباس سے صاحب بہادر بلکہ سانپ بہادر ہی معلوم ہوں گے؛ میرے خیال میں یہ تو عوام میں بھی ذلت ہی ہے سلف صالحین کا لباس خواص میں تو بالاتفاق وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے لیکن عوام میں بھی اسی کو عزت کی نظروں میں دیکھا جاتا ہے؛

اور صورت تسلیم اگر عوام اُس ثقہ لباس میں آپ کو ذلیل سمجھتے ہیں تو اس نئے لباس میں عوام خواص دونوں آپ کو ذلیل سمجھتے ہیں دونوں طرف سے طعن و تشنیع ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ سانپ بنے پھرتے ہیں اور نام کو انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں جانتے اس سے بڑھ کر ستم یہ ہے کہ تکبر لباس ہی میں تو تھا ہی دل میں بھی تکبر گھسا ہوا ہے چنانچہ کبھی اپنی خطا کے مقر نہیں ہوتے قصور کا اعتراف نہیں کرتے تا ذلیل کو تیار ہو جاتے ہیں ہر بات میں تاویلیں یعنی ٹھنسا ہوا ہے حالانکہ ہر کلامیکہ محتاج بعنی باشد لا یعنی است۔ ہر امر میں کمی موجود ہے اچکن میں بھی لاَن جوتا میں بھی لاَن کرتہ میں بھی بھی لاَن ٹوپی میں بھی لاَن لباس کیا ہوا لاَن کا مجموعہ ہو گیا جو نہ اوڑھنے کا نہ بچھانے کا۔

طلب کی شان اے صاحبو! ان تکلفات بارِدہ کو چھوڑو تم لوگ طالب علم ہو! تو طلب کی شان کو نبھاؤ، طلب کے ساتھ توجہ دو چیزوں کی طرف نہیں ہوا کرتی ہے؛ ان النفس لا تتوجه الی الشیئین فی آن واحد ورنہ اسی لباس و باس میں پھنسے رہ جاؤ گے اور مقصود اصل سے ہاتھ دھو بیٹھو گے اس نئی وضع قطع میں کیا دھرا ہے کوئی سی سلطنت مل جاتی ہے سلف صالحین کی وضع اختیار کرو، یہی کمال ہے یہی جمال ہے یہی عزت ہے یہی حرمت ہے گراں قیمت لباس پہننا شرعاً کمال ہے ہی نہیں؛ دیکھئے تواریخ میں جہاں سلاطین کے حالات لکھے ہیں ان کی تعریف کرتے ہیں تو یہ کسی جگہ نہیں لکھتے کہ فلاں بادشاہ بہت خوش لباس تھا بہت قیمتی کپڑا پہنا کرتا تھا؛ بلکہ جو بادشاہ موٹے اور کم قیمت کپڑے استعمال کرتا تھا، اس کا خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے اور خاص مدائح میں سے شمار ہوتا ہے جہاں اس کے کارنامے وقعت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں سادگی کا بھی احترام

کیا جاتا ہے اور یہ اس کی اول نمبر کے محاسن میں سے سمجھا جاتا ہے شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

نشنیدم کہ فرمانرہی دادگر — قبا داشتے ہر دو رو آستر

دیکھئے چونکہ اس کی قبا میں دونوں جانب استر تھا، اس لئے شیخ نے مدح کی اور کسی فرماں روا کی یہ مدح نہیں کی، کہ دیباج پہنتا تھا یا اطلس پہنتا تھا علاوہ ازیں کہ راحت و آرام بھی اسی سلف کے لباس میں ہے جہاں چاہا بیٹھ گئے زمین پر بیٹھ گئے تب بھی کچھ حرج نہیں، فرش پر بیٹھ گئے تب کچھ وقت نہیں غرض ہر طرح سے آرام ہوتا ہے اور تکلف کے لباس میں ہر حالت میں تکلیف ہوتی ہے بعض لباس تو ایسے ہیں، کہ ان کو پہن کر آدمی کرسی اور تخت کے سوا کسی چیز پر بیٹھ ہی نہیں سکتا؛ اور اگر فرش اور زمین پر بیٹھنا بھی ہے، تو بہت مصیبت سے پھر جن لوگوں کو لباس کی زینت کا اہتمام ہے ان کو ہر وقت اسی کا دھیان رہتا ہے! حتیٰ کہ نماز میں بھی یہی خیال دامن گیر ہوتا ہے دامن سمیٹ سمیٹ کر نماز پڑھتے ہیں مبادا کہیں خاک نہ لگ جائے، کہیں دھول وغیرہ میں نہ آلودہ ہو جائے؛ جماعت سے نماز پڑھیں گے تو سجدہ سے سب کے بعد اٹھیں گے تاکہ اچکن شریف کسی کے نوائے کثیف کے نیچے نہ آ جائے، نماز میں بھی یہی مشغلہ ہے جس سے ساری نماز لباس ہی ہو گئی؛ حالانکہ چاہیے تھا؛ اس کا عکس کہ لباس بھی نماز ہو جاتا اگر کوئی مقام صاف ستھرا ہو تو بیٹھ جائیں گے ورنہ کھڑے ہیں: اللہ میاں نے یہ اس لباس کی سزا دی ہے ایک صاحب کانپور میں میرے پاس آئے کوٹ پتلون ڈاٹے ہوئے تھے، جو شخص پتلون پہنے ہوئے ہو وہ کرسی وغیرہ پر تو بآسانی بیٹھ سکتا ہے زمین پر اس سے نہیں بیٹھا جاتا ہم غریب لوگ ملاں آدمی ہمارے پاس کرسی وغیرہ کہاں تھی ہم فرش پر بیٹھے تھے وہ بچارے بیٹھ

بھی نہ سکتے تھے؛ اور لحاظ و شرم کی وجہ سے کھڑے کھڑے گفتگو بھی نہ کر سکتے تھے مجبور ہو کر بدن کو تول کر اور ہاتھ کی چھڑی پر سہارا دے کر دھب سے گر پڑے؛ مجھے دل میں بہت ہنسی آئی پھر اٹھنے میں ان کو اس سے بھی زیادہ مصیبت ہوئی اگر اسی کا نام آزادی ہے تو ایسی آزادی ہماری قید پر ہزار مرتبہ قربان ہے انا للہ وانا الیہ راجعون

ایک شخص نے کیا اچھی بات کہی کہ لباس تو خادم مملوک ہے مخدوم و مالک نہیں ہے جب اسی کی دھن میں رہے تو وہ خادم کہاں رہا؛ مخدوم بنگیا مطلب موضوع لازم آگیا یہ تو ظاہری خرابی ہے اور شرعی خرابی یہ ہے کہ اس لباس سے کبر پیدا ہوتا ہے اور جب کبھی لباس سے کسی قسم کی ظاہری یا باطنی شرعی مفسدہ لازم آئے وہ نہی میں داخل اور حرمت کے حکم سے موصوف ہو جائے گا؛

کبر و عجب کا علاج

اس صورت میں اگر کبر و عجب کا علاج کرنا چاہو جو کہ ضروری ہے اور اس کی علت تھی "تکلف فی اللباس" تو اس کا علاج بھی ہے کہ اس کو بالکلیہ ترک کر دو؛ چند روز اس سے پرہیز کرو؛ اس کا نام تک نہ لو کہنے پر عمل کرو؛ اپنی رائے سے علاج نہیں ہوا کرتا ہے کسی طبیب حاذق سے مشورہ کرو؛ اطباء بھی اپنا خود علاج نہیں کر سکتے تم تو کس شمار میں ہو؛ یاد رکھو اس صورت میں عجب کے علاج یہ بغیر اس لباس کے ترک کی قدرت نہ ہوگی اگر اپنے کو صحیح سالم رکھنا پسند کرتے ہو تو اس آفت سے فوراً دست بردار ہو جاؤ، اور اگر یہ چاہو کہ لباس بھی یہی رہے اور عجب بھی جاتا رہے تو یہ غیر ممکن ہے اور اس شعر کا مصداق ہے سہ

درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردہ — بازمیگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

اگر کوئی معالج اپنی ناتجربہ کاری سے اس طریقہ کو تجویز کر چکا تو ہم یہی کہہ دیں گے

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ؎ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

حضرت آپ کو تو یہ تعلیم دی گئی ہے دع ما یریبك الی ما لایریبك کہ امور مشکوکہ مشتبہ سے احتراز کر کے امور یقینیہ کو اختیار کرو ، جن میں کسی مفسدہ کا شبہ بھی نہ ہو فرماتے ہیں ۔ لایکمل ورع المؤمن حتی یدع ما لاباس بہ حذرا مما بہ باس او کما قال یعنی انسان محرمات سے جب ہی اجتناب کر سکتا ہے متشبہات سے بھی اجتناب کرے

تقویٰ کی ضرورت

یہی ہے ورع کامل اور یہی ہے اول درجہ کا تقویٰ اس کو اختیار کیجئے اگر آپ لباس میں تاویلیں اور توجیہیں کر کے اس کو جائز بھی کر لیں ، تب بھی اس کے مشتبہ ہونے میں تو کلام نہیں پھر تم امر مشتبہ کو کیوں اختیار کرتے ہو ، صاحبو ! آپ اپنے سلف صالحین کے کارنامے دیکھیے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے ایک دفعہ ایک کرتہ پہنا جو آپ کو اچھا معلوم ہوا نفس کو اس سے حظ آنے لگا ، آپ نے مقراض لے کر اس کی تھوڑی تھوڑی آستینیں کاٹ ڈالیں تاکہ بار زیب ہو جائے اور نفس کو حظ نہ آئے اگر اور بھی کوئی خرابی نہ ہو تو اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ یہ نئی وضع قطع محض حظ نفس کے لئے اختیار کرتے ہیں ، اور آپ کے اسلاف حظ نفس سے بھی پرہیز کرتے ہیں حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں عیسائیوں نے آپ کو بیت المقدس کی طرف بلایا ، آپ معمولی لباس میں اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لے گئے اور تشریف اس لئے لے گئے ، کہ نصاریٰ نے کہا تھا کہ ہماری کتابوں میں فاتح بیت المقدس کا حلیہ موجود ہے اگر خلیفہ اسلام کا وہی حلیہ ہے تو ہم بدون جنگ کے شہر کھول دیں گے ورنہ اس کو کوئی فتح نہیں کر سکتا ، چونکہ حضرت عمرؓ کی تشریف لے جانے میں بدون

قتل و قتال کے شہر فتح ہوتا تھا، اس لئے تشریف لے گئے وہاں پہنچ کر لوگوں نے عرض کیا کہ آپ خلیفہ اور سلطان ہو کر پیش ہوں گے، گھوڑی پر سوار ہو جائیں، اور عمدہ لباس پہن لیجئے، تاکہ ان کی نظر میں عزت اور وقعت ہو، آپ نے فی البدیہہ فرمایا، نحن قوم اعزنا الله بالاسلام کہ ہم ایسی جماعت ہیں جن کو حق تعالیٰ نے اسلام سے عزت دی ہے جس سے دوسری عزتیں بلکہ ہیچ ہو گئی ہیں مگر آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اصرار سے رائے کو قبول فرما لیا تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہو، قبول فرمانے کے بعد لباس کی تلاش ہوئی کہ دوسرا جوڑا تبدیل کریں، اب وہ لباس کہاں سے آئے خلیفہ کے پاس کپڑوں کی گٹھری ہی نہ تھی، صاحبو! خیر یہ تو وہ جلیل القدر صحابی تھے جن سے شیطان بھی بچ کر نکلتا تھا، جن کی زبان پر حق تھا اگر ان کے پاس گٹھری نہ تھی تو کچھ عجب نہیں، ہمارے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس بھی کپڑوں کی گٹھری نہ تھی، نہ کوئی ٹرنک بکس تھا ایک مرتبہ کسی شخص نے مولانا کی خدمت میں چند ٹوپیاں بھیجیں آپ نے ان کو تقسیم کرنا شروع کر دیا صاحبزادہ نے والدہ صاحبہ کی وساطت سے ایک ٹوپی مانگ لی، خود نہیں کہا فرمایا ہاں تو بھی ایسی ٹوپی پہنے گا، ایسا دماغ بگڑا ہے اب یہ تکلف سوجھے گا، دیکھ تو میں کیسی ٹوپی پہنتا ہوں اور ان کے کپڑوں کی گٹھری دیکھی، اتفاق سے صاحبزادے کی گٹھری بھی بھڑکدار نکلی بس آگ بگولہ ہو گئے کہ ادھر اس بھڑکدار گٹھری میں آپ کا لباس رکھا ہوا تھا، یوں کپڑے تہہ کئے ہیں، یہ اچکن بھی تہہ ہوا رکھا ہے، غرض سب کپڑوں کو کھول کھول صحن میں پھینک دیا، تو جب متبعین کی یہ حالت ہے تو مقتداؤں کی حالت سے کیا تعجب، غرض حضرت خلیفہ کے پاس تو لباس ملا نہیں ایک خوش وضع جوڑا مستعار لیا گیا

اور آپ اسے پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر چلے ایک دو قدم ہی چلے تھے کہ فوراً اتر پڑے کیوں کہ اس لباس اور اس سواری میں نفس کو کچھ حظ آنے لگا تھا اور نظر اپنے اوپر پڑنے لگی تھی، پس سچ ہے ؎

بر دل سالک ہزاران غم بود | گر ز باغ دل خلالے کم بود

اور کہتے ہیں ؎

بہر چہ از دوست وامانی چہ کفراں حرف وچہ ایماں
بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

اور فرمایا تم نے عمرؓ کو ہلاک ہی کر دیا ہوتا، لاؤ میرا پرانا لباس اور اس جنجال کو مجھ سے دور کرو، میں اسی عاریتی لباس کو نہیں پہنتا ؎

کہن خرقہ خویش پیراستن | بہ از جامہ عاریت خواستن

بس وہی لباس پہن اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لے چلے، اس میں دینی نفع تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کے مقبول ہوئے اور دنیاوی فائدہ یہ ہوا کہ وہاں نصاریٰ کو اپنی کتابوں کی پیشن گوئی سے اس کی بھی اطلاع تھی، خلیفہ کس شان سے آئیں گے چنانچہ وہ دور سے دیکھتے ہی پہچان گئے ورنہ وہ اس وضع کو دیکھ کر سمجھتے بھی نا کہ خلیفہ کون ہیں، میں آپ لوگوں کو ایک ضابطہ کلیہ بتائے دیتا ہوں اس کو یاد رکھو اور اپنے ہر طرز کو اس معیار پر جانچ لیا کرو، یاد رکھو جس وقت تم اپنی نگاہ میں بھلے معلوم ہو اس وقت سمجھ لو تم حق تعالیٰ کی نظر میں برے ہو، کسی کمال سے کسی جمال سے کسی علمی تقریر تحریر سے جب تم کو اپنے اندر حسن ظاہر ہو، اس وقت حق تعالیٰ کے نزدیک تمہارے اندر قبیح یہی پندار اور خود بینی ہے اسی خود بینی کے باب میں ایک صاحب حال اور

صاحب فن فرماتے ہیں ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست — کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

احادیث میں اعجاب کل ذی رائے برأیہ خود رائی کی سخت مذمت وارد ہے؛ اور حضورؐ نے جو عجب کو مذموم فرمایا ہے اس کا راز یہی ہے کہ عجب و خود بینی مقدمہ ہے کبر کا کیونکہ انسان عجب سے اول تو اپنے نفس کو جمیل و حسین دیکھتا ہے بعد میں اوروں کو ذلیل سمجھنے لگتا ہے یہی کبر ہے اور مقدمات شئے کے لئے بھی شئے ہی کا حکم ہوا کرتا ہے لہٰذا عجب علاوہ مستقل نصوص کے خود اس دلیل سے بھی حرام ہے اب اس لباس کو پہننے والے سوچ لیں، کہ یہ لباس پہن کر ان کو عجب ہوتا ہے یا نہیں، اب اختیار ہے تاویلیں کرتے رہیں، ہمارا کام بتانا تھا، بتا دیا؛ بر رسولاں بلاغ باشد و بس وہ خود جانتے ہیں اہل علم ہیں، بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ

یہ تو لباس میں تفاخر تھا؛

مغرب کی تقلید

اب بول چال کو لے لیجئے یہاں بھی وہی مصیبت ہے تقریر میں بھی فخر تحریر میں بھی فخر اور مجھ کو بعض نا آموز اور مبتدیوں کی یہ زیادہ شکایت ہے کہ فخر بھی ایک مذموم چیز ہے یعنی یہ لوگ اپنی تحریر و تقریر میں نئی زبان کا اتباع کرنا چاہتے ہیں انگریزی زبان کے والہ اور شیدا ہیں وہی محاورات برتتے ہیں اور یہ بلا عوام میں بھی گھس گئی، چنانچہ بعضے مفردات کو بگاڑ کر بولیں گے لب و لہجہ کو بدل دیں گے صحیح اردو بولنے سے عار آتی ہے اگرچہ یہ ہیں ہندوستانی مگر زبان غلط ہی بولیں گے ورنہ کسر شان ہوگی کانپور کے اسٹیشن پر میں نے ایک ہندوستانی خانساماں کو دیکھا؛ حالانکہ ہندوستانی تھا؛ مگر انگریزی کے نشہ میں ڈوبا ہوا تھا؛ کسی

سے کہہ رہا تھا کہ ہم یہ بات سننا نہیں مانگتا : نالائق سننا بھی کوئی مانگنے کی چیز ہے! اس حماقت کی بھی کوئی حد ہے ، واللہ عقول مسخ ہوگئیں ! انگریز تو اس امر کی کوشش کریں کہ صحیح اردو بولیں خطا سے احتراز کریں اور یہ احمق اس کوشش میں ہیں کہ غلط اردو بولیں ! ان کو اگر صحیح اردو بولنا آجائے تو فخر کرتے ہیں اور یہ بے ہودہ غلط بول کر فخر کرتے ہیں اپنے کو انگریز بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ من تشبہ بقوم فھو منھم کے پورے مصداق ہو جائیں ! ایک مرتبہ میرے بھائی کے پاس ایک ہندو تحصیلدار صاحب اور ایک مسلمان سب انسپکٹر صاحب آئے مگر تھانیدار صاحب داڑھی منڈائے ہوئے تھے ! اور تحصیلدار صاحب داڑھی رکھے ہوئے تھے نوکر پان لے کر آیا اور تھالی تحصیلدار کے سامنے رکھ دی یہ دیکھ کر تھانیدار صاحب ہنسے کہ اس نے مجھے ہندو سمجھا نوکر ان کے ہنسنے سے سمجھ گیا اور تھالی اٹھا کر انکے سامنے رکھ دی ! اس پر بھائی نے ان کو خوب ہی لتاڑا اور بہت شرمندہ کیا کہ افسوس ہے کہ تم ایسی حالت اختیار کئے ہوئے ہو جس سے نوکر نے تم کو ہندو سمجھا ایک اہل کار اپنی داڑھی رکھنے کا ایک عجیب قصہ بتاتے ہیں کہ میں داڑھی منڈایا کرتا تھا میری کسی دوسری جگہ تبدیلی ہوئی ! وہاں پہنچا تو ایک ہندو رئیس ملنے آیا اور کہا کہ اچھا ہوا آپ تشریف لے آئے یہاں ہمیشہ سے مسلمان آتے رہے اور ہندوؤں کو بہت تنگ کرتے ہیں اب آپ سے ان کو قوت ہو گی اور یہ بھی کہا کہ جہاں تک ممکن ہو ! مسلمانوں کی خوب خبر لی جائے ! انھوں نے کہا سبحان اللہ اور میں کیا آپ کے نزدیک ہندو ہوں ! میں بھی مسلمان ہوں ! وہ تو اپنی اس حماقت سے شرمندہ ہوا ہی مگر میں نے بھی اسی روز سے داڑھی منڈانی چھوڑ دی کہ افسوس اس نالائق نے مجھ

کو محض داڑھی نہ ہونے کی وجہ سے ہندو سمجھا پھر کبھی نہیں منڈائی میں نے الہ آباد میں بیان کیا تھا کہ اے نئی روشنی کے شیدائیوں اور اے جنٹلمینوں تم جلدی داڑھی رکھ لو کیوں کہ میں نے اخبار میں دیکھا ہے کہ یورپ میں اس امر کا مشورہ ہو رہا ہے کہ داڑھی رکھنا چاہیئے منڈانا نہیں چاہیئے تو اگر وہاں یہ پاس ہو گیا تو لازمی بات ہے کہ پھر تم بھی تقلیداً ضرور ہی داڑھی رکھو گے سو قبل اس کے کہ یہ وہاں پاس ہو، تم اس جرم سے تائب ہو جاؤ اور شریعت کی رسی پکڑ لو ورنہ ناحق بدنام ہو گے کہ انہوں نے یورپ کی اتباع سے داڑھی رکھی ہے شریعت کے حکم سے نہیں رکھی اور یہ ممکن نہیں کہ جب داڑھی رکھنا فیشن ہو جائے تو تم اس فیشن کو چھوڑ دو، لا محالہ ضرور رکھو گے اس لئے پہلے ہی سے رکھنا مناسب ہے مجھے اس بات پر کہ بعضے ہندو داڑھی رکھتے ہیں اور بعضے مسلمان نہیں رکھتے ایک شعر یاد آیا؎

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا اپنا مذہب چھوڑ کر میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

مسلمانوں نے کفار کی دیکھا دیکھی داڑھی منڈانا شروع کی اور کفار نے مصالح خاصہ کے سبب رکھنی شروع کر دی یہ تو ان کے طرز پر مٹے ہوئے ہیں اور وہ ان کی پرواہ بھی نہیں کرتے آجکل مسلمان ہر امر میں الٹی چال چلتے جو اختیار کرنے کا کام ہے، اس کو ترک کرتے ہیں، جو ترک کرنے کا ہے اس کو اختیار کرتے، جیسے ایک شخص کی عورت ہمیشہ الٹا کام کرتی تھی، ہر بات کا الٹا جواب دیا کرتی تھی، جس کام کو کہتا اس کے خلاف ہی کرتی وہ تنگ آ گیا تھا، اس نے کہا قصہ پاک کرنا چاہیئے بس ایک روز ندی میں طغیانی ہوئی، اس نے عورت سے کہا آج جنگل میں میرے پاس روٹی لے کر نہ آنا، کہا میں تو آؤں گی، اس نے کہا کہ اچھا ندی چڑھ رہی ہے ندی میں سے مت آنا،

کہا میں تو ندی ہی میں سے آؤں گی غرض ندی میں سے روٹی لے کر جانے لگی، پانی زیادہ تھا ڈوب کر مرگئی شام کو جب وہ شخص اس کو ڈھونڈنے چلا تو جس طرف کو ندی بہہ رہی تھی، اس کے خلاف چلا لوگوں نے کہا ادھر کیوں جاتا ہے کہا ڈندی میں ڈوب کر مرگئی ہے اور چونکہ ہر کام الٹا کرتی تھی، تو شاید الٹ ہی بہی بھی ہو اس لیئے الٹا ہی تلاش کرتا ہوں خیر یہ تو ضد کے لفظ پر یاد آ گیا، بھائیوں تم مسلمان ہو تم اسلامی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے کہنے کو کہتے ہو کہ ہم مسلمان ہیں اور پھر مخالفت کرتے ہو، یہ کیسا اسلام ہے کہ اس کے مخالف ہے، حتیٰ کہ احکام سے گذر کر زبان تک میں غیر قوموں کی تقلید کرتے ہیں اور وہ لوگ صحیح اردو بولنا باعث عزت سمجھتے ہیں گو بولی نہیں جاتی، چنانچہ مظفر نگر میں ایک یورپین سپرنٹنڈنٹ پولیس اردو بولتا تھا اور اس پر فخر کرتا تھا کہ میں صحیح اردو بولتا ہوں اور ایک یہ احمق ہندوستانی ہیں۔ کہ کہ اس طرح بولتے ہیں دل، ہم سنا نہیں مانگتا، نہ معلوم یہ کون سی اردو ہے، ایسے ہی بعض مقامات پر ترکیب کو بدل رہے ہیں، مثلاً بجائے اس کے کہ آپ کو شام کو آنے کا اختیار ہے، یہ بولتے ہیں آپ شام کو آسکتے ہیں، آپ جا سکتے ہیں، نہ معلوم یہ سکنا کیسا ارزاں ہو گیا ہے بس فضول لفظ استعمال کرتے ہیں حالانکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ شام کو آنے کا اختیار ہے ایک مرتبہ ایک صاحب کا یہاں میری دعوت ہوئی اور ساتھ میں ایک جنٹلمین صاحب کی بھی تھی، چونکہ انہیں زکام تھا اس لئے ان کے واسطے مسّی روٹی پکوائی گئی تھی، اور میرے گیہوں کی روٹی پر مسّی روٹی اوپر رکھی تھی، میں نے دل میں کہا کہ اگر نیچے سے گیہوں کی روٹی نکالوں تو یہ شخص کہے گا کہ مولوی بھی کیسے بد دماغ ہوتے ہیں کہ ان سے مسّی روٹی نہیں کھائی جاتی

اس لئے میں نے مسّی روٹی توڑی صاحب خانہ نے کہا آپ گیہوں کی روٹی کھائیے
مسّی روٹی آپ کے لیئے ہے کیوں کہ آپ کوزکام ہے؛ تو حضرت صاحب فرماتے
ہیں نہیں نہیں آپ کھا سکتے ہیں یعنی آپ کھانے پر قادر ہیں؛ مجھ کو بہت ہنسی آئی
بس سکتا توان کا اور ہٹا پھونا ہوگیا ہے؛ مجھ کو انسے شکایت نہیں؛ شکایت تو عربی
خوانوں کی ہے کہ وہ کس وجہ سے اس طرز کو اختیار کرتے ہیں وہ لوگ تو انگریزی
پڑھتے ہیں اس لئے یہ طرز اختیار کرتے ہیں تم کو کیا ہوا تم تو عربی پڑھتے ہو؛ تو عربی
طریقہ اختیار کرو؛ افسوس تمہاری تحریر و تقریر سب نئی زبان کے قالب میں آگئی ہے
انا للہ وانا الیہ راجعون کیوں اپنے علم کو برباد کرتے ہو؛ تمہارے سلف کا طریقہ
کیا برا ہے اس میں کون سی قباحت ہے میں یہ نہیں کہتا کہ تم اس طرح بولو کہ اس
کے تئیں۔ بیچ سہارنپور کے۔ اوپر اس کے۔ گو ابتدائی تعلیم میں ترجمہ کا یہی طریقہ مناسب
ہے کیوں کہ عربی فارسی الفاظ کا ترجمہ اس طرز میں اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے
مولانا رحمت اللہ صاحب کے بھائی حکیم علی اکبر صاحب کیرانوی بہت سادہ مزاج
وباکمال شخص تھے؛ کسی بات میں تکلف نہ تھا؛ فرمایا کرتے تھے؛ کہ آجکل ترجمہ کا نیا
طریقہ اختیار کیا گیا ہے مکتوب دوئم کا ترجمہ کرایا جاتا ہے دوسرا خط جس سے وہ پڑھنے
والا ادنی کا یوں سمجھے کہ مکتوب کے معنی تو دوسرا اور دوئم کے معنی خط یوں ترجمہ
کرانا چاہیئے خط دوسرا اور ہے بھی واقعی یہی بات البتہ جب اتنی سمجھ آجائے؛ کہ
ترجمہ الفاظ خود سمجھنے لگے تو محاورہ کے اتباع میں بھی کچھ مضائقہ نہیں ایک مرتبہ
ان کے سامنے کوئی شخص نعتیہ غزل پڑھ رہا تھا اس نے کسی شعر میں پڑھا؛ بلا لو
یارسول اللہ فرمایا ادنی کا یا بھونی کا کہتا ہے؛ بلا لو ہاں اس کے لئے پالکی آئیگی؛

نا ارے جانا ہے تو چلا جا۔ ان کی باتیں بھلی معلوم ہوا کرتی تھیں۔ بھائیو تمہارے سلف تو بڑے فصیح و بلیغ تھے۔ ان کی پیروی کرو۔ ان کے طرز پر مطلب خیز عبارت لکھو اور اپنے مشائخ کا اتباع کرو۔ تواضع و استغنار کو پیشوا بناؤ۔ اب چونکہ وقت ختم ہو گیا ہے اور ضروری مضمون بھی ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔

ترک مالایعنی

لایعنی امور کو ترک اور تعلقات زائدہ کو کم کرنے کے متعلق یہ وعظ ۱۹ جمادی الاخریٰ سنہ ۴۰ھ یوم جمعہ کو برمکان شیخ رشید احمد صاحب میرٹھ تقریباً دو گھنٹے ہوا۔ اس وعظ میں جن صاحبان نے شرکت کی ان کی تعداد تقریباً ۴۰ کے قریب تھی؛ اس وعظ کو مولانا ظفر احمد عفا اللہ نے قلم بند کیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا مولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ ؛

دستور العمل

یہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیئے ایک نہایت نافع دستور العمل بیان فرمایا ہے جو ایک جامع کلام ہے جس میں دنیا و آخرت دونوں کا انتظام مضمر ہے اور یہ حضور کا معجزہ اور کمال ہے کہ چند لفظوں میں نہایت جامع مضمون آپ ارشاد فرما دیتے ہیں گویا وہ ایک کُلی ہے جس کے تحت میں صدہا ہزارہا جزئیات موجود ہیں اور سب جزئیات کا حکم ایک کلیہ سے معلوم ہو سکتا ہے یوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر بھی دستور العمل ارشاد فرمائے ہیں وہ سبھی نافع ہیں! حتیٰ کہ اس لئے بعض دفعہ بیان کے وقت سخت حیرانی ہوا کرتی ہے! کہ کس بات کو بیان کیا جائے آپ کی ساری ہی باتیں بیان کے قابل ہیں مگر اس کے لئے تو ایک عمر بھی ناکافی ہے؛ اس لئے ایک جلسہ میں ایک ہی مضمون کو اختیار کیا جاتا ہے مگر اس اختیار کا معیار ایک

امر اجتہادی ہے جس کی بنا پر متعدد مضامین سے ایک کو ترجیح دے لی جاتی ہے؛
اور معیار ضرورت ہے لیکن ضرورت بھی سب ہی ارشادات کی ہے آپ کا کوئی بھی ارشاد
غیر ضروری نہیں مگر زیادہ ضرورت پر نظر کر کے ایک بات کو اختیار کر لیا جاتا ہے اور
زیادہ ضرورت کا معیار مخاطبین کی کوئی خاص حالت ہوا کرتی ہے جیسے فن طب میں ایک
ایک مرض کے لئے بہت نسخے ہوتے ہیں کہ وہ سب اس مرض کے لئے مفید ہوتے ہیں
لیکن طبیب ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دے کر اسی کو تجویز کر دیتا ہے اور اس ترجیح
کی وجہ فصول و امزجہ کا اختلاف ہے کہ ایک نسخہ ایک فصل کے لئے مناسب ہے دوسرا
دوسری موسم کے لئے اور ایک نسخہ کسی مزاج کے موافق ہے دوسرا کسی اور مزاج کے
ان امور خاصہ پر نظر کر کے طبیب کسی ایک نسخہ کو ترجیح دیا کرتا ہے اور اس کا مدار
محض معالج کی تشخیص پر ہے اس کے اجتہاد میں جو نسخہ مریض کے مزاج سے زیادہ
موافق اس وقت ہوتا ہے وہ اسی کو اختیار کر لیتا ہے یہ ممکن ہے کہ دوسرے طبیب
کے نزدیک اس وقت کسی دوسرے نسخہ کو ترجیح ہو کیوں کہ اس تشخیص میں مرض کی
کیفیت کچھ اور ظاہر ہوئی ہو مگر بہر حال ایک طبیب کو دوسرے پر اعتراض کرنیکا کوئی
حق نہیں ہر ایک نے اپنے اجتہاد ہی سے ایک ترجیح دی ہے یہی حالت معالجہ
باطنیہ کی ہے کہ اس میں بھی خصوص مواقع کی وجہ سے ایک خاص تدبیر کو اختیار کیا
جاتا ہے چنانچہ اس وقت ایک ایسی ہی خاص وجہ سے میں نے اس مضمون کو اختیار
کیا ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ یہ مضمون باوجودیکہ نہایت ضروری ہے؛ مگر اس کیطرف
سے غفلت بہت ہو رہی ہے کسی مضمون کے ضروری ہونے کے مختلف اسباب ہوا
کرتے ہیں کبھی ایک مضمون کا بیان کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کرنا شرعاً

واجب یا فرض ہے یہ وجہ تو بہت سے احکام میں مشترک ہے کبھی اس لئے ضرورت بیان کی ہوتی ہے کہ کسی فرض و واجب پر عمل کرنے میں کوتاہی کی جاتی ہے اور ایک بڑا سبب ضروری ہونیکا یہ ہے کہ ایک چیز شرعاً ضروری ہے مگر اسکی طرف سے بے التفاتی اس درجہ ہے کہ اس کو ضروری نہیں سمجھا جاتا، اس لئے اس کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ یہ مضمون جو میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں اس کی یہی حالت ہے کہ فی نفسہ وہ بہت ضروری ہے مگر عام طور پر لوگوں کو اس کی ضرورت کا احساس نہیں ہے، ترجمہ سے آپ کو معلوم ہو جائے گا، کہ واقعی عموماً اس کو ضروری کوئی نہیں سمجھتا الا ماشاء اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اسلام کی خوبی یہ ہے، کہ جو چیز مفید نہ ہو، آدمی اس کو ترک کردے ترجمہ سن کر اکثر لوگوں کو خیال ہوا ہوگا، کہ اس میں کونسی ضرورت کی بات ہے نہ اس میں کسی ثواب کا ذکر ہے نہ عذاب کا نہ وعدہ ہے نہ وعید ہے نہ کسی کام کرنے کا حکم ہے، حالانکہ آئندہ آپ کو اس کا ضروری ہونا معلوم ہو جائے گا، اور اس وقت آپ کو اندازہ ہوگا، کہ اتنی ضروری بات سے ہم لوگ کس قدر غافل ہیں،

علمی غفلت

صاحبو! عملی غفلت سے علمی غفلت زیادہ اشد ہے کیونکہ جس کام کو انسان ضروری سمجھتا ہے اور عمل کرنے میں سستی کرتا ہو، وہاں تو یہ امید ہو سکتی ہے کہ اگر کسی وقت اس کے ضروری ہونے پر توجہ ہو گئی تو فوراً عمل شروع کردے گا، اور علمی غفلت میں یہ امید بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ جب اس کو ضروری ہی نہیں سمجھا جاتا تو ضرورت پر توجہ کیوں کر ہوگی بلکہ عجب نہیں، کہ اگر کوئی شخص کبھی اس کام کی ضرورت بیان کرے تو سننے والوں کی اس سے وحشت ہو

اور یوں کہیں کہ یہ تو بالکل نئی بات ہے آجتک کسی نے بھی اس کو ضروری نہ کہا تھا۔ یہ بات تو ہم نے کبھی نہیں سنی پس علمی غفلت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ متنبہ کرنے سے بھی بعض دفعہ تنبہ نہیں ہوتا ہے اس لئے علمی غفلت کا دور کرنا عملی غفلت کی اصلاح سے مقدم ہے یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات نماز کا بیان نہیں کیا جاتا ہے حالانکہ وہ سب سے زیادہ ضروری فرض ہے اور اس سے غفلت بھی بہت کی جارہی ہے اور دوسرا مضمون بیان کے لئے اختیار کیا جاتا ہے کہ نماز سے تو محض عملی غفلت ہے علمی غفلت نہیں ہر مسلمان نماز کی ضرورت کو جانتا اور تسلیم کرتا ہے لیکن اس دوسری بات کو لوگ ضروری نہیں سمجھتے عمل تو کیا ہی کرتے اس لئے طبیب روحانی اس دوسری بات کو بیان کرتا ہے تاکہ لوگوں کے عقائد کی تو اصلاح ہو جائے اور وہ گو اس پر عمل نہ کریں تو اس کو ضروری سمجھتے ہیں، خلاصہ یہ کہ عملی غفلت سے صرف عمل میں نقصان آتا ہے اور علمی غفلت سے عقائد وخیالات میں۔ اور ظاہر ہے کہ عقائد وخیالات کی اصلاح عملی اصلاح سے مقدم ہے، علمی غفلت کا تدارک بہت دیر سے ہوتا ہے اور اگر چندے اس کی ضرورت کو بیان نہ کیا جائے تو پھر ذہن میں ڈالنے سے بھی اس پر توجہ نہیں ہوتی، بلکہ اس کے سننے ہی سے وحشت اور تعجب ہونے لگتا ہے جیسا کہ اکثر سامعین نے اس حدیث کا ترجمہ سن کر یہ خیال کیا ہوگا کہ اس میں تو کوئی ضروری بات نہیں بلکہ محض ایک معمولی بات ہے کہ جو چیز مفید نہ ہو اس کو ترک کر دینا چاہیئے، میں کہتا ہوں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں اور ان میں سے بالخصوص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں یہی تو بڑی خوبی ہے کہ وہ بڑے بڑے مہلک امراض کا علاج نہایت سہل اور معمولی باتوں میں کر دیتے

ہیں جن دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ تو کچھ علاج نہیں محض ایک معمولی بات ہے لیکن اس پر عمل کرنے سے اس کا فائدہ عظیمہ جب معلوم ہوتا ہے اس وقت حضور کی تعلیم کی قدر ہوتی ہے اور بے ساختہ کہتا ہے، ؎

جزاک اللہ چشمم باز کردی | مرا با جانجاں ہمراز کردی

تعلیم انبیاءؑ انبیاء کی تعلیم ایسی ہوتی ہے؛ جیسے بعض اطباء جڑی بوٹیوں سے علاج کیا کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ طبیب بڑا ماہر ہے جو ایک معمولی گھاس سے بڑے سے بڑے مرض کا علاج کر دے مگر اس کی قدر وہی کر سکتا ہے جو اس کے علاج پر ایک دفعہ عمل کر کے اس کے فائدہ کا مشاہدہ کر چکا ہو؛ ورنہ ظاہر بین لوگ تو یہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ بھی کوئی علاج ہے جس میں جنگل کی گھاس ہی بتلا دی جو ایک پیسہ کو بھی نہیں پوچھی جاتی مگر حقیقت میں فن دانی اسی کا نام ہے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور کام جلدی ہو جائے؛ ہمارے استاد علیہ الرحمتہ (مولانا محمد یعقوب) صاحبؒ اکثر جڑی بوٹیوں سے علاج بتلایا کرتے تھے؛ مولانا علم طب میں بھی بڑے ماہر تھے اور آپ کے نسخہ میں زیادہ تر اجزاء نہ ہوتے تھے؛ اکثر تو مفردات بتلا دیا کرتے تھے ورنہ دو یا تین سے زیادہ اجزاء نہ ہوتے تھے ایک مرتبہ آپ نے ایک رئیس کو یہ دوا بتلائی کہ جامن کی کونپلوں کو سیاہ مرچوں میں پیس کر استعمال کریں یہ واقعہ تو میں نے ناتمام سنا ہے یہ معلوم نہیں کہ ان حضرات نے اس کو استعمال کیا یا نہیں دوسرا واقعہ مکمل سنا ہے وہ یہ کہ ایک مرتبہ مولانا انبہٹہ تشریف لے گئے مولانا کی دوسری شادی انبہٹہ ہی میں ہوئی تھی اس لئے وہاں جانا آنا رہتا تھا؛ ایک رئیس کو وہاں معدہ کا کچھ مرض تھا؛

جس کے علاج انہوں نے بہت کئے تھے، مگر کسی علاج سے نفع نہ ہوا، جب مولانا وہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے حضرت سے بھی رجوع کیا مولانا نے ان کو یہ دوا بتلائی کہ اکاس بیل کو دودھ میں پکا کر استعمال کریں چونکہ ایک معمولی دوا تھی جس میں ایک پیسہ کا بھی خرچ نہ تھا کیونکہ اکاس بیل خودرو بہت ملتی ہے اس لئے اس رئیس کو اس کی قدر نہ ہوئی، وہ یہ سمجھے کہ میرے مرض کے لئے تو ایسے نسخے کی ضرورت جس میں بہت سے روپے خرچ ہوں اس معمولی دوائی سے مجھے کیا آرام ہوگا، مولانا کو بھی آثار سے معلوم ہوگیا کہ اس شخص نے میرے نسخے کی قدر نہیں کی فرمایا اس کو معمولی نہ سمجھو تمہارے مرض کی یہی ایک دوا ہے کہ اس کو استعمال کر کے دیکھو مگر اس نے پھر بھی توجہ نہ کی جب مریض کو طبیب پر اعتماد نہ ہو، تو اس کی جوتی کو غرض پڑی ہے کہ اس کی خوشامد کرے پھر مولانا کو کون سی فیس ملتی ہے جو وہ خوشامد کرتے مولانا بھی خاموش ہو رہے۔ اتفاق سے اس محلہ کی مسجد میں ایک نابینا ملا جی مؤذن تھے، جن کی بزرگی کے لوگ معتقد تھے انہوں نے صبح کو اس رئیس کے روبرو خواب بیان کیا کہ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا اور دریافت کیا کہ حضرت اس مرض کے لئے کوئی دوا تبلا دیجئے تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی صرف ایک دوا ہے اور وہی دوا تبلائی، جو حضرت مولانا نے تبلائی تھی، یہ خواب مولانا سے بیان کیا گیا مولانا نے پوچھا کہ حافظ جی دیکھو میں ہی تو نہ تھا تو حافظ جی کیا کہتے ہیں ہاں حضرت آواز تو ایسی ہی تھی مولانا نے فرمایا بھائی جب تم نے جاگتے میں میرا کہنا نہ مانا، آخر میں نے سوتے میں تبلا دیا تو دیکھئے مولانا کے ارشاد کی قدر اسی لئے نہ ہوئی کہ بظاہر وہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی تھی،

پس آجکل کچھ مذاق ایسا بدل گیا ہے کہ معمولی اور آسان باتوں کی قدر نہیں ہوتی، نہ ایسی باتوں کو ضروری سمجھتے ہیں بس اسی بات کی قدر ہوتی ہے جس میں مصیبت جھیلنا پڑے، چنانچہ مشائخ میں سے بھی لوگ اسی شیخ کی قدر کرتے ہیں جو مجاہدات زیادہ تبلائے کہ تہجد کبھی قضا نہ ہو، چھ مہینے تک چلہ میں رہو، کسی سے نہ ملو چاہے اس کمبخت کی تمام ضروریات کا بیڑا ہو جائے مگر شیخ کو اس کی پرواہ نہ ہو، تب تو وہ شیخ ہے اور اگر کوئی یہ تبلادے کہ بھائی رات کو آنکھ نہ کھلتی ہو تو عشاء کے بعد تہجد پڑھ لیا کرو، اور اگر تنہائی کا موقع نہ ملے تو چلتے پھرتے ہی وظیفہ پورا کرلیا کرو، اس کی بہت کم قدر ہوتی ہے یوں سمجھتے ہیں کہ اس شیخ کے یہاں تو کوئی نئی بات نہیں سب معمولی باتیں ہیں میں کہتا ہوں کہ اگر ہنستے کھیلتے گھر بس جائے، تو یہ کمال کی بات ہے یا نقصان کی اگر دو پیسے کی جڑی بوٹی میں سالہا سال کا روگ جاتا رہے جو دوسرے اطباء کے صدہا روپے کی نسخوں میں بھی نہ گیا تھا تو یہ طبیب کا کمال ہے یا عیب، مگر جب لوگوں کا مذاق ہی بگڑ جائے تو اس کا کیا علاج وہی مثل ہے کہ اندھے کے آگے روئے اپنی آنکھیں کھوئے غرض انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا یہی حال ہے، کہ وہ جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں ان کی باتیں ظاہر میں معمولی ہی معلوم ہوتی ہیں مگر ان کا فائدہ بہت بڑا ہوتا ہے اور اس سہل تعلیم کی بناء وفور شفقت ہے، انبیاء علیہم السلام کو اپنی امت سے محبت اور ان کے حال پر شفقت بہت ہوتی ہے اس لئے ان کی تعلیم نہایت آسان ہوتی ہے، جیسے باپ اپنے بیٹے کو تعلیم دیا کرتا ہے، دیکھئے ایک تعلق تو حاکم کو اپنی رعایا سے ہوتا ہے اور ایک تعلق باپ کو اولاد سے ہوتا ہے، کیا

دونوں تعلق یکساں ہیں ؛ ہرگز نہیں حاکم بوجہ حکومت کے بے تکلف فرمائش کر دیتا ہے ؛
کہ فلاں کام کرو ؛ فلاں کام مت کرو ؛ اس کو حاکم ہونے کی حیثیت اس کی پرواہ
نہیں ہوتی کہ رعایا کو اس کام کرنے میں مشقت ہوگی ؛ یا سہولت نہ وہ اس کی فکر کرتا
ہے کہ اس کام کے آسان ہونے کا طریقہ رعایا کو بتلا دے کیوں کہ حاکم ہونے کا مقتضی
ہی نہیں اس کو تو حکم دے دینا آتا ہے اگر کسی نے اس کی تعمیل کی فبہا ورنہ خلاف
ورزی قانون کی دفعہ قائم کر کے اس پر جرمانہ یا سزا کر دے گا ؛ تو بات کیا ہے بات
صرف یہ ہے کہ حاکم کو اس کی فکر نہیں ہوتی ؛ کہ جو کچھ میں حکم دے رہا ہوں رعایا اس
پر عمل کر ہی لے ؛ بلکہ بعض دفعہ کسی شخص کو زیادہ ملزم بنانے کے لئے اور اس پر
حجت قائم کرنے کے لئے اس کا قصد کیا کرتا ہے کہ یہ شخص اس حکم پر عمل نہ کرے
تو اچھا ہے تاکہ میں اس کو سزا دے سکوں اس صورت میں وہ قصداً ایسا سخت حکم
دیتا ہے جو اس سے ہو ہی نہ سکے ؛ لیکن باپ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ بے تکلف بیٹے
کو جو چاہے حکم دے دے خواہ وہ اس سے ہو سکے یا نہ ہو سکے ؛ ہرگز نہیں ؛ بلکہ
باپ جو حکم دینا چاہے گا ؛ اول اس کے کہنے کے لئے وقت ایسا تجویز کرے گا ؛
جب کہ بیٹے کو فرصت ہو ؛ باپ کا کام بتلانا اسے ناگوار نہ ہو ؛ پھر وہ جو کچھ کہے
گا بیٹے کی ہمت کے موافق کہے گا ؛ اور اس کے بعد بھی اس سے یہ کہہ دے گا ؛
کہ اس کام کو اس طریقہ سے کرنا ہے اس میں سہولت ہوگی ؛ اور پھر خود بھی اس میں
اعانت کرے گا ؛ بیٹے کا ہاتھ بٹا دے گا ؛ اس کی وجہ کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے
کہ باپ چاہتا یہ ہے کہ بیٹا اس کام کو کرے اس میں اس کا نفع ہے باپ کبھی ایک
کام بتلا کر یہ نہیں چاہتا کہ بیٹا اس کام کو نہ کرے تو اچھا ہے ؛ تاکہ میں اس کو

خوب مار سکوں اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ حاکم اور باپ میں کتنا فرق ہے ! تو انبیائ علیہم السلام کو امت سے حاکمانہ تعلق نہیں ہوتا بلکہ ان کو ایسا تعلق ہوتا ہے ! جیسا باپ کو اولاد سے ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کیوں کہ باپ کو اولاد سے محبت و شفقت محض اس لئے ہے کہ اولاد کا جسم باپ کے ذریعہ سے پرورش پاتا ہے لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام امت کی ارواح کو پرورش کرتے ہیں اور ظاہر ہے ! کہ جسمانی تربیت سے روحانی تربیت بڑھی ہوئی ہے اور جو لوگ روحانی تربیت کرنے والے ہیں ! وہ خوب جانتے ہیں کہ بعض دفعہ شیخ کو کسی مرید سے ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اپنی اولاد سے بھی ویسا تعلق نہیں ہوتا ! اور اسی کا اثر یہ ہوتا ہے ! کہ بعض مریدین کو شیخ سے ایسا تعلق ہو جاتا ہے کہ باپ سے اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا چنانچہ اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے گو آجکل اس تعلق میں بہت کمی ہو گئی ہے کیوں کہ آج کل آزادی کا زمانہ ہے ہر شخص آزاد ہو گیا ہے اس آزادی کا اثر اس طبقہ میں بھی کسی قدر ہو چلا ہے ! مگر تاہم اس میں شک نہیں کہ روحانی تربیت میں بھی مربی کو وہی شفقت ہوتی ہے جو جسمانی تربیت کی وجہ سے باپ کو ہوتی ہے بلکہ روحانی مربی کو اس سے بھی زیادہ شفقت ہوتی ہے باپ جو کام کرتا ہے وہ تو حیوانات بھی کرتے ہیں ! وہ بھی اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہیں ان کو بھی اپنے بچوں سے محبت ہوتی ہے لیکن روحانی مربی وہ کام کرتا ہے جو کسی باپ سے نہیں ہو سکتا کہ وہ انسان کی روح کو خدا تعالیٰ سے ملا دیتا ہے ! اس کو عارف و واصل بنا دیتا ہے پھر اس پاکیزہ تربیت میں طرفین سے جس قدر بھی تعلق ہو تھوڑا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام عموماً اپنی امت پر بہت زیادہ شفیق ہوتے ہیں پھر ان میں سے

بھی بالخصوص ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہ آپ کو تو اپنی امت سے بہت ہی تعلق تھا بخدا آپ سے زیادہ کوئی بھی شفیق نہیں ؛ البتہ حق تعالیٰ کو اپنے بندوں پر آپ سے بھی زیادہ شفقت ہے ؛ بلکہ خود حضرات انبیاء علیہ السلام کی شفقت اسی شفقت الٰہیہ کا ظل ہے یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تعلیم نہایت سہل ہے اور انبیاء علیہ السلام کی تعلیم بھی اسی واسطے سہل ہے کہ ان میں شفقت خداوندی کی جھلک موجود ہے ؛

خدا کی شفقت

دیکھیے ایک جگہ حق تعالیٰ کو اعمال صالحہ کا امر فرمانا منظور تھا ؛ مگر اس کو کس شفقت کے عنوان سے شروع فرمایا ہے ارشاد فرمایا ہے یاایھا الذین آمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم واشکروا للہ ان کنتم ایاہ تعبدون ؎ مقصود تو اشکروا للہ تھا ؛ اور شکر سے مراد عبادت ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہی ہے کہ اس کی عبادت کی جائے مگر اس حکم سے پہلے فرماتے ہیں کلوا من طیبات من رزقناکم یعنی اے مسلمانو! ہم نے تم کو جو کچھ پاکیزہ چیزیں عطا کی ہیں ؛ ان کو کھاؤ پیئو ؛ اس کے بعد فرماتے ہیں واشکروا للہ یعنی اور ان نعمتوں کو کھا پی کر خدا کا شکر بھی کیا کرو ؛ تو دیکھئے بلا تشبیہ یہ ایسی ہی صورت ہے جیسے باپ کو یہ منظور ہو کہ بیٹے کا سبق سنے تو وہ اس کو بلا کر کہتا ہے کہ آؤ بیٹا یہ لڈو مٹھائی کھالو ؛ ہم تمہارے واسطے لائے ہیں پھر مٹھائی دے کر کہتا ہے کہ اچھا سبق تو سنادو ہم تمہیں پھر بھی مٹھائی دیں گے ؛ وہی صورت یہاں ہے کہ پہلے تو پاکیزہ نعمتوں کے کھانے کا حکم فرمایا پھر عبادت کا حکم فرمایا اور عبادت کے پھر بھی مٹھائی دینے کا وعدہ ہے وہ کیا جنت سبحان اللہ اس شفقت کی بھی کچھ انتہا ہے

باپ کو تو بیٹے کے سبق سنانے سے کچھ اپنی غرض بھی مد نظر ہوتی ہے وہ یہ امید کرتا ہے؛ کہ لڑکا لائق فائق ہو جائے گا، تو کچھ کمانے لگے گا؛ اور بڑھاپے میں میرے کام آئے گا؛ میری خدمت کرے گا؛ مگر حق تعالیٰ کو ہماری عبادت سے کچھ بھی غرض نہیں عبادت کا جو نفع ہے ہم کو ہی ہے؛ اور اگر عبادت نہ کریں تو نقصان بھی ہمارا ہے؛ تمام مخلوق اگر عابد زاہد ہو جائے تو خدا کی سلطنت وعظمت میں اس سے کچھ زیادتی نہ ہوتی؛ اور اگر سارے سرکش ہو جائیں؛ اس کی عظمت میں کچھ کمی نہیں آتی؛ پس حق تعالیٰ کو انسان کے ساتھ جس قدر شفقت ہے وہ محض بے غرض ہے پھر حق تعالیٰ حاکم بھی ہیں حاکم ہونے کی حیثیت سے ان کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ اس طرح چمکار کر پھسلا کر حکم دیں؛ اگر وہ حاکمانہ طریقہ پر حکم دیتے کہ ہماری عبادت کرو، ورنہ تم کو جیل خانے بھیج دیا جائے گا؛ تو اس سے ان کو کون چیز مانع تھی؛ پھر حاکم بھی ایسے نہیں جیسے دنیا کے حکام ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ سلاطین دنیا کو رعایا سے دبنا پڑتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس عالم میں ہر شخص محتاج ہے سلاطین اپنی سلطنت کے بقا میں رعایا کے محتاج ہیں کہ اگر رعایا آمادۂ بغاوت ہو جائے تو ان کی سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا ہے کہ ایک ذرہ ان کی مشیت کے بغیر نہیں ہل سکتا اور اگر تمام عالم آمادۂ بغاوت ہو جائے تو وہ ایک دم میں سب کو ہلاک کر کے دوسری مخلوق کو پیدا کر سکتا ہے اور اس کو اس کی بھی ضرورت نہیں وہ اگر چاہے تو کسی کی مجال نہیں کہ سرکشی کر سکے چنانچہ ملائکہ کی یہی شان ہے کہ وہ کسی وقت سرکشی نہیں کر سکتے اس نے بعض حکمتوں کی وجہ سے انسانوں کو نافرمانی اور اطاعت دونوں کا اختیار اور قدرت دے دی ہے اگر وہ چاہے تو اس قدرت

کو سلب کر سکتا ہے اور سارے ہی سرکش ہو جائیں تو ملائکہ انسان سے بہت زیادہ ہیں وہ اس کی اطاعت بجالاتے ہیں اور اگر کوئی بھی مطیع نہ ہو تب بھی اس کا کچھ ضرر نہیں اس کے تمام کمالات ذاتی ہیں کسی کی اطاعت و نافرمانی کا اس پر کچھ بھی اثر نہیں، پس حق تعالیٰ ایسے غنی ہیں کہ ان سے زیادہ کوئی غنی نہیں، مگر باوجود اس غنا کے اس درجہ شفقت ہے کہ باپ ماں کو بھی اولاد سے وہ شفقت نہیں جو حق تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے ہے کیونکہ باپ کو اولاد سے اضطراری شفقت و محبت ہے اور حق تعالیٰ اضطرار سے پاک ہے اس کو جو شفقت و رحمت ہے محض اختیاری ہے وہ خود چاہتے ہیں کہ مخلوق پر شفقت کریں، اور باپ ماں کے چاہنے میں ان کے اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں، وہ مجبور ہو کر شفقت کرتے ہیں پس ایسے غنا رکامل کے ساتھ ایسی کامل شفقت عجائب میں سے ہے،

شکر کی اہمیت

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں، مایفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم وآمنتم وکان اللہ شاکراً علیماً ط یعنی حق تعالیٰ تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے اگر تم خدا کا شکر کرو یعنی ایمان دکامل اختیار کرو، سبحان اللہ اس آیت میں یہ لفظ مایفعل اللہ بعذابکم اس قابل ہے کہ اس پر جان قربان کر دی جائے، فرماتے ہیں کہ ہم کو تمہارے عذاب کرنے میں کیا نفع ہے ہم تو تم پر رحمت ہی کرنا چاہتے ہیں، مگر تم نافرمانی کر کے خود ہی عذاب کو مول لیتے ہو تو اس عنوان سے کس درجہ شفقت ٹپکتی ہے، یہاں ایک ضروری تنبیہ بطور جملہ معترضہ کے ہے، بعض لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ حق تعالیٰ کو مخلوق سے بے پرواہ بے معنی بے توجہ سمجھتے ہیں اور اس غلطی کا منشاء یہ ہے کہ ان لوگوں نے غنا رکا مطلب غلط

سمجھا، اس میں تو شک نہیں کہ غنا رحق تعالیٰ کی صفت یقیناً ہے چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں ان اللہ غنی عن العلمین ۝ دتولوا واستغنی اللہ ط لیکن لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ان آیات میں مستغنی کے معنی وہ مراد لیتے ہیں جو ہمارے محاورہ میں مستعمل ہیں کہ ہمارے محاورہ میں مستغنی اس کو بھی کہتے ہیں جو دوسروں سے بالکل بے پرواہ ہو کسی کے نفع نقصان کی اسے رعایت نہ ہو، حالانکہ مستغنی کے معنی آیات میں صرف یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کو کسی کی احتیاج نہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں، لیس محتاج نہ ہونا اور بات ہے اور بے پرواہ ہونا اور رعایت مصالح نہ کرنا، دوسری بات ہے غنار جو حق تعالیٰ کی صفت ہے، اس کے معنی عدم احتیاج کے ہیں اور یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا، کہ آجکل جو لوگ محض ترجمے دیکھ کر محقق بن جاتے ہیں وہ کیسا ستم ڈھاتے ہیں پھر غضب یہ کہ یہ لوگ ترجمے دیکھ کر محققین سے مزاحمت کرتے ہیں اور معارضہ میں کہتے ہیں کہ صاحب مشارق الانوار میں تو یہ لکھا ہے، مظاہر حق میں یہ لکھا ہے میں کہتا ہوں کہ اس میں وہی لکھا ہے جو محقق بیان کرتا ہے۔ مگر تم ترجمہ دیکھ کر اس کی حقیقت کو نہیں سمجھے بس اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص کتابیں دیکھ دیکھ کر طبیب حاذق کے نسخوں میں مزاحمت کرنے لگے، اس کو یہی جواب دیا گیا، کہ تم نے صرف کتابیں دیکھی ہیں مگر فن کی حقیقت تم کو معلوم نہیں اس لئے طبیب کی رائے میں تم کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں اس طرح جو لوگ محض ترجمے پڑھ کر محققین سے مزاحمت کرتے ہیں، وہ بھی اسی جواب مستحق ہیں چنانچہ ان لوگوں نے غنی عن العالمین اور واستغنی اللہ کا ترجمہ دیکھ کر اتنی بات سمجھی کہ حق تعالیٰ مستغنی ہیں مگر اس کی حقیقت ان کو معلوم نہیں ہوئی

وہ یہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے محاورہ میں کہہ دیا کرتے ہیں فلاں شخص بہت ہی آزاد اور مستغنی المزاج ہے یعنی کسی کے نفع نقصان کی پرواہ نہیں کرتا؛ یہی معنی خدا کے مستغنی ہونے کے بھی ہیں حالانکہ یہ معنی دوسری نصوص کے اور نیز دلائل عقلیہ کے بالکل خلاف ہیں اگر مستغنی ہونے کے یہ معنی ہیں تو ان نصوص کیا مطلب ہے جن میں حق تعالیٰ کی شفقت و رحمت کا ذکر ہے کہ حق تعالیٰ کو اپنے بندوں پر ایسی شفقت ہے کہ ماں باپ کو بھی اولاد پر ایسی شفقت نہیں ہو سکتی؛ تو یہ خرابی کاہے کی ہے یہ خرابی اس کی ہے کہ ان لوگوں نے لفظ تو عربی لیا اور معنی اردو محاورہ کے موافق لیے حالانکہ ہر لفظ کے معنی اسی زبان کے موافق کرنے چاہئیں؛ جس زبان کا وہ لفظ ہے

عربی اور اردو کے معنی کا فرق

مگر آجکل بکثرت لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں چنانچہ ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین؛ سے بعض لوگوں کو اشکال ہوتا ہے؛ کہ اس میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہوں نے بھی مکر کیا؛ اور خدا نے بھی مکر کیا اور خدا سب سے بہتر مکر کرنے والا ہے؛ اشکال کا حاصل یہ ہے کہ دیکھو اس سے خدا کا نعوذ باللہ "مکار" ہونا لازم آتا ہے؛ تو منشاء اس اشکال کا صرف یہی ہے کہ انہوں نے عربی لفظ کا ترجمہ اردو محاورہ کے موافق کیا؛ اردو میں مکر کرنا فریب دینے کو کہتے ہیں جو کہ عیب کی صفت ہے اگر یہ لوگ اس عربی کے لفظ کا ترجمہ محاورہ عربیہ کے موافق کرتے تو اشکال کچھ بھی نہ تھا؛ عربی میں مکر کے معنی تدبیر خفی کے بھی آتے ہیں اور تدبیر خفی کرنا یہ عیب نہیں؛ بلکہ صفت کمال ہے؛ ترجمہ آیت کا یہ ہوا کہ کافروں نے

عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے واسطے مخفی تدبیر کی اور حق تعالیٰ نے ان کو بچانے واسطے مخفی تدبیر کی اور حق تعالیٰ سب تدبیر کرنے والوں میں بہتر ہے کہ کسی کی تدبیر اس کی تدبیر پر غالب نہیں آسکتی، اس ترجمہ کے بعد کچھ بھی اشکال نہیں، اس طرح ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے مجھ کو کچھ پوچھنا ہے، مگر اول اس آیت کا ترجمہ کردو، ووجدك ضالا فهدىٰ میں نے کہا کہ اس کا ترجمہ یہ ہے اور پایا خدا نے آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا، سن کر میرا منہ دیکھنے لگے، میں نے کہا جو پوچھنا ہو پوچھیئے، کہنے لگے اب تو کچھ بھی نہیں رہا، میں نے کہا کہ کیا آپ مجھ سے یہ امید کرتے ہیں، کہ میں اس جگہ ضالاً کا ترجمہ گمراہ سے کرونگا، بعض تراجم میں گمراہ سے ترجمہ کیا ہے، جس سے لوگوں کو اشکال پڑجاتا ہے لیکن ان حضرات پر کوئی الزام نہیں ممکن ہے اس وقت گمراہ کے معنے ناواقف بھی مستعمل ہوتے ہوں، جیسا کہ عربی میں ضلالت کے معنی غیبت اور فقدان کے بھی آتے ہیں چنانچہ کھوئی ہوئی چیز کو ضالہ کہتے ہیں جس کے معنی مفقود الخبر کے ہیں، اسی طرح ضالّ کا اطلاق فاقد الخبر پر بھی آتا ہے، جس کا ترجمہ ناواقف ہے لیکن اب فارسی واردو کا محاورہ بدل گیا، اب گمراہ اسے کہتے ہیں جو باوجود راستہ جاننے کے ٹیڑھے راستہ پر چلے، آجکل بیخبر اور ناواقف کو گمراہ نہیں کہتے، اس لئے اب گمراہ سے ترجمہ کرنا صحیح نہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نبوت سے پہلے بعض علوم سے ناواقف ہونا کچھ عیب نہیں کیونکہ ظاہر ہے، کہ جو علوم نبوت کے بعد آپ کو عطا ہوئے نبوت سے پہلے آپ

ان سے ناواقف تھے اگرچہ اس وقت بھی دنیا بھر کے عقلاء سے زیادہ آپ واقف کار تھے لیکن علوم قرآن واحکام سے تو خبردار نہ تھے؛ یہ تو علم نبوت کے بعد ہی آپ کو حاصل ہوا؛ اسی کو حق تعالیٰ دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشاء انہ علی حکیم ط وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا ماکنت تدری ما الکتب ولا الایمان ولکن جعلنہ نورا نھدی بہ من نشاء من عبادنا ط وانک لتھدی الی صراط مستقیم ہ (ترجمہ) اور کسی بشر کی (بحالت موجودہ) یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرماوے مگر (تین طریق سے) یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے یا کسی فرشتہ کو بھیج دے؛ کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے؛ پیغام پہنچا دیتا ہے بیشک وہ بڑا عالی شان بڑی حکمت والا ہے اسی طرح (یعنی اسی قاعدہ کے موافق ہم نے آپ کے پاس (بھی) وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے؛ (اور اس کے قبل آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان (و معرفت کا اعلیٰ درجہ جو کہ اب آپ کو حاصل ہے وہ) کیا چیز ہے (گونفس ایمان ہر نبی کو ہر وقت نبوت سے پہلے بھی حاصل ہوتا ہے) ولیکن ہم نے اس قرآن کو ایک نور بنایا؛ جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں؛ ہدایت کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ آپ (اس قرآن اور وحی کے ذریعہ سے عام لوگوں کو) ایک سیدھے راستہ کی ہدایت کرتے ہیں (سورۃ الشوریٰ) پارہ ۲۵ میں ووجدک ضالا فھدیٰ میں

ضال کے معنی وہی ہیں جو اس آیت ما کنت تدری الخ سے معلوم ہوتا ہے یعنی خدا کی تعلیم وہدایت سے پہلے آپ ان علوم سے بیخبر تھے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی نقص نہیں! بلکہ عین کمال ہے کیوں کہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے تبلانے سے پہلے انبیار کو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا؛ نہ ان کے پاس کمالات بدون اعطار الٰہی کے ہوتے ہیں گو ہم کو ایسا کہنا زیبا نہیں دتیا کہ انبیار کے پاس کچھ کمالات نہ تھے کیوں کہ اس سے ایہام بے ادبی کا ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ کے ذمہ تو حضور کا ادب لازم نہیں آپ تمام عالم کے سردار اور سب سے افضل ہیں مگر حق تعالیٰ کے تو بندے ہی ہیں اس لئے حق تعالیٰ آپ کو ناواقف اور بے خبر جو چاہیں کہہ سکتے ہیں تو دیکھئے اس سائل کو حقیقت نہ معلوم ہونے کی وجہ سے ووجدک ضالاً فھدی میں اشکال پڑا کیوں کہ اس نے ترجمہ میں گمراہ کا لفظ دیکھا اور اس سے وہ معنی سمجھا جو آجکل کے محاورہ میں گمراہ کے معنی ہیں اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ ترجمہ عوام کو خود نہ دیکھنا چاہیے بلکہ علمار سے پڑھنا چاہیئے؛ ورنہ ایسے ایسے اشکالات ترجمہ دیکھنے سے پیدا ہوں گے جن کا جواب عوام کے ذہن میں نہ آئے گا، چنانچہ قرآن میں حق تعالیٰ کی صفت استغنار کو دیکھ کر بعض لوگ یہی سمجھے کہ حق تعالیٰ ایسے مستغنی ہیں جیسے ہمارے محاورہ میں کسی کو مستغنی کہا کرتے ہیں حالانکہ استغنا کے معنی عربی میں یہ ہیں کہ اس کو کسی کی حاجت نہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں اور ہمارے محاورہ میں مستغنی اُسے بھی کہتے ہیں جسے کسی کے نفع وضرر کی پرواہ نہ ہو؛ اب لوگ غضب کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو باین

معنی بھی غنی سمجھتے ہیں چنانچہ ایسے مقام پر اس صفت کو استعمال کرتے ہیں جہاں سوا اس کے اور کچھ معنی ہو ہی نہیں سکتے ۔

خدا کی مصلحت و حکمت

مثلاً کوئی ایک شخص جوانی کی حالت میں مر جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جاتا ہے اب لوگ اسکی تعزیت میں جاتے ہیں ایک کہتا ہے کہ ہائے جوان موت مر گیا ابھی اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا ؛ دوسرے صاحب بولے کہ واقعی بہت ہی بے وقت موت آئی یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ان کی تعلیم و تربیت کا کون انتظام کرے گا ؛ زمینداری یا ریاست کو کون دیکھے بھالے گا ؛ اس کے بعد تیسرا کہتا ہے کہ ارے بھائی خدا کی ذات بڑی بے پرواہ ہے وہ بڑا مستغنی ہے اب ایسے موقع پر اس کلام کے معنی سوا اس کے اور کیا ہیں کہ نعوذ باللہ خدا کو کسی نفع و ضرر کی پرواہ نہیں کسی کی مصلحت و حکمت پر نظر نہیں بس شاہزادہ کی طرح بے وجہ حکم دے دیا کہ فلاں شخص کو مار ڈالو تو بس لگا دو مارشل لا جاری کر دو نہ اس کی بیوی کا خیال ہے نہ بچوں پر رحم ہے نعوذ باللہ منہ واللہ میرا تو اس سے رونگٹا کھڑا ہوتا ہے یہ سخت بے ادبی کا کلمہ ہے مگر لوگوں کو ذرا اس پر توجہ نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں صاحبو خوب سمجھ لو کہ حق تعالیٰ سے زیادہ کوئی رحیم و کریم نہیں ان کی برابر کسی کو شفقت نہیں ہو سکتی ؛ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کئے ایک حصہ تو اس نے دنیا میں ظاہر کیا ؛ جس کا یہ اثر ہے کہ باپ ماں کو اولاد سے دوست کو دوست سے جانوروں کو اپنے بچوں سے

محبت وشفقت ہوتی ہے اور ننانوے حصے خدا تعالیٰ کے پاس ہیں کہ ان میں مخلوق کو حصہ نہیں دیا گیا اب آپ غور کریں کہ جس رحمت کے ایک حصہ کا یہ اثر ہے جو دنیا میں ہم سب کو نظر آ رہا ہے کہ باپ ماں اس کی وجہ سے بچے کی تکلیف کو نہیں دیکھ سکتے تو خدا تعالیٰ کی رحمت وشفقت کا کیا ٹھکانا ہے! جس کی رحمت سے اس کو وہ نسبت ہے جو سو سے ایک کو حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ ننانوے حصوں کے ساتھ اس ایک حصہ کو شامل کر کے سو حصہ میں رحمت سے مسلمانوں کے ساتھ پیش آئیں گے! بخدا اس وقت ہم اس رحمت کا اندازہ ہرگز نہیں کر سکتے یہ تو آخرت کی رحمت کا حال ہے رہی دنیا میں حق تعالیٰ کی رحمت سو اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دنیا میں جس کسی کے اندر رحمت کا کچھ اثر ہے یہ خدا کی رحمت کے اس ایک حصہ کا ظل ہے جو اس نے دنیا میں ظاہر کی ہے! تو خود اصل کی کیا حالت ہو گی پس دنیا میں بھی حق تعالیٰ کی رحمت اس درجہ بڑی ہے کہ مخلوق کی رحمت کو اس سے کچھ نسبت بھی نہیں! کیا یہ رحمت ہی نہیں کہ ہم لوگ رات دن گناہ اور نافرمانی میں مبتلا ہیں اور حق تعالیٰ ہم کو عذاب سے ہلاک نہیں فرماتے بلکہ برابر اسباب حیات وسامان راحت عطا فرماتے رہتے ہیں! چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں:

ولو یؤاخذ اللہ الناس بما کسبوا ما ترک علیھا من دابۃ ولکن یؤخرھم الی اجل مسمّٰی: اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے ان کے افعال پر مواخذہ کرنے لگے تو زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑے لیکن وہ ان کو ایک میعاد

معین تک ڈھیل دے رہا ہے اس پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ گناہ تو انسان و جن کرتے ہیں پھر اس کی کیا وجہ کہ مواخذہ کے وقت زمین پر کوئی چلنے والا نہ چھوڑا جاتا، آخر حیوانات کی کیا خطا ہوئی وہ تو مکلف نہیں ہیں، سو بات یہ ہے کہ مواخذہ کے وقت انسان و جن تو گناہوں کی وجہ سے ہلاک کئے جاتے ہیں اور حیوانات اس لئے ہلاک کئے جاتے کہ وہ محض مکلفین کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں جب مکلفین باقی نہ رہتے تو حیوانات کی بقار کی ضرورت نہ رہتی، اس لئے سب ہی ہلاک کر دیئے جاتے رہا یہ کہ بعض لوگ تو نیک کام کرتے ہیں وہ کیوں ہلاک ہوتے سو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ نیک کام کرتے ہیں وہ بھی گناہوں سے بچے ہوئے نہیں ماسوائے الانبیار علیہم الصلوات والسلام ہیں یا تو وہ اس سے مخصوص ہیں یا یہ کہا جائے کہ حضرات انبیار علیہم السلام کا دنیا میں تشریف رکھنا صرف ہدایت مکلفین کے لئے ہے جب یہ نہ رہتے تو یہ حضرات آخرت میں رہتے مگر حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ان گناہوں پر مؤاخذہ نہیں فرماتے تنبیہ کا مضمون ختم ہوا،

سہل تعلیم اور احکام

(اصل مضمون یہ تھا کہ) حق تعالیٰ تعلیم میں بندوں پر بے حد شفقت کی رعایت فرماتے ہیں چنانچہ اس کی فرع یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے مخلوق کو ایسے کاموں کا مکلف نہیں بنایا جو ان پر دشوار ہوں، بلکہ بہت سہل سہل احکام مقرر فرمائے ہیں، صاحبو! ہم چار روپے کے نوکر سے وہ کام لیتے ہیں جو حق تعالیٰ نے باوجود اس تو انعم کے ہم سے نہیں لئے چار پانچ روپے ماہوار پر اگر آپ کسی کو نوکر رکھیں تو وہ تمام دن کے لئے آپ کا پابند ہو جاتا ہے اور دن بھر جو چاہیں

آپ اس سے کام لیتے ہیں کسی کام کا اس کو حق نہیں ہوتا؛ اور حق تعالیٰ نے آپ کو دن رات میں پانچ نمازوں کا مکلف کیا ہے؛ جن میں مجموعی طور پر ایک گھنٹہ سے زیادہ صرف نہیں ہوتا پھر یہ بھی حقیقت میں تمہارا ہی کام ہے خدا کا کام نہیں وہ ہماری نمازوں سے مستغنی ہے مولانا فرماتے ہیں؛ ؎

ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ
وز گراں جانی و چالاکی ہمہ

یعنی حق تعالیٰ ناپاکی سے تو پاک ہیں ہی وہ ہماری بیان کی ہوئی پاکی سے بھی پاک ہیں یعنی سبحان اللہ والحمد للہ میں جو تم کہتے ہو؛ کہ خدا تعالیٰ پاک ہیں تو وہ تمہاری اس پاکی بیان کرنے سے بھی پاک ہیں؛ کیوں کہ خدا تعالیٰ کی پاکی ہمارے ذہن میں بھی نہیں آسکتی؛ پس اس صورت میں ہماری تنزیہ کی یہ کیفیت ہوگی کہ ؎

شاہ را گوید کسے جولاہ نیست
ایں نہ مدح ست او مگر آگاہ نیست

یعنی ہم جو خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے؛ جیسے کوئی بادشاہ کی تعریف میں یہ کہے کہ وہ جولاہ نہیں ہے کہ اس تعریف کو بادشاہ کی تعظیم سے کچھ بھی نسبت نہیں؛ بعینہ یہی مثال ہماری تسبیح وتحمید کی ہے؛ حق تعالیٰ کی حقیقی پاکی ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی؛ مگر با ایں ہمہ حق تعالیٰ کی رحمت وشفقت ہے کہ ہماری طاعت وذکر کو قبول فرما لیتے ہیں اگر کوئی شخص کسی بادشاہ کی تعریف اس طرح کرنے لگے کہ حضور کی بہت بڑی شان ہے آپ نہ جلاہے ہیں نہ دھنے ہیں تو پھر دیکھو اس کی کیا گت بنتی ہے! مگر حق تعالیٰ ہماری تسبیح وتحمید کو قبول فرما لیتے ہیں، حالانکہ وہ بھی ایسی تعریف ہے بس ہمارے

ذکر و طاعت کی قبولیت کی یہ مثال ہے! سب کو مولانا فرماتے ہیں:

این قبول ذکرِ تو از رحمت است … چوں نمازِ مستحاضہ رخصت است

یعنی مستحاضہ عورت جس کو ہر وقت خون آتا رہتا ہے شریعت نے اسکو معذور سمجھ کر حکم دیا ہے کہ اسی حالت میں نماز پڑھتی رہے! خون ٹپک رہا ہے؛ کپڑے اور بدن ناپاک ہے! مگر اس حالت میں بھی اس کو دربار میں آنے کی اجازت ہے، کچھ ٹھکانا ہے! شفقت کا! بس یہی مثال ہمارے ذکر و طاعت کی ہے کہ ہم باطنی ناپاکیوں میں ملوث ہیں مگر رحمت کی وجہ سے قبول فرما لیتے ہیں! خدا کی رحمت ایسی شفقت ہے کہ کوئی کیسا ہی گناہ گار ہو مگر ہر وقت اس کو دربار میں آنے کی اجازت ہے!

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ … گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

این درگہِ نومیدی نیست … صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

بے مثالی شفقت اگر دن میں سو مرتبہ گناہ کرے اور پھر توبہ کرنا چاہے تب بھی اس کو اجازت ہے! کہ دربار میں آجائے اور توبہ کر کے پاک و صاف ہو جائے! دنیا میں کسی حاکم کو بلکہ اپنے باپ کی بھی ایک بار سرکشی کر کے پھر منہ دیکھانے کے قابل نہیں! مگر وہاں سو بار، ہزار بار سرکشی کرنے کے بعد بھی فرماتے ہیں! کہ آجاؤ ہم سب معاف کر دیں گے! اس قدر استغنا کے ساتھ یہ شفقت نہایت عجیب ہے (چنانچہ آیت بالا میں اشکروا للہ سے پہلے) کلوا من طیبات ما رزقناکم فرمانا یہ بھی اسی شفقت سے ناشی ہے پھر اس میں دوسری شفقت یہ ہے کہ عبادت کو شکر

سے تعبیر کیا عبد اللہ نہیں فرمایا بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے آخر تم پر بہت انعامات کیے ہیں! تمہارے لئے پاکیزہ نعمتیں کھانے پینے کو پیدا کی ہیں تم ہماری نعمتوں میں سرتاپا غرق ہو گیا! اس کی قدر ضروری نہیں کیا نعمت کا شکر لازمی نہیں یہ ایسا عنوان ہے! جس کو ہر شخص فوراً تسلیم کر لیتا ہے، کیوں کہ نعمت کا شکر ادا کرنا عقلاً ہر شخص کے نزدیک ضروری ہے؛ حق تعالیٰ کو یہ بھی حق تھا کہ ہم کو صاف صاف فرما دیتے کہ تم کو ہماری عبادت کرنا چاہیئے؛ مگر غایت شفقت کی وجہ سے یہ عنوان اختیار فرمایا کہ تمہارے اوپر ہمارے بہت سے انعامات ہیں ان کے شکریہ میں کچھ ہمارا بھی کام کرلو! پھر بیری شفقت یہ ہے کہ حقیقت میں عبادت کرنا ہمارے واسطے نافع ہے خدا کو اس کی کچھ ضرورت نہیں! پس واقع میں وہ ہمارا ہی کام ہے مگر شفقت کی وجہ سے اس کو اپنا کام کہہ دیا؛ جیسے باپ بیٹے سے کہا کرتا ہے کہ ہم تم کو مٹھائی دیں گے، تم ہمارا ایک کام کر دو؛ وہ یہ کہ سبق سنا دو؛ حالانکہ سبق سنانا اسی کا کام ہے! اسی کے نفع کی چیز ہے؛ غرض حق تعالیٰ کی تعلیم کے سہل ہونے کی لم یہ ہے کہ ان کو اپنے بندوں کے حال پر شفقت بہت زیادہ ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام میں بھی شفقت اسی طرح جھلک رہی ہے جیسے آئینہ میں نور آفتاب جھلکتا ہے اس لئے حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم بھی بہت سہل ہوتی ہے! انبیاءؑ کی بالکل ایسی مثال ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہمی گویم

ظاہری و باطنی اصلاح

انبیاء میں جو سب سے اکمل ہے، ان میں ظہور صفات بھی اکمل ہوتا ہے اسی لئے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں شفقت و سہولت سب سے کامل ہیں، اور منافع بھی آپؐ کی تعلیم میں بہ نسبت دوسروں کی تعلیم کے زیادہ ہیں، چنانچہ اس وقت جو ارشاد حضورؐ کا میں نے بیان کے لئے اختیار کیا ہے، وہ بظاہر ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کے بجالانے میں جو منافع ہے، اور ترک میں جو مضار ہیں ان کو معلوم کر کے اس کی ضرورت و اہمیت ظاہر ہو گی، پھر جب اس پر نظر کی جائے گی کہ ہم لوگ اس کی طرف سے کس قدر بے التفاتی برت رہے ہیں، تو اس سے اس کی ضرورت اور زیادہ مؤکد ہو جائے گی اب سمجھنا چاہیئے کہ ہم لوگ جن گناہوں کو چھوڑے ہوئے ہیں ان میں بعض تو اس لئے متروک ہیں کہ وہ وضع کے خلاف ہیں، مثلاً چوری کرنا۔ زناکاری۔ غصب کرنا، یہ ایسے کام ہیں جو محض اپنی شریفانہ وضع کی رعایت سے اکثر لوگ نہیں کرتے اور جو کام ہماری وضع کے خلاف نہیں گو شرعاً ان کا ارتکاب کتنا ہی گناہ عظیم ہو، ان میں اکثر لوگ مبتلا ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے اندر بعض گناہوں کے نہ ہونے کا سبب خوف خدا نہیں ہے اور جو لوگ خوف خدا کی وجہ سے بھی گناہ چھوڑتے ہیں، وہ بھی اکثر سب گناہوں کو نہیں چھوڑتے، بس وہ نماز پڑھ لیں گے، زکوٰۃ دے دیں گے، تو اپنے نزدیک جنید ہو گئے اور حج کر لیا تو جنید کے بھی پیر ہو گئے، بس انہوں نے انہی اعمال کو ضروری سمجھ لیا، باقی اعمال کی ان کو پرواہ نہیں، دل میں کبر و ریا بھری ہوئی ہے

رضا بالقضا نہیں ہے خدا کے ساتھ محبت نہیں معرفت نہیں جاہ طلبی حسد دل میں موجود ہے، مگر وہ بے فکر ہیں، حالانکہ حکم یہ ہے: وذروا ظاهر الاثم وباطنه کہ ظاہری اور باطنی سب گناہوں کو چھوڑ دو، یہ لوگ محض ظاہر کو سنوارتے ہیں، باطن کی اصلاح کا اہتمام نہیں کرتے، بس وہ حال ہے ؎

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ میدارد یزید

از بروں چوں گور کافر پر حلل — واندروں قہر خدائے عز و جل

بس ہماری وہی حالت ہے کہ اوپر سے اپنے آپ کو سنوار رکھا ہے اور کپڑا اٹھا کر دیکھو تو گوہ در گوہ ہو رہے ہیں ایک بزرگ نے ایک جوان کو دیکھا، کہ اکڑ کر چل رہا ہے، آپ نے اس کو ٹوکا، کہ ذرا سنبھل کر چلو، وہ کہنے لگا، تم جانتے نہیں ہم کون ہیں فرمایا ہاں میں خوب جانتا ہوں، کہنے لگا تبلاؤ تم کیا جانتے ہو، آپ نے فرمایا اولك نطفة مذرة واخرك جيفة قذرة وانت بين ذلك تحمل العذرة کہ تمہاری ابتدا تو ایک ناپاک نطفہ ہے اور تمہاری انتہا سڑی ہوئی لاش ہے کہ مرنے کے بعد تمہارے اندر ہزاروں کیڑے پڑ جائیں گے اور مردہ لاش میں ایسی بدبو آئے گی، کہ کوئی پاس بھی نہ پھٹک سکے گا، اس لئے شریعت نے حکم دیا ہے کہ مر جانے کے بعد دفن میں جلدی کرو، شریعت کا یہ مقصود ہے کہ مسلمان مردہ کو ایسی حالت میں اپنے سے جدا کیا جائے کہ کوئی بات موجب نفرت کے اس کے اندر نہ پیدا ہو، دیر کرنے میں اندیشہ ہے، کہ لاش پھول جائے اس میں سے بدبو آنے لگے اور اس حالت کو دیکھ کر لوگ اس کو حقارت سے دیکھیں، اور نفرت ظاہر کرنے لگے، یہ تو اکرام

میت کے منافی ہے؛ غرض یہ ہماری انتہائی حالت ہے؛ جس میں بڑے سے بڑا عاشق بھی ہماری لاش کو جلدی دفن کر دینا ہی چاہے گا؛ اور درمیانی حالت یہ ہے کہ تم ہر وقت گوہ کا ٹوکرا ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہو؛ کیوں کہ تمہارے پیٹ کے اندر نہ معلوم کتنے سیر پاخانہ بھرا ہوا ہے؛ یہ خدا کی رحمت ہے! کہ اس نے پیٹ کو ڈھکا ڈھول بنا دیا ہے کہ اس میں پاخانہ بھرا ہوا ہے؛ مگر پاس بیٹھنے والوں کو کچھ خبر نہیں ہوتی؛ واقعی اگر امعاء میں قوتِ ماسکہ نہ ہوتی؛ جس کی وجہ سے وہ پاخانے کو روکے رہتی ہے اور ایک معین وقت میں سارا بوجھ باہر نکال دیتی ہے تو ہماری کیسی بری گت بنتی ہے بس ہر وقت موری سے پاخانہ بہا کرتا؛ چنانچہ جب کسی مرض یا بڑھاپے کی وجہ سے یہ قوتِ ماسکہ کمزور ہو جاتی ہے! تو اس شخص کی تیمار دار بھی گھبراتے ہیں؛ سارا گھر بدبو سے سڑ جاتا ہے؛ سارے گھر میں ایک موری کی وجہ سے سڑاہند پھیل جاتا ہے؛ تو یہ خدا کی کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس نے امعاء میں قوتِ ماسکہ رکھ دی ہے ورنہ ہر وقت نجاست بہا کرتی؛ پھر دیکھو انسان کے بدن میں ہزاروں مسامات ہیں؛ جیسے پسینہ نکلتا ہے؛ یہ خدا کی کتنی بڑی رحمت ہے؛ کہ ان مسامات سے پاخانہ کا عرق کبھی باہر نہیں آتا؛ اگر مسامات سے پاخانہ نکلا کرتا تو زندگی موت ہو جاتی تو محض خدا کی رحمت کی وجہ سے آپ بنے ٹھنے پھرتے ہیں؛ ورنہ یہاں کے اندر اتنا پاخانہ بھرا ہوا ہے کہ اگر وہ ہر وقت نکلنے لگے اس وقت اس زینت و آرائش کی ساری مٹی پلید ہو جائے؛ غرض ان بزرگ نے خوب جواب دیا؛ کہ ہاں میں جانتا ہوں کہ تو کون ہے؛ بس تیری

حقیقت تو یہ ہے! آگے خدا کی ستاری ہے کہ اس نے تیرے پیٹ کو ڈھکا ڈھول بنا دیا ہے تو کیا اس نعمت کا یہی شکریہ ہے کہ تو فرعون کی طرح اکڑ کر چلے؛

صاحبو! جس طرح ہمارا ظاہر ناپاک معلوم ہو رہا ہے؛ اسی طرح ہمارا باطن بھی ناپاک ہے مگر خدا کی رحمت سے وہ پاک معلوم ہو رہا ہے؛ اسی طرح ہمارا باطن بھی پاک ہے؛ جس کی اطلاع خدا ہی کو ہے یا ہم کو ہے دوسروں کو کچھ خبر نہیں کہ ہمارے دل میں کیا کیا گندگی بھری ہوئی ہے بخدا اگر دلوں کی گندگی کی بدبو محسوس ہونے لگے تو پاخانہ کی بدبو کی اس کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہ رہے اور جن لوگوں کو محسوس ہوتی ہے وہ ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ بھی رحمت الٰہی ہے کہ اس گندگی کی بدبو ہر اک کو محسوس نہیں ہوتی؛ جس سے لوگ اپنے آپ کو پاک وصاف اور ستھرے سمجھنے لگے؛ صاحبو! تم کو زکام ہو رہا ہے؛ اس لئے یہ بدبو محسوس نہیں ہوتی؛ کسی صحیح الدماغ کو اپنا حال دکھلا دو؛ وہ بتلائے گا کہ تمہارے دل میں کس قدر گندگی ہے؛ جس کی بدبو سے اس کا دماغ پریشان ہو گیا؛ کوئی مولانا یا کوئی شیخ اس پر مغرور نہ ہو؛ کہ لوگ ہم کو اچھا سمجھتے ہیں؛ ہماری تعظیم و تکریم کرتے ہیں تو ہم واقع میں بھی ایسے ہی ہیں؛ یقیناً دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ مخلوق کو دھوکہ دے رہے ہیں کہ لوگ ان کے ظاہری طرز اور عبادت و مجاہدات کی وجہ سے ان کو بزرگ سمجھنے لگے؛ دل کی کسی کو خبر نہیں کہ یہ سارا ڈھونگ ہی ڈھونگ ہی یا کچھ اخلاص بھی ہے۔ مگر یاد رکھو خدا کے سامنے یہ دھوکہ نہ چل سکے گا، مولانا فرماتے ہیں؛ ؎

اللہ اللہ می زنی از بہر نان بے طمع پیش آ و اللہ را بخوان

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام — در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست — با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کار با او راست باید داشتن — رایت اخلاص و صدق افراشتن

از مہر نان پر مجھے یاد آیا کہ ایک مولوی کانپور میں آئے ان کا کرتہ پھٹا ہوا نئے کرتہ کی ضرورت تھی ؛ آپ نے کیا حکمت کی تھی کہ ایک رئیس کے یہاں مولود پڑھنے گئے وہاں کسی شعر پر آپ نے وجد ظاہر کیا ؛ اور کرتہ چیر پھاڑ ڈالا اب اس بیچارہ رئیس کو غیرت آئی کہ مولانا صاحب میرے گھر پر کرتہ پہن کر آئیں اور یہاں سے ننگے تشریف لے جاویں ؛ اس نے فوراً نوکر کو بزاز کے یہاں بھیجا ؛ اور ان کے واسطے ایک تھان منگایا فوراً کرتے قطع ہوئے اور ایک کرتہ ان کو پہنایا باقی کرتے بھی شاید انہیں کے حوالے کر دیئے تھے ؛ اس کو مولانا فرماتے ہیں ؛ اللہ اللہ می زنی از مہرِ نان یہی وجہ ہے کہ وعظ و پند میں اثر نہیں عوام بھی سمجھ گئے کہ یہ سارا وجد نیا کرتہ لینے کے واسطے کیا تھا ؛ پھر ایسی حالت میں ان پر کیا خاک اثر ہو ؛ غرض مخلوق کو بہت دھوکہ دیا جا رہا ہے ظاہر میں وجد و حال کی صورت بنائی جاتی ہزار دانوں کی تسبیح ہاتھ میں رکھی جاتی ہے اور باطن میں ریا اور حب جاہ بھری ہوئی ہے ؛ مگر حق تعالیٰ کے یہاں یہ دھوکہ نہ چل سکے گا ؛ لیکن اس سے وہ لوگ خوش نہ ہوں جو کچھ بھی نہیں کرتے کہ ہم ریا سے محفوظ ہیں کیوں کہ ہم ذکر ہی نہیں کرتے جو ریا پیدا ہو ؛ سو خوب سمجھ لو کہ تم ان سے اچھے نہیں ؛ کیوں کہ وہ ذکر تو کرتا ہے گو ریا ہی سے سہی اور تم تو اتنا بھی نہیں کرتے ؛ ذکر اگر ریا سے بھی ہو تو نتیجہ وہ ایک روز مبدل بہ اخلاص ہو جاتا ہے ایک دن اپنا کام کر جاتا

ہے؛ چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص ریا سے ذکر کرتا ہو، اسے حقیر نہ سمجھو کیوں کہ ریا ہمیشہ ریا نہیں رہتی؛ وہ اول ریا ہوتی ہے؛ پھر کرتے کرتے عادت ہو جاتی ہے اور عادت کے بعد پھر اس کو دکھلاوے کا خیال رہتا ہے نہ لوگوں کو وہ عمل نیا معلوم ہوتا ہے؛ اس لئے عادت سے عبادت ہو جاتی ہے پھر اسمیں خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔ سبحان اللہ واقعی یہ حضرات حکماء ہیں کسی نے افلاطون کو خواب میں دیکھا تھا اس سے ارسطو اور جالینوس وغیرہ کے متعلق پوچھا کہ یہ لوگ فلسفی تھے؛ کہا کہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں؛ پھر جنیدؒ اور بایزید بسطامیؒ وغیرہ کے متعلق پوچھا کہا اولٰئک ھم الفلاسفۃ حقا یعنی سچے فلسفی یہی لوگ ہے؛ واقعی حکمت اسلامی کے مقابلہ میں حکمت یونان کی حکمت ہی کیا ہے کچھ بھی نہیں؛ سچے فلسفی اور حکیم یہی لوگ ہیں؛ یعنی صوفیہ کرام چنانچہ دیکھ لیجئے حضرت حاجی صاحب نے ریا کے متعلق کیسا عجیب مضمون بیان فرمایا جس سے ریا کا علاج بہت ہی سہل ہو گیا ہے کہ جس کام میں ریا کا خیال آتا ہو؛ اسکو بکثرت کرنا چاہیئے؛ اور ریا کی پرواہ نہ کرنا چاہیئے البتہ عقلاً عقیدۃً اس کو بُرا سمجھتے رہنا چاہیئے پھر کرتے کرتے وہ خود ہی عادت اور عادت سے عبادت ہو جائے گی؛ یہ ایسی حکمت ہے کہ حکماء یونان کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی اسی کے مناسب یہ مضمون ہے کہ بعض لوگوں کو ذکر میں یہ شکایت پیش آتی ہے کہ ہم کو حضور قلب نصیب نہیں ہوتا وساوس وخطرات ہجوم کرتے ہیں اس کا بھی یہی علاج ہے کہ ذکر کرتے رہنا چاہیئے اول اول محض ذکر لسانی ہوتا ہے؛ پھر کرتے کرتے حضور حاصل ہو جاتا ہے اسم سے مسمّٰی کی طرف انتقال خودبخود

ہوجاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

مست و لایعقل نہ ازجام ہو
اے زہو قانع شدہ بانام ہو

یہ تو شکایت ہے پھر اس سے اضراب کے طور پر فرماتے ؎

از صفت وز نام چہ زاید خیال
واں خیالت ہست دلال وصال

یعنی خدا کا نام لیتے لیتے اول ایک خیال قائم ہوجاتا ہے۔ پھر وہی خیال وصال کا وسیلہ بنجاتا ہے! صاحبو! خدا کے نام سے اثر ضرور ہوتا اور کیوں نہ ہو جب کہ مٹھائی اور کھٹائی کا نام لینے سے منھ میں پانی بھر آتا ہے تو خدا کا نام کیا اس سے بھی کم ہو گیا۔ ہرگز نہیں اس سے بھی ضرور ایک دن دل پر اثر ہو گا، کام میں لگا رہنا چاہیئے، گھبرانا نہ چاہیئے کھٹائی کے نام سے منھ میں پانی بھر آنے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ایک بادشاہ نے شہزادہ کو روزہ رکھوایا تھا، اور روزہ کشائی کی رسم کے لئے بڑے پیمانہ پر دعوت کا انتظام کیا تھا، لڑکے نے ظہر تک تو صبر کیا، لیکن عصر کے بعد اس سے نہ رہا گیا۔ مارے پیاس کے بے تاب ہو گیا، اور مچلنا شروع کیا، بادشاہ نے اطباء کو بلایا کہ کوئی ایسی تدبیر کرو، کہ اس کی پیاس کو تسکین ہو جائے اور روزہ بھی نہ جائے ورنہ سارا کیا کرایا سامان برباد ہو جائے گا، سب اطباء اس کے علاج سے عاجز ہو گئے ایک غیر مشہور طبیب کی سمجھ میں ایک نسخہ آیا، اس نے عرض کیا کہ حضور میں اس کا علاج کردوں گا، آپ چند لڑکوں کو بلا لیجئے اور تھوڑے سے لیموں منگا دیجئے، چنانچہ فوراً انتظام کیا گیا، اس نے لڑکوں سے کہا کہ شہزادے کے سامنے لیموں کاٹ کاٹ کر کھانا شروع کردو، بس لیموں کو کھاتے ہوئے دیکھ کر شہزادہ کے

منہ سے رطوبت کے دریا پیدا ہوگئے، طبیب نے کہا کہ اس رطوبت کو نگلنا شروع کرو، بس لعاب دہن کے نگلنے سے روزہ بھی نہیں ٹوٹتا اس نے لعاب کو نگلنا شروع کیا، بس پیاس کو فوراً تسکین ہوگئی، بادشاہ اس تدبیر سے بہت خوش ہوا اور طبیب کو بہت کچھ انعام دیا، بس جب لیمون کے نام میں یہ خاصیت ہے تو خدا کے نام میں کیوں یہ خاصیت نہ ہوگی، کہ اس سے دل بھر آئے الغرض ریا کا قصد تو نہ کرنا چاہیئے، لیکن اگر ایک دن میں ریا زائل نہ ہو تو ذکر کو چھوڑنا بھی نہ چاہیئے کرتے رہنا چاہیئے رفتہ رفتہ ریا خود زائل ہوجائے گی، وہ خدا کا نام تم کو انشاء اللہ خدا ہی تک پہنچادے گا، نہ ہونے سے ذکر کا ہونا بہرحال اچھا ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ کوئی شیخ صاحب یا مولانا صاحب مخلوق کی تعظیم و تکریم پر مغرور نہ ہوں، وہ یا تو مخلوق کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اگر کسی کا قصد دھوکہ دینے کا نہ بھی ہو، تو خدا کی ستاری ہے کہ اس نے ہمارے عیوب مخلوق سے چھپا دیئے ہیں اور محاسن ظاہر کر دیئے ہمارے اندر کبر ہے ریا ہے حسد ہے۔ حب جاہ ہے، لیکن مخلوق کو خبر نہیں، وہ ہم کو اس عیوب سے پاک سمجھتے ہیں، اس لئے تعظیم و تکریم سے پیش آتے ہیں اگر لوگوں کو ہمارے عیوب باطنیہ کی خبر ہوجائے تو سب سے پہلے وہ ہماری گت بنائیں لیس اگر خدا کی ستاری سے ہمارے عیوب ظاہر نہ ہوں تو ہم کو اپنا معتقد نہ ہونا چاہیئے غضب تو یہ ہے کہ لوگوں کی تعظیم و تکریم عقیدت سے ہم خود بھی اپنے معتقد ہوجاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم واقع میں کچھ ضرور ہیں، عجب ہی تو اتنے آدمی بڑا سمجھتے ہیں، سو خوب سمجھ لو بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ

ہر شخص اپنی حالت کو دوسرے زیادہ جانتا ہے اور دوسرے اس کی اندرونی حالت سے محض اس لئے بے خبر ہوتے ہیں! بس تعجب ہے کہ چند نا واقفوں کی تعظیم و تکریم سے تم واقف ہو کر اپنے معتقدین گئے آجکل بکثرت یہی حالت ہے! کہ باوجودیکہ باطن سراپا گندہ ہے لیکن ظاہری تقویٰ کو کافی سمجھا جاتا ہے اس کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے باطن میں کیا کیا گندگی بھری ہوئی ہے اس پر میں نے یہ شعر پڑھا تھا! ؎

از بروں چوں گورِ کافر پُر حلل | واندروں قہرِ خدائے عزوجل

لایعنی امور سے احتیاط

حاصل یہ کہ بعضے منکر رذائل کے ازالہ کی طرف التفات بھی نہیں کرتے منجملہ ان ہی رذائل کے اشتغال بما لایعنی ہی ہے جس کے نسبت یہ ارشاد ہے یعنی من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ! کہ غیر ضروری اور لایعنی امور کو ترک کر دیں اس پر نہ مشائخ کو التفات ہے نہ غیر مشائخ کو سب غور کر کے دیکھ لیں کہ دن بھر میں کتنی بار فضول باتیں کرتے ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ آدمی لایعنی امور کو ترک کر دے اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا حسن اس کے بغیر حاصل نہیں ہوتا تو کیا اسلام کے حسن کی آپ کو ضرورت نہیں حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کے والد ہمیشہ نظر نیچی رکھتے تھے! اگر کوئی ان سے بات بھی کرتا تو نظر اٹھا کر اس کو نہ دیکھتے تھے! سر نیچے کئے بات کا جواب دیتے لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ بات کا سننا کان کے متعلق ہے اور جواب دینا زبان کے متعلق ہے نگاہ کا اس میں کچھ کام نہیں تو میں نے بے فائدہ اپنی نظر کو کیوں

صرف کیا، صاحبو! جن لوگوں کو اپنے اسلام کے کامل کرنے کا خیال ہوتا ہے، وہ تو لایعنی امور سے اتنی احتیاط کرتے ہیں کہ منظر کو بھی بے فائدہ نہیں صرف کرتے اور اس میں جو نفع ہے اس کو ابھی آپ نہیں سمجھ سکتے، اس پر عمل کر کے دیکھئے کس قدر دل میں نور پیدا ہوتا ہے پھر آپ کو محسوس ہوگا، کہ بے فائدہ نظر کرنے سے کتنا ضرر ہوتا ہے غرض یہ کہ معلوم ہو گیا کہ اس سے غفلت سب کو ہے، اور ایسی غفلت ہے کہ لایعنی امور کا ارتکاب کر کے ندامت بھی کسی کو نہیں ہوتی، گناہ بھی لوگ کرتے ہیں۔ مگر اس سے ندامت تو ہوتی ہے، چنانچہ غیبت کر کے سب پچھتاتے ہیں، مگر ہنسی دل لگی کر کے کوئی نہیں پچھتاتا کہ اے اللہ میں نے فضول وقت ضائع کیا میری توبہ ہے اگر لایعنی امور سے ایسی احتیاط نہ ہو سکے، جیسی مولانا رفیع الدین صاحب کے والد کرتے تھے کہ وہ منظر کو بھی بے فائدہ صرف نہ کرتے تھے تو ایسا بھی تو نہ ہونا چاہیئے کہ بالکل وہ درد ہی ہو جاوے کہ کسی وقت اس سے بچنے کا خیال ہی نہ ہو، اب سمجھو کہ لایعنی کسے کہتے ہیں، افعال کی تین قسمیں ہیں کہ ایک وہ جو نافع ہیں خواہ دنیا میں یا دین میں دوسرے وہ جو مضر ہیں دنیا میں یا آخرت میں تو جو امور نافع ہیں خواہ دنیا میں دین میں وہ تو ضروری ہیں انکے چھوڑنے کو میں نہیں کہتا البتہ اتنی قید ضروری ہے کہ جو امور دنیا میں نافع ہوں شریعت سے انکی اجازت ہونی چاہیئے اگر اجازت نہ ہو گی تو وہ دوسری قسم میں داخل ہو جائیں گے، جو کہ آخرت میں مضر ہیں کیوں کہ ناجائز کام میں یہ ممکن ہے کہ دنیا کا نفع بظاہر معلوم ہوتا ہو، مگر آخرت میں اس سے ضرر ہو گا، عتاب و عذاب ہو گا، لیکن جب ایک کام دنیا میں بھی نافع ہے شریعت سے بھی اس کی اجازت ہے تو اس کو ضرور کر لینا چاہیئے، مثلاً ہم ایک شخص سے سودا کر رہے ہیں اور

اس کو مال دکھلا رہے ہیں اور وہ ہم سے جھک جھک کرتا ہے اور اگر اس میں ایک گھنٹہ بھی لگ جائے تو کچھ حرج نہیں یہ سب گفتگو ثواب میں داخل ہے بشرطیکہ جھوٹ اور فریب سے احتراز کیا جائے ! کیوں کہ اگر ہم خریدار سے بات چیت نہ کریں اور اس کو بار بار قسم قسم کا مال نہ دکھلائیں اور ایک چیز دکھلا کر ایک دفعہ قیمت بتلا کر خاموش ہو جائیں ! تو اس طرح تجارت نہیں چل سکتی اس لئے خریدار سے بات چیت کرنا ضروری ہے کیوں کہ دنیا کے لئے نافع ہے اور اگر تجارت کے سوا ہماری اور کوئی آمدنی نہ ہو تو دین کے واسطے بھی نافع ہے کہ کسب حلال کے لئے سعی ہے ضروری کی تفسیر میں لوگ غلطی کرتے ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بس نماز روزہ ہی ضروری ہے اور کوئی چیز ضروری نہیں یہ خیال غلط ہے ! ضروری وہ ہے جس کے ترک میں ضرر ہو ! دنیا کا یا آخرت کا اس تفسیر کیمطابق خریدار سے بات چیت کرنا بھی ضروری ہے اگر تم اس سے نہ بولو گے تو تجارت کو ضرر ہو گا ! اس وقت شریعت مقدسہ سکوت کی اجازت نہیں دیتی ! اگر اس مکالمت میں گھنٹہ دو گھنٹہ لگ جائیں تو یہ مت سمجھا جائے کہ وقت ضائع ہوا اور دین کا نقصان ہوا ! ہرگز نہیں یہ سارا وقت ضروری کام میں صرف ہوا ہے اگر نیت اچھی ہے ! مثلاً یہ نیت ہے کہ ہم اس خریدار سے اس لئے گفتگو کرتے ہیں ! تاکہ یہ کوئی چیز خریدے تو ہم کو مال حاصل ہو گا ! جس سے اہل وعیال کا نفقہ ملے گا یا صدقہ خیرات کریں گے ! تو اس تمام وقت میں ثواب بھی ملا یہ کتنی بڑی رحمت ہے ! یہاں سے معلوم ہوا ہو گا ! کہ شریعت کو ہماری دنیا کی کس قدر رعایت ہے پھر بھی لوگ شریعت کی قدر نہیں کرتے بس اگر تم کو تجارت کی ضرورت

و حاجت ہو تو جب تک یہ امید رہے کہ خریدار کچھ نہ کچھ خریدے گا۔ اس وقت تک سودا رنے میں کچھ بھی حرج نہیں چاہے کتنا ہی وقت صرف ہو جائے یہ سب ضرورت میں داخل ہے لایعنی نہیں ہے! اسی طرح ایک شخص غریب ہے سر پر امرودوں کا ٹوکرا رکھے ہوئے بیچتا پھرتا ہے وہ اگر تمام دن لیلو امرود کی صدا لگاتا پھرے تو اس میں بھی کچھ حرج نہیں! اس کا سارا وقت ضروری کام میں صرف ہوا! اور اس کے دن بھر لیلو امرود کہنے میں وہی ثواب ہے جو دن بھر اللہ اللہ کرنے میں ثواب ہے بلکہ اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ لیلو امرود کہنے میں خدا کا ذکر نہیں ہوتا لاؤ اس کے بجائے سبحان خالق الکمثری کہا کروں تو فقہاء نے اس کو ناجائز لکھا ہے کیوں کہ اس میں خدا کے نام کو دنیا کے واسطے استعمال کرنا ہے جس سے خدا کے نام کی بے ادبی ہوتی ہے اس شخص کو لیلو امرود کہنے ہی میں ثواب ہے اور سبحان خالق الکمثری کہنے میں کراہت ہے! اسی طرح اگر کوئی شخص پہرہ دینے کا ملازم ہے وہ رات بھر جاگو جاگو کہتا ہے تو اس کے جاگو جاگو کہنے میں کوئی ضرر نہیں! یہ بھی ضروری کام میں داخل ہے اس سے دل کا نور کچھ بھی کم نہ ہو گا اور اگر وہ بجائے جاگو کے لا الہ الا اللہ زور سے کہتا پھرے اور یہ سمجھے کہ جاگو کہنے میں خدا کا ذکر نہیں ہوتا! لاؤ ایسا لفظ پکاریں جس میں خدا کا ذکر بھی ہو جائے اور پہرہ بھی ہو جائے! تو فقہاء نے اس کو مکروہ لکھا ہے اور وجہ وہی ہے کہ اس نے خدا کے نام کو دنیا کے واسطے استعمال کیا! واقعی فقہائے دین کو خوب سمجھتے ہیں! بظاہر تو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ لا الہ الا اللہ پکار کر پہرہ دیا جائے! مگر فقہاء نے اس کو علت سمجھا ہے! وہ فرماتے ہیں کہ جاگو جاگو کہنے میں اس کو ثواب ملے گا

اور ذکر کے ساتھ پہرہ دینے میں گناہ ہوگا؛ اسی طرح راستوں میں بیٹھ کر قرآن پڑھنا اس نیت سے کہ کوئی ہم کو حاجت مند سمجھ کر کچھ دے گا؛ بالکل حرام ہے اگر کوئی حاجت مند زیادہ ہو؛ اور اس کو مانگنا جائز ہو صاف صاف سوال کرنا چاہیئے؛ قرآن کو موت سوال بنانا حرام ہے۔ فقہار نے ضرورت کی وجہ سے تعلیم پر اجرت لینے کو جائز کہا ہے لیکن ذکر خالص کو دنیا کا ذریعہ بنانا جس سے تعلیم مقصود نہ ہو حرام ہے؛ غرض پہرہ والے کا جاگو پکارنا فضول نہیں ہے بلکہ وہ اگر پہرہ چھوڑ کر چپکے چپکے نفلیں پڑھنے لگے؛ تو وہ خائن ہے اس نے اپنی ملازمت میں خیانت کی؛ اس حالت میں تنخواہ لینا اسے بالکل حرام ہے؛ اسی طرح اگر کوئی شخص ذکر و شغل میں مشغول ہو؛ اور اس وقت کوئی اس کے پاس نماز سیکھنے آئے تو اس وقت ذکر و شغل ترک کر دینا اور اس شخص سے بات چیت کرنا واجب ہے یہ بات چیت بھی ضرورت میں داخل ہے یا ہم تسبیح وغیرہ میں مشغول ہیں اور ایک آدمی نماز خراب پڑھ رہا ہو اس وقت واجب ہے کہ اپنا ذکر چھوڑ کر اسے ٹوک دیں؛ کہ نماز اطمینان سے پڑھو بشرطیکہ فتنہ اور لڑائی کا خوف نہ ہو؛ اگر ایسا خوف ہو اور نہ ٹوکا تو کچھ گناہ نہیں؛ لیکن اگر محض اپنے ذکر اور تسبیحوں کا خیال ہو تو کہ کون اس کو بتلائے کیوں اپنا کام چھوڑیں؛ یہ نماز خراب پڑھے گا تو خود ہی جہنم میں جائے گا؛ تو اس میں ان تسبیح پڑھنے والے صاحب کو بھی گناہ ہوگا؛ باوجود قدرت کے اس نے نہی عن المنکر میں کوتاہی کی؛ مگر آجکل کے لوگوں کو اپنے وظائف کا ایسا اہتمام ہوتا ہے کہ ان میں بولنا گناہ سمجھتے ہیں بس ایسی چپ سادھ کر بیٹھتے ہیں کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے بولنا جانتے ہی نہیں یاد رکھو

یہ سخت غلطی ہے ضرورت کے وقت بات چیت کرنا ذکر وغیرہ سے افضل ہے مگر لوگوں کی حالت یہ ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے بولنے بات کرنے کو برا نہیں سمجھتے اور وظیفہ میں بولنے کو گناہ سمجھتے ہیں، چاہے ان کے نہ بولنے سے کسی کی جان ہی جاتی رہے جیسے ایک دیہاتی زاہد رات کو مسجد میں بیٹھا ہوا مراقبہ کر رہا تھا وہاں ایک غریب مسافر بھی پڑا سو رہا تھا، جو سوتے ہوئے خراٹے لیا کرتا تھا، اس کے خراٹوں سے دیہاتی کے مراقبہ میں خلل پڑنے لگا، تو آپ نے اسے کو جگا کر بٹھا دیا کہ اٹھ کر بیٹھو یہ تم کیا کر رہے ہو، وہ غریب اٹھ کر بیٹھا مگر نیند کہاں جاتی ہے بے چارہ تھکا ماندہ تھا، تھوڑی دیر بعد پھر سو رہا اور ویسے ہی خراٹے لینے لگا، دیہاتی نے پھر اسے اٹھا دیا، وہ پھر کچھ دیر میں سو رہا اور ویسے ہی خراٹے لینے لگا اب تو دیہاتی سے نہ رہا گیا، اس نے نکال خنجر اس غریب کا کام تمام کر دیا کہ اب تو خراٹے نہ لے گا، صبح ہوئی لوگ نماز کو آئے تو مسجد میں خون ہی خون دیکھا پوچھا خان اس مسافر کو کس نے مارا تو آپ بے تکلف فرماتے ہیں کہ ہم نے مارا یہ ہمارے مراقبہ میں خلل ڈالتا تھا، سبحان اللہ! آپ کا مراقبہ نہ جائے چاہے کسی کی جان جاتی رہے؛ ع۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری؛ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ گڑ کھا دیں اور گلگلوں پر پرہیز، قتل تو کر دیں مگر مراقبہ نہ چھوٹنے پائے؛ استغفر اللہ العظیم؛

یہ سب باتیں جہالت سے پیدا ہوتی ہے لوگ بوجہ جہالت کے یہی نہیں سمجھتے کہ شرعاً کون سا کام ضروری ہے اور کون سا غیر ضروری ہے اسی لئے علم کی ضرورت ہے یا کم از کم علماء کی صحبت ہی ہو؛ تو ایسی غلطیاں پھر نہیں پیش آتیں الغرض تین قسم کے افعال ہیں، ایک وہ جن میں دنیا کا یا دین کا نفع ہو

یہ تو ضروری ہیں، دوسرے وہ جن میں دنیا کا یا دین میں ضرر ہو ان کا ترک ضروری ہے تیسرے وہ جن میں نہ دنیا کا دین کا نفع ہے نہ ترک میں ان دونوں کا ضرر ہے یہ قسم لایعنی ہے حدیث من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ میں اسی قسم کے افعال کو چھوڑنے کی ترغیب دی گئی ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے افعال سے منع فرماتے ہیں مگر اس کی طرف کسی کو بھی التفات نہیں ہے خصوصیت کے ساتھ اتقیاء کی شکایت کرتا ہوں کیوں کہ ہم جیسوں کے تو بہت سے گناہ ہیں ہم لوگ جب گناہوں میں مبتلا ہیں تو لایعنی امور میں ہمارا ابتلا چنداں عجیب نہیں ہم تو کہیں غیبت کرتے رہتے ہیں کہیں بدنگاہی میں مبتلا ہیں غرض سر سے پیر تک گناہوں میں غرق ہیں پھر ہم لایعنی امور میں بھی اگر مبتلا ہوں تو کچھ تعجب نہیں مگر افسوس اتقیاء پر ہے جو تمام گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں مگر لایعنی امور سے بچنے کا ذرا فکر نہیں کرتے بس حضرت شیخ ہاتھ تسبیح لئے بیٹھے ہیں تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھتے رہیں کہ ان کا دل مشغول بحق ہے، مگر ساتھ ہی ہنسی دل لگی بھی ہو رہی ہے، صاحبو! فضول باتوں سے قلب میں وہ ظلمت پیدا ہوتی ہے جس سے ذکر واذکار کا سارا اثر دھل جاتا ہے مگر اس کا ادراک ہر شخص کو نہیں ہو سکتا، جس کا دل نورانی ہوا سے اس ضرر کا ادراک ہوتا ہے، کالے توے پر اگر تھوڑی سی سیاہی اور لگ جائے تو اس پر کیا اثر محسوس ہو سکتا ہے ہاں شفاف آئینہ کو دیکھو کہ اس پر ذرا سی بھاپ سے بھی میلا پن آجاتا ہے، اور فوراً فرق محسوس ہوتا ہے، چنانچہ جن لوگوں کے قلوب شفاف ہیں ان کے ایسے واقعات منقول ہیں ایک ذرا سی بھی فضول بات سے کس

قدر متاثر ہوئے ہیں ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ اپنے ایک دوست کے مکان پر گئے جا کر آواز دی اندر سے جواب ملا کہ گھر میں نہیں ہیں، آپ نے پوچھا کہ کہاں گئے ہیں؛ جواب ملا معلوم نہیں کہاں گئے ہیں بس اس کے بعد ان کو فوراً تنبہ ہوا کہ میں نے سوال فضول کیا کہ کہاں گئے ہیں ممکن ہے کہ وہ کسی مخفی کام کے لئے گئے ہوں جس کا بتلانا مصلحت کے خلاف ہو؛ تو میں نے خواہ مخواہ اپنے ایک مسلمان بھائی کا راز دریافت کیا، بس اتنی بات پر تیس برس تک روتے رہے کہ میں نے یہ سوال کیوں کیا کہ وہ کہاں ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فضول بات کا اہل قلوب پر کتنا بڑا اثر ہوتا ہے ایک ڈاکٹر صاحب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں رہ کر ہندوستان واپس آئے تھے؛ کہ ایک مرتبہ ایک رئیس کی فٹن گاڑی میرے بلانے کے لئے آئی میں نے سوار ہونے سے عذر کیا کہ قریب جگہ ہے ویسے ہی چلا جاؤں انہوں نے اصرار کر کے بٹھلا دیا بس گاڑی میں پیر رکھنا تھا وہ نور معاً سلب ہو گیا؛ تو یہ امور جن کو ہم ہلکا سمجھتے ہیں صاف شفاف قلوب سے پوچھو کہ ان سے کس قدر ظلمت پیدا ہوتی ہے؛ صاحبو میں حرمت کا فتوے نہیں دیتا میں یہ نہیں کہتا کہ ایسے امور کے ارتکاب سے گناہ ہوتا ہے نہیں فتوے تو وہی ہے کہ گناہوں سے بچنا واجب ہے اور اتنی کاوش کی ضرورت نہیں مگر اس کا یہ تو مطلب نہیں ہو سکتا کہ یہ حدیث ہی پڑھنا فضول ہے آخر یہ بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے کہ لایعنی امور کا ترک کر دینا اسلام کی خوبی ہے اگر ہم سے بالکل ترک لایعنی نہ ہو سکے تو اس کی کثرت تو ترک کرنی چاہیئے رہا یہ کہ اس کا ضرر کیا

ہے تو جس طرح ترک لایعنی کے فائدہ کا احساس بھی نورِ قلب پر موقوف ہے! اور
اگر کسی کے دل میں نور نہ ہو تو اس کو کسی محقق کا قول مان لینا چاہیئے یا محقق کے
معتمد کی تقلید کر لینی چاہیئے! قاعدہ ہے کہ یا تو آدمی خود بینا ہو جب راستہ دیکھ
سکتا ہے اور اگر خود اندھا ہے تو اس کو کسی سوانکھے کی تقلید کرنی ضروری ہے
اگر اندھے آدمی سے ایک سوانکھا یہ کہے کہ اس راستہ میں گڑھا ہے اس سے بچ
کر چلو تو عقلاء یہی کہیں گے! کہ اندھے پر اس کی تقلید واجب ہے پھر حیرت ہے
کہ دین کے باب میں محققین کا قول نہ مانا جائے!

فضول باتوں سے پرہیز

سید المحققین سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فرماتے ہیں کثرۃ الکلام تقسو القلب. زیادہ
باتیں بنانا دل کو سخت کر دیتا ہے ایک میں ہے کثرۃ الضحک تمیت القلب،
زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے کیا آپ بھی کسی کو اس میں شک ہے کہ فضول
(اور لایعنی) باتوں سے دل کی صفائی اور نور زائل ہو جاتا ہے اگر کوئی یہ کہے کہ
ہم تو رات دن ہنستے رہتے ہیں ہمارا دل تو مردہ نہیں ہوتا اس کا جواب یہ
ہے کہ تجکو حیاتِ قلب نصیب ہی نہیں ہوئی جس سے کہ موتِ قلب کا احساس
ہو الاشیاء تعرف باضدادھا غضب یہ ہے کہ جس طرح دنیا والے شطرنج
و گنجفہ سے دل بہلاتے ہیں اسی طرح آجکل اتقیاء کے یہاں لغو اور فضول باتیں
دل بہلانے کا مشغلہ ہو گئی بس تسبیح ہاتھ میں لے لی اور دنیا بھر کی باتیں بنا
رہے ہیں جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ذکر سے جو نور قلب حاصل ہوا تھا وہ زائل ہو جاتا
ہے اور نور قلب کے زائل ہونے سے طاعت کا شوق کم اور ہمت میں پستی آجاتی

ہے اور جہاں شوق و ہمت میں کمی آئی پھر گناہوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کیونکہ گناہ سے بچنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک شوق و محبت دوسرے ہمت اور یہ دونوں باتیں نورِ ذکر سے پیدا ہوتی ہیں جب ان لغویات سے وہ نور ہی زائل ہو گیا، تو شوق و ہمت میں کمی آنا لازمی ہے پھر اس شخص کا گناہوں میں مبتلا ہو جانا کچھ بھی عجیب نہیں کیوں کہ اب وہ روک ہی نہیں رہی جس کے ذریعہ گناہوں کی نفرت دل میں جم جاتی ہے پس لایعنی امور کا ارتکاب گو خود معصیت نہ ہو مگر معصیت کا ذریعہ ضرور ہے! اب تو آپ کو اس کے ترک کا ضروری ہونا معلوم ہو گیا، ہوگا! شیخ فرید عطارؒ پند نامہ میں فرماتے ہیں:

دل زپر گفتن بمیرد در بدن　　گرچہ گفتارش بود دُرِّ عدن

پند نامہ عجیب کتاب ہے اسکو دستور العمل بنانا چاہیئے اس سے اصلاح کا زیادہ حصہ طے ہو جاتا ہے پس دریا کو کوزہ میں بھر دیا ہے شیخ عطار نے یہ کتاب تالیف کر کے مولانا رومی کے والد صاحب کو دے دی تھی کہ اپنے صاحبزادے کو کتاب پڑھائے گا، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کیسی کتاب ہے مولانا رومی رح نے بھی شیخ عطار کی کتاب کی بہت مدح فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں: ؎

ہفت شہر عشق را عطار گشت　　ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

یعنی بہت ہی بڑے عارف ہیں جنہوں نے عشق کے تمام طبقے طے کر لئے ہیں سو اتنا بڑا محقق کہتا ہے: ؎

دل زپر گفتن بمیرد در بدن　　گرچہ گفتارش بود دُرِّ عدن

پر گفتن کے معنی بہت بک بک کرنا اور درِ عدن سے مراد بھر کدار کلام

ہے یعنی چاہئے ظاہر میں کلام کیسا ہی خوش نما پھر کدار ہو مگر زیادہ کلام سے دل ضرور مرجاتا ہے، صاحبو! آخر اس کی کچھ تو وجہ ہے کہ ہم نماز بھی پڑھتے ہیں وضو بھی کرتے ہیں مگر پھر دل میں ہمارے نور نہیں پیدا ہوتا، حالانکہ نماز کے انوار اس قدر ہیں کہ شاید ہی کسی عبادت کے انوار اس قدر ہوں، اسی طرح وضو کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ وضو کے ہر قطرۂ پانی کے ساتھ گناہ جھڑ جاتے ہیں، نیز آپ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ اگر کسی شخص کے گھر کے پاس نہر جاری ہو، جس میں وہ پانچوں وقت غسل کرتا ہو، تو کیا اس کے بدن پر کچھ بھی میل رہ جائے گا، صحابہ نے عرض کیا کہ کچھ بھی نہیں، حضور نے فرمایا کہ اسی طرح مسلمان جب پانچوں وقت وضو کر کے نماز پڑھتا ہے تو وہ گناہوں سے ایسا ہی پاک ہو جاتا ہے، پھر حیرت ہے، کہ ہمارے دل میں نہ نماز سے نور پیدا ہوتا ہے، نہ وضو سے آخر اس کی وجہ کیا ہے تو خوب سمجھ لو، کہ نور تو پیدا ہوتا ہے مگر وہ نور ذرا سا ہوتا ہے کیوں کہ ہمارے قلوب پہلے ہی سے شفاف نہیں پھر نماز اور وضو بھی ہم ایسے ہی معمولی طور پر ادا کرتے ہیں لیکن پھر بھی جس قدر نور پیدا ہوتا ہے وہ ہماری ان فضول اور لغو باتوں سے زائل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ دوسری نماز کے وقت کچھ بھی نور باقی نہیں رہتا، پھر دوسری نماز سے کچھ نور پیدا ہوا، وہ اس کے بعد لغویات کا نشکا ہو گیا، یہی قصہ روزانہ چلتا رہتا ہے جیسا کہ مولانا نے مثنوی میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک چور چوری کرنے گیا تھا، جب کچھ آہٹ ہوئی تو مالک کی آنکھ کھل گئی، پہلے زمانہ میں دیا سلائی تو تھی نہیں جس سے فوراً چراغ روشن ہو جائے، چقماق سے کام لیا کرتے تھے، اس نے ایک سوکھی لکڑی پر چقماق سے

چنگاری جھاڑی وہ چور بھی قریب آبیٹھا، جب وہ چنگاری ستاری کی طرح چمکی اور لکڑی پر پڑی اس نے فوراً اپنا انگوٹھا اس جگہ رکھ دیا، وہ گل ہوگئی! غرض جب وہ ستارہ جھڑتا چور اس جگہ انگوٹھا رکھ دیتا جس سے آگ بڑھنے نہ پاتی، مولانا فرماتے ہیں :

بس ستارہ آتش از آہن چکید (اس جگہ کے شعر یاد نہیں آئے)

بغل کا چور

مولانا فرماتے ہیں کہ نماز و وضو وغیرہ سے نور تو ضرور پیدا ہوتا ہے ؛ کیوں کہ خدا اور رسول کا فرمان سچا ہے مگر ہماری بغل میں چور بیٹھا ہوا ہے، جہاں ذرا نور پیدا ہوا وہ فوراً انگوٹھا رکھ دیتا ہے جس سے نور بڑھنے نہیں پاتا ؛ بلکہ جس قدر پیدا ہوتا ہے ساتھ کے ساتھ گل ہوجاتا ہے، صاحبو! وہ چور کا انگوٹھا یہی ہماری فضول اور لغو باتیں ہیں جس سے طاعات کا نور سلب ہوجاتا ہے اول تو ہماری طاعات میں نور ہی کہاں ؛ اس کی مثال تو پہلے ہی سے ایسی ہو رہی ہے جیسے کوئی منہیار چوڑیاں لئے جارہا تھا ایک گاؤدی نے اس میں لاٹھی کا کھودا مار کر پوچھا کہ میاں اس میں کیا چیز ہے ان گنواروں کی عادت ہوتی کہ لاٹھی کا کھودا مار کر پوچھا کرتے ہیں منہیار نے کہا کہ ایک کھودا اور مار دو تو کچھ بھی نہیں، یعنی اس میں ایسی نازک چیز ہے دوسری مار میں ختم ہو جائے گی، یہی حال ہمارے نور کا ہے کہ بس شیطان کی ایک ضرب لگ جائے تو کچھ بھی نہیں نہ کہ اس پر اتنی ضربیں پڑتی ہوں کہ ہم رات دن فضول باتیں کرکے پھونکیں مار مار کر خود ہی اس کو گل کرتے ہوں ؛ صاحبو! نور بڑھتا ہے ؛ دھونکنے سے شیطان ہماری دھونکنی چرا کر لے گیا ہے اس لئے وہ بڑھنے نہیں

پاتا، پھر جس قدر پیدا ہوتا ہے وہ ساتھ ساتھ بجھتا جاتا ہے جمع نہیں ہونے پاتا اس لیئے ہم کورے کے کورے رہ جاتے ہیں، بعض ذاکرین شکایت کیا کرتے ہیں کہ ہم کو ذکر سے نفع نہیں ہوتا، دل میں نور نہیں آتا، اس کا جواب یہی ہے، کہ نور کہاں سے پیدا ہو، جب تم ایک گھنٹہ ذکر کر کے چار گھنٹے فضول بک بک میں لگاتے ہو، وہ جس قدر بھی پیدا ہوتا ہے تم اس سے زیادہ ظلمت پیدا کر دیتے ہو دیکھو حوض میں اس وقت پانی ہو سکتا ہے، جب کہ نیچے کی ڈاٹ بند ہو، اور اگر ڈاٹ کھلی ہوئی ہو گی، تو تم اوپر سے بھر دگے اور نیچے سے وہ نکلتا رہے، حوض خالی کا خالی رہیگا اور اگر اوپر سے پانی کے ساتھ خس و خاشاک بھی بھرتے رہو گے، تو وہ اٹ جائے گا، اور کیچڑ جمع ہو کر سڑاہند پیدا کر دے گا، پھر چند دنوں میں پانی خشک ہو جائے گا، اور کوڑا ہی کوڑا رہ جائے گا بعض ذاکرین ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ زیادہ بک بک نہیں کرتے مگر ان کو ذکر سے اس لیئے نفع نہیں ہوتا کہ ان میں کبر جب جاہ بھری ہوتی ہے حضرت شبلیؒ کے ایک مرید نے ان سے شکایت کی کہ ذکر سے نفع نہیں ہوتا۔ شیخ نے اس کو کچھ اور بتلا دیا اس نے پھر شکایت کی آپ نے کچھ اور بتلا دیا جب بار بار شکایت کی، تو شیخ نے توجہ سے مرض دریافت کیا، معلوم ہوا کہ اس میں کبر ہے، آپ نے اس کے علاج کی تدبیر کی فرمایا کہ یہ اخروٹوں کا ٹوکرا فلاں محلہ میں اپنے سر پر رکھ کر لے جاؤ (اس محلہ میں اس کے معتقدین زیادہ تھے) اور لوگوں سے کہنا کہ تھلے سر پر دھولیں ماریں اور فی دھول ایک اخروٹ لے لیں اس نے کہا اللہ اکبر میں ایسا کروں، شیخ نے فرمایا اے شخص یہ وہ کلمہ ہے کہ اگر کافر صد سالہ اسے

کہتا تو مومن ہو جاتا مگر اس وقت تو اس کے کہنے سے کافر ہو گیا کیوں کہ اس نے اللہ اکبر اس لیئے نہ کہا تھا کہ خدا کی بڑائی بیان کرے بلکہ اس نے اپنی بڑائی بیان کرنے کے لیئے اللہ اکبر کہا تھا، عارفین نے لکھا ہے کہ سالک کے سر پر سے تکبر تمام امراض کے بعد نکلتا ہے اور جہاں یہ خبیث مادہ نکلا پھر وہ بہت جلد واصل ہو جاتا ہے تو گویا خدا اور بندے کے درمیان صرف خودی حائل ہے، یہ خودی جاتی رہے تو پھر کوئی حجاب نہیں، عارف شیرازی فرماتے ہیں، ؎

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

قرب الی اللہ

حضرت بایزیدؒ نے ایک مرتبہ حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا، موقع اچھا تھا انہوں نے موقع کا سوال بھی کیا عرض یا رب دُلّنی علیٰ اقرب الطریق الیک یعنی مجھ کو ایسا راستہ تبلا دیجئے جو آپ کی طرف پہنچنے کے لئے سب سے زیادہ نزدیک ہو، وہاں سے ارشاد ہوا، یا ابا یزید دع نفسک و تعال، اے بایزید بس اپنے نفس کو چھوڑ دو اور چلے آؤ مطلب وہی ہے کہ خودی اور کبر کو زائل کر دو، پھر کوئی حجاب نہیں، واقعی بہت ہی مختصر اور قریب راستہ بیان فرمایا اور حق تعالیٰ سے زیادہ اس بات کو کون تبلا سکتا ہے تو یہ کبر وہ بلا ہے، جس کی وجہ سے سارا ذکر و شغل بے کار ہو جاتا ہے حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بزرگ کے مرید کو ذکر و شغل سے نفع نہ ہوتا تھا، شیخ نے بہت سی تدابیر کیں مگر سب بے کار ثابت ہوئیں آخر ایک دن انہوں نے اس کو بلا کر پوچھا کہ بھائی تم جو ذکر و شغل کرتے ہو اس میں تمہاری نیت کیا ہے، کہنے لگا میری نیت یہ ہے کہ حق تعالیٰ میری اصلاح

کردیں تو میں دوسروں کی اصلاح کردوں مخلوق کو نفع پہنچاؤں فرمایا کہ اب یہ معلوم ہوا، تم پہلے ہی بڑے بننے کی فکر میں ہو، اس لئے نفع نہیں ہوتا اس خیال کو دل سے نکالو اور مخلوق کے نفع کو چولہے میں ڈالو، محض رضاء حق کی نیت رکھو اور تمام خیالات دل سے دور کرو، چنانچہ وہ شخص طالب تھا نیت درست کرلی، اگلے ہی دن سے نفع شروع ہو گیا، خوب سمجھ لو، یہ حب ریاست بھی بڑا سد راہ ہے، لوگ ذکر شروع کرکے اگلے ہی دن سے پیر بننے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں ایسی مثال ہے جیسے لڑکا بلوغ سے پہلے ہی باپ بننا چاہے، تو بجز اس کے کہ اپنی صحت کو خراب کرے گا، اور کچھ نفع نہ ہوگا، ؎

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی | تا راہ بین نباشی کے راہبر شوی
در مکتب حقائق پیش ادیب عشق | ہاں اے پسر بکوش کہ روزی پدر شوی

اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ یہ کبر کیسی مضر چیز ہے سالکین اپنے ان امراض کی اطلاع تو شیخ کو کرتے نہیں ان کو تو بلی کی گوہ کی طرح چھپاتے ہیں کیوں کہ ڈرتے ہیں کہ ان کا علاج کیا جائے گا، اور وہ علاج ہم کو ناگوار ہوگا، جیسے حضرت شبلی نے اس مرید کا علاج کیا تھا کہ فی دھول ایک اخروٹ بانٹتے جاؤ، اور دھولیں کھاتے جاؤ پھر شیخ کی شکایت بیجا کرتے ہیں کہ ہم کو اتنے دن سر رگڑتے ہو گئے ہیں، نفع ہی نہیں ہوتا، کچھ توجہ ہی نہیں فرماتے وہ توجہ کیا خاک کریں جب تک یہ متعفن مادہ مسہل کے ذریعہ سے نہ نکالا جائے اس وقت تک توجہ بھی نفع نہیں دے سکتی، اطباء لکھتے ہیں کہ جب مزاج پر کسی خلط کا غلبہ ہوتا ہے، تو دودھ مضر ہوتا ہے کیوں کہ یہ لطیف غذا ہے جلد خلط غالب کی طرف مستحیل ہو جاتا

ہے؛ دودھ کا نفع جب ہی ہوتا ہے؛ جب کہ مزاج کا تنقیہ کر کے اعتدال پیدا کر لیا جائے اسی طرح توجہ کا نفع رذائل کے تنقیہ کے بعد ہوتا ہے اور جن بزرگوں کے واقعات آپ نے سن رکھے ہیں کہ وہ اپنے پیر کی ایک توجہ سے کامیاب ہو گئے؛ وہ ان رذائل سے پہلے ہی پاک ہو چکے ہیں استعداد کامل موجود تھی صرف دیا سلائی لگانے کی دیر تھی؛ توجہ دیا سلائی ہے؛ اس کا لگانا تھا کہ آگ بھڑک اٹھی کام بن گیا؛ گیلی لکڑی میں ہزار دیا سلائیاں لگاؤ کبھی آگ جل کر نہ دے گی؛ ہاں دھواں بہت اٹھے گا؛ جس سے سارا گھر سیاہ اور پاس والے پریشان ہو جائیں گے؛ دھوئیں سے مراد جھوٹے دعوے ہیں؛ یعنی جس کا رذائل سے تنقیہ نہ ہوا ہو اس کو اگرچہ توجہ دی جائے اور اس سے کچھ کیفیات طاری ہونے لگیں تو وہ رات دن ڈینگیں ہانکتا پھرے گا؛ کہ میں ایسا ہوں کہ میں ویسا ہوں بس اس کے سوا اور کچھ نفع نہ ہوگا؛ اور اگر کسی میں یہ معاصی کبر و حب جاہ وغیرہ نہ بھی ہوں تو یہ لغو اور فضول باتیں بنانے کا مرض سب ہی میں ہے اس سے سارا کیا کرایا کام برباد ہو جاتا ہے تو یہ باتیں اگر معاصی میں داخل نہ ہوں مباحات ہی میں داخل ہوں مگر ان کی تاثیر یہ ہے کہ نور قلب کو بجھا دیتی ہیں گو گناہ نہ ہوتا ہو؛ جیسے پانی اگرچہ فی نفسہ طاہر و مطہر ہے کپڑے کو صاف کر کے سفید بنا دیتا ہے لیکن آگ کو بجھا ہی دیتا ہے اس کی وجہ کیا ہے؛ وجہ صرف یہ ہے کہ آگ اور پانی کے مزاج میں اختلاف ہے اسی طرح یہاں سمجھو کہ مباحات گو فی نفسہ پاک ہوں؛ ان سے گناہ نہ ہوتا ہو؛ مگر یہ نور جو قلب میں طاعات و ذکر سے پیدا ہوتا ہے؛ یہ طاعات سے تو بڑھتا ہے لیکن فضول مباحات سے بجھ جاتا؛ اور اس کی وجہ

اس کے سوا کچھ نہیں کہ نور قلب کے مزاج کے لئے مباحات موافق نہیں آتے اس لئے سالک کو جس طرح معاصی سے اجتناب لازم ہے اسی طرح بعضے مباحات سے بچنا بھی ضروری ہے (یعنی امور سے) باقی اس کی دلیل مشاہدہ اور تجربہ کے سوا کچھ نہیں، آزما کر دیکھ لیجئے کہ ایک دن آپ دس گھنٹے ذکر کریں، اور دو گھنٹے فضول بک بک کریں، اس روز دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اور ایک دن صرف دو گھنٹے ذکر کریں اور لایعنی امور سے پرہیز کریں اس دن قلب کی کیا حالت ہوتی ہے، دونوں دنوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا، کسی نے سچ کہا ہے، ؎

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند گر نہ بینی نور حق بر ما بخند

لایعنی امور اور لایعنی امور صرف باتوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جس طرح بعضے اقوال لایعنی ہوتے ہیں، اسی طرح بعضے افعال لایعنی ہوتے ہیں بعضے احوال لایعنی ہوتے ہیں، سب کو ترک کرنا چاہیئے، پس لایعنی کی تین قسمیں ہوئیں۔ اقوال، افعال، احوال فضول باتیں تو یہ ہیں کہ مجلس جما کر بیٹھ گئے اور ادھر ادھر کے قصے کہنے شروع کر دیئے، ایک کہتا ہے کہ متھرا میں پیڑے اچھے ہوتے ہیں، دوسرا کہتا ہے کہ نہیں اناؤ میں اچھے پیڑے ہوتے ہیں بھلا ان فضول باتوں میں کوئی نفع بھی نہیں ہے، سوائے وقت ضائع کرنے کے اناؤ کے پیڑوں پر مجھے ایک قصہ ہنسی کا یاد آیا کہ دو شخص لکھنؤ سے کانپور جانے کو ریل میں سوار ہوئے راستہ میں اناؤ کا اسٹیشن آیا، وہ کہنے لگے یہاں کے پیڑے بہت مشہور ہیں ایک تیسرا شخص بھی وہاں بیٹھا تھا، وہ بولا جی ہاں مشہور تو بہت ہیں مگر اب پہلے جیسے نہیں رہے میں نے پیڑے خریدے ہیں ان کو چکھ لیجئے پھر خریدنے کا قصد کیجئے گا پھر دو پیڑے جو خریدے تھے،

پیش کر دیئے اس پر ان دونوں میں سے ایک صاحب نے چکھنے کے لئے ایک پیڑا
اٹھالیا، اس شخص کو بہت ناگوار ہوا، اس نے دوسرا پیڑا دوسرے رفیق کے سامنے پیش
کر دیا، کہ اس کو آپ چکھ لیجئے، وہ کہتے تھے کہ اس بات سے مجھے ندامت ہوئی کہ سر اوپر
کو نہ اٹھتا تھا پھر وہ پیڑے والا کانپور اترا ہم نے اس شخص کو سواری کرایہ نہ کرنے دی
اور اس کو بھی اپنے ساتھ سوار کر لیا، کہ اسی طرح اس ندامت کا معاوضہ ہو جائے،
مگر پھر بھی اس سے طبیعت ایسی شرماتی رہی کہ اپنی یہ ساری خاطر تواضع خاک میں
ملی جاتی تھی، بعض دفعہ مجلسوں میں چاولوں کی قسمیں بیان ہوتی ہیں ایک کہتا ہے
کہ دہرہ کے چاول اچھے ہوتے ہیں، ایک کہتا ہے کہ پیلی بھیت کے عمدہ ہوتے ہیں
غرض انہی فضولیات میں مجلسیں گرم رہتی ہیں، بعض لوگوں کو فضول سوالات کرنے
کا مرض ہوتا ہے کہ ایسے سوالات کرتے ہیں جن کی عمر بھر بھی ضرورت پیش نہ آئے
چنانچہ ایک مولوی صاحب ریل میں سوار ہوئے تھے اسٹیشن پر وہ کسی کام کو اتر کر
چلے گئے، پیچھے کچھ جنٹلمین اسی گاڑی میں آگھسے یہ لوگ آزاد بے باک ہوتے ہی ہیں
انہوں نے مولوی صاحب کا اسباب تختہ سے پھینک دیا اور اپنا سامان رکھ دیا،
جب وہ لوٹ کر آئے تو اسباب منتشر پایا پوچھا کہ میرا اسباب کس نے پھینکا ہے،
کوئی بڑا ہی نالائق ہے لڑکوں نے اقرار کیا کہ حضرت یہ نالائق حرکت ہم سے ہوئی ہے
انھوں نے ان کو خوب کوری کوری سنائی کہ تم لوگ بڑا تہذیب کا دعوٰی کرتے ہو،
مگر تم میں خاک تہذیب نہیں ہے، تم بڑے بے تہذیب ہو لڑکے سب کچھ سنتے
رہے اور بہت شرمندہ ہوئے، جب گاڑی چل پڑی، اور مولوی صاحب بھی اطمینان
سے بیٹھ گئے،

شریعت کی توہین

تو اب ان لڑکوں کو شرارت سوجھی انہوں مولوی صاحب سے بدلہ لینا چاہا، کہ ان سے کوئی ایسا سوال کرنا چاہیئے جس کا جواب ان سے نہ بن پڑے تاکہ یہ شرمندہ ہوں چنانچہ ایک آگے بڑھا اور مولوی صاحب سے پوچھنے لگا۔ کہ مولانا نماز کے وقت فرض ہے انہوں نے کہا کیا آپ کو اب تک اتنی خبر بھی نہیں، کہنے لگا جی ہاں ہم تو ایسے ہی جاہل ہیں آپ بتلا دیجئے انہوں نے بتلا دیا کہ پانچ وقت فرض ہے کہنے لگا ہر زمانہ میں اور ہر شہر میں انہوں نے کہا ہاں ہر حال میں دن رات کی پانچ ہی نمازیں ہیں۔ کہنے لگا پھر جن مقامات میں چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینہ کی رات ہوتی ہے کیا وہاں بھی پانچ ہی نمازیں فرض ہوں گی، تو وہاں سال بھر میں پانچ نمازیں ہوئیں۔ مولوی صاحب نے اس سوال کا نہایت معقول جواب دیا، فرمایا کیا تم کو وہاں جانا ہے؟ کہا نہیں، فرمایا کیا تم وہاں سے آئے ہو، کہا نہیں، فرمایا جب تم کو نہ وہاں جانا ہے نہ وہاں سے آئے ہو، پھر تم کو ایسی جگہ کے بارے میں سوال کرنا فضول ہے، کام کی باتیں پوچھو فضول وقت ضائع نہ کرو جواب نہایت معقول تھا، مگر ان کے مذاق کے موافق نہ تھا، اس لئے ان کو قدر نہ ہوئی، اور یہ سمجھ کر سب لڑکے ہنسنے لگے کہ ہم نے مولوی صاحب کو چپ کرا دیا، لڑکے تو ہنسنے ہی تھے وہاں ایک صاحب پختہ عمر کے بھی بیٹھے تھے، جو باوجود جنٹلمین ہونے کے پابند صوم وصلوٰۃ بھی تھے وہ بھی ہنسنے لگے مولانا احمد حسن صاحب امروہی بھی اس گاڑی میں سوار تھے، وہ فرماتے تھے کہ مجھے اس شخص کے ہنسنے پر بڑا غصہ آیا، کہ اس بے وقوف کو کیا ہو گیا کہ نماز کا پابند ہو کر ایک شرعی بات پر ہنستا ہے میں نے اپنے جی میں کہا کہ تجھے تو میں ٹھیک بنا دوں گا میں اس کے پاس گیا، اور سلام کر کے

اِدہر اُدہر کی باتیں کرنے لگا، کہ آپ کا نام کیا ہے، مکان کہاں ہے شغل معاش کیا ہے معلوم ہوا کہ سرکاری ملازم ہیں، میں نے پوچھا کہ آپ کے ذمہ سرکاری کام کتنے گھنٹہ روزانہ ہے بولے چھ گھنٹے میں نے کہا کہ ہر موسم میں خواہ دن چھوٹا ہو یا بڑا، کہنے لگے ہاں ہر موسم میں، میں نے کہا بھلا اگر گورنمنٹ کی حکومت اس علاقہ میں ہو جائے، جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہوتی ہے اور گورنمنٹ آپ کو وہاں متعین کر دے، کسی کام پر کیا وہاں بھی آپ دن بھر میں چھ گھنٹے کام کریں گے اگر وہاں بھی یہی رہا تو یوں کہو کہ سال بھر میں صرف چھ گھنٹے ہی کام ہوگا، کہنے لگے کہ وہاں گھڑی گھنٹے سے حساب لگا لیں گے، مولانا نے کہا کہ افسوس ہے تمہارے ایمانِ اسلام پر، کہ یہی سوال ایک دین کے کام کے لئے کیا گیا تو یہ جواب وہاں آپ کو نہ سوجھا اور گورنمنٹ کے کام کے لئے فوراً عقل آ گئی کہ گھڑی گھنٹہ سے حساب لگا لیں گے، صاحب تم اپنے ایمان کی خیر مناؤ کہ تم ایک عالم کے شرعی جواب پر ان بے باک لڑکوں کے ساتھ ہو کر ہنسے تم نے شریعت کی توہین کی تمہارا ایمان نہ کہیں سلب ہو گیا ہو، بے چارے پر نماز روزہ کا اتنا اثر تھا کہ اس کو ایمان سے محبت تھی، سلب ایمان کا لفظ سن کر اس کے ہوش اڑ گئے، اور روتا ہوا مولانا کے قدموں میں گر پڑا کہ مولانا میں اس گناہ سے توبہ کرتا ہوں، واقعی مجھ سے خطا ہوئی، مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے بھی اس کا سر قدموں سے نہ اٹھایا کہ اچھا ہے اس متکبر کا دماغ تو درست ہو، دیر کے بعد اس نے سر اٹھایا۔

تو میں نے ان کو نصیحت کی کہ دین کی بات پر اس طرح نہ ہنسنا چاہیئے جس سے مسئلہ دین کی توہین لازم آ جائے، مولانا کا جواب تو بتقدیر تسلیم تھا کہ اگر بالفرض وہاں کوئی پہنچ جائے تو کیا کرے ظاہر ہے کہ حساب لگا کر سال بھر کی نمازیں پڑھی جائیں

گی، لیکن تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے مقامات پر سردی اس قدر ہے کہ سمندر تک برف سے جمے ہوئے ہیں، وہاں انسان کا زندہ رہنا ممکن نہیں اس لئے یہ سوال ہی سرے سے لغو ہے!

لوگوں کی عادت

اسی طرح ایک شخص نے ایک بزرگ سے سوال کیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں آپ کے نزدیک کون حق پر تھا فرمایا تم کو اس سے کیا مطلب میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ قیامت میں تم سے اس کے متعلق کوئی سوال نہ ہوگا، نہ ان کا مقدمہ فیصلہ کے لئے تمہارے پاس آئے گا، اور اگر تم سے سوال ہوا تو تم اللہ میاں کے سامنے میرا نام لے دینا کہ میں نے اس سے سوال کیا تھا اس نے مجھ کو جواب نہیں دیا، واقعی خوب جواب دیا، اسی طرح آجکل یہ عادت ہے کہ جہاں کوئی مولوی باہر کا کسی شہر میں پہنچا اور لوگوں نے اس سے سوالات کرنا شروع کیے یہ بھی بہت بُرا مرض ہے کیوں کہ پردیسی آدمی کو شہر کے واقعات پوری طرح معلوم نہیں ہوتے اور پوچھنے والے بوجہ جہل کے پوری بات بیان نہیں کرتے، وہ جتنی بات سنتا ہے اس کے موافق جواب دیتا ہے اس کو یہ لوگ فتوے قرار دے کر وہاں کے علماء سے الجھتے ہیں کہ تم نے تو یہ کہا تھا اور فلاں عالم یہ فرما گئے ہیں، حالانکہ ممکن ہے کہ وہاں کے علماء کو واقعہ کی پوری تحقیق ہو، جس کی بناء پر انہوں نے دوسرا جواب دیا، ہو، اسی لئے میری عادت ہے کہ سفر میں ایسے سوالات کے جواب نہیں دیا کرتا۔ کہہ دیتا ہوں کہ سوال کی پوری صورت حال لکھ کر ڈاک میں میرے پاس بھیج دینا، اطمینان سے جواب دوں گا، اس کے بعد اگر وہ کسی سے الجھے گا تو جواب کے ساتھ لوگ اس کے سوال کو دیکھ لیں گے، کہ اس نے سوال کس طرح کیا تھا، اور زبانی سوال کے جواب

بن لوگ صرف جواب کو نقل کر دیتے ہیں اپنے سوال کو پورا نقل نہیں کرتے کہ ہم نے سوال
س طرح کیا تھا ایک مرتبہ میں رامپور گیا تو وہاں ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ
گیارہویں کرنا کیسا ہے! میں سمجھ گیا کہ اسکا مقصود میرے مسلک پر عمل کرنا نہیں ہے بلکہ
عض مجھے بدنام کرنا ہے کہ یہ وہابی ہے اس لئے میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ تم عمل
لے واسطے پوچھتے ہو یا امتحان کے واسطے اگر عمل کے واسطے پوچھتے ہو تو تم کو شہر کے
علماء سے پوچھنا چاہیئے جن کی دین داری اور تقوے کا تم کو تجربہ ہے مجھ سے تم واقف
ہیں ہو؛ صرف آج ہی آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے ایک دن میں تم کو میری
یانت اور تقوے کا تجربہ نہیں ہو سکتا میرے ساتھ کچھ دنوں رہو گے جب میری حالت
سے واقف ہو گے؛ اور اگر امتحان کے واسطے پوچھتے ہو تو تم کو میرا امتحان لینے کا کوئی
ق نہیں ہے؛

مناظرہ کا شوق

جن لوگوں نے مجھ کو پڑھایا ہے وہ سہ ماہی اور ششماہی اور سالانہ
امتحانات میرے لے چکے ہیں آپ سے میں نے کچھ پڑھا نہیں؛
؛ پڑھانا چاہتا ہوں؛ اس لئے آپ کو میرے امتحان کا کیا حق ہے؛ بس اس جواب پر
ہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا؛ وہ یہ چاہتے تھے کہ میں ان کے سامنے اپنا مسلک بیان کر دوں
پھر مجھے میں اور وہاں کے علماء میں مناظرہ ہو؛ سو میں ایسا روگ نہیں پالتا؛ بعض علماء کو مناظرہ
کا شوق ہوتا ہے؛ وہ جہاں جاتے ہیں مناظرہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے
ہ مناظرہ کے بعد بھی لوگ تو اسی حال پر رہتے ہیں؛ جس پر پہلے سے تھے ہاں ان کا
قت اچھی طرح برباد ہوتا ہے آجکل مناظروں میں اظہار حق کا مطلوب ہوتا نہیں محض
ہار اور جیت مدنظر ہوتی ہے؛ چنانچہ ہر فریق اسی کوشش میں ہوتا ہے؛ کہ جسطرح

ہو سکے دوسرے کی ہر بات کو توڑا جائے، چاہے اس کے منہ سے ایک دو بات سچی نکل جائے، مگر یہ اس کو بھی رد کرنا چاہتے ہیں، ایک مرتبہ رامپور میں نواب صاحب نے قادیانیوں سے اہل حق کا مناظرہ کرایا تھا جب میں وہاں سے لوٹا تو لوگوں نے مجھ سے مناظرہ کا حال پوچھا میں نے کہا کہ امیروں کو بازیوں کا شوق ہوتا ہے آج مرغ بازی ہو رہی ہے، کل تیتر بازی، پرسوں بٹیر بازی نواب صاحب کو مولوی بازی کا شوق ہوا تھا: انہوں نے مناظرہ کرا دیا کہ دو مولوی آپس میں کھڑے لڑ رہے تھے نواب صاحب کو لطف آرہا تھا، بس یہ حاصل تھا، مناظرہ کا سو واقعی آجکل کے مناظروں کا تو یہی حال ہے، بچپن میں مجھے بھی اس کا شوق تھا مگر جتنا پہلے شوق تھا اب اتنی ہی نفرت ہے، آجکل مناظرہ میں تو تو میں میں اور پھبتیاں بہت ہوتی ہیں جس سے سوائے اپنے مقابل کو رنج دینے کے کچھ مقصود نہیں ہوتا بات بات میں رسالے بازی ہوتی ہے جس میں طرز تحریر ایسا اختیار کیا جاتا ہے جس سے مدمقابل کی خوب تحقیر و توہین ہو، اسی لئے آجکل مناظرہ سے ضد اور عداوت بہت بڑھ جاتی ہے، چنانچہ ایک شخص نے ایک رسالہ کسی کے جواب میں لکھا ہے مصنف رسالہ کے پیر کا نام مسکین شاہ ہے تو مجیب نے اس کے پیر کے اوپر پھبتی کے طور سے یہ شعر لکھا ہے

گربہ مسکین اگر پر داشتے — تخم گنجشک از جہاں برداشتے

بھلا اظہار حق میں اس پھبتی کو کیا دخل تھا کچھ بھی نہیں محض فضول وقت ضائع کرتے ہیں جس سے نفع کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے، اسی لئے آجکل کے مناظرے بھی میرے نزدیک لا یعنی میں داخل ہیں، البتہ اگر کسی مسلمانوں کا دین برباد ہونے کا اندیشہ ہو اور ان کی ایمان کی حفاظت کے لئے مناظرہ کی ضرورت ہو، وہ موقع

اس سے مستثنیٰ ہے۔ مگر ایسے مناظرے سو میں ایک دو ہوتے ہیں اکثر تو محض شوقیہ ہوتے ہی ہیں ۱۲ جامع) امام ابوحنیفہؒ نے اپنے صاحبزادہ حمادؒ کو وصیت فرمائی تھی کہ علم کلام (مناظرہ) میں مشغول مت ہونا؛ انہوں نے کہا کہ آپ مجھ کو اس سے منع فرماتے ہیں؛ مگر میں نے آپ کو خود مناظرہ کرتے دیکھا ہے فرمایا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے جب ہم مناظرہ کرتے تھے، تو ہم یہ چاہتے تھے کہ دوسروں کی زبان سے حق کی بات نکلے اور ہم اس کو تسلیم کر لیں؛ تاکہ میرے بھائی کی بات اونچی رہے اور وہ حق راستہ پر چلے اور اب ہر فریق یہ چاہتا ہے کہ دوسرے کی زبان سے غلط بات ہی نکلے تاکہ میں اس کو رد کر سکوں تو اس زمانہ میں ہر شخص اپنے بھائی مسلمان کے لئے گمراہی کی تمنا کرتا ہے؛ اس لئے اب مناظرہ میں پڑنا مضر ہے؛ سبحان اللہ کیسی عجیب بات فرمائی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سلف صالحین کے مناظرہ میں اور آجکل کے مناظرہ میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے ان کو درحقیقت اظہار حق ہی مطلوب تھا؛ وہ فضول وقت ضائع نہ کرتے تھے؛ نہ ان کو اس سے عار تھی؛ کہ کوئی ہم کو ناواقف کہہ دے گا؛ مولانا عبدالقیوم صاحب بھوپالیؒ سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو آپ مسئلہ بتلا دیتے اگر کوئی یہ پوچھتا کہ یہ مسئلہ کس حدیث سے ثابت ہے تو آپ فرما دیتے کہ بھائی میں تو مسلم نہیں ہوں میرے آباد اجداد سب مسلمان تھے جس طرح میں نے اپنے باپ کو عمل کرتے دیکھا ہے اسی طرح میں نے کیا اور وہ اپنے باپ کو دیکھ کر عمل کرتے تھے اور وہ اپنے باپ سے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک دوسرے کو دیکھ کر عمل کرتے آرہے ہیں اس لئے ہم کو حدیث معلوم کرنے کی ضرورت نہیں؛ ہاں جو نو مسلم ہو اسے حدیث معلوم کرنے کی ضرورت ہے؛ کیونکہ اس کے آباد اجداد نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کا طریقۂ عمل کر کے نہیں دکھلایا، تو مولانا کے اس جواب کا منشاء صرف یہ تھا، کہ تو تو میں میں کے اندر وقت ضائع نہ ہو، کیوں کہ جاہلوں کو اگر حدیث بتلا بھی دی جائے، تو وہ یہ کیوں کر سمجھ سکتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ کس طرح مستنبط ہوا اس لئے ایک عامی شخص کا یہ سوال کرنا فضول ہے اور فضول سوال کا جواب دینا بھی فضول ہے، یہ ضروری ہے کہ جواب نہ دینے سے بعض لوگ اس کو ناواقف کہیں گے مگر سلف کو اس کی پرواہی نہ تھی، کہ کوئی ہم کو کیا کہے گا، وہ فضول باتوں میں پڑنے کو گوارا نہ کرتے تھے،

علمائ کی عادت

آجکل علمائ کی عادت ہے کہ وہ سائل کے مذاق کا اتباع کرتے ہیں اور جہاں سے وہ دلیل طلب کرے اسی جگہ سے دلیل بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس سے بجائے نفع کے نقصان ہوتا ہے، کیوں کہ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کے دلائل عوام کی فہم سے باہر ہوتے ہیں اب اگر ان کو دلیل کا عادی کر دیا جائے گا، وہ ان مسائل کو بھی بلا دلیل نہ مانیں گے اور دلیل سمجھ نہ سکیں گے اس کا انجام یہ ہو گا، کہ وہ عمل بھی نہ کریں گے، تو یہ کتنا بڑا نقصان ہے بس اسلم طریقہ یہ ہے کہ لایعنی سوالات کا جواب نہ دیا جائے ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ ایک عورت کا شوہر اور بھائی چوروں کے ہاتھوں سے مارے گئے وہاں سے ایک فقیر کا گذر ہوا، عورت کو روتا دیکھ کر رحم آیا اور عورت سے کہا کہ تم ان کے سر کو دھڑ سے جوڑ دو، اور دعائیں کرتا ہوں، عورت نے سروں کو دھڑ سے جوڑ دیا، مگر جلدی میں یہ غلطی کی کہ شوہر کا سر بھائی کے دھڑ پر لگا دیا اور بھائی کا سر شوہر کے دھڑ سے فقیر نے دعا کی، وہ دونوں زندہ ہو گئے، اب وہ عورت کس

کے پاس رہے؛ میں نے کہا کہ ہم نہیں جانتے؛ بھلا یہ بھی کوئی سوال ہے جس کے سر نہ پاؤں؛ اس کا طرز بتلا رہا ہے کہ کسی نے فرصت میں بیٹھ کر گھڑا ہے؛ علماء کو چاہیئے کہ ایسی فرضی صورتوں کا جواب نہ دیا کریں حضرت عمرؓ سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو آپ اول یہ سوال کرتے تھے کہ یہ واقعہ پیش آیا ہے یا ویسے ہی سوال کرتے ہو؛ اگر وہ یہ کہتا کہ واقعہ پیش آیا ہے؛ تب جواب دیتے ورنہ دھمکا دیا کرتے تھے؛ آج کل بہت لوگوں کو یہ مرض ہے کہ فضول سوالات کیا کرتے ہیں حتیٰ کہ خطوط میں بھی دنیوی امور کے متعلق ایسے سوالات ہوتے ہیں؛ تھانہ بھون میں ایک شخص ہیں ان کے ایک دوست کی عادت تھی کہ وہ ہر خط میں بہت سے بے ہودہ سوالات کیا کرتے تھے؛ مثلاً یہ کہ غلہ کا بھاؤ کیا ہے دال کا نرخ کیا ہے بارش کیسی ہوئی کھیتیاں کیسی ہیں اور اس کے بہت سے سوالات ہر خط میں ہوتے تھے؛ وہ بیچارے بعض باتوں کا جواب دے دیتے اور بعض باتوں کا جواب نہ دیتے تھے اگلے خط میں وہ اس پر مواخذہ کرتے کہ تم نے میری بہت سی باتوں کا جواب نہیں دیا؛ اس کی کیا وجہ ہے؛ جب وہ بے چارہ تنگ آ گیا تو اس نے بھی ایک خط میں سوا سو سوالات اسی قسم کے لکھے اس پر ان کا خط آیا کہ تم بڑے بے ہودہ آدمی ہو؛ فضول سوالات کرتے ہو؛ اس نے لکھا حضور ایسے ہی سوالات آپ کے ہوتے ہیں جن سے میں تنگ ہوا کرتا تھا میں نے آپ کو دکھلایا ہے کہ فضول باتوں سے کیسی تکلیف ہوتی ہے؛ جب ان کی وہ عادت بدلی؛ سو واقعی ایسے لوگوں کا ایسا ہی علاج ہونا چاہیئے؛ جب کوئی تم سے ایک فضول سوال کرے تم اس سے دو سوال ویسے ہی کرو؛

عربی کا احترام

مجھے تو اس سے بھی تکلیف ہوتی ہے کہ لوگ خط میں لکھ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں کو سلام پہنچا دیجئے! بھلا خواہ مخواہ اپنے ایک دو پیسہ کی کفایت کے لئے دوسرے آدمی کو سلام پہنچانے کے لئے مزدور بنانا یہ کون سی آدمیت ہے اور خیر جہاں بے تکلفی ہو، وہاں تو زیادہ مضائقہ نہیں مگر جس کو اپنا مربی بنایا جائے اس سے اپنا کام اس قسم کا لینا نری جہالت ہے صوفیہ نے تصریح کی ہے، کہ شیخ کے خط میں کسی کو سلام نہ لکھنا چاہیئے: اسی طرح ایک مرتبہ جب بخار کا زور ہوا تو لوگ خطوط میں مجھ سے تھانہ بھون کی حالت دریافت کرتے تھے کہ وہاں بیماروں کا کیا حال ہے میں اس کے جواب میں یہ شعر لکھ دیا کرتا تھا: ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

اور واقعی مجھے بسا اوقات شہر کی حالت معلوم بھی نہیں ہوتی تھی نہ میں اس کی تحقیق کرتا ہوں کہ آج کتنی موتیں ہوئیں، بعض لوگوں کو بیماری میں بھی مشغلہ ہوتا ہے کہ اموات کی شمار معلوم کرتے پھرتے ہیں اور مجلسوں میں بجائے خوف الٰہی کے تذکرہ کے یہی تذکرہ ہوتا ہے کہ آج اتنی موتیں ہوئیں کل اتنی موتیں ہوئیں تھیں، یہ بھی ایک لایعنی مشغلہ ہے ایسے وقت میں انسان کو طاعات میں مشغول ہونا چاہیئے: اور اپنے اعمال کی اصلاح کرنی چاہیئے، نہ کہ دنیا بھر کے قصے لے بیٹھیں اور بیماری کے تذکرہ کو مشغلہ بنالیں اسی طرح بعض لوگ خطوط میں خوابیں بہت لکھا کرتے ہیں اور ان کی تعبیر دریافت کرتے ہیں: میں اس کے جواب میں اکثر یہ شعر لکھ دیتا ہوں:

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم   چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

اور یہ بھی لکھ دیتا ہوں کہ بیداری کا حال لکھو اس کا جواب دوں گا خوابوں سے

کیا ہوتا ہے ! ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ خط میں چند احوال بیداری کے لکھے جائیں ! اپنی امراض کی اصلاح دریافت کی بجائے اور اگر کوئی عجیب خواب ہوا ! تو اس کا تذکرہ بھی کر دیا ! باقی سارے خط کا یہی حاصل ہوتا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے ! وہ خواب دیکھا ہے یہ مجھ کو پسند نہیں ! اسی لئے میں خوابوں کی تعبیر بہت کم دیا کرتا ہوں ! یہ تو فضول باتوں کا بیان تھا ! لایعنی افعال کی تفصیل یہ ہے کہ بعض لوگ بلا وجہ فضول کاموں میں مشغول ہوتے ہیں مثلاً ناول دیکھنا چھوٹے موٹے قصوں کا مطالعہ کرنا اس سے بے فائدہ وقت ضائع ہوتا ہے اس میں نہ کچھ دنیا کا نفع ہے نہ دین کا اس لئے کتابیں وہ دیکھنی چاہئیں جو دنیا یا دین کے لئے نافع ہوں !

اہتمام اصلاح

بعض لوگوں کو اپنی اصلاح کا اہتمام ہوتا ہے دوسروں کے کاموں میں لگے رہتے ہیں کسی نے جو فرمائش کر دی ! اس کو پورا کرنے میں لگے رہتے ہیں ! سو یاد رکھو کہ خدمتِ خلائق اگرچہ بہت اچھی چیز ہے مگر ہر کام کا ایک درجہ ہے سب سے مقدم انسان کے لئے اپنی اصلاح ہے اپنے کام سے جو وقت بچے اس میں مخلوق کی خدمت کا مضائقہ نہیں مگر اپنی حالت کی خبر نہ لینا اور دوسرے ہی کے کاموں میں سارا وقت گنوا دینا یہ خدمت کا ہیضہ ہے ! اس لئے الاھم فالاھم پر عمل کرنا چاہیئے ! بعض لوگوں کی یہ عادت کہ جہاں کوئی ان سے ملنے آ گیا ! بس اسی کو لے بیٹھتے ہیں اس کی خاطر مدارت میں اپنے ضروری کاموں کا حرج کر دیتے ہیں ایسے لوگ ہمیشہ بے انتظام رہتے ہیں ان کا کوئی معمول پابندی سے ادا نہیں ہوتا ! خاطر مدارت کے لئے دس پندرہ منٹ کافی ہیں اس کے بعد اپنے کاموں میں لگ جانا چاہیئے اگر انسان میں انتظام کا سلیقہ ہو تو اس کو یہ باتیں خود

بخوبی محسوس ہونے لگتی ہیں کہ کون سا کام مقدم ہے کونسا موخر ہے کس کی زیادہ ضرورت
کس کی نہیں اس لئے اپنے افعال کی نگہداشت لازمی ہے اس پر عمل کرنے سے سارے
معمولات بخوبی ادا ہوتے رہیں گے ۔ لایعنی اموال کی یہ صورت ہے کہ بعض لوگ ضرورت
سے زیادہ مال حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں ۔ مثلاً ایک ذریعہ معاش تجارت
کا اس قدر موجود ہے جس سے گذر خاصی طرح ہو رہا ہے ۔ مگر زیادہ مال کی حرص
ہے اس لئے بڑے پیمانہ کا کارخانہ جاری کرنا چاہتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری
عمر تحصیل مال ہی میں کٹ جاتی ہے خدا کی طرف متوجہ ہونے کی توفیق نہیں ہوتی
پھر غضب یہ کہ بڑا کارخانہ اگر ذاتی رقم سے کھولا ہے اس کا بھی چنداں مضائقہ
نہیں بعض لوگ بلا وجہ قرض لے کر کارخانہ کھول لیتے ہیں اس میں جس قدر دقتیں
اور پریشانیاں پیش آتی ہیں ان کا اندازہ وہ خود کر سکتے ہیں بلا وجہ بلا ضرورت قرض
لینے کی بھی شریعت نے ممانعت کی ہے ۔ بعض لوگوں کو دوسروں کی امانتیں
رکھنے کا شوق ہوا کرتا ہے کہ جس نے امانت رکھوائی اٹھا کر رکھ لی ۔ بعض دفعہ اگر
امانت ضائع ہو جاتی ہے تو اس شخص کو سخت پریشانی ہوتی ہے اگر ضمان نہ دے
تو طبیعت نہیں مانتی دوسرے شخص سے ندامت ہوتی ہے اور اگر ضمان دے تو
اپنے دل پر گراں ہوتی ہے اتنی رقم میری بے فائدہ خرچ ہو رہی ہے اس لئے ہر
شخص کو دوسروں کی امانتیں نہ رکھنی چاہئیں ۔ ہاں اگر کوئی بڑا منظم ہو اور لوگوں
کو اس پر ایسا اعتماد ہو کہ اگر وہ یہ کہہ دے کہ امانت ضائع ہو گئی ہے تو کسی کو
اس پر خیانت کا وسوسہ بھی نہ آئے ایسا شخص امانت رکھے تو مضائقہ نہیں بشرطیکہ
امانت کی وجہ سے اس کو پریشانی لاحق نہ ہو ۔ ورنہ انسان کو ایسا کام ہرگز نہ کرنا

چاہیئے، جس سے جمعیت قلب فوت ہو، غرض بے فائدہ باتیں، فضول کام، اور بے ضرورت مال کے پیچھے نہ پڑنا چاہیئے، ہر قسم کے لایعنی امور سے احتراز کرنا چاہیئے پھر دیکھئے دل میں کیسا نور اور اطمینان اور سکون رہے گا۔ اس دولت کے سامنے سلطنت بھی ہیچ معلوم ہوگی، کیوں کہ اصل راحت اسی کا نام ہے کہ دلکو چین وسکون ہو، بعض لوگ ایسے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں، جن کا انجام ان کی قدرت سے باہر ہے۔ اس کا نتیجہ بجز پریشانی کے اور کچھ نہیں، چنانچہ آجکل اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے، خلاصہ یہ کہ اس وقت مشائخ وغیر مشائخ علماء و عوام سب ہی اس مرض میں مبتلا ہیں کہ لایعنی امور سے احتراز نہیں کرتے، اور اس وجہ سے دنیا و دین دونوں کا نقصان ہو رہا ہے۔

عورتوں کی عادت بالخصوص یہ عورتیں کہ ان کو رات دن زیور اور کپڑے کے تذکرہ سے سوا اور کوئی کام ہی نہیں پھر مصیبت یہ ہے کہ جس کے پاس زیور نہ ہو، وہ تو دوسروں کے زیور کا ذکر کرتی رہتی ہیں اور جس کے پاس ہو، وہ کبھی چین سے نہیں بیٹھتی اس کو اس کی تلاش رہتی ہے کہ اگر کسی کے پاس میرے زیور سے اچھا نمونہ ہو تو میں بھی اس کو توڑ کر ویسا ہی بنواؤں، چنانچہ جہاں کسی کا زیور پسند آیا، اور اپنا زیور ان کے دل سے اترا اور انہوں نے فوراً فرمائش کی کہ اس کو توڑ کر ویسا ہی بنایا جائے اس کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی کہ ابھی ابھی اس کی بنوائی میں اتنے روپے گئے ہیں توڑوانے سے وہ سب لاگت ضائع ہو جائے گی، اور دوسری لاگت الگ دینی پڑے گی، مگر ان کی بلا پرواہ کرے، جانتی ہیں شوہر کما دے گا، اور لا دے گا، ہم کیوں فکر کریں۔

بس ان کی تو اپنی فرمائش پوری ہونی چاہیئے۔ شوہر کے ذمہ چاہیئے کتنا ہی ہو جائے کپڑوں کی جمع کرنے کی بھرمار ہوتی ہے کہ صندوق بھرا ہوا ہے! مگر کیا ممکن ہے کہ بزاز ان کے گھر کے سامنے سے خالی گذر جائے! غرض عورتوں کے اقوال و افعال و اموال تو سراسر لایعنی ہیں۔ ان کی فہرست گنانا تو گویا محال ہے! ع تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم! خیر یہ مضمون تو ظاہر تھا، جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے!
اب میں ایک بات مختصر طور پر ایسی بیان کرنا چاہتا ہوں، جو ذرا باریک بات ہے جس کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں!

اتباعِ شیخ

وہ یہ کہ بعض اوقات مشائخ طریق مریدین کو ایسے امور کا حکم دیتے ہیں جو بظاہر لایعنی معلوم ہوتے ہیں، جس سے ظاہر بین کو شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس حدیث کے خلاف کر رہے ہیں تو اس کی حقیقت سمجھنے کی ضرورت ہے پھر اس کے ساتھ جب کہ یہ بھی تاکید کی جاتی ہے کہ شیخ کی اطاعت کامل طور پر بجالائیں۔ تو یہ اشکال اور قوی ہو جاتا ہے سو اول سمجھنا چاہیئے! کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خلاف شریعت بھی اگر وہ امر کرے تو اطاعت کریں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب وہ خلاف شرع نہ کرے! بلکہ شریعت کے موافق حکم کرے اس میں اس کی اطاعت بجالاویں! لیکن بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ شیخ شریعت کے موافق امر کرتا ہے! مگر مرید اس کو کم فہمی سے خلاف شرع سمجھ جاتا ہے اس لیئے اسکا معیار یہ ہے کہ بیعت ہونے سے پہلے ہی اس کی حالت کا تجربہ کر لیا جائے جب تجربہ سے اس کا متقی اور کامل دیندار ہونا ثابت ہو جائے اور جتنی شرائط شیخ کامل کی ہیں، وہ سب اس کے اندر معلوم ہو جائیں! اس کے بعد بیعت ہوں پھر

اُس کے احکام میں پس وپیش نہ کریں کیوں کہ شیخ کامل ہرگز شریعت کے خلاف امر نہیں کر سکتا؛ اور خلاف شرع امر کرے؛ وہ شیخ کامل نہ ہوگا؛ البتہ اگر اس کا موافق شرع ہونا سمجھ میں نہ آوے تو ادب کے ساتھ شیخ سے تحقیق کر لینا ضروری ہے اگر وہ نہ سمجھا سکا تو ادب کے ساتھ عذر کر دے مگر گستاخی و بے تابی نہ کرے؛ لیکن اگر بکثرت ایسا ہونے لگے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ کامل نہیں ہے؛ لطف کے ساتھ اس کو چھوڑ دینا چاہیئے؛ اس تمہید کے بعد اب سمجھئے کہ بعض دفعہ شیخ کامل بعض مریدوں کو کسی اطاعت غیر واجبہ سے روک دیتا ہے؛ مثلاً حکم دے دیا؛ کہ تمام نوافل اور ذکر و اذکار یک لخت موقوف کر دو؛ حالانکہ ان کا ترک لایعنی ہے اور بعض دفعہ بعض مباحات میں مشغول ہونے کا حکم دیتا ہے کہ خوب کھاؤ، پیو، ہنسو بولو جنگل کی سیر کرو؛ تفریح طبائع کے لئے سفر کرو؛ حالانکہ بظاہر یہ امور لایعنی ہوتے ہیں تو اس سے کم فہموں کو غلطی پیش آسکتی ہے کہ یہ عجیب شیخ ہے جو لایعنی امور کا حکم دیتا ہے اور بالیعنی سے یعنی مفید کاموں سے منع کرتا ہے سو خوب سمجھ لو؛ اس میں شیخ کی غلطی نہیں؛ بلکہ تمہارے فہم کا قصور ہے اس کا راز یہ ہے؛ کہ وہ اطاعت جو فی نفسہٖ بالیعنی ہے اس مریض کے حق میں مالیعنی نہیں ہے بلکہ کسی عارض کی وجہ سے مضر ہو رہی ہے اس لئے وہ اس کو ان خاص طاعات سے منع کر رہا ہے؛ مثلاً شیخ دیکھتا ہے کہ اس مریض کو زیادہ نوافل اور ذکر و شغل کرنے سے عجب پیدا ہو گیا ہے؛ یہ اپنے کو صاحب کمال سمجھنے لگا ہے اس لئے وہ اس کو اذکار و اشغال سے منع کر دیتا ہے؛ جیسے طبیب مریض کو کسی حلوے سے روک دیتا ہے؛ حالانکہ اس میں میوہ جات پڑے ہوئے ہوتے ہیں مفرحات بھی اس

ہیں موجود ہیں۔ لیکن مریض کا معدہ کمزور ہے؛ وہ اس کو ہضم نہیں کر سکتا پس طبیب اسکو حلوے سے روک دیتی ہے اور کڑوی ہی دوا پلاتا ہے کہ اس کے لئے کڑوی دوا ہی مفید ہے اسی طرح طاعات واذکار اگرچہ شیریں ہیں؛ مگر بعض دفعہ ذاکر کا مزاج اس متحمل نہیں ہوتا؛ بلکہ امراض کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے اس کو اذکار سے منع کر کے بعض مباحات میں مشغول کیا جاتا ہے؛ اس وقت طالب کو شیخ کا اتباع کرنا چاہیئے اور ہمہ تن اپنے کو اس کے سپرد کر دینا چاہیئے؛ کہ وہ اس میں جو چاہے تصرف کرے؛ اس کو مولانا فرماتے ہیں؛ ؎

قال را بگذار مرد حال شو — پیش مرد کاملے پامال شو
چون گزیدی پیر ہیں تسلیم شو — ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو
صبر کن در کار خضر اے بے نفاق — تا نگوید خضر رو ہذا فراق
گر خضر در بحر کشتی را شکست — صد درستی در شکست خضر ہست
آن پسر را کش خضر ببرید حلق — سر آن را در نیابد عام خلق

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے؛ کہ ایک شخص حج کے واسطے شیخ سے اجازت لینے آیا مگر اس پر حج فرض نہیں یا فرض کو وہ ادا کر چکا ہے؛ اب حج نفل کے لئے اجازت چاہتا ہے لیکن شیخ نے اس کو منع کر دیا ہے اس پر بعض لوگ متوحش ہوتے ہیں کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو حج جیسی طاعت سے منع کرتے ہیں؛ لیکن حقیقت میں وہ حج سے منع نہیں کرتا؛ بلکہ تم کو معصیت اور کفر سے بچانا چاہتا ہے؛ کیوں کہ وہ دیکھتا ہے کہ تم کمزور ہمت والے ہو؛ صعوبت سفر اور مشقت طریق کا تحمل تم نہیں کر سکتے ایسی حالت میں اگر تم حج کرنے گئے تو اندیشہ ہے؛

کہ ایک حج کے لئے پچاس نمازیں قضا کروگے، اور اگر زیادہ مشقت پیش آئی تو یہ بھی اندیشہ ہے کہ تم کو حج ہی سے نفرت ہو جائے، اور خدا کی طرف سے دل میں شکایت پیدا ہو جائے گی، تو اس صورت میں حج کا ثواب تو کیا ملتا ایمان بھی مکہ ہی میں رہ جاتا اور فرض ادا ہی ہو چکا تھا، تو خواہ مخواہ نفل کام کے لئے ایمان کو خطرہ میں ڈالنا، یا کم از کم معاصی میں مبتلا ہونا کون سی عقل مندی ہے اس لئے وہ شیخ کامل ایسے شخص کے لئے یوں کہتا ہے ؎

اے قوم بحج رفتہ کجا ئید کجا ئید — معشوق دریں جاست بیائید بیائید

البتہ جس پر حج فرض ہو اس کو چلا جانا چاہیئے اور مشقت سفر کے لئے دل کو یہ مضمون سمجھائے، ؎

اے دل آن بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی — بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجان — شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

بات یہ ہے کہ حج میں تکلیف و مشقت اسی کو معلوم ہوتی ہے جس کو محبت نہ ہو، ورنہ اہل محبت کو تو وہاں کی ہر کلفت کا لطف آتا ہے، آخر محبوبان مجازی کے وصال میں عشاق کیسی کیسی کلفتیں برداشت کرتے ہیں پھر کیا ان کو ان کلفتوں سے کچھ پریشانی ہوتی ہے ہرگز نہیں، پس جس پر حج فرض ہو، وہ اپنے دل کو یہ باتیں سمجھائے کہ عشاق ایک ادنیٰ سے محبوب کے لئے ہزاروں مشقتیں جھیلتے ہیں پھر تعجب ہے کہ ہیں محبوب حقیقی کے دربار میں پہنچنے سے ذرا سی کلفت کی وجہ سے رک جاؤں اسی طرح دنیوی مقدمات کی کامیابی کے لئے اہل دنیا نہ گرمی کی پرواہ کرتے ہیں نہ سردی کی نہ بھوک کی پرواہ کرتے ہیں نہ پیاس پھر حیرت ہے

کہ میں مقدمۂ آخرت کی کامیابی کے لئے ذراسی تکلیف برداشت نہ کروں مجھے ہمت کرکے ضرور جانا چاہیئے؛ البتہ جس پر حج فرض نہ ہو، یا وہ فرض ادا کر چکا ہے اس کو اگر شیخ منع کردے تو اس سے یہی کہا جائے گا؛ ؎

اے قوم بحج رفتہ کجا ئید کجا ئید — معشوق دریں جاست بیائید بیائید

اس کے لئے اس صورت میں حج سے زیادہ نفع صحبت شیخ میں ہوگا؛ یہاں مرید کو شیخ کے ہاتھ میں اپنے آپ کو تسلیم کردینا چاہیئے؛

طریق تسلیم وتفویض

اس طریق میں تسلیم وتفویض بہت ضروری ہے بدون اس کے کام نہیں چل سکتا بشرطیکہ شیخ کوئی گناہ نہ کروائے ہاں مباحات ومستحبات اس کی قلمرو ہیں ان میں وہ جس طرح چاہے تصرف کرے اسے اختیار ہے اگر وہ کسی مستحب کام سے روک دے تو اس میں اس کی اطاعت لازم ہے کیوں کہ وہ تم کو ایک مستحب سے روک کر اس سے افضل اور ضروری کام میں لگائے گا؛ اس راستہ میں نفس وشیطان کے مکائد بہت دقیق ہوتے ہیں بعض دفعہ شیطان ایک مستحب کام کی رغبت دلاتا ہے مگر اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس میں مشغول ہو کر دوسرے اہم اور ضروری کام سے یہ رہ جائے گناہ کی رغبت تو سالک کو وہ اس لئے نہیں دلاتا کہ جانتا ہے کہ گناہ کا وسوسہ ڈالنے سے یہ فوراً سمجھ جائے گا کہ وسوسہ شیطانی ہے اور مستحب کام کی رغبت کو شیطانی وسوسہ ہر شخص نہیں سمجھ سکتا؛ بلکہ ناواقف تو اس کو الہام رحمانی سمجھنے لگتا ہے؛ مگر شیخ کامل سمجھ لیتا ہے کہ بعض دفعہ شیطان بھی مستحب کام کی رغبت دلایا کرتا ہے، نہ اس لئے کہ وہ مستحبات سے خوش ہے یا سالک

کا مستحبات میں مشغول ہونا اس کو پسند ہے؛ بلکہ محض اس لئے کہ ایک ادنیٰ مستحب
ہے اس کو مشغول کر کے اعلیٰ اور اہم کام سے روک دے؛ چنانچہ ایک بار ایک
طالب کے قلب پر تقاضا ہوا کہ فلاں جگہ چلو وہاں قتال ہو رہا ہے وہاں چل کر خدا
کے راستہ میں جان دینا چاہیئے؛ وہ بے چارہ اس وقت تک خلوت نشین تھا ذکر
وشغل و مجاہدات میں مشغول تھا کہ دفعتہً ایک دن جہاد کا داعیہ قلب میں پیدا ہوا
اب اس خطرہ کو شیطانی وسوسہ کوئی کہہ سکتا تھا ظاہر میں تو بہت اچھا خیال تھا؛
مگر وہ شخص چونکہ سچا طالب تھا؛ اس لئے حق تعالیٰ نے دستگیری کی کہ اس نے
اس خطرہ پر عمل نہیں کیا؛ بلکہ حق تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھ کو اس خطرہ کی حقیقت سے
مطلع کر دیا جائے؛ آخر الحاح وزاری کے بعد حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ خطرہ
نفسانی ہے تمہارا نفس مجاہدات سے پریشان ہو گیا ہے اس لئے وہ تم کو جہاد
کی رغبت دلاتا ہے کہ اس میں ایک دم سے خاتمہ ہو جائے گا؛ یہ روز کی مصیبت
تو نہ رہے گی تو آپ نے نفس کی چال دیکھی وہ ان کو فرض سے فرض کفایہ میں مشغول
کرنا چاہتا تھا کیوں کہ جہاد کرنے والے اور بہت مسلمان موجود تھے ان کے ذمے
فرض عین نہ تھا؛ اور اصلاح نفس فرض عین ہے اور اسکی منشا راحت طلبی تھی
وہ چاہتا تھا کہ بس جہاد میں جا کر ایک دم سے فیصلہ ہو جائے یہ روز روز کی مشقت
اور جھنجھٹ ختم ہو جائے پس نفس وشیطان کے ان مکائد کو شیخ پہچان لیتا ہے
اس لئے بعض دفعہ وہ مستحبات سے روک دیتا ہے؛ جس سے اہل ظاہر متوحش
ہوتے ہیں کیوں کہ وہ حقیقت کو نہیں سمجھتے میرے ایک دوست نے ذکر و
شغل بہت زیادہ کیا؛ دفعتہً ان کو شدید قبض طاری ہوا انہوں نے مجھے اطلاع

کی میں نے کہا کہ سب کام چھوڑ دو اور خوب کھاؤ پیو، ہنسو بولو، سیر و تفریح میں مشغول ہو، اور لکھنو جا کر سیر کرو یا کسی دوسری جگہ کا سفر کرو۔ اس علاج سے ان کو بہت وحشت ہوئی کہ ذکر و شغل چھڑا کر اچھا کام تبلایا مگر باوجود حقیقت سمجھ میں نہ آنے کے انہوں نے اس پر عمل کیا، تین چار ہی دن میں بسط قوی حاصل ہو گیا، اور سارا قبض جاتا رہا، بڑے خوش ہوئے تو یہ بات تھی کہ کثرت مجاہدات سے نفس تھک گیا تھا، جیسے بعض دفعہ روز روز مٹھائی کھانے سے جی اکتا جاتا ہے اس لئے تبدیل ذائقہ کی ضرورت تھی، جیسے جب غذا ہضم نہ ہو تو کھانے کے ساتھ چٹنی کھا لیا کرتے ہیں چنانچہ جب نفس کو مجاہدات سے چھڑا کر سیر و تفریح میں مشغول کیا گیا۔ ذائقہ بدل گیا، تو وہ انقباض بھی جاتا رہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راز کو خوب سمجھا ہے اسی لئے حدیث میں ہے جب رات کو نماز پڑھتے پڑھتے نیند آنے لگے تو سو جاؤ پھر اٹھ کر کام کرنے لگو، ولن یمل اللہ حتی تملو، ہمارے حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھا کہ سبق کا تکرار ایسے وقت ختم کرنا چاہیئے جب کہ کچھ شوق ختم ہو جائے مثلاً بارہ دفعہ کہنے کا شوق ہو، تو دس بار ہی کہہ کر ختم کر دو، تاکہ آئندہ کے لئے شوق باقی رہے اس سے اکتا کر ختم نہ کرنا چاہیئے اس سے آئندہ کو ہمت ہار جاتی ہے اور اس کی ایک عجیب مثال بیان فرمائی، گویا معقول کو محسوس کر دیا فرمایا دیکھو چلیئ پھراتے ہوئے کچھ ڈورا اس کے اوپر لپٹا ہوا چھوڑ دیتے ہیں تاکہ اس ڈورے پر آسانی سے پھر لوٹ آوے اور اگر کبھی غلطی سے سارا ڈورا اتر جاتا ہے پھر دقت سے لوٹتی ہے۔ غرض اسی طرح اور بہت نظریں ہیں، جن

ہیں شیخ منتجات سے روک کر مباحات میں مشغول کرتا ہے مگر وہ مباحات ہی مالیعنی ہیں اور منتجات اس شخص کے لئے لایعنی ہوتے ہیں باقی اس کے لئے قواعد ہیں یہ نہیں کہ جب چاہا جو چاہا حکم دے دیا قواعد ضرور ہیں مگر وہ پاس رہنے والے کو تبلائے جائیں اور وہ ان سے کام لینے لگے ؛

عدم مہارتِ فن

تو عدم مہارت فن کے سبب وہی قصہ ہو گا کہ ایک حکیم صاحب اپنے صاحبزادہ کو ساتھ لے کر ایک مریض کو دیکھنے گئے نبض دیکھ کر کہنے لگے کہ معلوم ہوتا ہے آج آپ نے نارنگی کھائی ہے مریض نے اقرار کیا ؛ لوٹتے ہوئے صاحبزادہ نے دریافت کیا کہ آپ کو نبض سے یہ کیوں کر پتہ چل گیا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے حکیم صاحب نے کہا کہ نبض سے تو کچھ اتنا معلوم ہوا تھا کہ اس نے کوئی چیز قاطع سفرا استعمال کی ہے ؛ پھر مجھے پلنگ کے نیچے سے نارنگی کے چھلکے نظر آئے تو میں سمجھ گیا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے بس اب صاحبزادہ کہاں تھے بڑے خوش ہوئے کہ ہمکو آج بڑا مسئلہ معلوم ہوا جب حکیم صاحب مر گئے اور صاحبزادہ کا دور دورہ ہوا تو کسی مریض کے یہاں بلائے گئے آپ کو تو وہ مسئلہ یاد ہی تھا نبض دیکھ کر چارپائی کے نیچے نظر کی تو ایک نمدہ پڑا ہوا دیکھا ؛ کہنے لگے کہ آپ نے آج نمدہ کھایا ہے لوگ اس پر ہنسنے لگے ؛ بیمار نے کہا بھلا نمدہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے جو میں کھا لیتا تو آپ کہنے لگے کہ نبض سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے آج نمدہ کھایا ہے اس نے ملازموں سے کہا کہ اس جاہل کو نکالو ؛ اس کی دم میں نمدہ ؛ اسی طرح اناڑی آدمی کو اگر یہ قواعد بتائے جائیں گے وہ بھی ایک قاعدہ یاد کر کے سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکے گا باقی محققین نے اس کے لئے اصول و قواعد بیان کئے ہیں

اور محقق ان کو سمجھ کر استعمال بھی کرتا ہے اگرچہ ایسے لوگوں پر عوام نے طعن بھی بہت کئے ہیں مگر مشائخ پر طعن نہیں ہو سکتا؛ وہ جو کچھ کرتے ہیں حقیقت سمجھ کر کرتے ہیں امام غزالی نے لکھا ہے کہ جب ذکر سے طبیعت اکتا جائے تو اس ذاکر پر تھوڑی دیر ہنسنا بولنا بھی واجب ہے؛ لوگوں نے اس مسئلہ کی وجہ سے امام پر بہت طعن کیا کہ دیکھو ہنسنے بولنے کو واجب کر دیا؛ مگر محقق کا کلام محقق ہوتا ہے اس کا راز یہ تھا کہ اصل میں تو عمل واجب ہے اور بعض طبائع کی خصوصیت سے عمل موقوف ہوتا ہے؛ نشاط پر نشاط ہوتا ہے؛ ہنسنے بولنے سے اور یہ مسلم ہے کہ مقدمۃ الواجب واجب پس اس میں کیا اشکال رہا۔ یہ مضمون بہت طویل ہے؛ لیکن وقت تنگ ہو گیا ہے اس لئے میں بیان کو ختم کرتا ہوں اور حدیث کا خلاصہ پھر بیان کئے دیتا ہوں کیوں کہ خلاصہ بیان کر دینے سے مقصود محفوظ ہو جاتا ہے حاصل اس ارشاد نبوی کا یہ ہے کہ فضول اور لغو باتیں اور کام چھوڑ دو اور فضول اسے کہتے جس کے چھوڑنے سے نہ دنیا کا ضرر ہو نہ آخرت کا اور اس کے کرنے میں نہ دنیا کا نفع ہو؛ نہ آخرت کا اب دعا کرو کہ حق تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق دیں؛ آمین؛ وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین؛

رفع الموانع

موانع طریق کی تفصیل کے متعلق یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں، ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ کو بھوپال سے آئے ہوئے چند مہمانوں کی خواہش پر بیٹھ کر فرمایا، ۱۵۰ کے قریب سامعین تھے، جن کی اکثریت صلحاء پر مشتمل تھی اور اہلِ علم کم تھے، مولوی محمد عبداللہ صاحب گنگوہی نے قلم بند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ
ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ
فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا
اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ
ورسولہ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن
الرحیم ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ ویومن باللہ یھد قلبہ
واللہ بکل شیء علیم. واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولیتم
فانما علی رسول البلاغ المبین اللہ لا الہ الا ھو وعلی اللہ
فلیتوکل المومنون یا ایھا الذین امنوا ان من ازواجکم واولادکم
عدوا لکم فاحذروھم وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا
فان اللہ غفور رحیم انما اموالکم واولادکم فتنۃ واللہ عندہ
اجر عظیم فاتقوا اللہ ما استطعتم واسمعوا واطیعوا و
انفقوا خیرا لانفسکم ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون
ان تقرضوا اللہ قرضا حسنا یضاعفہ لکم ویغفر لکم واللہ شکور
حلیم عالم الغیب والشھادۃ العزیز الحکیم

تمہید یہ سورۃ تغابن کا ایک پورا رکوع ہے ہر چند کہ آیتیں متعدد ہیں، لیکن ان سب میں ایک جہتہ جامعہ ہے، جس کی وجہ سے تمام آیتیں تلاوت کی گئیں اور گو بیان میں اختصار ہوگا، لیکن بوجہ ارتباط آیات و جامعیت بیان کے اس مختصر ہی میں تمام آیتوں کے متعلق بیان ہو جائے گا اب میں پہلے وہ عنوان عرض کردوں جس کی یہ آیتیں بمنزلہ شرح اور تفسیر کے ہیں تاکہ ان کو تمام بیان میں پیش نظر رکھا جائے اور اس سے یہ بھی اجمالاً معلوم ہوگا، کہ آیات قرآنیہ میں کیسا ارتباط ہے لیکن یہ وقت اس مسئلہ پر مفصل گفتگو کرنے کا نہیں ہے۔ اس لئے اگر اس کو بیان کیا جاوے گا: تو اصل مضمون مقصود رہ جائے گا اس لئے اصل مضمون کی طرف رجوع کیا جاتا ہے،

اس تمام رکوع کے اندر جہتہ جامعہ بمنزلہ عنوان کے ہے صرف ایک شئے ہے، وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے ان آیتوں میں موانع طریق کو بیان فرمایا ہے، یعنی جو چیزیں حق تعالیٰ

کے راستہ سے روکنے والی ہیں اور اللہ کی یاد سے غفلت میں ڈالنے والی ہیں، یہ ان کی فہرست ہے لیکن صرف موانع کے بیان پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی مذکور ہے اور یہ حق تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ جہاں کسی مضرت کا وجود ہے وہاں اس کا دفع بھی موجود ہے اور اس حکمت کا ظہور تمام کائنات عالم پر ہوا ہے اور قرآن مجید میں تو خصوصیت کے ساتھ ہوا ہے کہ جہاں امراض کا ذکر ہے وہاں دوا بھی ہے، اور جس جگہ معاصی کا بیان ہے، وہاں اس کا علاج بھی ہے یہ ہے حاصل آج کے بیان کا۔

خوشگوار اور ناگوار امور

اس کے بعد سمجھئے کہ وہ موانع چند کلیات ہیں اور ان کی بے شمار جزئیات ہیں پھر ان کلیات کے لئے دو کلی جامع ہیں اس طور سے یہ تمام مضمون باہم متناسق اور منتظم ہیں وہ موانع باوجود تعدد و تکثر کے جزئیات کے صرف دو امر کلی کے اندر منحصر ہیں، یعنی صرف دو مانع ہیں، اول ضرا یعنی وہ حالت کہ جس کا عروض انسان کو ناگوار ہے دوسرے سرا یعنی وہ کیفیت جس کا ظہور آدمی کو گوارا ہو، لیکن یہ دونوں حالتیں مطلقاً مانع نہیں، بلکہ قید افراط کے ساتھ یعنی ضرا میں وہ حالت جو زیادہ ناگوار ہے اور سرا جہتہ میں وہ حال جو زیادہ گوارا ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ طریق جس کے موانع میں ہم کلام کر رہے ہیں اس سے مراد حق تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ ہے، اور وہ کوئی محسوس شے نہیں ہے کہ کوئی ٹھیا ہو یا سڑک ہو بلکہ حاصل اس کا شغل مع اللہ ہے اور شغل قلب کا فعل ہے جو کم و بیش ہر مومن کو حاصل ہے یہ تو حاصل ہوا طریق کا، اب سمجھو کہ ہر شخص پر اکثر اوقات ان دو حالتوں

یعنی سرار یا ضرار میں سے ایک نہ ایک حالت کا عروض علی سبیل التعاقب والتناوب ضرور رہتا ہے بعض مرتبہ تو ادنیٰ درجہ ان حالتوں کا ہوتا ہے! یعنی ناگواری اور خوشگواری کم درجہ کی ہوتی ہے کہ قلب کو اپنی اصلی حالت سے از جار فتہ نہیں کرتی اور بعض مرتبہ زیادہ ہو جاتی ہے کہ قلب کو اپنی طرف مشغول کر لیتی ہے اور اپنی اصل حقیقت سے دور کر دیتی ہے بس یہ ہی حالت مانع طریق ہے باقی اس حالت کی کوئی ایسی تحدید کہ اس فلاں درجہ مانع ہے نہیں ہو سکتی بطور تشکیک کے حسب اختلاف نوت شغل مع اللہ کی ہر فرد کے اعتبار سے اس میں اختلاف ہوگا! اور یہ شغل مع اللہ وہ چیز ہے کہ تمام شریعت جس کا ایک جزو طریقت بھی ہے اسی شغل مع اللہ کی شرح اور تفصیل ہے اور یہ جو میں نے کہا کہ جس کا ایک جزو طریقت بھی ہے اور طریقت کو شریعت پر عطف نہیں کیا تو کیا وجہ اس کی ہے کہ شریعت اور طریقت میں تباین بمعنی تنافی نہیں! ہاں ایسا تباین کہا جا سکتا ہے جیسے کُل میں اور اس کے اجزار خارجیہ میں تباین ہوتا ہے کہ چھت کو یا دیوار کو بیت یا بیت کو چھت یا دیوار نہیں کہہ سکتے اور اجزار ذہنیہ میں تو کل کا اس کے اجزا پر اور اجزار کا اپنے کل پر صادق آنا بھی ضروری ہے اس لئے میں تباین کے لفظ کو کہ موہم ہے چھوڑ کر یہ کہوں گا کہ شریعت اور طریقت میں تنافی نہیں ہے! جیسے جہلا کا خیال ہے کہ شریعت اور شئے ہے اور طریقت اور، اور کہتے ہیں کہ شریعت میں بہت سی چیزیں حرام ہیں اور طریقت میں حلال ہیں کاش اس کا عکس کرتے تو اس سے تو اچھا تھا یعنی یہ کہتے کہ شریعت میں بہت سی چیزیں حلال ہیں اور طریقت میں حرام تو ہم اس کی یہ تاویل کر لیتے کہ مطلب ان کا یہ ہے کہ نرے فتوے

پر مت رہو، اس لئے کہ ہمکو خدا تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کرنا منظور ہے اس لئے ہم کو بہت وہ چیزیں جن کو حق تعالیٰ نے شریعت میں بوجہ اپنے بندوں کے ضعف کے بطور رخصت کے جائز کر دی ہیں ان کے ساتھ ہم کو عملاً ناجائز کا سا برتاؤ رکھنا چاہیئے تاکہ عزیمتہ پر عمل فوت نہ ہو؛ لیکن اس کا تو نام و نشان نہیں بلکہ برعکس اس کے جو اعمال کہ شریعت میں حرام ہے؛ ان کے نزدیک جائز ہے شراب پینا حرام ہے اور ان کے نزدیک جائز ہے اور بہت سے صوفی ایسے بھی دیکھے گئے جو امرد پرستی کو سبب قرب کا جانتے ہیں، چنانچہ ہم نے خود ان لوگوں کو دیکھا ہے؛ کہ ایک ایک لڑکا ان کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کے جواز کے لئے ایک حدیث گھڑی ہے وہ یہ ہے رأیت ربی فی صورۃ شاب امرد؛ اول تو یہ حدیث ہی نہیں کسی کی گھڑت ہے اور اگر بالفرض ہو بھی تو توجیہہ اس کی یہ ہوگی؛ کہ مراد اس میں ایک تجلی مثالی ہے: جو کہ مخصوص امردی کے ساتھ نہیں ہے؛ بلکہ بزرگوں کو یہ تجلی مختلف صورتوں میں ہوئی ہے اور حاصل اس کا صرف مظہریت ہے یعنی ان کو ان صورتوں میں حق تعالیٰ کے علم قدرت وغیرہ صفات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اگر وہ اس حدیث سے قطع نظر کر کے کہیں کہ ہم امارد کو بحیثیت مظہریت ہی کے دیکھتے ہیں کہ اس میں بعض صفات کا مشاہدہ ہوتا ہے؛ سو ایسے مشاہدہ تو جس طرح امردمیں ہے اسی طرح بوڑھے میں بھی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ امرد بے ریش تو سبب قرب کا ہو؛ اور سو برس کا بوڑھا یا ایک ماہ کا بچہ نہ ہو؛ بقراط کی حکایت شیخ سعدی شیرازیؒ نے لکھی ہے کہ چلا جا رہا تھا؛ ایک شخص کو دیکھا کہ پسینہ پسینہ اور بے خود

ہو رہا ہے پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے لوگوں نے کہا کہ یہ ایک بزرگ ہے اس نے ایک حسین لڑکے کو دیکھ لیا ہے اس میں حق تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کر رہا ہے: بقراط نے کہا کیا حق تعالیٰ نے صرف یہ ہی لڑکا ہی اپنی قدرت کے اظہار کے لئے پیدا کیا ہے اور کوئی نہیں ایک دن کا بچہ بھی تو اُسی کا پیدا کیا ہوا ہے اس کو دیکھ کر اس کا حال متغیر نہ ہوا، حق تعالیٰ کی صنعت دیکھنے کے اندر تو دونوں برابر ہیں بلکہ طفل یک روزہ کے اندر بوجہ زیادہ عجیب ہونے کا قدرۃ کا ظہور زیادہ ہے یہ تو ایک حکیم یونانی کی حکایت ہے اس کو سن کر تو شاید لوگ رد کردیں کہ اس کی بات کا کیا اعتبار ہے: لیکن شیخ سعدیؒ اس کی تصدیق کرتے ہیں، اب تو کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ وہ تو سب کے نزدیک مسلم ہیں صوفی بھی ہیں اور حکیم بھی وہ فرماتے ہیں محقق ہماں بیند اندر ابل: کہ در خوبرویاں چین و چگل، یعنی جو شخص حقیقت بین ہے وہ اونٹ میں بھی وہی دیکھتا ہے، بلکہ اونٹ کے دیکھنے میں تو نفع محض ہے اور امرد کے دیکھنے میں فتنہ کا احتمال بھی غالب ہے! اسی واسطے اونٹ کے دیکھنے کا امر بھی فرمایا ہے؛ ارشاد ہے: افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت یہ نہیں فرمایا افلا ینظرون الی الامارد کیف خلقوا:

کم علمی کی خرابی یہ جہلا صوفیہ کفار قریش سے بھی بڑھ گئے ہیں اس لئے کہ انہوں نے قرآن شریف کی نسبت حضورؐ سے یہ درخواست کی تھی ائت بقرآن غیر ہذا او بدلہ: یعنی اس قرآن کے سوا کوئی دوسرا قرآن جس میں ہمارے معبودوں کی برائی نہ ہو لے آیئے یا اسی میں ترمیم کر دیجئے جس کا جواب ارشاد ہوا: قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی یعنی میرے اختیار میں نہیں ہے:

کہ میں اس کو اپنی طرف سے بدل دوں جواب میں صرف تبدیل کی اس لئے نفی فرمائی
کہ اس سے ہی تجدید کی نفی بھی ہوگی، اس لئے کہ جب کہ ترمیم بھی اختیار میں نہیں
ہے تو نیا قرآن لانا تو بطریق اولیٰ منتفی ہوگیا، اور ان حضرات نے خود ہی ایک قرآن
بنا لیا، کہ حق تعالیٰ تو فرماتے ہیں، افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت اور یہ اپنے
طرز عمل سے کہہ رہے ہیں افلا ینظرون الی الاحمار وکیف خلقوا انہوں نے
تو صرف درخواست کی تھی، مگر انہوں نے تو بدل کر دکھلا دیا گویا در پردہ قرآن مجید کا
مقابلہ ہے کہ قرآن میں طریق قرب الٰہی کے مذکور نہیں ہیں، ہم نے ایجاد کئے ہیں،
غرض قائل ہوئے تو اس کے ہوئے کہ طریقت میں بہت سی حرام چیزیں بھی حلال ہیں یہ
اور یہ مسلک نیا نہیں ہے، پہلے بھی ان کے ہم خیال لوگ ہوئے ہیں چنانچہ ایک
فرقہ اباحیہ مشہور ہے کہ ان کے نزدیک ہر شئے مباح ہے اور اس حدیث سے استدلال
کرتے ہیں، جو اہل بدر کی شان میں وارد ہوئی ہے، اعملوا ما شئتم فقد غفرت
لکم جو چاہو عمل کرو، میں نے تمہارے لئے مغفرت کر دی نیم ملّا خطرہ ایمان کا مضمون
ہے یہ ادھورے علم کی خرابی ہے، حالانکہ خود اس حدیث کے اندر غور کرنے سے
جواب ظاہر ہے، چنانچہ شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ لفظ مغفرت فرمانا خود دال ہے
گناہ ہونے پر اگر گناہ نہ ہوتا تو غفرت ارشاد نہ ہوتا، ابحت یا احللت ہوتا، غرض
کمالات میں کوئی مرتبہ ایسا نہیں ہے کہ اس پر پہنچ کر احکام شرعی مکلف سے ساقط
ہو جاویں، الحاصل شریعت اور طریقت تنافی نہیں ہے اس لئے میں نے طریقت کا
شریعت پر عطف نہیں کیا، بہرحال تمام شریعت شرح ہے، اسی شغل مع اللہ کی
یہ تو بیان تھا طریق کا، اور مانع کا حاصل ہوگا، تشغل الغیر یعنی قلب کو غیر حق کے

ساتھ مشغول کر دینا اس لئے کہ قلب ایسی چیز ہے کہ ایک وقت میں دو طرف اس کو توجہ تام نہیں ہوتی جب غیر کے ساتھ مشغولی ہو گی تو اس سے لامحالہ حق تعالیٰ سے غفلت ہو گی؛

عبادت میں یکسوئی

اسی واسطے فلاسفہ نے کہا ہے النفس لاتتوجہ الیٰ شیئین فی ان واحد اور یہاں سے ایک کام کی بات مستنبط ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اس کی شکایت کیا کرتے ہیں کہ ہم کو نماز میں وسوسے آتے ہیں اور اس کے مختلف علاج کرتے ہیں چنانچہ مشائخ زمانہ تو اس کے لئے وظیفے بتلاتے ہیں کہ یہ وظیفہ پڑھو وسوسے نہ آئیں گے؛ اور اس میں یہ قید لگادی کہ جی لگا کر پڑھنا؛ اس بے چارہ نے پڑھنا شروع کیا تو وسوسے وہاں بھی موجود پھر شیخ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت وسوسے آتے ہیں؛ انہوں نے اس کے لئے بھی ایک وظیفہ اور بتا دیا؛ اب اس میں بھی وسوسے ہیں پھر اس کے لئے بھی تیسرا وظیفہ بتا دیا؛ تسلسل محال لازم آگیا؛ اور ان حضرات نے یہ ثابت کر دیا کہ نماز میں جی لگنا اور وساوس کا قطع ہو جانا محال ہے اس لئے کہ تسلسل کو مستلزم ہے اور جو مستلزم محال کو ہو؛ وہ خود محال ہے اب وہ بے چارہ پریشان ہو کر سمجھ جاتا ہے کہ بس جی نماز میں جی لگنا میرے لئے تو بہت مشکل ہے اور وظیفے پڑھتا پڑھتا تھک جاتا ہے؛ بعض مرتبہ انجام اس کا یہ ہوتا ہے کہ نماز بھی چھوڑ دیتا ہے؛

صاحبو! کوئی ان شیخ سے پوچھے کہ وظیفہ پڑھنے اور وساوس کے قطع ہونے میں کیا مناسبت ہے! آخر مرض اور دوا میں کوئی تناسب تو ہونا چاہیئے خوب سمجھو کہ وساوس کا حاصل شغل بالغیر ہے اس کا بجز اس کے کچھ علاج نہیں ہے کہ اپنے قصد

اور اعتقاد سے خدا کے مشغول ہو، وساوس خود بخود منقطع ہو جائیں گے اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص ٹکٹکی باندھ کر ایک شئے کی طرف دیکھتا ہے اگر اس کی نگاہ پورا پورا اس کی طرف ہے تو دوسری شئے اس کو ہرگز نظر نہ آئے گی، اور اگر اس میں کمی ہے تو آنکھ کی شعاعیں دوسری طرف بھی جائیں گی، اور دوسری چیز بھی نظر آئے گی، تو جس طرح ظاہر کی آنکھیں ہیں اسی طرح قلب کی بھی آنکھ ہے، اگر قلب کو تمام شئے واحد کی طرف متوجہ کر دیا جائے گا، تو قلب کی شعاعیں دوسری طرف منتقل نہ ہوں گی، پس کسی شئے کا خیال نہ آئے گا، اور اگر توجہ میں کمی ہے تو ضرور دوسری چیزیں بھی اس میں آئیں گی، پس علاج یہ ہے کہ جب وساوس آئیں فوراً توجہ الی الحق ہو جاؤ اور پھر اگر آئیں پھر اس توجہ کو تازہ کر لو، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے، کہ توجہ الی الحق کے انحاء مختلف ہیں جن پر توحید اور تنزیہ کی شان غالب ہے تو ان کو براہ راست بلا واسطہ توجہ الی الحضرت الحق حاصل ہو جاتی ہے غائب کی طرف متوجہ ہونے میں ان کو کوئی شئے مانع نہیں ہوتی اور جن کو یہ دولت حاصل نہیں ہے، ان کے لئے توجہ الی الحق یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے نام پاک کی طرف توجہ کرے اور نماز کے اندر خصوصیت کے ساتھ یہ طریق اختیار کریں کہ جو کچھ زبان سے کلمات ادا کریں اور جوارح سے جو افعال کریں ان کی طرف توجہ کریں اور اول ان کا قصد کریں اور ان کلمات اور افعال کی طرف توجہ کرنا توجہ الی الغیر نہ کہلائے گا، اس لئے کہ وہ غیر ہے جو حق سے حاجب ہو اور جو موصل ہو، اس کی طرف توجہ کرنا عین توجہ الی الحق ہے اور یہ طریق میرا ایجاد کیا ہوا نہیں بلکہ اس کی دلیل موجود ہے، دیکھو حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص دو

رکعتیں پڑھے اور ان کی صفت یہ ہو کہ مقبلاً علیھما بقلبہ یعنی ان دو رکعتوں پر اپنے دل سے متوجہ ہو، اب دیکھ لیجئے کہ رکعتیں کی حقیقت کیا ہے رکعت نام ہے قیام قراءۃ رکوع سجود کا پس حاصل مقبلا علیھما کے یہ ہوا مقبلا علی القراءۃ والرکوع والسجود پس عبادت کے اجزاء خارجیہ اور ذکر اللہ کی طرف متوجہ ہونا مامور بہ اور مطلوب ہوا، اور یہ ہی عین توجہ الی اللہ ہے اس لئے کہ موصل الی اللہ ہے، پس اس کو الی غیر الحق نہ کہیں گے، اور جن کی چشم عبرت حق تعالیٰ نے کھول دی ہے ان کے لئے ہر شئے موصل الی الحق ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے، ؎

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

پس جب نماز میں وسوسے آئیں ذکر کی طرف متوجہ ہو جاؤ ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تسبیح اور قراءۃ یاد سے نہ پڑھو ارادہ سے پڑھو مولانا اس کی مثال دیا کرتے تھے کہ میاں ہماری نماز تو ایسی ہے، جیسے گھڑی کہ جب اس کو کوک دیتے ہیں تو برابر چوبیس گھنٹے تک چلتی رہتی ہے، اسی طرح ہم نماز جب شروع کرتے ہیں تو ہم کو کچھ خبر نہیں ہوتی رکوع سجود قیام قراءۃ سب آپ سے آپ ادا ہوتے رہتے ہیں نماز بھی ادا ہوتی ہے اور دکان اور بازار کے کام بھی ہوتے رہتے ہیں، جب سلام پھیرتے ہیں اس وقت خبر ہوتی کہ ہم نے نماز پڑھی ہے وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ ہم نماز محض یاد پر پڑھتے ہیں، علاج اس کا یہ ہے کہ نماز یاد سے نہ پڑھو، ارادہ سے پڑھو، یعنی ہر فعل کرنے اور ہر کلمہ کہنے کے وقت مستقل ارادہ کرو، اسی شان سے تمام نماز ختم کرو، دیکھیں کیسے وسوسے آتے ہیں، البتہ نفس کو تھوڑی سی دشواری اور مشقت ضرور ہو گی،

کہ اس کو جو عادت تھی : کہ شتر بے مہار کی طرح جہاں چاہتا تھا، پھرتا تھا؛ اس کو مقید کرنا پڑے گا؛ سو اتنی دشواری اور مشقت کوئی مشقت نہیں ہے؛ کیا آپ یہ چاہتے کہ نفس کو اتنی محنت بھی نہ کرنی پڑے؛ صاحبو! اگر جان بھی اس راہ میں جا کر کچھ مل جائے تو ارزاں ہے: ع: متاع جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے اور یہاں جان دی بھی نہیں گئی؛ بلکہ جان لی گئی ہے کہ ' ادھر اُدھر جو نفس مارا مارا پھرتا ہے اس کو ایک جگہ آرام دیا ہے اگر اتنی مشقت بھی گوارا نہیں تو یہ احدی بننا ہے؛ واجد علی شاہ کے یہاں دو احدی تھے؛ باری باری سے ایک دن ایک لیٹا رہتا تھا، اور دوسرا بیٹھا تھا؛ ایک روز ہ کا قصہ ہے کہ ایک سوار جا رہا تھا اس لیٹے ہوئے نے کہا کہ میاں سوار میرے سینہ پر جو یہ بیر رکھا ہے ذرا تکلیف کر کے یہ میرے مُنہ میں ڈال دو؛ اس سوار نے کہا کہ جو تیرے پاس بیٹھا ہے یہ ڈال دے گا؛ وہ بیٹھا ہوا بولا کہ جناب بس رہنے دیجئے ایک روز میں لیٹا تھا؛ اور میرے منہ میں کتا موت رہا تھا اس نے اس کو ہٹایا نہیں؛ میں اس کے منہ میں بیر ڈال دوں گا؛ اے صاحبو! خدا کی طلب کا دعویٰ اور پھر اس قدر سستی اور آرام طلبی آپ چاہتے ہیں کہ ہم کو اتنا بھی کام کرنا نہ پڑے مفت سفت مل جائے اتنا آسان طریق اور وہ بھی آپ نہ کریں؛ تو بس نرا دعویٰ ہی دعویٰ ہے بزرگانِ دین یہ فرماتے ہیں: سے

صوفی نشود صافی تا در نہ کشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

یہاں تو بسیار سفر بھی نہیں ہے؛ نہایت ہلکا کام ہے؛ غرض یہ طریقہ ہے؛ نماز میں جی لگانے کا جو بطور تفریع کے یہاں بیان کیا گیا؛ لیکن یہ طریقہ محض جان

نے کے لئے نہیں ہے ! بلکہ عمل کرنے کے واسطے ہے علوم اگر بہت سے حاصل کر لئے جائیں اور عمل نہ کیا تو وہ علوم کسی کام کے نہیں ہیں!

علم کے عملی فوائد

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ جس شخص کو علوم بہت سے حاصل ہوں اور عمل نہ کرے اس کی مثال ایسی ہے ! جیسے ایک سپاہی ہو ! اس کے پاس بہت سے ہتھیار ہوں اس کو راہ میں دشمن ملے ! اور مقابل ہوا ! لیکن وہ ان اسلحہ کا استعمال نہیں کرتا ! تو کیا دشمن پر غالب ہوگا یہ علوم بمنزلہ ہتھیاروں کے ہیں ! شیطان کے ذبح کرنے کے لئے ہتھیار بھی کیسے بلالیسنس کے مگر صرف ہتھیاروں کے لگانے سے خوش نہ ہونا چاہیئے اکثر لوگ بزرگوں سے سن کر یا کتابیں دیکھ کر کچھ طریقے وصول الی اللہ یاد کر لیتے ہیں اور ان پر ان کو ناز ہے لیکن جب ان پر عمل ہی نہ کیا ! تو کیا فائدہ ایسے ہی لوگوں کے لئے ارشاد فرحوا بما عندھم من العلم اگر کوئی خارش والا خارش کے بہت سے نسخے یاد کرلے تو اس سے کیا نفع جب تک کہ ان کو کوٹ پیس کر کام میں نہ لایا جائے پس جب آپ کو یہ طریقہ نماز میں دل لگانے کا معلوم ہوگیا ! تو آج عصر ہی کے وقت سے اس پر عمل شروع کردو ! الحاصل یہ ایک تفریع مفید تھی اس پر کہ النفس ! لاتتوجہ الی شیئین فی آن واحد اور مقصود مقام یہ ہے کہ شغل مع غیر اللہ مانع طریق ہے پس اس رکوع میں ان موانع کی فہرست ہے اور وہ دو کلیوں میں منحصر ہے ایک وہ حالت جو بہت ناگوار ہو ! دوسری وہ کیفیت جو زیادہ گوارا ہو اس لئے جو شئے کم گوارا ہو ! وہ قلب کو مشغول نہیں کرتی مثلاً آپ کچھ کام کر رہے ہے ! عین مشغول حالت میں کسی مچھر نے کاٹ لیا ! یا عین کام کے وقت آپ نے ایک چنے

کا دانہ اٹھا کر کھالیا؛ تو یہ دونوں حالتیں کام کی مانع نہ ہوں گی؛ مانع وہ حالت ہے جو زیادہ ناگوار ہو؛ یا وہ حالت جو زیادہ گوارہو، جو زیادہ نہ گوار ہو، وہ مصیبت کہلاتی ہے اور جو زیادہ گوارہو، وہ نعمت ہے پس قلب کو مشغول کرنے والی دو چیزیں ہوئیں مصیبت اور نعمت لیکن ان کی ذات مانع نہیں ہے؛ بلکہ مانع اس وقت ہے، جب کہ قلب ان سے متاثر ہو؛ پس مصیبت اور نعمت کا ہر درجہ مانع نہیں ہے؛ یہاں سے ایک اشکال دفع ہو گیا، تقریر اشکال کی یہ ہے کہ جب نعمت اور مصیبت مانع ہیں تو مصائب تو صلحاء اور اولیاء و انبیاء پر بہت آئے ہیں؛ چنانچہ ارشاد ہے اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام پر دنیوی نعمتیں بھی بہت فائض ہوئی ہیں؛ چنانچہ ارشاد ہے ولقد ارسلنا رسلا من قبلک وجعلنا لهم ازواجا وذریۃ تو اگر مصیبت اور نعمت شاغل ہیں تو انبیاء کے لئے بھی شاغل ہوں گی جواب یہ ہے کہ نعمت اور مصیبت کی ذات شاغل نہیں ہے بلکہ ان سے متاثر ہونا مانع ہے؛

محبت و رحمت

انبیاء علیہم السلام کو تاثر اس درجہ کا نہ ہوتا تھا کہ مصیبت اور ان کو خدائے تعالیٰ سے مشغول کر دے یہ تو نہ تھا کہ ان کو مصیبت سے تالم اور نعمت سے تلذذ نہ ہوتا تھا، بلکہ ان کو ہم سے بھی زیادہ ہوتا تھا لیکن خدا تعالیٰ کی یاد سے ان کو غفلت نہ ہوتی تھی، ہم لوگوں کو ہو جاتی ہے؛ اولاد کے ساتھ ان کو ہم سے زیادہ انس تھا؛ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور ممبر پر خطبہ پڑھ رہے تھے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما بچے سے تھے بڑے بڑے کرتے پہنے ہوئے تھے کہ حضور نے ممبر پر سے دیکھا کہ الجھتے پلجھتے گرتے پڑتے

آرہے ہیں، حضور نے خطبہ چھوڑ کر ان کو اٹھا کر گود میں لے لیا اور یہ فرمایا کہ حق تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے انما اموالکم و اولادکم فتنۃ، مجھ کو دیکھ کر صبر نہ آیا، ایک مرتبہ ایک رئیس نجد کے حضور کی خدمت میں بیٹھے تھے آپ حضرت حسنؓ کو یا حسینؓ کو پیار کر رہے تھے اس رئیس نے کہا کہ یا رسول اللہ میرے تو دس بیٹے ہیں، میں تو ایک کو بھی پیار نہیں کرتا، حضور نے فرمایا میں کیا کروں! اگر حق تعالیٰ نے تمہارے دل سے رحمت ہی نکال لی ہے حضور نے ایسے استغنار کو پسند نہیں فرمایا! آج اگر کوئی مولوی طالمبر پہ سے اتر کر کسی بچے کو لے لے تو لوگ بدنام کر دیں،

شانِ بزرگان

میں اس وقت دیکھتا ہوں کہ جو چیزیں شریعت میں ناجائز ہیں لوگ اس کو بہ کثرت جائز سمجھتے ہیں اور جو جائز ہیں ان کو ناجائز سمجھتے ہیں وظیفہ پڑھنے کی حالت میں بولنا حرام سمجھتے ہیں، خواہ شرعاً کتنا ہی ضروری کام بولنے کا ہو، لیکن بولتے نہیں اگر کوئی کچھ کہے گا، تو ہوں ہوں کریں گے، لیکن زبان سے بولنا حرام ہے! وظائف بہت پڑھتے ہیں، لیکن لوگوں کو ستاتے ہیں اپنی وجاہت سے دباؤ ڈال کر لوگوں سے کام لیتے ہیں دعوتیں کھاتے ہیں اگر اس غریب کے ہاں کھانے کو بھی نہ ہو، مناسب تو یہ ہے کہ ایسے غریب آدمی کی دعوت منظور بھی نہ کرے اودھ میں ایک بزرگ تھے کسی تعلقہ دار کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے! ایک غریب آدمی ان کا معتقد تھا، اس نے عرض کیا کہ حضرت آج مستی کسی روٹی میرے ہاں کھا لیجئے! ان بزرگ نے منظور فرمالیا، وہ شخص پانچ روپے ماہوار کا نوکر تھا، وہ ایک مرغ لایا اور چاول وغیرہ خرید کئے پانچ روپیہ ایک دن میں خرچ کر ڈالے ان بزرگ کو خبر ہوئی اس کو بلایا اور فرمایا بھائی تم سے ہماری مستی روٹی کی ٹھہری تھی یہ تکلفات تم

تم نے کیوں کیے اس لئے کہا حضرت جی یونہی کہہ دیا کرتے ہیں فرمایا کہ بھائی ہم نہ کھائیں گے ہم کو مسّی روٹی کھلاؤ گے تو کھائیں گے، یہ سب چیزیں ابھی واپس کر آئیں اور مسّی روٹی پکوائی، لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ کا کیا حرج تھا کیوں واپس کرادی، فرمایا کہ بے چارے کی کل پانچ روپیہ تو تنخواہ ہے اگر آج ہی یہ صرف کر دیتا تو مہینہ بھر اس کے بال بچے بھوکے رہتے میری جان کو کوستے شب کو وہ غریب حسب الحکم مسّی روٹی لایا اتنا اس نے اضافہ کر دیا کہ گھی سے چیڑ دی اس پر شاہ صاحب نے کچھ انکار نہیں کیا، فرمایا جب ان تعلقدار صاحب کے یہاں دستر خوان پر قسم قسم کے کھانے آئے اور سب دوست احباب جمع ہو گئے لوگوں نے چاہا شاہ صاحب کو یہ روٹی نہ کھانے دیں، اور عمدہ کھانا کھلادیں، اول ایک نے کہنا شروع کیا کہ حضرت کچھ تبرک ہم کو بھی عطا ہو، دوسرا بولا کہ حضرت میرا بھی بہت جی چاہتا ہے بزرگوں کو حق تعالیٰ نے فراست صحیحہ عطا فرمائی ہے، سمجھ گئے یہ مل کر میری روٹی اڑانا چاہتے ہیں انہوں نے اس میں سے ایک روٹی دے کر فرمایا کہ اس کو بانٹ لو، زیادہ کسی کو ایک ٹکڑا بھی نہ دوں گا، غرض انہوں نے وہی روٹی اس جگہ بیٹھ کر کھائی بزرگوں کی یہ شان ہوتی ہے!

آجکل کے بزرگ

یہ آجکل کے بعضے بزرگ اور مولوی صاحب کھانے کے بزرگ اور مولوی ہیں، مولوی ہونا گویا اپاہج ہو جانا ہے! گھر کے کام کاج کو ہاتھ نہیں لگاتے اس لئے کہ حضرت بن گئے ہیں اگر گھر کا سودا سلف خرید کر دینگے تو ان کی بزرگی میں فرق آجائے گا، حالانکہ صحابہ کی شان یہ تھی۔ لیوث النہار رہبان اللیل یعنی دن کو اگر کوئی صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھتا تھا۔

تو سمجھتا تھا کہ شیر ہیں اور رات کو راہب بنجاتے تھے کہ شب بیداری میں گذارتے تھے اب تو یہ حالت ہے کہ ذرا کوئی تہجد پڑھنے لگے تو پیر بننے کے مدعی ہو جاتے ہیں اور اگر دو چار مرید ہو گئے تو وہ بنانا شروع کر دیتے ہیں اور کاروبار سے تو بالکل ہی معطل ہو جاتے ہیں اگر پیاس ہو تو پیاسے بیٹھے رہیں گے، یہ نہیں کہ خود اٹھ کر پانی پی لیں کہیں گے کوئی ہے یہ خدام حضرت جی حضرت جی کہہ کر مزاج بگاڑ دیتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں : ؎

نفس از بس مدحہا فرعون شد کن ذلیل النفس ہونا لا تسد

فی الواقع شہرت بہت بری بلا ہے ، دین کے لئے تو مضر ہے ہی دنیا میں بھی اس کی بہت آفات ہیں ، جیسے مولانا فرماتے ہیں :

چشمہا و خشمہا و رشکہا بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

یعنی لوگوں کے غصے اور چشم بد اور غبطے و رشک تیرے سر پر اس طرح برستے ہیں ، جیسے مشکوں سے پانی گرتا ہے ، حقیقت یہ ہے کہ بڑا بننا بہت مشکل ہے ! آجکل کے بزرگ شاہ صاحب نہیں بیاہ صاحب ہیں . بزرگوں کی یہ شان ہوتی ہے ، جیسا ان بزرگ نے کیا کہ تمام سامان اس غریب کا واپس کرا دیا ، اور دعوت میں مستی روٹی پکوائی اور باوجود اس کے کہ اودھ میں تہذیب بہت ہے کہ جس کو تعذیب کہنا مناسب ہے لیکن انہوں نے کچھ پروا نہ کی اور وہی روٹی کھائی !

تعظیم اور تہذیب ہمارے ان قصبات میں الحمد اللہ ایسی تہذیب نہیں ہے سادگی ہے ، برتاؤ میں بات چیت میں ہر امر میں سادگی ہے میرے پاس ایک گاؤں کا آدمی آیا کرتا تھا ، سلسلہ میں داخل تھا ! ایک مرتبہ مجھ سے

کہنے لگا کہ ہمارے گاؤں میں ایک فقیر آیا کرتا ہے۔ میں اس کا طالب ہو جاؤں میں نے اس کو دھمکایا اس لئے کہ وہ فقیر پابند شریعت نہ تھا۔ ایک مدت کے بعد میں نے پوچھا کہ اب کس کے طالب ہو، سادگی سے کہنے لگا، کہ بس اب تو تیرا ہی پلہ پکڑ لیا ہے۔ مجھے اس کی زبان سے یہ بات ایسی اچھی معلوم ہوئی کہ میں نے اس سے کئی مرتبہ یہی بات کہلائی۔ اودھ میں تو یہ بات ایسی ہے جیسے گولی مار دی اور تعظیم و تکریم کی یہ حالت ہے کہ اگر کوئی آجائے تو نصف قامت کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے میاں جی لڑکوں کو سزا دینے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ اودھ تشریف لے گئے تھے۔ ایک رئیس نے اسی طرح تعظیم کی۔ مولانا نے انگوٹھا دکھا دیا۔ اس نے کچھ نذر پیش کی۔ مولانا نے منہ چڑا دیا یہ ان کی اس تعظیم و تہذیب مفرط کا رد تھا اور اس قصہ میں یہ بھی ہے کہ جب وہ غریب مسّی روٹی لایا اور ان امراء نے چاہا کہ شاہ صاحب کو یہ روٹی نہ کھانے دیں اور تہذیب کی وجہ سے یہ تو کہہ نہیں سکے کہ حضرت یہ روٹی نہ کھایئے۔ بلکہ یہ کہا کہ حضور ہم بھی تبرک لیں گے۔ تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ بزرگ بھولے نہیں ہوتے ان کو اللہ تعالیٰ فراست اور عقل صحیح عطا فرماتے ہیں انبیاء میں کوئی بھولا نہیں ہوا اگر ایسے ہوتے تو مفسدوں کے مکر اور ان کی چالوں سے کیسے واقف ہوتے ان کے دھوکہ میں آجایا کرتے سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شان یہ تھی کہ قیصر کے ہاں سے یہاں کا ایک قاصد گیا تھا۔ اس سے قیصر نے پوچھا کہ تمہارا خلیفہ کیسا ہے تو انہوں نے کہا کہ ان کی شان ہے لا یخدع ولا یخدع یعنی وہ نہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں اور نہ کسی کے دھوکہ میں آتے ہیں۔ قیصر نے سن کر کہا کہ کسی کو دھوکہ نہ

دینے سے معلوم ہوا کہ وہ بڑے دیندار ہیں اور دہو کہ نہ کھانے سے معلوم ہوا کہ وہ بڑے عاقل ہیں اور جس شخص کے اندر یہ دونوں صفتیں ہوں وہ کسی سے مغلوب نہ ہوگا! اسی طرح ان صاحب کی خفیف سمجھ کر کہہ دیا کہ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ یہ روٹی مجھ کو نہ کھانے دوگے، سو یاد رکھو میں کسی کو نہ دوں گا! اور وہ روٹی خود انہوں نے کھائی صرف ایک روٹی ان کی درخواست پر دے دی اور یہ جو اس قصہ میں ہے کہ لوگوں نے جب پوچھا کہ حضرت اس میں کیا مصلحت تھی! کہ آپ نے سب سامان واپس کرا دیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم دیوانے ہوئے ہو بیچارے کی پانچ روپیہ تو تنخواہ ہے اور وہ سب آج ہی اگر خرچ کر دیتا تو تمام مہینہ بیچارا تکلیف میں رہتا اور اس کے اہل وعیال کوستے وہ اور بال بچے کہتے کہ اچھے بزرگ آئے تھے کہ صفایا ہی کر گئے! اس لئے مشائخ کو چاہیئے! کہ اپنے متوسلین اور احباب کی رعایت کریں ان کی وسعت سے زائد نذر قبول نہ کریں!

طبعی راحت و کلفت: مگر اب ان اخلاق کو چھوڑ کر بزرگی اس میں رہ گئی ہے! کہ وظیفہ میں بولنا ان کے نزدیک حرام ہے اگر بولیں گے تو وظیفہ ٹوٹ جائے گا! ان کا وظیفہ کیا ہوا جولاہہ کا تاگا ہے! خدا جانے یہ مسئلہ کس نے تراشا ہے کہ وظیفہ میں بولنے سے وظیفہ ٹوٹ جاتا ہے جس چیز کو خدا نے بولنے سے ٹوٹ جانے کو کہا ہے! وہ تو ٹوٹ جاتی ہے! جیسے نماز باقی کوئی شئے نہیں ٹوٹتی! سو اب بزرگی اس کا نام رہ گیا ہے کہ جس شئے میں تنگی کرنا چاہیئے اس میں تو وسعت کرتے ہیں اور وسعت کی جگہ تنگی بڑا بزرگ وہ ہے کہ اگر گھر میں آگ بھی لگ جائے یا کوئی شخص مرتا ہو تو وظیفہ کو قطع کر کے اس

کی مدد نہ کرے یاد رکھو بزرگ وہ ہے جو قدم بقدم ہو، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پس اولاد کے ساتھ انبیاء کو بہت محبت ہوتی ہے مگر وہ محبت ان کو حق تعالیٰ سے غافل نہیں کرتی پس معلوم ہوا کہ نعمت اور مصیبت کی ذات مانع نہیں ہے، بلکہ وہ درجہ مانع ہے، جو افراط کے درجہ میں ہو، اور خواص کو کوئی درجہ بھی مانع نہیں ہوتا، کیوں کہ ان کو مصیبت میں زیادہ ناگواری اور نعمت میں زیادہ گوارائی ہی نہیں ہوتی بخلاف عوام کے کہ ان کو مصیبت اور نعمت از جا رفتہ کر دیتی ہے اس مضمون کو دوسرے عنوان سے سمجھو کہ انبیاء و اولیاء کو بلا اور نعمت سے راحت اور کلفت تو ہوتی ہے، لیکن وہ راحت اور کلفت طبعی ہوتی ہے ان کو اس میں مبالغہ اور انہماک نہیں ہوتا پس راحت اور کلفت کے دو درجے ہوئے اول طبعی دوسرا درجہ انہماک اور مبالغہ کا کہ بشرہ اثرہ اور باسرہ اس میں کھپ جائے اور دوسری طرف مطلق دھیان نہ ہو انبیاء و اولیاء کو طبعی راحت او طبعی کلفت ہوتی ہے، چنانچہ جب حضرت ابراہیم یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ کی وفات ہوئی تو حضور کو رنج ہوا، اور فرمایا انا بفراقک یا ابراہیم لمحزونون اور حضور کے آنسو جاری ہوئے، بعض صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ کیا ہے: فرمایا یہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے قلب میں رکھی ہے، اسی طرح حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو آتے دیکھ کر جوش محبت سے ان کو ممبر سے اتر کر اٹھا لیا، لیکن یہ حزن اور محبت طبعی تھا، جس کا ادراک خاصہ ہے طبع سلیم کا حال اگر کسی پر حال غالب ہو، تو اس وقت یہ طبعی کلفت اور راحت بھی نہیں ہوتی، لیکن انبیاء پر بوجہ ان کے علوی مقام کے حال غالب نہیں ہوتا وہ اس سے منزہ ہوتے

ہیں وہ حال پر خود غالب ہوتے ہیں غلبہ حال اولیاء متوسطین پر ہوتا ہے جس میں ان
کو راحت سے راحت اور کلفت سے کلفت نہیں ہوتی ؛ چنانچہ بعض اولیاء اللہ
کی اولاد کا انتقال ہوا ؛ وہ ہنس دیئے لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسے لوگ بڑے کامل ہیں
کامل ہونے میں ان کے شک نہیں ہاں اکمل نہیں ہیں اکمل وہ ہے کہ جس کی
حالت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہو ؛ کہ آنسو ٹپک رہے ہوں
اور دل من کل الوجوہ اپنے مولا کی قضا پر راضی ہو ؛ شاید کسی کو اشکال ہو کہ یہ کیسے
ہو سکتا ہے اس لئے میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں دیکھو کسی شخص
کے دنبل ہو جائے سول سرجن کو دکھلایا اس نے کہا کہ یہ بغیر شگاف کے صاف نہ ہو
گا ؛ اب اس میں مریضوں کی مختلف حالت ہوتی ہے ؛ بعض دل کے کمزور ہوتے
ہیں ان کو تو کلورا فارم سونگھا کر بے ہوش کر کے شگاف دیتے ہیں اس وقت اس
مریض کو اس چیر پھاڑ کا کچھ الم محسوس نہیں ہوتا ؛ اس لئے کہ دوسری شئے اس
کے حواس پر غالب ہے ؛ یہ مثال ان اولیاء اللہ کی ہے جن پر حال ایسا غالب
ہوتا ہے کہ ان کو مصیبت کا الم محسوس نہیں ہوتا اور ایک قوی شخص ہے کہ اس نے
کہا کہ مجھ کو بے ہوش کرنے کی ضرورت نہیں ؛ تم بشوق تمام اپنا کام کرو ؛ ڈاکٹر نے
وہ دنبل تراشا ؛ تراشنے میں اس کو تکلیف بھی ہو گی ؛ اور آہ بھی زبان سے نکلے گی ؛
اور یاد رکھو یہ آہ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے تکلیف میں آہ سے بڑی راحت
ہوتی ہے یہ آہ مصیبت کی مقلل ہے ؛ غرض اس زخم کے تراشنے کے وقت اس
مریض کا منہ بھی بنجاوے گا ؛ لیکن وہ دل سے راضی ہے کاٹنے والے سے ذرا
بھی اس کے دل میں کدورت نہیں ہے ؛ چنانچہ جب وہ زخم صاف ہو گیا ؛ تو

جراح کہتا ہے لائیے انعام فوراً جیب سے نکال کر دس روپیہ اس کی نذر کئے اور اب وہ جھگڑ رہا ہے : کہ حضور یہ بہت کم ہے اور دیکھئے اس نے دس روپیہ اور نکال کر دیئے : اب کوئی اس سے پوچھے کہ ایک تو اس نے مصیبت میں ڈالا : پھر اس کو انعام دیا جاتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اس زخم پر راضی تھا : سو بظاہر یہاں بھی وہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ اگر راضی تھا تو ناک منہ کیوں چڑھایا اور اگر ناراض تھا تو انعام کیوں دیا : وہ بھی جواب دے گا کہ کلفت طبعیہ کی وجہ سے تو ناک منہ چڑھایا اور دل سے راضی تھا کہ اس کا انجام بہتر ہے یہ مثال عباداللکین کی ہے کہ ان کو مصیبت میں طبعی کلفت اور رنج ہوتا ہے اور دل چونکہ یقین رکھتا ہے کہ اس میں حکمت اور مصلحت میرے مولا کی ہے اس لئے راضی ہے اعتراض یا کدورت یا انقباض تام کو بھی نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ شخص بڑا قوی دل ہے کہ باوجود ہوش و حواس کے پھر از جار فتہ نہیں ہوا اور اپنے خیر خواہ معالج سے اس کو کچھ انقباض نہیں ہوا اگر جاہل اور نادان ہوتا تو ضرور اس سے مکدر ہو جاتا اور وہ شخص جس کو بے ہوش کیا گیا ہے : وہ درجہ میں اس سے کم ہے سول سرجن جانتا ہے کہ اگر ہم اس کو بے ہوش نہ کریں گے تو بہت شور مچا دے گا اور ہم کو کام نہ کرنے دے گا : یس جن کو غلبہ حال کا کلوروفارم سونگھا دیا گیا ہے وہ درجہ میں ان حضرات سے کم ہیں اور یہ امر بہت ظاہر ہے اس لئے کہ شریعت نے رضا بالقضا کا حکم کیا ہے التذاذ بالقضاء کا حکم نہیں کیا اور مشائخ کے کلام سے بھی اس کا ثبوت ہوتا ہے چنانچہ شیخ سعدی شیرازیؒ فرماتے ہیں : ع وگر تلخ بینید دم درکشید معلوم ہوا کہ تلخی کا تو احساس ان کو ہوتا ہے : لیکن اس سے راضی ہیں : قضا کے سامنے

بولتے نہیں ہیں مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؛ ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من — دل فدائے یار دل رنجان من

معلوم ہوتا ہے کہ دل رنجانی ہوتی ہے لیکن وہ خوش ہے بہر حال رضا بالقضا کلفت طبعیہ کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے اور جن کو اس میں لذت ہوتی ہے کلفت نہیں ہے؛ وہ صاحبِ کمال نہیں ہے ؛

کامل کی نشان

صاحبِ کمال کی پہچان یہ ہے کہ اس کا حال انبیار علیہم السلام کے مشابہ ہو؛ دیکھو حضرت یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام کے فراق میں کیا حال ہوا ؛ کہ روتے روتے آنکھیں مبارک سفید ہو گئیں تھیں جیسا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں فرمایا ؛ یا اسفی علی یوسف و ابیضت عیناہ من الحزن نھو کظیم جب بیٹوں نے یہ حال دیکھا تو کہا قالو آ باللہ تفتؤ تذکر یوسف حتے تکون حرضا او تکون من الھالکین یعنی بیٹوں نے کہا کہ قسم اللہ کی (اے ابا) تم تو ہمیشہ یوسفؑ ہی کو یاد کرتے رہو گے یہاں تک کہ سخت مریض ہو جاؤ گے یا بالکل ہلاک ہو جاؤ گے ؛ یعقوب علیہ السلام نے سبحان اللہ کیا جواب ارشاد فرمایا ہے ؛ فرماتے ہیں انما اشکو بثی و حزنی الی اللہ و اعلم من اللہ مالا تعلمون یعنی میں تو اپنے رنج و غم کا اپنے اللہ سے شکوہ کرتا ہوں اور میں اپنے اللہ کے یہاں کی وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ؛ یہ وہی مضمون ہے ؛ ع ہم در تو گریزم ؛ دیکھئے ماں جب بچے کو مارتی ہے تو وہ روتا ضرور ہے ؛ لیکن رو کر پھر ماں ہی کو لپٹ جاتا ہے بس بڑا کمال ان اولیار اللہ کا ہے ؛ کہ ان کو غم محسوس ہو اور ازجا رفتہ نہ ہوں اور اس شخص کی کیا ہمت ہے کہ ادھر

سے ان کو ایسی لذت دی گئی کہ اس کے غلبہ میں سب بھول گئے اور یہ جو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا داعلم من اللہ مالا تعلمون مطلب یہ ہے کہ میرے بث اور حزن کا راز تم کو معلوم نہیں ہے وہ مجھ کو معلوم ہے یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ کاملین کی حالت کا انداز عوام اور ناقصین بلکہ متوسطین بھی نہیں کر سکتے، مولانا فرماتے ہیں : ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر | گرچہ ماند در نبشتن شیر و شیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد | کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
گفت اینک ما بشر ایشاں بشر | ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

اور وجہ اس کی یہ ہے، کہ کاملین بظاہر عوام مومنین کے مشابہ ہوتے ہیں ان میں کوئی امتیازی نشان نہیں ہوتا، اس لئے ان کے مراتب کا ادراک ہر ایک کو نہیں ہو سکتا، ظاہر حال ان کا اور عوام کا یکساں ہوتا ہے پھر کیسے کوئی پہچانے، ہاں جو صاحب بصیرت ہے اس کو ادراک ہوتا ہے پس صورت عوام کے مشابہ اور حقیقت متفاوت جیسے کسی بزرگ نے حضرت حق سے ناز کر کے پوچھا تھا کہ اے اللہ فرعون نے انا ربکم الاعلیٰ کہا اور منصور نے انا الحق کہا دونوں کا ایک ہی مدلول ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ایک مردود ہوا اور دوسرا مقبول، ارشاد ہوا کہ فرعون نے انا ربکم الاعلیٰ ہمارے مٹانے کو کہا تھا، اس لئے ملعون ہوا اور منصور نے انا الحق اپنے مٹانے کو کہا، اس لئے مقبول اسی مضمون کو مولانا فرماتے ہیں : ؎

گفت فرعونے انا الحق گشت پست | گفت منصورے انا الحق گشت مست
رحمۃ اللہ ایں انا را در وفا | لعنۃ اللہ آں انا را در قفا

منصور کے انا الحق کے معنی یہ تھے کہ انا کوئی شئے نہیں جس کو انا کہا جاتا ہے

وہ بھی حق ہے اور فرعون کے انا الحق کے معنی یہ ہیں کہ حق جس کو کہا جاتا ہے، وہ انا ہی ہے سوائے میرے کوئی حق نہیں ہے۔ یہاں بھی صورت دونوں قول کی یکساں اور معنی متفاوت غرض انبیاء مغلوب نہیں ہوتے۔ لیکن رضا میں کامل ہوتے ہیں، اور مغلوب نہ ہونے کے سبب انبیاء کو مصیبت میں لذت نہیں ہوئی اور جن پر حال غالب تھا، ان کو مصیبت میں کلفت محسوس ہوئی، بلکہ لذت اور مزہ آیا اور تیسرا وہ عوام کا ہے کہ ان کو مصیبت میں الم اس قدر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسی میں کھپ جاتے ہیں، اور دوسری جہت مقابل یا تو بالکل گم ہو جاتی ہے، یا مغلوب ہو جاتی ہے اور بعضوں کی بلکہ اکثر کی زبان سے شکوہ اور شکایت بھی اپنے مولا کا نکلتا ہے، عوام کی مصیبت ان کا جیل خانہ ہے اور خواص کے لئے زخم کا نشتر ہے، عوام مصیبت میں اسی کا سبق لے کر بیٹھ جاتے ہیں، جس کا کوئی حاصل نہیں، سو ایسا نہ کرنا چاہیئے بلکہ مومن کو چاہیئے کہ جو معالجات اور آداب ہر مرض اور ہر حال کے متعلق حق تعالیٰ نے ہم کو ارشاد فرمائے ہیں، ان پر عملدرآمد کرے اس لئے کہ کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کا علاج ہم کو نہ بتلایا گیا ہو، ؎

دردِ از یار است درماں نیز ہم　　دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

حقوق مصائب اب دیکھنا چاہیئے کہ مصیبت کے کیا حقوق ہم پر لازم کئے گئے ہیں سو ارشاد ہے، اذا اصابتهم مصيبة قالوا انا لله وانا اليه راجعون یعنی ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون لیکن یہ مراد نہیں ہے کہ صرف زبان سے انا للہ الخ کا وظیفہ پڑھتے رہیں، حضرت اگر نرا وظیفہ پڑھنا مراد ہوتا اور کوئی مناسبت آپ کے

حال سے ان کلمات کو نہ ہوتی تو رکوع میں سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ کہنے کی خصوصیت نہ ہوتی دونوں میں ایک قسم کا ذکر مشروع ہوتا یہ ضروری ہے کہ سبحان ربی العظیم کو رکوع کی حالت سے مناسبت ہے اور سبحان ربی الاعلیٰ کو سجدہ کے ساتھ تعلق خاص ہے جن کی وجہ سے دونوں میں تفاوت ہوا اور وہ بظاہر یہ ہے کہ سجدہ میں پستی زیادہ ہے کہ اشرف الاعضاء کو اخس الاشیاء کے ساتھ ملحق کر دیا ہے تو یہ حالت مقتضی ہے کہ حق تعالیٰ کی صفت زیادت علوم کو مستحضر کیا جائے جو مدلول ہے افعل التفضیل کا کہ وہ پاک ذات سب سے برتر ہے اور رکوع میں بہ نسبت سجدہ کے پستی کم ہے اس لئے اس حالت میں نفس عظمت کا استحضار مناسب ہوا کہ صیغہ فعیل افعل کی طرح نہیں ہے معنی تفضیل میں پس معلوم ہوا کہ نرا وظیفہ پڑھنا مراد نہیں ہے بلکہ دل سے اس کو سمجھ کر اس سے متاثر ہونا مقصود ہے اسی واسطے ہر قول کی نسبت ارشاد ہے: قل لھم قولاً بلیغاً کہ آپ ان کو ایسی بات فرمایئے کہ جو موثر ہو اور بات تو وہی ہے جس کا منشاء قلب ہو۔ جیسا شاعر کہتا ہے: ؎

ان الکلام لفی الفؤاد و انما ۔۔۔ جعل اللسان علی الکلام دلیلا

یعنی کلام تو دل میں ہے اور زبان تو کلام کی نری ترجمان ہے پس قالوا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قالوا باللسان بلکہ یہ ہیں قالوا من انفسھم یعنی اپنے دل سے کہتے صرف زبان سے نہیں کہتے آپ شاید اس کو سن کر یہ سمجھے ہوں گے کہ دل میں یہ وظیفہ پڑھ لیں گے۔ یعنی الفاظ کا خیال کر لیں گے۔ افسوس ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ۔۔۔ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

قرآن کا اعجاز

یاد رکھو کہ نرا دل فعل بغیر سمجھے بھی کام کا نہیں، حق تعالیٰ اس کی بھی شکایت فرماتے ہیں، و لھم قلوب لا یفقھون بھا یعنی ان کفار کے لئے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں پس دل سے کہنا بے معنی بحیل لصوالفاظ بھی کارآمد نہیں ہے بلکہ مضمون کا فہم شرط ہے اس لئے ہم اس کی شرح بقدر ضرورت بیان کرتے ہیں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ مصیبت کے وقت کہتے ہیں اناللہ یعنی دل سے اپنے یقین رکھتے ہیں کہ ہم اللہ کی ملک ہیں سبحان اللہ کیا تعلیم ہے مطلب یہ ہے کہ جب یہ امر ثابت ہے کہ ہم سب اللہ کی ملک ہیں اور ملک اور قبضہ و تصرف کا کوئی حصہ ہمارا نہیں تو اگر مالک اپنی کسی شئے کے اندر تغیر تبدل کرے اور اپنی ایک مملوک چیز کو اپنی دوسری مملوک چیز سے جدا کر دے تو یہ امر قابل اعتراض و مزاحمت نہیں ہے دیکھئے اگر آپ کی ملک میں ایک الماری ہے اور اس میں کچھ کتابیں رکھی ہیں، اگر آپ اُن کتابوں کی ترتیب بدل دیں، کہ ان میں کی ایک کتاب کو کسی دوسرے خانہ میں رکھ دیں، تو وہ کتاب جس سے علیحدہ کیا ہے یہ نہیں کہہ سکتی کہ میری بہن کو علیحدہ کیوں کر دیا، اور نہ کوئی اور کہہ سکتا ہے کہ اس کتاب کی جگہ کیوں بدل دی پس اگر ہمارا مالک ہمارے کسی عزیز کو ہم سے علیحدہ کر کے دوسرے جہان میں منتقل کر دے تو ہم کو کوئی حق نہیں ہے کہ چون و چرا کریں، وہ مالک ہیں تصرف فینا کیف یشاء پس مومن کو چاہیئے کہ ان کے معنی کو سمجھ کر تسلی حاصل کر لے اور واقعی اگر یہ مضمون قلب میں راسخ ہو جائے تو مادہ غم، کو بیخ سے کاٹنے والا ہے اس کے ہوتے ہوئے رنج اور حسرت کا نام نشان نہیں رہ سکتا دیکھئے یہ ہے تعلیم اسلامی کہ بقراط و سقراط

اور جہاں بھر کے فلاسفہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اگر کوئی مدعی ہو تو بتلائے کہ اس کے سوا کونسی تدبیر ہے کہ جس سے انسان کو تسلی حاصل ہو، اور گو اس قدر جملہ بھی مصیبت کا اثر دور کرنے کے لئے کافی تھا لیکن یہ اس شخص کے لئے ہے کہ توحید کے اندر اس کا قدم راسخ اور اعتقاد کے ساتھ حال بھی میسر ہو، اور جو اس مرتبہ کا نہ ہو اس کے دل میں خیال گذر سکتا ہے کہ اس پر تو ہمارا ایمان ہے کہ ہم سب اللہ کے ہیں اور ہم کو حق چون و چرا کا ہے. لیکن چونکہ ہمارا بیٹا یا عزیز ہم سے جدا ہو گیا ہے اس کا رنج ہمارے دل کو پاش پاش کر رہا ہے اور اس کی مفارقت دائمی ہم کو ستا رہی ہے اس کا کیا علاج اس لئے اس پر وانا الیہ راجعون بھی بڑھا دیا گیا ہے یعنی ہم سب اسی کی طرف جانے والے ہیں، مطلب ہے کہ اگر تم کو بہت ہی بے قراری ہے اور وہ وہی شئے تمہارا مطلوب ہے اور اس کے بغیر تم کو چین نہیں آتا تو تم اپنے نفس سے کہو کہ ہم سب اسی طرف جانیوالے ہیں وہاں سب ایک دوسرے سے مل لیں گے، اور حیاتِ دنیوی کا زمانہ وہاں رہنے کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں اب گذر جائے گا جب یہ مضمون پیش نظر ہو گا، اور یقین کامل اس کا ہو جائے گا، تو پوری تسلی اور راحت اس کو حاصل ہو جائے گی، یہ ہے قرآن کا اعجاز معنوی اور یہ ہیں اس کی تعلیمات آج کوئی دکھلائے تو کہ ایسی تعلیم کہاں ہے اور تمام تعلیم یافتہ اور فلاسفر جمع ہو کر بتلائیں کہ اس کے سوا کون سا طریقہ ہے تسلی کا اور کچھ اسی باب میں یہ تعلیم نادر نہیں بلکہ قرآن و حدیث کی تمام تعلیمات ایسی ہی ہیں واللہ الحمد میں بقسم کہتا ہوں کہ جس کا قرآن و حدیث پر ایمان نہیں ہے یا ایمان میں ضعف ہے اس کی راحت

اور تسلی کا کوئی طریقہ ہی نہیں اور قرآن مجید کی ہر ہر تعلیم اور ہر ہر ادا ایسی ہے کہ بے اختیار یہ شعر یاد آتا ہے ؛

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

یہ حق ہے معیت کا کہ جو ہم کو تعلیم کیا گیا ہے اس حق کے ادا کرنے والے کو ناگواری رہ ہی نہیں سکتی ، دیکھو اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں عزیز حیدر آباد کا وزیر اعظم ہو گیا ہے کہ ہم بجائے اس کے کہ اس کی جدائی کا رنج ہو خوشی ہو گی اور شوق ہو گا کہ کسی طرح ہم بھی وہاں پہنچیں اسی طرح معتقد آخرۃ کو وہاں جانے کا شوق ہونا چاہیئے اور جو وہاں پہنچ گئے ہیں ان پر خوش ہونا چاہیئے ، کہ اچھا ہوا کہ دنیا کی قید خانہ سے ان کو رہائی ہوئی بعضے بزرگوں پر اس درجہ یہاں کے چھوٹنے کا شوق ہوا ہے انہوں نے اس تمنا کی ہے چنانچہ بعض ان میں سے کہتے ہیں

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم راحت جاں طلبم وزپے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تا درمیکدہ شادان و غزلخواں بردم

میکدہ اصطلاحی لفظ ہے اس سے مراد مقام قرب ہوتا ہے اور بعض مرتبہ میکدہ سے راہ محبت و عشق اور کعبہ سے طریق زہد و عبادت بھی مراد لیتے ہیں ؛ چنانچہ حافظ شیرازی کہتے ہیں ؛

از مدرسہ بکعبہ روم یا بمیکدہ اے پیر رہ بگو کہ طریق صواب چیست

غرض اس مضمون کو سمجھنے کے بعد غم بالکل جاتا رہے گا ؛ اور اگر اب بھی رہے تو سمجھ لو کہ اس مضمون کا اس کو یقین ہی نہیں ہوا اور وہ غم کے اندر اپنی عمر فضول ضائع کر رہا ہے ، جس سے کوئی حاصل نہیں ؛ اس لئے کہ وہ محبوب سے ملنے

گا: تو ہے نہیں، جیسا عرفی کا شعر ہے۔ ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بتمنا گریستن

محبت کا تقاضا

صاحبو! اگر آپ کا محبوب کوئی آپ کی چیز لے لے! تو وہ محبوب اگر آپ کا محبوب ہے تو آپ کچھ بھی چوں وچرا نہ کریں گے بلکہ خوش ہوں گے؛ اور اگر چوں وچرا کرو تو معلوم ہوا کہ وہ محبوب آپ کو محبوب نہیں بلکہ وہ شئے محبوب ہے؛ بلکہ محبت کا مقتضا تو یہ تھا کہ آپ رو دیں بھی نہیں مگر اس پر یہ شبہ آپ کریں گے؛ کہ انبیاء بھی تو مصیبت میں روئے ہیں جیسا کہ ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رونا صاحبزادہ کے انتقال پر مذکور ہوا ہے بات یہ ہے کہ ہمارے رونے اور ان حضرات کے رونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے ہم تو محض اس شئے کی یاد میں روتے ہیں اور وہ حضرت دیکھتے ہیں کہ اسوقت حضرت حق کو ہمارا رونا ہی مطلوب ہے کہ دلیل افتقار ہے اس لئے روتے ہیں سو آپ کو بھی رونے کی اجازت ہے اس محبوب شئے کا لے لینا خود دلیل ہے؛ اس کی کہ محبوب حقیقی کو مصلحت کے لئے تمہارا رلانا بھی منظور ہے سو رو دو لیکن حدود کی رعایت رکھو کہ اس محبوب شئے کو محبوب حقیقی سے مت بڑھاؤ؛ کہ اس کا ہی وظیفہ کر لو؛ بس رو رلا کر پھر محبوب حقیقی کی یاد میں مشغول ہو جاؤ؛ اگر بالکل نہ روئے تو بھی آپ نے اس مصیبت کے راز کو نہ سمجھا اور اگر ساری عمر روتے رہے اور اسی کو لے؛ تو مالک حقیقی آپ کا محبوب نہ ہوا؛ خدا کے سامنے رو دو؛ اس کے دکھلانے کو رو دو تا کہ افتقار اور عجز تمہارا اظہار ہو اور خدا سے دوسروں کے سامنے نہ رو دو جو اس راز کو سمجھ گئے ہیں۔

وہ روئے بھی ہیں مولانا رومی فرماتے ہیں :۔

کیں تضرع را بر حق قدر ہاست | کان بہا کانجاست زاری را کجاست
گر تو خواہی کہ بلا جاں و آخری | جان خود را در تضرع آوری
اے خوشا چشمے کہ آن گریان اوست | اے خوشا آں دل کہ آن بریان اوست

پس جو مصیبت میں اس کے رلانے سے روتے ہیں وہ بھی گریان اوست میں داخل ہیں رونا اور مصیبت دونوں بڑی نعمت ہیں کہ اس میں بندہ کا افتقار ظاہر ہوتا ہے پس جو نہ روئے اور ضبط کر کے پتھر سا بنا رہے اس نے مراد حق کو پورا نہ کیا ؛ حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیسی طبیعت ہے فرمایا اچھی نہیں بیمار ہوں ؛ کسی نے پوچھا حضرت آپ تو بڑے عارف ہیں جزع فزع کرتے ہیں فرمایا کہ دیوانے ہو گیا ؛ میں اپنے خدا کے سامنے بہادر بنوں کہ وہ تو میرا ضعف ظاہر کریں اور میں قوت ظاہر کروں ؛ ایک بزرگ رو رہے تھے کسی نے پوچھا آپ کیوں رو رہے ہیں ؛ فرمایا کہ بھوک لگ رہی ہے اس شخص نے کہا حضرت آپ بھوک میں روتے ہیں فرمایا کہ محبوب حقیقی جب ہمارے رونے ہی کو بھوک لگا دیں تو ہم کیوں نہ رو ویں مگر ایسا رونا نہیں جس رونے کی مشق عورتوں کو ہوتی ہے جب کہیں تعزیت وغیرہ میں جاتی ہیں تو ڈولی گاڑی میں اچھی خاصی ہوتی ہیں اور اس سے اترتے ہی ہُو ہُو کرنا شروع کر دیتی ہیں غرض رونا جو غم میں بے ساختہ جوش زن ہو ؛ ممنوع نہیں ؛ بلکہ عین مراد حق ہے یہ بھی ہے ؛ کہ بطریق مذکور نفس کو تسلی دو ؛ پس جب اس طرح مراد حق پوری ہو جائے ؛ تو اب اس رونے شغل چھوڑ دو ؛ اور اگر سوچ سوچ کر اس کو لے کر بیٹھ گئے ؛ تو

یہ بُرا ہے اور حق تعالیٰ بزبان حقیقت اس کو پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اے شخص جس کے
پاس ہم ہوں اس کو کون چیز غمگین کر سکتی ہے تو جو اسی کو لے بیٹھا ہے، معلوم ہوا کہ
ہم تجھ کو محبوب نہیں؛

محبت کا مظاہرہ

اور صاحبو! غور تو کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے نزدیک
میں جیسے محبوب تھے اتنا محبوب کسی محب کی نظر میں
کوئی ہوا اور نہ ہو آپ کی محبوبیت کی یہ کیفیت تھی کہ آپ کا آب دہن مبارک اور
آب بینی صحابہ زمین پر نہ گرنے دیتے تھے فوراً اپنے منہ کو اور بدن کو مل لیتے تھے؛ اور
چاٹ لیتے تھے؛ کوئی اس قصہ کو سن کر دل میں اپنے گھن نہ کرے اس لئے کہ اول تو
محبت وہ شئے ہے کہ کسی مرد اور عورت کے ساتھ اگر تعلق ہو جاتا ہے تو یہ معاملہ اس
کے ساتھ بھی لوگ کرتے ہیں اور حالانکہ یہ محبت محض نفسانی و شہوانی ہوتی ہے اور
جہاں محبت حقیقی ہو؛ وہاں اگر یہ امر ہو تو تعجب کیا ہے دوسرے یہ کہ حضور کی
ذات اقدس نفاست اور لطافت میں اس درجہ پر تھی کہ ہمارے علماء نے تصریح
کی ہے کہ حضور کا بول و براز بھی پاک تھا؛ ایک صحابی نے غلطی سے حضور کا خون
پی لیا تھا؛ ان کی اولاد میں کئی نسل تک خوشبو رہی اور حضور کا پسینہ مبارک بجائے
عطر کے استعمال کیا جاتا تھا؛ پس جب آپ کے فضلات میں نہ بو تھی نہ کدورت
تو پھر طبعی گھن بھی نہیں ہو سکتی اور آپ کی محبوبیت کی یہ کیفیت تھی کہ عورتیں
طبعاً اپنی اولاد کی محبت میں غرق ہوا کرتی ہیں لیکن حضور کے ساتھ ان کو محبت
کی یہ حالت تھی کہ ایک غزوہ سے حضور تشریف لا رہے تھے ایک عورت بر
راہ اشتیاق میں کھڑی تھی؛ کسی نے کہا کہ تیرے بیٹے اور بھائی شہید ہو گئے

تو وہ پوچھتی ہے کہ یہ تو بتلادو کہ حضور بھی صحیح سلامت ہیں، لوگوں نے کہا کہ ہاں وہ تو ہیں، کہنے لگی کہ کچھ پرواہ نہیں، ان کی تو یہ حالت تھی ؛ ؎

فان ابی ووالدتی وعرضی لعرض محمد منکم وقاء

پھر اس فدائیکی محبوبیت پر آپ قیاس کیجئے کہ حضور کی وفات پر صحابی کی کیا حالت ہوئی ہوگی، صحابہ پر یہ صدمہ ایسا ہوا ہے کہ اس صدمہ کی نظیر روئے زمین پر نہ پہلے کبھی ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی ؛

خدمتِ دین

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس صدمہ میں کیا سب سے زیادہ ہوش وحواس اس صدمہ میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہی رہے جو سب سے زیادہ عاشق تھے ورنہ بقیہ صحابہ کے شدتِ صدمہ سے ہوش بجا نہ تھے جب صدیق اکبر رضؓ نے یہ کیفیت دیکھی تو فوراً منبر پر تشریف لے گئے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بعد حضور کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر خاص نظر تھی جب ان کو ممبر پر دیکھا سب منبر کے گرد جمع ہوگئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بعد حمد ونعت فرمایا الا ان من کان منکم یعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لایموت یعنی آگاہ ہوجاؤ ، بے شک جو تم میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کیا کرتا تھا، تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو وفات پاگئے اور جو اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا، تو اللہ تعالیٰ زندہ ہے ان کو موت نہ آئے گی اور اس کے بعد یہ آیت وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا یعنی نہیں ہیں محمد مگر ایک رسول ان سے پہلے بھی بہت رسول

گذر چکے ہیں کیا پس اگر وہ مرجائیں گے، تو تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو شخص پھر جائے گا، تو وہ اللہ کا ہرگز کچھ نہ بگاڑے گا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فانی ہونا بیان فرمایا اور جس کے واسطے حضور دنیا میں تشریف لائے تھے، اس پر استقامت کی تعلیم فرمائی اور اس کے بعد حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا موجلا یعنی کسی جان کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ بغیر حکم الٰہی کے مرسکے اور آپ نے آیت بھی پڑھی انک میت وانہم میتون صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ کلام سن کر ہماری یہ حالت ہوئی کہ گویا ہم نے یہ آیت پہلے کبھی نہ سنی تھی مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں کلام اللہ سن کر جو حالت قلب کے تاثر کی ہوا کرتی ہے اس کو سن کر وہی حالت ہوگئی اور ہوش سے آگئے اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ غور کرنا چاہیئے، کہ حضور جس کام کے لئے تشریف لائے تھے، یعنی دین حق کی اشاعت اور احیاء، وہ کام ہم کو کرنا چاہیئے چنانچہ صحابہ اس شغل کو لے کر نہیں بیٹھے اور سب کے سب فوراً خدمتِ دین میں مصروف ہوگئے، چنانچہ غزوات اور فتوحات اور تفسیر اور حدیث اور فقہ اور علوم کی اشاعت خدماتِ دین اس درجہ تک کیں کہ نادان آدمی کو دیکھ کر سرسری نظر سے یہ خیال ہوسکتا ہے کہ جو کام حضورؐ کے وقت میں نہیں ہوئے تھے وہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعد کے علماء نے کئے حالانکہ یہ غلط ہے، اس لئے کہ بنیاد حضور ہی نے رکھی تھی اور بنیاد رکھنا ہی کسی کام کی مشکل کام ہے اور جب بنیاد رکھی جائے اور بنیاد درست ہوجائے تو آگے اس کے چلانا کون سا مشکل کام ہے اسی مشکل کے موقوف

علی الرسول ہونے کے مضمون کو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین منفکین حتی تاتیھم البینۃ رسول من اللہ یتلو صحفا مطھرۃ فیھا کتب قیمۃ یعنی جو لوگ کافر ہوئے ہیں اہل کتاب اور مشرکین سے وہ اپنے کفر سے باز آنے والے نہیں تھے؛ یہاں تک کہ ان کے پاس دلیل روشن آئی اور وہ دلیل اللہ کی طرف سے ایک عظیم الشان رسول ہیں جو پاک صحیفوں کی تلاوت کرتے ہیں کہ ان صحیفوں میں لکھے ہوئے مضبوط مضمون ہیں؛ غرض صحابہ نے اس صدمۂ جانکاہ کا وظیفہ نہیں کیا؛ حالانکہ صحابہ کے نزدیک حضور سے زیادہ کوئی محبوب نہیں تھا اور اسی وجہ سے صدمہ بے حد سخت تھا پس ہم کو بھی چاہیئے کہ ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کی اقتدا کریں؛

نسخۂ کیمیا حضور ارشاد فرماتے ہیں؛ من اصیب بمصیبۃ فلیتعز بمصیبتی یعنی جس کو کوئی مصیبت پہنچے اس کو چاہیئے کہ میری مصیبت سے وہ تسلی حاصل کرے یعنی میری وفات سے جو میری امت کو صدمہ پہنچا ہے اس کو یاد کرے یعنی یہ سوچے کہ حضور تو اس میرے محبوب سے بھی زیادہ محبوب ہیں؛ جب آپ ہی اس حیات ظاہری میں نہ رہے اور اس پر ہم نے صبر کر لیا؛ تو اس کی کیا پرواہ ہے اس پر وہ شخص شبہ کر سکتا ہے جو یہ کہے کہ مجھے حضور کے ساتھ محبت ہی نہیں؛ لیکن مسلمان تو ایسا کہہ نہیں سکتا؛ بفضلہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اپنی جان، اولاد اور مال سے زیادہ محبت حضور کے ساتھ ہے اور جس کو نہیں اس کی طرف ہمارا روئے سخن نہیں ہے؛ غرض ان طریقوں کے اختیار کرنے سے مصیبت کا جو زیادہ ناگواری کا درجہ ہے وہ نہ رہے گا؛ ورنہ مصیبت اختیا

اپنی حد سے بڑھ کر حضرت حق سے مانع ہوجائے گی، اور یہ اور زیادہ مصیبت پر مصیبت ہوگی یہ آداب ہیں مصیبت کے الحاصل دو چیزیں حضرت حق سے مانع ثابت ہوئیں نعمت اور مصیبت پھر ان کی اور بہت سی جزئیات ہیں پس ان میں سے اہمات جزئیات کی فہرست ان آیات میں ارشاد فرماتے ہیں، ارشاد ہے ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ یعنی کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر اللہ کے حکم سے یہ علاج ہے مصیبت کے مانع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم مالک اور محبوب ہیں اور مصیبت ہمارے ہی حکم سے آتی ہے تو تم کو اس پر اعتراض اور چوں وچرا کا حق نہیں ہے اگر حق تعالیٰ مالکیت اور محبوبیت اور اس کا اعتقاد کہ مصیبت اسی کے حکم سے آتی ہے قلب میں راسخ ہوجائے تو مصیبت کی شدۃ الم قلب کو ہرگز از جار فتہ نہ کرے گی یہ نسخہ کیمیا کا اثر رکھتا ہے،

فقدانِ عمل

آگے ارشاد ہے ومن یؤمن باللہ یہد قلبہ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو اس علاج کی ہدایت فرماتا ہے یہ جواب ہے ایک سوال کا جو جملہ اولیٰ کو سن کر ناشی ہوسکتا ہے، وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے علاج تو بتلا دیا، اور ہمارا اس پر ایمان بھی ہے کہ مصیبت اس کے حکم سے آتی ہے، لیکن قلب میں اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا تو اس کا جواب ارشاد ہے کہ تمہاری طرف سے ایمان اور ایقان ہونا چاہیئے، کام تم شروع کرو، یعنی یقین تم پختہ کرلو، باقی ہدایت اور اثر تو ہم دیں گے ہاں یہ تمہارا کام ہے اگر تم وہی نہ کرو، تو اس کا کوئی علاج نہیں، ہم لوگوں کی آجکل یہ حالت ہے کہ کام تو کرتے نہیں اور ثمرات کی امیدیں باندھتے ہیں، ہماری ایسی مثال ہے

جیسے مریض کسی حکیم کے پاس گئے اور اس سے نسخہ لکھوایا اور شکایت کرتے پھرتے ہیں کہ ہم کو شفا نہیں ہوئی کسی نے پوچھا کہ میاں کسی طبیب سے تم نے معالجہ نہ کیا ایک نے کہا کہ جناب نسخہ تو میں نے لکھوالیا تھا، دوسرے نے کہا کہ میں نے نسخہ کے دام بھی پوچھ لئے تھے، تیسرے نے کہا کہ میں نے خرید بھی لیا تھا چوتھے نے کہا کہ میں نے اس کو پکا بھی لیا تھا، پانچویں نے کہا کہ میں نے پکایا بھی اور اس کو برتن میں انڈیل بھی لیا تھا، چھٹے نے کہا کہ جناب میں نے پیا بھی لیکن فوراً قے کردی، خدا کی تبلائی ہوئی تعلیمات پر ہمارا ایسا ہی عمل ہے، جیسا کہ ان مریضوں کا ہے کہ تعلیم پر ایک نے بھی عمل نہ کیا، پھر شفا ہو تو کیسے ہو میں بقسم کہتا ہوں کہ لوگ کام نہیں کرتے اس طرف سے کچھ کمی نہیں کوئی ذرا کام شروع کر کے دیکھے ہماری تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ حرکت ہی نہیں ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ نظر کے روکنے پر قدرت نہیں ہے، میں نے کہا کہ قدرت تو ہے ہاں یہ کہو کہ روکنے میں کلفت ہوتی ہے، اس کو برداشت نہیں کرتے اور کر سکتے ہو تو بہت دیر تک الجھتے رہے اور میں ان کی ہر بات کا جواب دیتا رہا مگر ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا، وہ اطراف کانپور کے رہنے والے تھے، وہاں جا کر انہوں نے خط بھیجا کہ واقعی میری سمجھ میں آگیا کہ قدرۃ ہے تو وہ بات کیا ہوئی کہ وہاں پہنچ کر انہوں نے کام شروع کیا، یعنی نظر کو روکا، تو تجربہ ہوا اور اس سے پہلے کام تو نہیں کیا تھا خالی باتیں بنا رہے تھے اور اپنے خیال میں اس کو محال سمجھ رکھا تھا، اس لئے الجھتے رہے اور بعضے لوگ کام بھی شروع کرتے ہیں، اس کا کچھ اثر بھی نہیں ہوتا ہے مگر پھر کچھ غلبہ شہوات کا ہوتا ہے، اور کام چھوڑ دیتے ہیں، سو یہ لوگ طریقہ سے کام نہیں کرتے، واللہ اگر

طریقہ کے موافق کام کریں تو ضرور ہدایت ہو؛

ہدایت کا راستہ

حق تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا یعنی جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں تو ہم ضرور ان کو اپنے رستے بتلاتے ہیں اسی طریق پر یہاں ارشاد ہے کہ تم کام کرو، جب تم کام کروگے تو تمہارے قلب کو ہم ہدایت کریں گے؛ آگے ارشاد ہے واللہ بکل شیئ علیم یعنی اللہ ہر شئے کو جانتا ہے پس یہ بھی جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں سعی کرنے والا ہے؛ اور کون نہیں ہے اس کے بعد جاننا چاہیئے کہ مریض کو جو مرض پیش آتا ہے اس کا ایک علاج تو خاص اسی مرض کا ہوتا ہے اور اسی کا خاص پرہیز ہوتا ہے مثلاً مرض اگر خلط سودا کے سبب سے ہے تو اسی کا خاص علاج اور خاص پرہیز کرایا جاتا ہے کہ نسخہ بھی اسی کا اور جو چیزیں سودا بڑھانے والی ہیں ان ہی سے بچنا بھی اور ایک عام علاج اور عام پرہیز ہے کہ جس کو تمام امراض میں پیش نظر رکھنا مریض کو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو چیزیں عامۃً مضعف اور کلیتہً منافی طبیعت ہیں ان سے بچنا چاہیئے یہاں تک تو حق تعالیٰ نے اس مرض یعنی مصیبت کے مانع عن الطریق ہونے کا خاص نسخہ کہ جو ایک خاص مراقبہ ہے کہ ہر مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ارشاد فرمایا تھا آگے ایک عام جس کا تمام اوقات میں ہر شخص کو التزام کرنا چاہیئے؛ ارشاد فرماتے ہیں۔ اس لیئے کہ اگر خاص مرض کے لئے خاص نسخہ کا استعمال کیا اور قواعد عام صحت کی رعایت نہ رکھی تو اس خاص نسخہ کا کوئی نفع مرتب نہ ہوگا وہ عام

علاج یہ ہے جس میں تندرست اور مریض سب شریک ہیں یعنی واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول یعنی ہم نے جو خاص علاج خاص مرض کے لئے تم کو تعلیم کیا ہے اسی پر اقتصار نہ کرو، کہ یہ مراقبہ تو کر لیا، اور دیگر احکام شرعیہ میں اخلال کیا، بلکہ اس کے ساتھ اللہ و رسولؐ کی تمام امور میں اطاعت کرو، اور یہ ہی وجہ ہے کہ اطیعوا کا متعلق ذکر نہیں فرمایا جس سے بقاعدۂ بلاغت عموم مستفاد ہوتا ہے یعنی اگر تم نے صرف خاص اسی نسخہ کو استعمال کیا اور عام قواعد کی رعایت نہ کی: مثلاً احکام کی پابندی نہ کی اور معاصی کا ارتکاب کرتے رہے تو اس خاص نسخہ کا کوئی نفع معتدبہ تم کو نہ ہوگا؛ اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے جس مضمون کو ارشاد فرمایا ہے اس کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا؛ اس کے بعد سمجھو کہ بعضے مریض ایسے سست اور کاہل یا کنجوس یا بد پرہیز ہوتے کہ طبیب سے نسخہ لکھوانا اور دوا خریدنا پھر اس کو پکا کر پینا اور پرہیز کرنا ان کو نہایت شاق اور پہاڑ معلوم ہوتا ہے؛ ہاں مرض کی شکایت کیا کرتے ہیں اور یہ کہا کرتے ہیں دوا دارو تو صاحب ہم سے ہوتی نہیں کوئی شخص ایسا ملے کہ چھو کر دے اور مرض جاتا رہے؛

طبیب کا منصب

ایسے ہی روحانی مرض کے مریض بھی دیکھے جاتے ہیں بلکہ ایسے لوگ بہ کثرت ہیں کہ جو مجاہدہ، ریاضت تو اختیار کرتے نہیں؛ ہاں یہ چاہتے ہیں کہ کوئی بزرگ توجہ ڈال دیں اور ہمارا مرض جاتا رہے ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے؛ حالانکہ محض توجہ سے بغیر اپنے کئے کچھ نہیں ہوتا؛ تو ایسے مریضوں کے لئے ارشاد ہے فان تولیتم فانما علیٰ رسولنا البلاغ المبین

یعنی ہم نے جو تمہارے مرض کا علاج اپنے رسول کی معرفت ارشاد فرمایا ہے، کہ اگر تم اس نسخہ کے استعمال کرنے اور اس کا جو خاص اور عام علاج و پرہیز ہے اس سے اعراض کرو، تو یاد رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ بجز اس کے کچھ نہیں ہے، کہ تم کو علی الاعلان دوا اور پرہیز بتلا دیں کہ جو طبیب کا منصب ہے کیا طبیب کا یہ تھوڑا احسان ہے کہ تم دیکھ کر وہ دوا بتلا دے اس کے ذمہ یہ نہیں ہے اور نہ اس کے بس میں یہ ہے کہ شفا اور صحت تمہارے منہ میں زبردستی ٹھونس دے اگر تم کو اپنی صحت مد نظر ہے تو جو دوا بتلائی گئی ہے ہمت سے اس کا استعمال کرو، ورنہ تم جانو اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ انبیاء اور اولیاء کی توجہ میں برکت نہیں بے شک برکت ہے لیکن وہ توجہ مشروط ہے اس کے ساتھ کہ تم بھی خود کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤ ورنہ توجہ مؤثر نہیں ہو گی اور نہ اس کے متوجہ کرنے کا یہ طریق ہے کہ ہم لوگ کچھ نہ کریں اور نری تمنائیں کیا کریں کہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہو جائے، کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ تمہاری طرف متوجہ ہو، ہاں تم کام کرو، بزرگوں کو بھی توجہ ہو گی پھر اس توجہ کی برکات تم کو خود مشاہدہ ہو جاویں گے، دیکھو طبیب شفیق جب یہ دیکھتا ہے کہ یہ مریض ہمارے نسخہ کو استعمال کر رہا ہے تو اس مریض کے حال پر خود توجہ ہوتی ہے اور پھر اس کے لئے قسم قسم کی دوائیں وہ خود تجویز کرتا ہے، بلکہ اپنے پاس سے دیتا ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کو صحت ہو جائے اور اگر یہ دیکھتا ہے کہ یہ دوا نہیں پیتا یا دوا پینے کے ساتھ جان کر بد پرہیزی کرتا ہے تو اس کو کچھ بھی خیال نہیں، پس حضور کے وقت میں حضور کو اور حضور کے بعد آپ کے وارثوں کو اپنی طرف

متوجہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے جب وہ دیکھیں گے کہ یہ شخص اللہ کی راہ میں مر کھپ رہا ہے اور اس نے کوئی دقیقہ اپنی وسعت کا اٹھا نہیں رکھا اور اس وقت اگر اس کی امداد نہ کی گئی تو کچھ عجب نہیں کہ ہمت ہار دے تو اس وقت ادھر سے فوراً مدد ہوگی واللہ وہ بڑے شفیق ہوتے ہیں اور بڑے دینے والے ہوتے ہیں؛ ہاں کوئی لینے والا چاہیئے یہ بیان تو ان لوگوں کا تھا جو کام میں لگے ہی نہیں؛ اب ایک وہ ہیں جو کام کرتے ہیں اور ان کو اس کے کچھ ثمرات بھی حاصل ہوئے؛

ناز اور عجب

مگر ان میں ایک مرض پیدا ہوا وہ یہ ہے کہ جہل اور کمی بصیرت سے یہ سمجھے کہ یہ ثمرات ہمارے کام کرنے سے مرتب ہوئے اور اس پر ان کو ناز اور عجب پیدا ہو گیا تو ان کے اس مرض کے دفعیہ کے لئے ارشاد ہے اللہ لا الٰہ الا ھو و علی اللّٰہ فلیتق کل المومنون مطلب یہ ہے کہ تم کو حضرتِ حق اور موجود حقیقی کے سامنے اپنے وجود کا دعویٰ کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؛ ارے یاد رکھو کہ ماسوا اس کے کوئی موجود حقیقی نہیں ہے پس ناز چہ معنی مومنین کو یہ چاہیئے کہ اسی ایک ذات پر بھروسہ رکھیں اور غیر کو کہ جس میں اپنا وجود بھی ہے فانی محض اور ہالک بحت سمجھیں نہ کہ اپنے وجود کا دعویٰ کریں تم کچھ بھی نہیں ہو اور نہ کچھ کر سکتے ہو یہ ہمارا ہی کام تھا کہ تم کو کام کی توفیق دی اور اس کے اسباب مہیا کر دیئے اور پھر اس میں کامیابی عطا فرمائی؛ یہاں تک مصیبت کے متعلق بیان تھا جو مانع عن الطریق ہوتی ہے؛

عفو و درگذر

اب دوسرا مانع نعمت ہے کہ جو اپنی زیادہ گوارائی کے سبب مانع عن الطریق اور ہمارے لئے رہزن بن جاتی ہے؛

آگے اس کے متعلق ارشاد ہے یایھا الذین اٰمنوا ان من ازواجکم و اولادکم عدوا لکم فاحذروھم یعنی اے ایمان والوں تمہاری بیبیوں اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن بھی ہیں تو تم ان سے احتیاط رکھو ایسا نہ ہو کہ یہ تم کو اپنے اندر مشغول کر کے راہ حق سے ہٹا دیں اور گو نعمتیں تو بہت ہیں لیکن دنیا میں اولاد و ازواج انسان کو بہت محبوب ہوتی ہیں اس لئے بالتخصیص ان کا ذکر فرما کر ان سے تحذیر فرماتے ہیں اور اس آیت میں جو ازواج اور اولاد کو حق تعالیٰ نے مانع عن الطریق فرمایا ہے تو ان کا مانع ہونا دو طریق سے ہے اول طریق تو یہ ہے کہ اولاد اور ازواج ایسی فرمائشیں کریں کہ جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف ہیں، اور یہ مغلوب ہو کر ان کا ارتکاب کریں، دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ تو کچھ نہیں کہتے مگر یہ خود ان کی محبت میں ایسا مستغرق ہے کہ وہ محبت اس کو مانع بن رہی ہے پہلی صورت میں مانعیت اختیاری ہوگی یعنی وہ مانعیت اولاد اور ازواج کے اختیار میں ہے اور دوسری غیر اختیاری ہر چند کہ ظاہر نظر میں یہ جملہ دونوں طریق کو عام معلوم ہوتا ہے لیکن آگے جو ارشاد ہے وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا فان اللہ غفور رحیم وہ قرینہ اس کا ہے کہ یہاں مانعیت اختیاری ہی مراد لی جائے جس پر غصہ محتمل ہونے کے بعد عفو و صفح کی ترغیب واقع ہوئی چنانچہ شان نزول سے بھی اس مراد کی تعین ہوتی ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضور کی خدمت میں باہر کے کچھ مسلمان علوم سیکھنے کے لئے آکر رہنا چاہتے تھے، اور یہ سب کو معلوم ہے کہ جو شخص کسی گھر میں پڑا ہوتا ہے وہ اگر کہیں چلا جاتا ہے تو گھر بے رونق ہو جاتا ہے کبھی بعضی کلفتوں کا بھی خیال ہوا کرتا ہے اس لئے گھر

کی بیبیاں بچے یہ ہی چاہا کرتے ہیں کہ یہ کہیں نہ جائیں چنانچہ ان کو بھی اسی طرح روکا مگر بعد چندے جب یہ لوگ حضور کی خدمت میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ جو صحابہ اس سے پہلے آئے ہوئے تھے وہ اور مسائل میں بہت دور نکل گئے، ان کو بڑی حسرت اور ندامت ہوئی کہ ہم بیوی بچوں ہی میں رہے اور دوسرے لوگ بہت دور نکل گئے اور ہم سے بہت زیادہ بڑھ گئے یہ سوچ کر ان کو اپنی اولاد اور ازواج پر غصہ آیا اور یہ ارادہ کیا کہ گھر جا کر ان کو خوب ماریں گے کہ ہم کو راہ حق سے مانع ہوئے تو جس وقت انہوں نے رد کا تھا اس وقت جزو اول آیت کا یعنی فاحذروہم تک نازل ہوا اور جب انہوں نے ان کے مارنے کوٹنے کا ارادہ کیا تو وان تعفوا وتصفحوا الخ نازل ہوا مطلب یہ ہے کہ اگر تم معاف کر دو اور سزا سے درگذر کر دو اور ان کا گذشتہ قصور معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم والا ہے تمہارے گناہ بھی بخش دے گا اور تمہارے حال پر رحم فرمائے گا پس یہ قصہ اور یہ جزو قرینہ اس کا ہے کہ یہاں اختیاری طریق مراد ہے؛

انہماک محبت

اور دوسری صورت اس سے مستنبط ہوتی ہے گو وہ مدلول مطابقی نہیں ہے لیکن مدلول التزامی ضرور ہے یا یوں کہو کہ مدلول نصی نہیں تو مدلول بدلالۃ النص ضرور ہے اور اس صورت میں ان کو عدوالکم فرمانا اس کے معنی اعتبار سے ہوگا کہ گو وہ مانعیت اور عداوت کے مباشر نہیں ہے لیکن سبب تو ہیں پس ان کو عدو فرمانا مشعر ذم ہے درجۂ سبب میں ہوگا نہ یہ کہ اس عداوت میں وہ عاصی ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص ایک کبوتر کے پیچھے بھاگا جاتا تھا تو حضور

نے فرمایا شیطان یتبع شیطانہ یعنی ایک شیطان ایک شیطانہ کے پیچھے جا رہا ہے ؛ اس کو شیطانہ اس لیئے فرمایا کہ اس کے حق میں تو اس نے شیطان ہی کا کام دیا کہ اس کو ذکر اللہ سے غافل کر دیا پس ایسے ہی اولاد اور ازواج اس محب کے حق میں بلا قصد عادد بن گئے کہ وہ ان کی محبت میں ایسا منہمک ہوا کہ اپنا اصلی کام بھول گیا ؛ پس اصل مانع اور مدار منع انہماک فی المحبت ہوا ؛ اور اس مدار کے اعتبار سے کہ محبوب کو عام ہو سکتا ہے یہ مضمون جیسا کہ اولاد اور ازواج کو شامل ہے ؛ غیر اولاد اور غیر ازواج کو بھی جس شئے کی محبت میں بھی یہ مبتلا ہو کہ اپنے مولا کو بھول جائے عام ہو گیا ؛ جس کو صوفیہ نے اس عبارت سے ادا کیا ہے ما شغلک عن الحق فھو طاغوتک کہ جو چیز بھی تجھ کو حق سے مانع ہو جائے وہ ہی تیرا بت ہے حکیم سنائی اسی مضمون کو فرماتے ہیں ؛ ؎

بہر چہ از دوست وامانی چہ کفر آں حرف وچہ ایماں
بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

اور اس میں ایمان سے مراد ایمان حقیقی نہیں اس لیئے کہ وہ تو عین مطلوب ہے نہ کہ مانع عن المطلوب بلکہ یہ ایسا ہے ؛ جیسے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ؛ قل بئسما یامرکم بہ ایمانکم اور اگر زیادہ غور کیا جائے تو یہ مانعیت غیر اختیاری بھی آیت کا مدلول مطابقی بن سکتا ہے اور ان تعفوا الخ اس پر بھی منطبق ہو جائے گا ؛ تقریر اس کی یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جیسے مباشرت مانعیت پر غصہ آتا ہے بسبب مانعیت بھی موجب غیظ ہو جاتا ہے کہ اس شئے کی محبت ہم کو ہمارے مقصود میں مانع ہوئی ہے اس کو ہی اڑانا چاہیئے ؛ باقی رہا شان نزول تو اس کا

جواب یہ ہے کہ العبرۃ لعموم الالفاظ لا لخصوص المورد پس اس صورت میں آیت مانعیت کی دونوں طریق کو دلالۃً مطابقی سے شامل ہو جائے گی اور ان تعفوا و تصفحوا الخ بھی بلا تکلف دونوں پر منطبق ہو جائے گا، اور یہ دو طریق تو مانعیت کے ازواج اور اولاد کی حیات میں تھے، کہ یا تو اولاد اور ازواج نے اس کو خود روکا تھا شاید خود ان کی محبت میں اس قدر مغلوب تھا کہ اللہ کی یاد سے رک گیا تھا،

ابتلاء محبت

تیسری صورت میں ان کی مانعیت کی ایک اور ہے کہ اولاد یا ازواج مر گئے یہاں مصیبت اور محبت دونوں مانع جمع ہو گئے، محبت تو مقتضی ہے، یاد کو کہ اس کی وجہ سے یہ سب اشتغال سے معطل ہو گیا اور محبوب کے فقدان کے الم کا مصیبت ہونا ظاہر ہی ہے اور وہ بھی شاغل عن الحق ہو رہا ہے اور جاننا چاہیئے کہ حیات محبوب میں جو مانعیت اور ممات محبوب میں جو مانعیت ہے یہ دونوں مانع نفس مانعیت میں تو مشترک ہیں لیکن ان میں ایک فرق ہے جس پر نظر کرکے بعد ممات والی مانعیت زیادہ عجیب اور فہم سلیم سے زیادہ بعید ہے، وہ یہ کہ محبوب کی حیات کی صورت میں تو فی الجملہ گو حقیقتاً نہ سہی، مگر ظاہراً بہ نسبت حالت ممات کے شخص کسی قدر معذور بھی ہے کہ محبوب مجازی کا کچھ قرب ہے کچھ مشاہدہ ہے یا امید مشاہدہ ہے یہ محرک ہو گیا ہے اس کی محبت میں ایسا مبتلا رہے گا کہ وہ محبت اس محبوب حقیقی سے مانع ہو گئی، مگر اس کے فقدان و ممات کی صورت میں تو کوئی عذر نہیں ہے اس لئے کہ اس سے مفارقت بھی ہو گئی اور اس کی محبت کا کوئی محرک بھی نہ رہا ادھر دوسرا محبوب یعنی محبوب حقیقی موجود ہے اور اس سے تسلی کرنا ممکن پھر تعجب ہے کہ جو محبوب

اس کے پاس موجود ہو اس میں تو مشغول ہو کر تسلی نہ پائے اور محبوب مجازی جو کہ سامنے موجود بھی نہیں اس کی یاد میں گھلے کہ جس کا کوئی نتیجہ سوائے اپنی جان گھٹانے کے نہیں ہے؛ واقعی یہ شخص بالکل معذور نہیں اور یہ ساری خرابی غیر اللہ کے ساتھ حد سے زیادہ تعلق بڑھانے کی ہے

محبت اور شرک یاد رکھو کہ یہ محبت بعض مرتبہ شرک کے درجے میں پہنچ جاتی ہے؛ چنانچہ ایسی محبت کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں؛ ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونہم کحب اللہ یعنی بعضے لوگ ایسے بھی ہیں کہ سوائے اللہ کے انہوں نے شریک بنا رکھے ہیں کہ ان سے مثل اللہ کی محبت کے محبت کرتے ہیں دیکھیے اس آیت میں جیسے کہ اتخاذ انداد یعنی شرک فی الالوہیت کی شکایت ہے اسی طرح یہ عمل بھی اسی درجہ میں محل شکایت ہے کہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں؛ جیسے خدا کے ساتھ ہونی چاہیئے یعنی جیسی خدا کی محبت سے کسی وقت قلب خالی نہ ہونا چاہیئے؛ ایسی محبت دوسروں سے کرتے ہیں؛ واقعی ایسی محبت شرک کا شعبہ ہے اور شرک کا شعبہ ہونے کے علاوہ عذاب جان بھی ہے؛ اور وہاں تو عذاب ہو ہی گا؛ یہاں بھی سخت مصیبت ہے چنانچہ دوسرے مقام پر اسی مضمون کو ارشاد فرماتے ہیں ولا تعجبک اموالہم ولا اولادہم انما یرید اللہ لیعذبہم بہا فی الحیوۃ الدنیا یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ان منافقین کے اموال و اولاد اچھے معلوم نہ ہونا چاہیئے اللہ تعالیٰ کا بس یہ ارادہ ہے کہ ان اموال اور اولاد کے سبب سے ان کو دنیا کی حیات ہی میں عذاب دے؛ غرض سخت حسرت

وافسوس ہے کہ محبوب حقیقی کے ہوتے ہوئے محبوب مردہ یا زندہ کے ساتھ کہ وہ بھی اہل بصیرت کے نزدیک مردہ ہی ہے لگایا جائے اگر کوئی کہے کہ اس تعجب کا مبنیٰ تو یہ مقدمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا زیادہ محبوب ہو تو اس کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ احب کے ہوتے ہوئے محبوب ادنیٰ کی طرف کیوں التفات ہے؛ سو یہ زیادہ محبوب ہونا کہاں ثابت ہے؛ ہمارا زیادہ محبوب تو وہی تھا جس پر ہم مفتون ہیں تو جناب من آپ اس زیادہ محبوب ہونے کو تسلیم کر چکے ہیں ایمان لانا یہ خود اس احبیت کے اقرار کو مستلزم ہے چنانچہ اسی آیت میں ارشاد ہے والذین امنوا اشد حبا للہ یعنی جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہے پس آپ تو رجسٹری شدہ محب ہیں ضرورت ہی اس بات کی نہیں ہے پس جب آپ عاشق اور محب ٹھہرے تو عاشق کے لئے بڑی غیرت کی بات ہے کہ محبوب کو چھوڑ کر غیر پر نظر ڈالے مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک عورت چلی جارہی تھی اس نے دیکھا کہ اس نے دیکھا کہ میرے پیچھے ایک مرد آرہا ہے: پوچھا کہ میرے پیچھے کیوں آرہا ہے اس نے کہا کہ میں تیرا عاشق ہوں اس عورت نے کہا کہ میرے پیچھے میری بہن آرہی ہے، وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے وہ شخص لوٹ گیا اس عورت نے بڑھ کر اس کے ایک دھول رسید کی اور یہ کہا؛ ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی در بیان دعوئ خود صادقی
پس چرا بر غیر افگندی نظر ایں بود دعوئ عشق اے بے ہنر

دیکھئے ایک ادنیٰ عورت نے جب شرکت پسند نہیں تو احکم الحاکمین کہ جس کو بے انتہا غیرت ہے اس کو کب پسند ہوگا کہ ہمارے چاہنے والے غیر پر نظر

ڈالیں غرض عشق تو سوائے محبوب کے کسی شئے کو نہیں چھوڑتا ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

حضرت سلطان ابراہیم بن ادہمؒ کی حکایت ہے کہ جب سلطنت چھوڑ کر درویشی اختیار کی تھی تو گھر میں ایک بچہ چھوڑ گئے تھے، جب وہ بچہ جوان ہوا تو اس نے اپنے باپ کا پوچھا کہا گیا وہ تو درویش ہو گئے مکہ معظمہ میں ہیں یہ لڑکا مکہ معظمہ حج کو پہنچا مطاف میں دونوں باپ بیٹے کا اتفاقی اجتماع بلا تعارف ہو گیا اور حضرت ابراہیم کی نظر اس پر پڑی محبت کا جوش ہوا کئی بار اس کو دیکھا مریدوں نے دیکھا کہ حضرت شیخ ایک امرد حسین کو دیکھ رہے ہیں اس لئے کہ یہ لڑکا بادشاہ کا لڑکا ناز و نعمت کا پلا ہوا نہایت حسین و جمیل تھا اور وہ زمانہ یہ زمانہ تو تھا نہیں کہ جتنا زیادہ کوئی امرد پرست ہو اتنا ہی زیادہ بزرگ ہو اُس زمانہ میں تو شریعت کے احکام کا غلبہ تھا، مریدوں کو گمان ہوا کہ بے شک شیخ کو لغزش ہوئی ہے بعد طواف کے ہم متنبہ کریں گے وہ لڑکا حضرت ابراہیم کی جستجو میں آیا تھا، بعد طواف کے ہر ایک سے پتہ حضرت ابراہیم کا پوچھتا تھا لوگوں نے بتایا خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کہ میں آپ کا بیٹا ہوں اور میرا نام محمود ہے حضرت ابراہیم نے پوچھا کہ تم نے کچھ پڑھا بھی ہے عرض کیا کہ قرآن مجید اور علم دین پڑھا ہے پھر پوچھا کہ صوم و صلوٰۃ اور احکام شرعیہ کے پابند ہو معلوم ہوا کہ پابند ہیں دیکھئے اللہ کے بندوں کی ایسی محبت ہوتی ہے اس لئے پوچھا کہ اگر معلوم ہو گا کہ جاہل اور خدا و رسول کی مرضی کے خلاف ہے تو میرے کس کام کا ہے، جب اس کا ہر طرح سے کامل ہونا معلوم ہوا تو اور زیادہ محبت کا جوش ہوا اور سینہ سے لگایا، فوراً الہام ہوا کہ اے ابراہیم ہمارے ہوتے ہوئے غیر پر نظر ؎

جب حق ہو دل میں یا حب بسیر　　　جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر

دعا کی کہ اے اللہ یہ لڑکا میرے اور تیرے درمیان میں حجاب ہے اس حجاب کو اٹھالے فوراً اس کے گردہ میں درد ہوا اور جاں بحق ہوا لیکن اہل بصیرنے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم کے ایک مرتبہ سینے سے لگا دینے سے سلطان محمود کے اندر نسبت قوی پیدا ہو گئی تھی مزاران کا مکہ کے باہر اب تک موجود ہے اہل البصیرت انکی نسبت کی قوت کا احساس کرتے ہیں لیکن اس قصے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اولاد کے ساتھ محبت حرام ہے

درجاتِ محبت

بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا معاملہ ہر بندہ کے ساتھ جدا ہے بعضوں کے لئے وہ غیر کے ساتھ ادنیٰ درجہ محبت کا بھی بلا ضرورت ادائے حقوق پسند نہیں فرماتے اس لئے ان کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ ہوتا ہے ورنہ اولاد کے ساتھ محبت رکھنا اسی طرح ازواج کے ساتھ اسی طرح دوسرے تعلقات والوں کے ساتھ مشروع ہے بشرطیکہ غلو نہ ہو جس کا ضابطہ یہ ہے کہ جیسے مصیبت کے دو درجے تھے اسی طرح محبت کے بھی دو درجے ہیں ایک محبت لاداء الحقوق دوسری محبت لتحصیل الحظوظ اداۓ حقوق کے لئے جو محبت ہے وہ فی نفسہ عقلی محبت ہے اگرچہ اس میں طبیعت بھی ہو اور تحصیل حظوظ کے لئے جو محبت ہے! وہ نری طبعی ہے اسی کا نام عشق ہے پس ادار حقوق کے لئے جو محبت ہے! اس میں کوئی ملامت نہیں ہے بلکہ ایک درجہ میں اس کی تحصیل ضروری ہے اور تحصیل حظوظ کے لئے بھی محبت منع نہیں بشرطیکہ واجبات اور محرمات میں اس سے اختلال نہ ہو مثلاً بیوی سے کسی کو عشق ہو کوئی ملامت نہیں لیکن اس کو بڑھائے نہیں اس لئے کہ بڑھ کر شاغل عن الحق ہو جائے گی ہاں اگر محبت بالکل نہ ہو اور یہ خوف ہے کہ مجھ

سے ادائے حقوق میں کوتاہی ہوگی اس لئے محبت کی تحصیل کرتا ہے یا کچھ تو ہے مگر اس کو اس مصلحت ادائے حقوق کے لئے بڑھاتا ہے تو جائز بلکہ مستحب ہے اور جو اس قدر محبت موجود ہے کہ ادائے حقوق کے لئے کافی ہے مگر محض تحصیل لذت کیلئے اس کو بڑھاتا ہے یعنی ایسے اسباب غیر ضروری کا ارتکاب کرتا ہے کہ جن سے محبت بڑھے اور غرض لذت اور عیش پرستی ہے تو یہ برا ہے بلکہ بعض اوقات مفضی الے المضرت ہو کر ظناً یا یقیناً حرام ہے اور یہی راز ہے اس میں کہ حب کا تعویذ کرنا ناجائز ہے چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ بیوی کو حرام ہے کہ تسخیر زوج کے لئے تعویذ کرے مطلب اس کا یہ ہے کہ جس وقت محبت بقدر ضرورت موجود ہے لیکن صرف اس واسطے کہ زوج میرا ہی اُلو بن جائے نہ ماں کا رہے نہ باپ کا تعویذ کرتی ہے یہ حرام ہے ہاں اگر حقوق ادا نہ کرتا ہو تو تعویذ وغیرہ کا کچھ مضائقہ نہیں پس جب کہ محبت جائز کا بھی جیسے کہ زوجین میں ہوتی ہے بڑھانا حد سے زائد پسندیدہ نہیں تو جو محبت اصل سے ہی ناجائز ہے وہ تو کیوں کر قابل ملامت نہ ہوگی اور بیوی تو بیوی ہمارے مشائخ محققین نے تو شغل رابطہ کو کہ جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے شیخ کی صورت کا تصور کیا کرے پسند نہیں کیا ہے اور بعضوں نے ناجائز بھی کہا ہے! اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ایسا تصور کرنا کہ غیر متصور کا تصور ہی نہ کرے یہ صرف خدا ہی کا حق ہے چنانچہ مولانا اسمٰعیل صاحب شہید نے اس شغل کو ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون میں داخل فرمایا ہے اسی طرح توجہ متعارف بین الصوفیہ کہ جس کی حقیقت یہ ہے کہ شیخ تمام خطرات سے خالی ہو کر طالبین کی طرف متوجہ ہوتا ہے محققین نے اس کو بھی ناپسند کیا ہے اس لئے کہ قلب کو ماسوا طالب سے جب خالی کر لیا تو حق

تعالیٰ کی یاد بھی اس میں برائے نام ہی رہ جائے گی یعنی جتنی کہ قلب میں رچ چکی ہے اور درجہ اختیار سے نکل کر درجہ اضطرار میں پہنچ گئی ہے۔

توجہ الی اللہ باقی قصداً توجہ الی اللہ نہ رہے گی اس لئے کہ قصد طالب کی طرف متوجہ ہے تو اس وقت یہ شخص توجہ الی اللہ کا جو کہ مامور بہ ہے تارک ہوا کیوں کہ مامور بہ توجہ اختیاری ہے نہ کہ اضطراری میں اس کی حرکت کا تو فتوے نہیں دیتا اس لئے کہ اکثر مشائخ کا معمول رہا ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ نیت ان حضرات کی اس میں خیر ہی کی تھی اس لئے جائز ہی کہتا ہوں مگر مجھ کو اس جائز سے اس قدر نفرت ہے جیسے بعض کو اوجھڑی کھانے سے نفرت ہوتی ہے مجھ کو اس میں بالکل صورت شرک کی سی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یہ خدا کا حق ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی شئے کو دل میں نہ لائے پس جب کہ اس شغل القلب بالغیر کو جس میں نیت بھی خیر ہے محققین نے پسند نہیں کیا تو جس محبت کا ثمرہ لیعذبھم بھا فی الدنیا ہو اور جس تعلق کا نتیجہ ظلمت ہے ظلمت ہو وہ تو کیوں کر ناجائز نہ ہوگی اور محبت کا بڑا سبب یا تو نظیر ہے اگر وہ مشاہد ہے اور اگر مر گیا ہے یا غائب ہے تو کثرت تخیل و تصور ہے پس نظر کی بھی حفاظت ضروری ہے اور تخیل اور تصور کو بھی دوسرے کام لگ کر منفرق کر دینا چاہیئے ورنہ کثرت تخیل کا نتیجہ اکثر جنون ہوتا ہے مولانا نصیحت میں فرماتے ہیں؛ ؎

عشق با مردہ نباشد پائدار ۔ عشق را باحی و باقیوم دار ۔
عشق ہائے کز پئے رنگے بود ۔ عشق نبود عاقبت ننگے بود ۔
غرق عشقے شو کہ غرق است اندریں ۔ عشق ہائے اولیں و آخریں ۔

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست ؛ با کریماں کارہا دشوار نیست ؛

یعنی یہ مت کہو کہ ہمارا تو اس درگاہ میں دخل نہیں ہے اس لئے کہ کریم پر کار دشوار نہیں تم مطلب تو کرو وہ کریم تم کو رسائی دے گا ، افسوس ایسی ذات کے ساتھ تو محبت نہ کریں کہ جو خود تم کو طلب کرے اور جس کی محبت میں ہر طرح کا چین لطف سکون حاصل ہو اور ایسوں کے اوپر مریں ، کہ جن کی محبت سے مالیخولیا اور جنون اضطراب بے قراری بے چینی ہو اور اکثر وہ تمہاری طرف التفات بھی نہ کرے ؛

مُردہ کا تخیل خصوص جس شخص نے مردہ کا تخیل غالب کر لیا ہو ایسے شخص کے لئے تو ضروری ہے کہ وہ اپنا علاج کرے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دماغ صحیح نہیں ہے اور مردہ کو یاد کر کر کے زیادہ رونے سے ایک یہ بھی خرابی ہے کہ مردہ کو بھی تکلیف ہوتی ہے حدیث شریف میں آیا ہے ؛ کہ صحابی بیمار ہوئے اور ان کو نزع شروع ہوا ان کی بیوی یہ کہہ کر رونے لگی ہائے میرے سردار انہوں نے آنکھ کھول کر منع کیا کہ کیا میں تم کو منع نہیں کرتا تھا کہ نوحہ مت کرنا ، جب تم یہ کہتی تھی کہ ہائے سردار تو فرشتے مجھ کو کھینچتے تھے کہ کیا تو ایسا تھا ۔ دیکھو اس طرح کی بات سننے سے بھی تکلیف ہی ہوتی ہے اسی طرح میری بڑی ہمشیرہ کے انتقال کے بعد میری نانی صاحبہ یعنی بڑی آچی بہت روتی تھیں ؛ ایک بار مرحومہ کو خواب میں دیکھا کہتی ہے کہ نانی تم نے رو رو کر ندی نالے بہا دیئے میں تمہارے پاس آیا کرتی مگر تم نے رستہ ہی نہ رکھا اس حکایت سے معلوم ہوا ؛ کہ اموات کو بعض اوقات احیاء کے افعال کا احساس ہوتا ہے اور وجہ اس

کی کبھی یہ ہوتی ہے کہ فرشتے اطلاع کر دیتے ہیں اور کبھی کبھی حق تعالیٰ کی طرف سے اقتراب روحانی کا اذن ہو جاتا ہے اس سے ان کو ادراک ہوتا ہے جلال الدین سیوطیؒ نے شرح الصدور میں ایک حکایت لکھی ہے کہ بزرگ اپنی والدہ کی قبر پر جا کر قرآن مجید پڑھا کرتے تھے ایک روز انہوں نے اپنی والدہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہتی ہیں بیٹا جب تم میرے پاس آیا کرو تو آتے ہی قرآن مجید نہ شروع کر دیا کرو، تھوڑی دیر بیٹھ کر شروع کیا کرو، تاکہ میں تم کو جی بھر کر اول دیکھ لیا کروں جب تم قرآن شروع کر دیتے ہو تو اس کے انوار تمہارے چہرے کو مجھ سے چھپا دیتے ہیں۔

حرام محبت الحاصل یہ تفصیل تو حلال محبت میں تھی اور جو حرام محبت ہے، جس کا نام لوگوں نے عشق رکھا ہے جس کو بجائے عشق کے اگر فسق کہا جائے تو بجا ہے خواہ وہ محبت عورتوں کے ساتھ ہو یا لڑکوں کے ساتھ یہ تو کسی طرح بھی جائز نہیں آجکل لڑکوں کی محبت کا مرض بہت عام ہو گیا ہے اور یہ فتنہ عورتوں سے زیادہ سخت ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ عورتیں تو خود بھی اجنبی مردوں سے بچتی ہیں اور ان میں حیا بھی ہوتی ہے اور نیز وہ پردہ میں بھی رہتی ہیں دوسرے یہ کہ عورت مرد ملیں تو فوراً لوگوں کو بدگمانی ہوتی ہے اور لڑکوں میں بچاؤ کی کوئی چیز نہیں ہے اس لئے اس میں ابتلاء بہت ہے۔ اور نہایت سخت چیز ہے یہ وہ فعل ہے کہ جس نے قوم لوط کو تباہ کر دیا ہے اور جو لوگ اس میں مبتلا ہیں ان کی بہت سی قسمیں ہیں چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے۔ کہ لوطی کی تین قسمیں ہیں قسم ینظرون وقسم یقبلون وقسم یفعلون، یعنی ایک

قسم تو وہ ہے جو صرف دیکھتے ہیں اور دوسری قسم جو بوس وکنار کرتے ہیں تیسری قسم جو یہ فعل کرتے ہیں اور میں عرض کرتا ہوں کہ چوتھی قسم ایک اور ہے وہ یہ ہے یتصورون ویتخیلون یعنی تصور اور تخیل میں مبتلا ہیں یہ قلب کی لواطت ہے! اور دلیل اس کی وہ حدیث ہے والقلب یزنی وزناہ ان یشتھی اور یہ فعل زیادہ سخت اس لئے ہے کہ عورت کسی وقت حلال ہونے کا محل تو ہے اور اس فعل خبیث میں تو حلت کا وسوسہ بھی نہیں اور یہ فعل فطرۃ سلیمہ کے بالکل مبائن اور مخالف ہے اور اس فعل سے عقوبۃً بھی سخت بلائیں نازل ہوتی ہیں، چند سال ہوئے تھانہ بھون کا ہی قصہ ہے کہ ایک شخص حق تعالیٰ کی طرف مشغول تھا اس کے قلب پر یہ آیت وارد ہوئی انا منزلون علیٰ اہل ھذہ القریۃ رجزاً من السماء بما کانوا یفسقون یہ آیت قوم لوط کے بارے میں ہے ترجمہ یہ ہے کہ ہم بیشک اس بستی والوں پر بسبب ان کے فسق کے آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں اس شخص نے ممبر پر بیٹھ کر سب کو سنا دیا اور یہ کہہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس فعل خبیث میں مبتلا ہیں توبہ اور استغفار پڑھنا چاہیئے لیکن کسی نے نہ سُنا، اس کے بعد ہی اس شدت سے طاعون ہوا کہ گھر کے گھر خالی ہو گئے اور ہنظر بصیرت وکشفی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل کی ظلمت قلب پر بہت سخت ہے زنا میں اتنی ظلمت نہیں ہے! فقط ہاتھ لگانے ہی سے بے حد ظلمت طاری ہو جاتی ہے اصل فعل کا درجہ تو آگے رہا بزرگوں نے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ جس شخص کو اپنی بارگاہ سے مردود کرنا چاہتے ہیں اس کو امردوں کی محبت میں مبتلا کرتے ہیں یہ تمام ترکلام محبت کے بارے میں تھا!

حب مال

تیسرا مانع کہ وہ بھی فرد نعمت کا ہے حب مال ہے اسلیئے آگے اس کو ارشاد فرماتے ہیں انما اموالکم و اولادکم فتنۃ و اللہ عندہ اجر عظیم یعنی تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہے اور اللہ کے نزدیک اجر عظیم ہے کیوں کہ اولاد کا فتنہ زیادہ سخت ہے اس لئے یہاں اس کو مکرر ارشاد فرمایا اور نیز اس لئے کہ اموال کے ساتھ محبت کا ایک منشا اولاد کی محبت بھی ہے؛ اس لئے بھی اولاد کو مکرر ذکر فرمایا اور مال کی محبت کے بھی دو درجے ہیں ایک تو بضرورت حدود شرعیہ کے اندر یہ مذموم اور مانع نہیں اور ایک وہ محبت جس کے غلبہ میں حقوق شرعی فوت ہوتے ہیں چنانچہ آجکل یہ بلا بھی عام ہے جو کہ حب مال کا شعبہ ہے وہ یہ کہ حقوق العباد میں بہت کوتاہی کرتے ہیں اس زمانہ میں لوگ بڑے باہمت ہیں جو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اہل حقوق کو حقوق پہنچاتے ہیں آجکل بڑے بڑے دینداروں کی یہ کیفیت ہے کہ نمازیں بہت پڑھیں گے حتیٰ کہ نوافل اور تسبیح ذکر و شغل کے پابند لیکن حقوق کے ادا کرنے میں تساہل حتیٰ کہ بعض علماء کا یہ حال ہے کہ کسی مردہ کے ورثہ اس کا مال ان کے مدرسہ یا مسجد میں لائیں یہ بے تکلف لے لیتے ہیں نہ اس کی تحقیق کرتے ہیں کہ اس کے کتنے وارث ہیں اور سب کی رضامندی ہے یا نہیں کوئی ان میں نابالغ تو نہیں ہے اس بلا میں باستثناء خاص خاص بندوں کے سب ہی مبتلا ہیں؛ خصوص مدارس میں تو اس چندہ کا قصہ بڑا نازک ہے؛ میں نے ایک جگہ کی حکایت سنی ہے کہ شادیوں کے موقع میں جو مدارس میں لوگ دیا کرتے ہیں سو ایک شادی ہوئی ایک خاص مدرسہ میں شادی والوں نے نہ دیا تو منتظم مدرسہ نے دعوت کے موقع پر میزبان سے خود کہا کہ مدرسہ کا حق نہیں آیا

کوئی اس بھلے مانس سے پوچھے کہ حق کے یہاں کیا معنی ہیں، حق تو وہ ہے جو شرعاً واجب ہو، بعض برادریوں میں دستور ہے کہ جس کے ہاں شادی ہو اس سے جبراً مدرسہ یا مسجد کے لئے کچھ مقدارِ خاص روپیہ کی لیتے ہیں جو بالکل ناجائز ہے، بہر حال عوام یا خاص باستثنار اخص الخواص سب ہی ان بے احتیاطیوں میں مبتلا ہیں، جن میں خواص کے ان افعال اور تعلق اہل اموال سے بے حد ضرر ہو رہا ہے، ایک موقع پر ایک ڈاڑھی منڈے صاحب کہہ رہے تھے کہ ہم فلاں مدرسہ میں گئے تھے ہماری بڑی تعظیم کی گئی، دیکھو یہ ہماری تعظیم مال ہی کی وجہ سے ہے اگر ہم مالدار نہ ہوتے یا اس مال کی اہل مدرسہ کو امید نہ ہوتی تو ایسے علمار ہم کو کیوں پوچھتے اتفاق سے میں ایک مدرسہ میں کلکتہ گیا تو ان ہی حضرات نے جو اس وقت وہاں آئے ہوئے تھے میرا وعظ سنا میں نے وعظ کہا اور اس میں حب مال پر زیادہ مضمون بیان کیا، انہوں نے اس کی بھی شکایت کی، تھوڑا عرصہ ہوا نواب صاحب ڈھاکہ کی استدعا پر جو میں کلکتہ تک گیا تو وہ ملے، بہت تعظیم سے پیش آئے اور کہنے لگے کہ ہم کو تو آنے سے ناامیدی ہوئی تھی نواب صاحب نے بیان کیا کہ اس نے (یعنی احقر نے) ایک شرط کی ہے جو مشکل ہے میں نے پوچھا کہ وہ شرط کیا نقل کی تھی کہنے لگے، کہ نواب صاحب نے بیان کیا کہ یہ شرط کی ہے کہ ہم کو کچھ نہ دیا جائے میں نے کہا کہ یہ شرط کیا مشکل ہے یہ تو بہت آسان ہے، وہ کہنے لگے کہ جناب یہ کیسے ہو سکتا ہے، اپنے محبوب کی خدمت کرنے کو تو جی چاہا ہی کرتا ہے میں نے کہا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب کی خدمت محبوب کے گھر بیٹھے ہوئے کر دی جائے، یہ کیا ضروری ہے کہ بلا ہی کر دیں، کہنے لگے جناب گستاخی معاف پیاسا کنویں کے پاس جایا کرتا ہے

کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا، میں نے کہا کہ آہا تو کیا آپ ہم کو پیاسا اور اپنے آپ کو کنواں جانتے ہیں واللہ آپ خود پیاسے ہیں اور ہم کنویں ہیں آپ اپنے کو دنیا کی دولت کی وجہ سے کنواں کہتے ہوں گے، سو بحمد اللہ جس قدر دنیا کی ضرورت ہے وہ ہمارے پاس موجود ہے اور جس قدر تم کو دین کی ضرورت ہے اس سے تم لوگ مفلس ہو، غرض میں نے خوب ہی کان کھولے لیکن بولے بالکل نہیں، جب وہ چلے گئے، تو لوگ کہنے لگے کہ بہت ہی اچھا ہوا یہ بڑا مغرور ہے، جس کو چاہے کہہ بیٹھتا ہے، غرض ان مدارس کے چندوں نے علماء کو بہت بے وقعت کر دیا ہے اگر علماء اپنی حالت درست کر لیں اور ان مالداروں کو منہ لگائیں اور قناعت اختیار کر لیں تو پھر عوام پر بھی بہت اچھا اثر ہو، اور جب علماء ہی کو اموال کے ساتھ اس قدر دلچسپی ہو، کہ دولت مندوں کی خوشامدیں کریں تو عوام بے چاروں کی کیا شکایت ہے واللہ اگر یہ لوگ خوشامد اور حرص چھوڑ کر استغناء کا معاملہ کریں تو امراء ان کے دروازوں پر خود آویں البتہ آنے والوں کے ساتھ بد اخلاقی نہ کریں، اور فتنہ کے معنی یہاں وہ نہیں ہیں، جس کو عام لوگ فتنہ فساد کہا کرتے ہیں، بلکہ فتنہ کے معنی امتحان کے ہیں، یعنی اولاد اور مال تمہارے لئے امتحان کی چیز ہے یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ تم ان کے ساتھ مشغول ہوتے ہو، یا ہماری طرف اور جو امتحان میں کامیاب ہو گا، اس کے واسطے اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے!

تقویٰ یہاں موانع کی فہرست تمام ہو گئی اور وہ کل تین چیزیں ہوئیں ایک مصیبت اور نعمت کے افراد میں سے ایک اولاد و ازواج دوسرا مال اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مانعیت ان کی بوجہ افراط محبت و تاثر کے ہے اب اس

مقام پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ محبت اور تأثر تو قلب میں ہوتا ہے اور وہ اختیار میں نہیں ہے
یہ تو سخت مصیبت ہوئی تو آگے اس کا جواب ارشاد ہے فاتقوا اللہ ما استطعتم مطلب
یہ ہے کہ تم کو یہ کون کہتا ہے کہ تم آج ہی جنید جیسے ہوجاؤ میاں جس قدر تم سے ہوسکے
تقویٰ کرتے رہو رفتہ رفتہ مطلوب تک پہنچ جاؤ گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ
آیت فاتقوا اللہ حق تقاتہ کی ناسخ ہے لیکن میرے تفسیر کر دینے سے معلوم ہوا ہو
گا کہ فاتقوا اللہ حق تقاتہ کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی
ہے کہ جب آیت فاتقوا اللہ حق تقاتہ نازل ہوئی تو صحابہ یہ سمجھے کہ امر کا صیغہ اس میں فور
کے واسطے ہے اسی وقت اللہ سے ایسا درجہ تقویٰ حاصل کرلو۔ جو حق ہے اس کا او
قاعدہ تو یہی ہے کہ امر فور کے لئے نہیں ہوتا لیکن گاہ گاہ قرائن سے فور بھی محتمل ہوتا
ہے پس صحابہؓ اس احتمال سے کانپ اٹھے اس لئے جو حق ہے تقویٰ کا وہ فوراً کیسے
حاصل ہوسکتا ہے تو اس کے بعد یہ آیت فاتقوا اللہ ما استطعتم بطور اس کی تفسیر کے
نازل ہوئی مطلب یہ ہوا کہ حق تقاتہ درجہ منتہی کا ہے اور اس مامور بہ کا حاصل کرنا علیٰ
الفور واجب نہیں ہے بلکہ بقدر استطاعت تقویٰ اختیار کرو۔ اور تدریج اس میں
جتنی جتنی ہوسکے۔ ترقی کرتے رہو حتیٰ کہ جو تقویٰ مطلوب ہے اس پر جا پہنچو گے
پس اس تقریر پر ان دونوں آیتوں میں نسخ اصطلاحی نہیں ہوا اور بعض روایات میں
جو یہاں نسخ کا لفظ آیا ہے وہ بالمعنی المصطلح نہیں بلکہ بالمعنی الاعم ہے جو تفسیر مبہم
کو بھی شامل ہے اب یہاں پر یہ خلجان ہوا کہ تقویٰ کا سلسلہ ایسا دراز ہے کہ اس کے
علوم موقوف علیہا اور اعمال موقی بہا کا احاطہ حاصل نہیں تو عمل کی کیا صورت ہو آگے
اس کا دفعیہ فرماتے ہیں واسمعوا واطیعوا یعنی تم اپنا دستور العمل یہ بنالو کہ سنو اور مانو اور

اپنی طبیعت کو پریشان نہ کرو، جب کوئی بات سنی فوراً اس پر عمل شروع کردو گو اسوقت احاطہ نہ ہو، البتہ یہ نہ کرو کہ سن کر غفلت اور عمل میں کوتاہی کرو، جیسا کہ ایک شخص میرے پاس آئے کہ میں تمہارا مرید ہوں میں نے کہا کہ کب سے ہوئے تھے کہا کہ پانچ برس ہوئے، اور جو وظیفہ آپ نے تبلایا تھا وہ پڑھتا ہوں میں نے کہا کہ بندہ خدا اس درمیان میں نہ خود آئے اور نہ خط کے ذریعے سے اپنے حال کی اطلاع کی اچھے مرید ہو کبھی تم نے ایسا بھی کیا ہے کہ حکیم کو نبض دکھلا کر اور نسخہ لکھوا کر پانچ برس تک غائب رہے ہو وہاں تو گھنٹہ گھنٹہ بھر کے بعد حکیم جی کو اطلاع کرتے ہو اور یہاں تم نے پانچ برس کے بعد خبر لی ہے افسوس کو طالب کو چاہیئے کہ جب کسی شیخ سے رجوع کرے تو دو امر اپنے اوپر لازم کرلے: اطلاع اور اتباع یعنی اطلاع اپنے احوال کی اور اتباع اس کی تعلیم کا پس واسمعوا واطیعوا میں ایک اعلیٰ درجہ کا دستور العمل تبلا دیا گیا اور چونکہ مال انسان کو بالطبع محبوب ہے اور نیز انسان کے اندر بخل بھی طبعی سا ہے اس لئے تقویٰ کے افراد میں سے تعمیم کے بعد تخصیص کے طور پر اہتمام شان کے لئے اس کو مستقل طور سے بھی ارشاد فرماتے ہیں وانفقوا خیرا لانفسکم یعنی اپنے نفسوں کے مال خرچ کرو اور لانفسکم اس لئے فرمایا کہ شاید تم یہ سمجھنے لگو کہ اس کا نفع حق تعالیٰ کا ہوگا، سو یاد رکھو کہ اس انفاق کا نفع تمہاری ہی طرف عائد ہوگا ہم تو غنی بالذات ہیں اور چونکہ جملہ کلام سابق یعنی اسمعوا واطیعوا سے بعضے کوتاہ بیں ممکن ہے کہ یہ سمجھیں کہ صرف ظاہر احکام پر عمل کرلینے سے بس مقصود حاصل ہو جائے گا،

تزکیہ نفس

اس لئے آگے ان اعمال ظاہرہ کی روح تعیین فرماتے ہیں ارشاد ومن یوق شح نفسہ فاولٰئک ھم المفلحون مطلب یہ ہے،

کہ صرف اعمال ظاہرہ کی صورت پر مت رہو بلکہ روح کو بھی حاصل کرو اور اس کو ہم ایک مختصر عنوان میں بیان کرتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص نفس کی حرص سے بچا لیا جائے تو یہ لوگ ہیں بامراد یعنی جب نفس کی اندر اس قدر سماحت پیدا ہو جائے کہ غیر اللہ کا تعلق اس میں نہ رہے اور غیر پر نہ گرے تو جانو کہ فلاح حاصل ہو گئی اور یہ روح عادتاً اہل اللہ ہی سے حاصل ہوتی ہے اہل اللہ کی خدمت و صحبت سے اور یوق بصیغہ مجہول فرمایا یہ نہیں فرمایا ومن یتق نفسہ (جو شخص اپنے نفس کی حرص سے) اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ وقایہ (نگہداشت) تمہارا کام نہیں ہے بلکہ بچانے والے ہم ہیں یعنی اپنے پر ناز نہ کرنا ہم بچاتے ہیں جو مقصود پہنچا دیتے ہیں جس کا ظاہری واسطہ اہل اللہ ہیں اس سے دوام مجاہدہ کی حد بھی بیان فرما دی کہ جب تک نفس کے اندر حرص اور شح باقی ہے اس وقت تک مجاہدہ نہ چھوڑو اور چونکہ نفس کے اندر حرص اور شح جبلی ہے کہ کسی طرح قابل زوال نہیں اس لئے مجاہدہ بھی مدۃ العمر ہی ضروری ہوا۔ البتہ بعد چندے اس میں زیادہ مشقت نہیں رہتی اور چونکہ ومن یوق شح نفسہ الخ اس کی تمام حرصیں جو غیر اللہ کے متعلق ہیں چھڑانا مقصود ہے اور یہ جب تک کہ نفس کو اس سے بڑی چیز کی حرص نہ دلائی جائے نہ نکل نہیں سکتی جیسے کسی کے پاس پیسہ ہو تو اس کو جب تک روپیہ یا گنی کا لالچ نہ دیا جائے اس کو چھوڑ نہیں سکتا اس لئے آگے ثمرہ اعمال کی خیر کی حرص دلاتے ہیں

حرص کی قسمیں

یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ مطلق حرص مذموم نہیں بلکہ حرص کی دو قسمیں ہیں غیر اللہ کی حرص تو مذموم ہے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کی حرص محمود ہے چنانچہ ارشاد ہے ان تقرضوا اللہ قرضاً حسناً یضا

عفہ لکم یعنی ہم جو تم سے تمہارے اموال اور اولاد اور ازواج اور تمہارے جان چھڑانے (یعنی تلب سے نکالنے) کے لئے آیاتِ سابقہ میں ارشاد کر آئے ہیں اس سے ڈرو مت کہ ہم تو بالکل ہی مفلس ہو جائیں گے تم یہ سب چیزیں ہم کو قرض دے رہے ہو، سو اگر تم اچھا قرض دو گے یعنی خالص بلا ریار کے یعنی ان کی جب مفرط کو چھوڑ دو گے اور جس کے لئے انفاق بھی لازم ہے جان بھی مال کا بھی تو ہم اس کو بڑھا دیں گے مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں: ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را | کہ بیک گل می خری گلزار را
نیم جان بستاند و صد جان دہد | انچہ در دہمت نیاید آں دہد

اور دوسرے مقام پر اضعافا کثیرہ ہے یعنی بہت حصے بڑھا دیں گے، جس کی کوئی انتہا نہیں اور بعض روایتوں میں جو سات سو تک مضاعفت آئی ہے، اس سے مراد تحدید نہیں بلکہ تکثیر ہے، چنانچہ ایک دوسری حدیث اس پر صاف دال ہے وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ایک چھوارہ راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس قدر بڑھاتے ہیں کہ وہ احد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے اب احد پہاڑ سے چھوارہ کے حجم کے برابر ٹکڑے کرو، دیکھو کس قدر ہوتے ہیں سنکھ دھا سنکھوں تک نوبت پہنچی اور اگر ذرات میں چھوارہ کے برابر ٹکڑے کرو، تو اور بھی زیادہ ہوں گے۔ اب یہاں خیال ہوتا ہے کہ ہاں دیں گے تو سہی لیکن ہمارے جرائم اس قدر ہیں کہ یہ سب ثواب اس میں کہیں وضع ہو جائیں، جیسے ملازم کی تنخواہ جرم کے سبب ضبط ہو جاتی ہے؛ اس کے لئے آگے ارشاد ہے: ویغفر لکم یعنی گناہوں سے اندیشہ نہ کرو سب بخش دیں گے اور چونکہ انسان بہت کم حوصلہ ہے اس لئے اس مضمون کو سن کر

خیال اور تعجب ہو سکتا ہے کہ اس قدر عطا اور پھر اس کے ساتھ مغفرت کیسے ہو گی؛ تو اس لئے ارشاد فرماتے ہیں واللہ شکور حلیم یعنی اس عطا اور مغفرت سے تعجب نہ کرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ شکور یعنی بہت قدر دان اور بہت حلم والے ہیں تمہاری طرح ذراسی بات پر ان کو غصہ نہیں آتا، بلکہ سب معاف فرما دیتے ہیں؛ باقی یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ مغفرت بلاتبعہ بدرجۂ وعدہ ان کے ہی واسطے ہے؛ جو پہلے گناہوں سے صدق دل سے توبہ کر لیں اور آئندہ کو اصلاح کا قصد کریں؛ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے ثم ان ربك للذين عملوا السوء بجهالة ثم تابوا من بعد ذلك واصلحوا ان ربك من بعدها لغفور رحيم اور چونکہ پہلے قرض کو حسن کے ساتھ موصوف کر کے یہ بتلایا ہے کہ حاصل عمل ہو؛ ریا اس میں نہ ہو تو ممکن ہے کہ بعضوں کا خیال ہو جائے اور اس پر ناز ہو جائے کہ ہمارے اعمال خالص ہیں اس لئے آگے ارشاد ہے عالم الغيب والشهادة یعنی غیب اور شہادت کے ہم عالم ہیں اور اسی میں خلوص اور ریا بھی داخل ہے پس کوئی شخص اپنے اوپر ناز نہ کرے اور نہ دوسرے کو مرائی نہ سمجھے اس لئے کہ وہ عزیز زبردست بھی ہیں کہ ناز کرنے والا کا ناز توڑ دیتے ہیں اور بعض مرتبہ مرائی اور معجب کی سزا ہیں جو التوا رہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حکیم ہیں سب کام حکمت سے کرتے ہیں اور اس التوا میں بھی حکمت ہے؛ خلاصہ یہ کہ ان آیات میں حق تعالیٰ نے موانع طریق کی تفصیل اور ساتھ ساتھ ان کے رفع کی تدبیریں ارشاد فرمائی ہیں؛ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق عطا فرمائیں؛ آمین

سیرت الصوفی

زندگی کے دستور العمل کے متعلق یہ وعظ ۲۳ صفر ۱۳۲۹ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر بیان فرمایا؛ جسے مولوی نور حسین پنجابی نے قلم بند کیا

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ
و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ
فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ
وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہ
و رسولہ ط

آیت :- یٰٓایھا المزمل ۝ قم الیل الا قلیلا ۝ نصفہ او انقص منہ قلیلا ۝
او زد علیہ و رتل القراٰن ترتیلا ۝ط انا سنلقی علیک قولا ثقیلا ۝ ان
ناشئۃ الیل ھی اشد وطا و اقوم قیلا ۝ ان لک فی النھار سبحا طویلا ۝
و اذکر اسم ربک و تبتل الیہ تبتیلا ۝ط رب المشرق و المغرب لا الٰہ
الا ھو فاتخذہ وکیلا ۝ و اصبر علیٰ ما یقولون و اھجرھم ھجرا جمیلا ۝ و
ذرنی و المکذبین اولی النعمۃ و مھلھم قلیلا ۝

تمہید

بعض احباب ارباب سلوک نے مجھ سے استدعا کی کہ اگر ہمارے لئے کچھ دستور العمل کے طور پر بیان ہو جائے تو بہتر ہے اس وقت بوجہ کسی مضمون کے حاضر ہونے کے اور نیز ایسے مضامین کے لئے خلوت مناسب ہونے کے میں نے حتمی وعدہ نہیں کیا، مگر آج صبح کو سورۂ مزمل کی یہ ابتدائی آیات قلب میں وارد ہوئیں معلوم ہوا کہ ان میں تمام تر طریق سلوک ہی مذکور ہے اس لئے آج انہیں آیات کے متعلق کچھ بیان کیا جاتا ہے، اور بیان سے پہلے یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ عوام یہ نہ سمجھیں کہ اس میں ہمارا نفع کیا ہو گا؛ یہ طریقہ تو خواص کے لئے ہے۔ یعنی یہ کہ طریقہ جو بیان ہو گا، تارکان دنیا کے لئے ہے ہم دنیا داروں کے لئے نہیں؛ سو بات یہ ہے کہ سرے سے یہ تقسیم ہی صحیح نہیں کہ دنیاداروں کیلئے اور احکام اور دینداروں کے لئے اور احکام؛ کیوں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں اور احکام شرعی سب کے ساتھ یکساں متعلق ہیں، بلکہ حقیقت میں مسلمان دنیادار ہوتا ہی نہیں کیوں کہ دنیاداری حقیقت میں یہ ہے کہ حرام و حلال میں کچھ امتیاز نہ رہے جس طرح

سے بجنے مال حاصل کرنے کو مقصود سمجھے اگر کہیں دونوں غرضیں دین و دنیا کی جمع ہو جائیں تو دنیوی غرض کو مقدم رکھا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ دین سے ہم کو کوئی غرض نہیں، کیوں کہ شریعت کے احکام اس قدر دشوار ہیں کہ اگر ہم ان پر عمل کریں تو دنیا کی زندگی مشکل ہے سو ظاہر ہے کہ اسلام کے ساتھ ان خیالات کی گنجائش کہاں ہے کیوں کہ اس سے تو باری تعالیٰ کی تکذیب کی نوبت پہنچتی ہے یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر و لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا؛ اور اگر یہ عذر کیا جائے کہ ہم تکذیب نہیں کرتے، مگر جب واقعات ہی روزمرہ اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ احکام شرعیہ پر چلنا بہت مشکل ہے تو ہمارا کیا قصور ہے؛

احکام شرعیہ کی اہمیت

اس اشتباہ کا جواب یہ ہے کہ ایک مشقت تو ہوتی ہے ذات حکم میں مثلاً وہ حکم فی حد ذاتہ سخت اور دشوار ہے یہ امر اور اغلال کہلاتے ہیں امم سابقہ میں بعضے ایسے احکام تھے مگر اس امت میں اس قسم کے احکام نہیں رکھے گئے اور ایک مشقت یہ ہے کہ در اصل ذات حکم میں تو کوئی دشواری نہیں مگر ہم نے اپنے اغراض فاسدہ کی وجہ سے خود اپنی حالت ایسی بگاڑ لی اور قوم نے متفق ہو کر شریعت کے خلاف عادتیں اختیار کر لیں کہ وہ رسم عام ہو گئی اور ظاہر ہے کہ جب اس رسم عام کے خلاف کوئی حکم شرعی پر چلنا چاہے گا؛ تو ضرور اس کو اس آسان اور بے ضرر حکم میں دشواری پیدا ہو گی؛ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی طبیب کسی مریض کو ودیبیہ کا نسخہ لکھ دے مگر مریض چونکہ ایسے گاؤں میں رہتا ہے جہاں کے لوگوں کی نادانی کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ وہ لوگ اس قسم کی ضروری اور مفید چیزوں کی رغبت نہیں رکھتے وہ چیزیں وہاں نہیں آتیں اور نہیں مل سکتیں؛ اس ودیبیہ کے نسخہ کو

وہاں نہیں پی سکتا، اب فی نفسہ نسخہ گراں نہیں کمیاب نہیں، مگر اس گاؤں والوں نے خود اپنا دستور بگاڑ رکھا ہے، اس واسطے وہاں نہیں مل سکتا، اس صورت میں ہر عاقل کہے گا، کہ علاج بالکل آسان ہے مگر یہ قصور اس جگہ کے رہنے والوں کا ہے، کہ ایسی معمولی چیزیں بھی نہیں مل سکتیں، ایسا ہی ہمارا حال ہے کہ مجموعۂ قوم نے مل کر ایسی حالت بگاڑ دی ہے کہ اب احکام شرعیہ کے بجالانے میں دشواری پیدا ہوگئی ہے، مثلاً بہانہ کیا جاتا ہے کہ تنخواہ کم ہے، بھلا اگر رشوت نہ لیں تو کام کیسے چلے، اگر اپنے اخراجات اندازہ سے رکھے جائیں تو تنخواہ کیوں نہ کفالت کرے، یا مثلاً عام طور پر بڑے آم کی بیع پھل آنے سے پہلے کی جاتی ہے اور اگر ایک بچنا چاہے تو ضرور کسی قدر دقت پیش نہیں آتی ہے لیکن اگر سب اتفاق کرلیں کہ اس طرح سے کوئی خرید و فروخت نہ کرے تو دیکھیں پھر کیا دشواری پیش آتی ہے دشواری حقیقی تو وہ ہے کہ اگر سب مل کر بھی اس کو دور کرنا چاہیں جب بھی دور نہ ہوں اور سب مل کر اس مذموم رسم اور طریق کو چھوڑنا چاہیں اور چھٹ جائے تو یہ دشوار نہیں آسان ہے یہ عارضی دشواری تو صرف اپنا طرز معاشرت بگاڑ دینے اور طریق تعامل کو خراب کردینے سے پیدا ہوگئی ہے، سو یہ تنگی خود اپنے اوپر تنگی ڈال لینے سے ہوئی تعجب ہے کہ خود اپنی تنگی کو نہ دیکھیں شریعت پر تنگی کا الزام دیں، جیساکہ اس شیر نے جس کا قصہ مثنوی میں ہے، خرگوش کے بہانے سے اپنا عکس دکھایا اور اس کو دوسرا شیر سمجھ کر اس پر حملہ کرنے کو کوئیں میں کود پڑا در اصل وہ خود اپنے اوپر حملہ کرنا چاہتا تھا، ایسے ہی ہم اپنے عیب کو آئینہ شریعت میں دیکھ رہے ہیں اور ناسمجھی سے اس کو شریعت کی تنگی بتلاتے ہیں سو یہ در حقیقت شریعت پر حملہ نہ ہوا بلکہ خود اپنی ذات پر حملہ کر رہے ہیں ؎

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد
ہمچوں آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

تنگی کے اسباب

ہماری تنگی کا قصہ یہی ہے کہ بعض لوگ عذر کرتے ہیں کہ ہم ناجائز معاملات رشوت ستانی وغیرہ ضرورت کی وجہ سے کرتے ہیں ؛ مگر حقیقت میں وہ لوگ جس کو ضرورت کہتے ہیں ، وہ ضرورت ہی نہیں بلکہ محض حظوظ نفسانیہ ہیں ، جن کا نام ضرورت رکھ دیا ہے مثلاً کسی کی نوکری کے پیسے میں اتنی گنجائش ہے کہ معمولی درمیانی قیمت کے کپڑے پہن سکتا ہے مگر بیش قیمت زرق برق کپڑے پہننے کی گنجائش نہیں ، اس صورت میں عقلمند آدمی کبھی بھی ایسے گراں قدر کپڑوں کی ضرورت تسلیم نہیں کر سکتا ، کہ جس ضرورت کے واسطے رشوت وغیرہ لینا پڑے اور اگر اس پر بھی کچھ تنگی ہو تو آخر صبر کی تعلیم اسی حالت کے لئے ہے اور جو مرتبہ صبر سے گذر جائے ، تو ایسے لوگوں کی امداد کے واسطے شریعت نے خاص قواعد مقرر کئے ہیں ان سے منتفع ہونا چاہیئے ، غرض مسلمان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے کسی حالت میں بھی دنیا کو دین پر ترجیح دینا جائز نہیں ، پس اس اعتبار سے مسلمان دنیا دار ہو ہی نہیں سکتا صرف کفار ہی اہل دنیا ہے جو دین کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دیتے ہیں اور اس شعر کا مطلب اس تقریر پر بالکل صادق ہو گیا ؛ ؎

اہل دنیا کافران مطلق اند ۔۔۔ روز و شب در زق زق و در بق بق اند

یعنی پہلے مصرع میں مبتدا موخر اور خبر مقدم ہے ، یعنی جو محض کافران مطلق ہے صرف وہی اہل دنیا باقی مسلمان کی شان ہی اور ہے اللہ ولی الذین آمنوا اس میں عام مومنین کے لئے درجہ ولایت کا ثابت کیا گیا ہے گو وہ ولایت عامہ ہی ہو کیوں کہ خاصہ میں اتنا اور زیادہ ہے الذین امنوا کانوا یتقون اور اگر دنیا داری کے معنی عام لئے جائیں کہ طلب المال ولو علی وجہ الحلال تو یہ منافی دین کی نہیں ، تاکہ ایسا شخص مخاطب

احکام دینیہ کا نہ ہو؛ کیوں کہ خود حضرات انبیاء علیہ السلام سے کاروبار دنیوی اکل و شرب
نکاح وصنعت وغیرہ سبھی کچھ ثابت ہے غرض دنیوی کاروبار دین کے منافی نہیں بشرطیکہ
وہ شریعت کے دائرے میں ہوں اللہ جل جلالہ کی رحمت تو یہاں تک وسیع ہے کہ باوجود
ظلم وگناہ کی بھی ولائت عامہ اور اصطفائے عام سے مومنین کو محروم نہیں کیا؛

نفس کی اہمیت

فرماتے ہیں کہ ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا
منہم ظالم لنفسہ و منہم مقتصد ومنہم سابق بالخیرات
باذن اللہ ظاہر ہے کہ منہم ظالم لنفسہ و مقتصد و منہم سابق بالخیرات الذین
اصطفینا کی ہیں اور مقسم کا صدق ہر قسم پر واجب ہے؛ پس اصطفا ظالم لنفسہ
کو بھی شامل ہوا؛ بھلا جب گناہ کے ساتھ بھی ولایت عامہ اور اصطفا باقی رہتا ہے
تو ضروری اشتغال دنیا کیسے منافع دین ہو سکتا ہے؛ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں: کہ صاحب
ہم تو دنیا کے کتے ہیں ہم سے دین کا کام کیا ہو سکتا ہے تعجب ہے کہ اپنے منہ سے اس
ذلت و بے حمیتی کا اقرار کیا جاتا ہے گویا خدا تعالیٰ نے ان کو دین کے واسطے پیدا ہی
نہیں کیا؛ اور غضب تو یہ ہے کہ ان بھلے مانسوں نے اپنے لئے تو ایسے ناجائز لقب تراشے
ہیں اہل دین کے لئے بھی ایسے القاب نازیبا کا بے محابا استعمال کرتے ہیں؛ جیسے مسجد کے
مینڈھے؛ اس پر بطور جملہ معترضہ کے ہنسی کی حکایت یاد آگئی؛ ایک طالب علم کو کسی
متکبر نے کہہ دیا مسجد کا مینڈھا اس نے کہا بلا سے پھر بھی دنیا کے کتوں سے تو اچھے ہی ہیں
اور اس کے جواب میں لطیفہ یہ ہے کہ اہل دین کے لئے جو وہ لقب تجویز کرتے ہیں وہ
تو ایک دعویٰ ہے جو دلیل کا محتاج ہے؛ مگر دنیا کا یہ کتا اقراری لقب ہے اور المرء
یوخذ باقرارہ بالجملہ ایسے القاب اپنے لئے یا غیر کے لئے تراشنا ممنوع ہے حال

اللہ تعالیٰ لا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان حدیث شریف میں آیا ہے لیس لنا مثل السوء عجیب ہے کہ بعض لوگ ایسے واہیات القاب کو انکسار اور تواضع سمجھتے ہیں اس کی مثال میں ایک قصہ یاد آگیا کہ میرے سامنے ریل میں ایک دولت مند مسخرے اپنے کھانے کو گوہ موت کہہ کر ایک شخص کو مدعو کیا تھا اور ان ہی کے ایک جلیس نے ان کو کہا کہ ہاں کھانے کی ایسی بے ادبی تو انہوں نے تواضع کی توجیہ کی تھی سو ایسی تواضع حماقت ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ کوئی چیز حتیٰ کہ اپنا نفس بھی ہمارے ملک حقیقتی نہیں کہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں بلکہ یہ ہم سب سرکاری چیز ایسی ہیں سرکاری مد سے زیادہ اس سے کام لینا یا سرکاری اصول کیخلاف اس کی بے قدری کرنا جائز نہیں۔ اہل اللہ اسی بنا پر کبھی اپنے نفس کی بھی قدر کرنے لگتے ہیں اور عام لوگ کچھ اور سمجھ جاتے ہیں۔ سچ کہا ہے۔ سہ

درنیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

سو وہ حضرات اس حیثیت سے اپنے نفس کی قدر کرتے ہیں کہ وہ اس نفس کو سرکاری چیز سمجھتے ہیں اور اسی طرح ہاتھ پاؤں اور دماغ یہ سب سرکاری مشینیں ہیں جن کو ہمارے سپرد کیا گیا ہے اگر ہم اپنی بے اعتدالی سے ان کو بگاڑیں گے تو خود مورد عتاب مستوجب عذاب بنیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف ارشاد ہے۔ ان لنفسک علیک حقا۔ وان لزوجک علیک حقا ان لعینک علیک حقا اگر اپنے دل ودماغ آنکھ کی حفاظت اور خدمت اس نیت سے کریں گے کہ یہ ہمارے مولیٰ کے سپرد کی ہوئی چیزیں ہیں۔ ان کی عزت وحرمت خدمت وحفاظت ہم پر بوجہ عبد وخادم ہونے کے ضروری ہے تو اس میں بھی ثواب ملے گا۔ یہی معنی ہیں انما الاعمال بالنیات

کے اور اس مرتبہ میں کہ ان اعضاء کو محبوب سے تعلق ہے! کسی نے کہا ہے : ے

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است | افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را | کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اور بعض کے کلام سے جو ان اشیاء کا اپنی طرف منسوب ہونا اور اس نسبت کے درجے میں ایسے اقوال صادر ہونا معلوم ہوتا ہے! جیسے کہا گیا ہے : ے

بغدار تنکم آید ز دو چشم روشن خود | کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

تو یہ ہے غلبہ حال کا ورنہ اہل مقام کی تحقیق وہی ہے!

درود شریف کی فضیلت

حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے کہا کہ جب آپ کو دولت وصول میسر ہو چکی ہے تو اب کیوں تسبیح رکھتے ہیں! آپ نے کیا لطیف جواب دیا کہ میاں جس کی بدولت ہم کو یہ دولت ملی کیا اب اس رفیق کو چھوڑ دیں ہرگز نہیں! حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے گھوڑا پالا ہے اس گھوڑے کا بول و براز بھی ضائع نہیں جاتا! بلکہ میزان اعمال میں اس کے اندازے کے موافق اعمال رکھے جائیں گے اور ان پر ثواب ملے گا! یہ سب برکت نسبت الی اللہ کی ہے اور ایسی خسیس اشیاء کے حسنات میں شمار ہونے کی ایسی مثال ہے! جیسے کوئی شخص مصری خریدے تو جو تنکا مصری میں ہو گا وہ بھی مصری کے بھاؤ ملے گا اور دعا کے اول اور آخر درود شریف پڑھنے کی یہی حکمت ہے کہ درود شریف کو تو بہر حال اللہ تعالیٰ ضرور ہی قبول کریں گے! اور یہ ان کے کرم سے بعید ہے کہ اول اور آخر تو قبول کرلیں اور بیچ والی لپٹی ہوئی چیز کو رد کر دیں اور درود شریف ضرور قبول ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے خاص

مقبول و محبوب ہیں آپ پر بے کسی کی درخواست کے بھی رحمت فرماتے ہیں، سو جب کسی نے آپ پر رحمت کرنے کی درخواست کی تو یہ گویا اس شخص کی خیر خواہی ظاہر ہوئی، جس سے یہ بھی مقبول ہو گیا، اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص ہر عید پر اپنے لڑکے کو کچھ انعام دیا کرتا ہے تو وہ تو دے ہی گا اگر کسی شخص نے اس کو انعام دینے کی نسبت کہہ بھی دیا۔ تو وہ شخص اس کہنے کی وجہ سے اس کہنے والے پر بھی مہربان ہو جائے گا اور یہ سمجھے گا کہ اس کو ہمارے لڑکے سے محبت ہے اس لئے درود شریف ضرور قبول ہوتا ہے اور طفیل میں یہ شخص بھی، جب درود شریف قبول ہو گا تو دعا اس کے ساتھ وہ بھی ضرور قبول ہو گی اس کی ایسی ہی مثال ہے، جیسے کھانڈ کے چنے۔ کہ اندر چنا ہوتا ہے اوپر کھانڈ لپٹی ہوئی ہوتی ہے اس مٹھائی کے سبب وہ چنے بھی مٹھائی کے حساب میں بکتے ہیں کیوں کہ اس پر کھانڈ لپٹی ہوئی ہے، اس واسطے وہ اسی کے حکم میں ہو گئے، اسی طرح وہ بھی گویا درود شریف کے حکم میں ہو گئی یا جیسے چنے مٹھائی کے ساتھ جاتے ہیں اور پھر ان کو کوئی واپس نہیں کرتا اور یہی راز اور حکمت ہے، نماز میں جماعت کی، کیوں کہ۔ ع بد از ابہ نیکاں بہ بخشد کریم

جماعت کی فضیلت

جماعت میں نیک بھی ہوتے ہیں ان کی نماز غالباً قبول ہو گی اور بروں کی نماز بھی چونکہ نیکوں کے ساتھ ہے اس واسطے وہ بھی قبول ہو جائے گی اس کی ایک فقہی نظیر ہے، وہ یہ کہ اگر متعدد اشیاء ایک سودے سے خریدی جائیں تو یا سب واپس کی جاتی ہیں یا سب رکھی جاتی ہیں اور جو ہر ایک کا الگ الگ سودا ہوتا ہے تو معیب کو واپس کر سکتے ہیں، پس اللہ تعالیٰ بھی بندوں سے یہی معاملہ کرتا ہے اسی لئے جماعت مشروع فرمائی، کیوں کہ یہ تو مستبعد ہے کہ سب کی نمازیں واپس فرمائیں، تو سب ہی قبول فرمالیں گے البتہ اس میں ایک یہ

شبہ رہ گیا کہ جماعت تو صرف فرضوں کے ساتھ مخصوص ہے وہ تو اس جماعت کے ذریعے سے قبول ہوگئی! مگر سنت باقی رہ گئیں؛ اس کا جواب یہ ہے کہ تابع ہمیشہ اپنے متبوع کے حکم میں ہوا کرتا ہے سنتیں تابع ہیں فرضوں کی وہ بھی فرضوں کے ساتھ قبول ہوجائے گی؛ جیسے کوئی شخص گائے بھینس خریدے تو اس کے رسے وغیرہ بھی گو وہ کیسے ہی بوسیدہ ہوں لے لیتا ہے؛ غرض انضمام و اقتران کے یہ فوائد ہیں اسی طرح اگر کوئی شخص اعمالِ دنیویہ میں بھی نیت خیر رکھے گا تو اس کو ضرور ثواب ملے گا؛

نیت کی اہمیت

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ کسی اپنے مرید کے گھر گئے؛ وہاں ان کے گھر روشن دان دیکھا؛ پوچھا یہ کیوں رکھا ہے اس نے جواب دیا روشنی کے واسطے انھوں نے فرمایا کہ روشنی تو بدون نیت کے بھی آتی ہے اگر اس کے رکھنے میں یہ نیت کرلیتا کہ اس میں سے اذان کی آواز آیا کرے گی تو تجھے اس کا ثواب ملتا رہتا اور روشنی تو خود آہی جاتی! مطلب یہ کہ نیت صالحہ رکھنے سے سب اعمال دنیوی بھی قابلِ ثواب بن جاتے ہیں؛

پس ایسی دنیا منافی دین نہیں — بس ایسا دنیا دار بھی دیندار ہی ہے

اور پہلے معنی کر دنیا دار کوئی مسلمان نہیں تو سب مسلمان دیندار ہی ہوئے! اور دو قسمیں بن کر کوئی فرق نہیں ہوا یہ دیندار اور دنیادار کا فرق بوجہ جہل بالاحکام کے ہم نے تراش لیا ہے اور جب فرق نہ ہوا تو کیا وجہ ہے کہ دستور العمل الگ الگ رکھا جائے یہ بات جدا رہی کہ حالت عذر و ضرورت میں کسی کے لئے کچھ تخفیف کردی جائے! سو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دستور العمل ہر ایک کے واسطے الگ الگ تجویز کیا جائے؛ دستور العمل تو ایک ہی رہے گا! مواقع ضرورت اس سے مستثنیٰ سمجھے جائیں گے بس یہ تو

طے ہو چکا ہے کہ دستور العمل سب کا ایک ہے مگر عوام کا ایک شبہ اور وسوسہ اور رہ گیا کہ شاید اس دستور العمل کا نفع مشروط ہو فہم کے ساتھ اور وہ مخصوص ہے خواص کے ساتھ تو ہم کو اس پر چلنے سے کچھ نفع نہ ہوگا، سو یہ خیال اور عذر بھی درست نہیں کیوں کہ نفع ان اعمال کا علی حسب استعداد سب کو ہوتا ہے، جیسے متنجن کھانے سے اس شخص کو لذت ہوگی جو اس کی حقیقت اور اجزا سے واقف اور ماہر ہے ایسے ہی وہ شخص بھی متلذذ ہوگا جو متنجن کی حقیقت سے بالکل واقف نہ ہو اور اسی طرح اس کا نفع قوت وغیرہ بھی جس طرح اس پہلے شخص کو ہوا ہے اسی طرح اس کو بھی حاصل ہوگا ایسا ہی خیال کرنا چاہیئے کہ اعمال حسنہ کے نفس منافع اور برکات سب کے لئے عام ہیں ع ادیم زمیں سفرہ عام اوست، البتہ خواص کے لیئے بوجہ زیادہ فہم کے ایک خاص زائد لذت ہوگی اور آخرت میں بھی اس کا ثواب اصل عمل کے ثواب پر زائد ملے گا، مگر اصل مقصود میں عوام و خواص سب شریک ہیں:

مزمّل کی تفسیر

اب وہ دستور العمل بیان کیا جاتا ہے اتفاق سے وہ ضروری ہدایا جو اس مبحث کے مناسب ہیں ان آیات میں پورے طور پر جمع ہیں ارشاد ہوتا ہے: کہ یا ایھا المزمل قم الیل الا قلیلا نصفه او انقص منه قلیلا او زد علیه: الآیة. ہرچند کہ یہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر حکم اس کا امت کو بھی شامل ہیں اور مزمل کے معنیٰ ہیں چادر اوڑھنے والا۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی تکذیب سے بہت تکلیف ہوتی تھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو چاہتے تھے کہ یہ کمبخت ایمان لائیں تاکہ نار جہنم سے چھوٹ جائیں اور وہ لوگ ایمان تو کیا لاتے الٹی تکذیب پر کمر باندھ رکھی تھی اور آیات الٰہی سے تمسخر اور مقابلہ کیا کرتے اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

بوجہ شدتِ غم و رنج و حزن و ملال کی چادر اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے اس لئے خاص اس حالت کے اعتبار سے یا ایہا المزمل ندا و خطاب میں فرمایا گیا تاکہ آنحضرت کو ایک گونہ تسلی ہو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص ہجوم اعدا اور ان کے طعن و تشنیع سے پریشان ہو رہا ہو، اس وقت اس کا محبوب خاص اسی حالت کے عنوان سے اس کو پکارے جس کے ساتھ اس کا تلبس ہے دیکھئے اس شخص کو کتنی تسلی ہو گی اور اس لفظ کی لذت اس کو کتنی معلوم ہو گی؛ جس کی ایک وجہ یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ محبوب کو میرے حال پر نظر ہے ایسا ہی یہاں بھی یا ایہا المزمل کے عنوان سے جو کہ مناسب وقت سے ہے ندا دیکر آنحضرت کو تسکین دی گئی ہے اور بعد اس کے بعض اعمال کا حکم دیا جاتا ہے اور ان بعض عارضی احوال پر صبر کرنے کا ارشاد فرماتے ہیں چنانچہ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے فاصبر علی مایقولون و سبح بحمد ربک اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے اوپر؛ کہ مثال ہیں اس شخص کا محبوب اس کو یہ کہے کہ میاں تم ہم سے باتیں کرو؛ ہم کو دیکھو؛ دشمنوں کو بکنے دو جو بکتے ہیں؛ آؤ تم ہم سے باتیں کرو؛ وہ کام کرو؛ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ایسا تسلیہ بذریعہ وحی کے ہوا مگر امت میں اہل اللہ کو اس قسم کے خطابات وغیرہ بذریعہ الہام اور واردات کے ہوتے ہیں اور اس پر لفظ مزمل کی تفسیر سے ایک مسئلہ نکلتا ہے وہ یہ کہ سابقاً معلوم ہو چکا ہے! کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر اوڑھنے کی وجہ شدتِ ملال و حزن تھی اس سے ثابت ہوا کہ کامل باوجود کمال کے لوازم بشریت سے نہیں نکلتا؛ جیسا یہاں پر بوجہ تکذیب مخالفین کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مغموم ہونا معلوم ہوتا ہے یہاں اتنا فرق ہے کہ ہم لوگوں کا غم ایسے مواقع پر بوجہ تنگ دلی و ضعف تحمل کے ہوتا ہے اور رسول صلی علیہ وسلم کا غم بوجہ غایت شفقت اور رحم کے تھا؛ آپ اس پر مغموم تھے کہ اگر یہ لوگ ایمان پر نہ آئیں گے تو جہنم میں جائیں

گے اس وجہ سے ان پر رحم آتا تھا اور غم پیدا ہوتا تھا چنانچہ ارشاد ہے لعلک باخع نفسک

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

حقوق کی رعایت

مگر یہ بات ثابت ہے کہ کامل باوجود کمال عرفان کے لوازم طبعی سے نہیں نکلتا اور یہی ہونا بھی چاہیئے کیوں کہ اگر کسی کو اذیت و مصیبت میں تکلیف جو لازمۂ طبعی ہے محسوس نہ ہو تو صبر کیسے متحقق ہو گا کیوں کہ صبر تو نام ہے ناگوار چیز پر ضبط نفس کرنے کا اور جب کسی کو کوئی چیز ناگوار ہی معلوم نہ ہو تو ضبط کیا کرے گا البتہ غلبۂ حال میں محسوس نہ ہونا اور بات ہے لیکن غلبہ حال خود کوئی کمال کی چیز نہیں، ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ بیٹے کی مرنے کی خبر سنی تو قہقہہ لگا کر ہنسے اور آنحضرت کے اپنے بیٹے ابراہیم پر آنسو بہانا ثابت ہے اور یہ فرمانا کہ انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون اب اگر ظاہر میں کسی شخص کے سامنے یہ دونوں قصے بیان کر دیئے جائیں اور یہ نہ ظاہر کیا جائے کہ یہ قصہ کس کا ہے اور وہ کس کا تو ظاہر بات ہے کہ یہ شخص پہلے بزرگ کو جنہوں نے قہقہہ لگایا زیادہ باکمال سمجھے گا، حالانکہ یہ مسئلہ مسلم و بدیہی ہے کہ ولی کسی حال میں نبی سے نہیں بڑھ سکتا اور یہ بھی مسلم ہے کہ اولیاء کے کمالات انبیاء کے کمالات سے مستفاد ہیں سو در اصل ان دونوں قصوں کی حقیقت یہ ہے کہ اس ولی کی نظر میں صرف حقوق حق پر تھی، حقوق عباد و اولاد کی اہمیت اس کے قلب سے مستور تھی اس واسطے حقوق عباد کا اثر ظاہر نہیں ہوا جو ترحم کی وجہ سے غم پیدا ہوتا ہے اور آنحضرت کی نظر دونوں حقوق پر تھی، حقوق حق پر بھی اور حقوق عباد پر بھی، اللہ تعالیٰ کے حقوق کی رعایت سے تو صبر کیا اور جزع فزع نہیں کیا، اور حقوق عباد یعنی ترحم علی الاولاد کی وجہ سے آنسو جاری ہوئے سخت دلی نہیں کی انما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء۔ اس کی ایک مثال ہے، مثلاً:

آئینہ کے دیکھنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک تو وہ جو ضرورت سے خریداری وغیرہ کیلئے صرف آئینہ کو دیکھتے ہیں اس کی موٹائی چوڑائی شفافیت پر ان کی نظر ہوتی ہے یہ مثال ہے محجوبین غافلین اہلِ صورت کی، اور ایک وہ کہ صرف اس چیز کو دیکھتے ہیں جو کہ آئینہ میں منعکس ہوتی ہے اور آئینے کو نہیں دیکھتے یہ مثال ہے غیر کاملین مغلوب الحال لوگوں کی یہ غلبۂ حال سے مظہر کو نہیں دیکھتے صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں اور ایک وہ جو آئینہ اور صورت منعکسہ دونوں کو دیکھتے ہیں اور دونوں کی حقوق کی رعائت کرتے ہیں اس کو جمع الجمع کہتے ہیں یہ شان ہے انبیاء علیہم السلام اور عارفین کاملین کی کہ حقوقِ حق کی رعائت کے ساتھ حقوقِ عباد کی رعایت بھی اُن کا نصب العین رہتی ہے یہ لوگ جامع ہیں، ؎

بر کفے جام شریعت در کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام سندان باختن

ایسی باریکیوں کو سمجھنے کے واسطے بڑی فہم کی ضرورت ہے ورنہ ظاہر میں تو ناگوار نہ گذرنا زیادہ کمال معلوم ہوتا ہے، بہ نسبت ناگوار گذرنے کے،

نفس کی حیلہ سازی اسی طرح دوسری کیفیات وجدانیہ کے تفاضل میں اس قسم کی غلطی واقع ہوتی ہے کہ بعض باتیں کمال سمجھی جاتی ہیں، حالانکہ اس میں کوئی نقص خفی ہوتا ہے، جیسے مبالغہ فی التواضع کو بعض دفعہ مقتضی ہو جاتا ہے ناشکری کی طرف کیوں کہ اس میں ایہام ہوتا ہے انکار نعمت کا ایسا ہی بعض آدمی کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے ذکر شغل کیا، مگر کچھ نہیں ہوا، اور سمجھتے ہیں کہ یہ کہنا انکساری ہے حالانکہ علاوہ ناشکری نعمت ذکر کے اس میں ایک نقصان بھی ہے، کہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذکر و شغل کو اس قابل سمجھا کہ اس کو قبول کیا جائے اور اس کے صلہ میں ان کو بڑا رتبہ دیا جائے اور یہ کبر ہے یہ نفس کے بڑے بڑے مکر ہیں ان لوگوں کو یہ خبر نہیں، کہ ذکر خود

ایک مستقل نعمت ہے، ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ سے اگر کوئی خادم اس قسم کی شکایت کرتا تو آپ فرماتے خود ذکر کی توفیق ہونا کیا تھوڑی نعمت ہے جو دوسرے ثمرات کی تمنا کرتے ہو، اور اکثر ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے :

یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

ع بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے، الخ، کسی خادم نے حضرت سے بیان کیا تھا، کہ میں نے اب کے چلہ کھینچا اور روزانہ سوالاکھ اسم ذات پڑھا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، شاید حضرت مجھ سے ناراض ہیں کہ ثمرہ نہیں ملا، فرمایا اگر میں ناراض ہوتا تو تمہیں سوالاکھ پڑھنے کی توفیق ہی کہاں ہوتی اور یہ ثمرات کے طالب ایک اور بہت بڑی غلطی میں ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ ثمرات اصل مقصود ہیں اور اعمال مقصود بالغرض اور یہ سخت غلطی ہے بلکہ اعمال خود مقصود بالذات ہیں اور اصل ثمرہ ان کا حصول رضا دخول جنت دیدار خداوندی ہے افسوس ہے کہ طالب ثمرات عشق میں مجنوں سے بھی کم ہیں وہ تو لیلیٰ کے نام کی مشق کو بڑا مقصود سمجھ رہا ہے، مگر یہ لوگ دوسری چیزوں کی تلاش میں ہیں کیا مولیٰ کا عشق لیلے کے عشق سے بھی کم ہے، ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد در بیابانِ غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود، انگشتان قلم مے نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلے میکنم خاطر خود را تسلی مے دہم
ہمیں بس کہ داند ماہ رویم کہ من نیز از خریداران اویم

کبھی ثمرات کا قصد مت کرو، یہ تو ایک قسم کی مزدوری ہوئی جو کہ عشق محبت کے

سراسر خلاف ہے: ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرطِ مزد مکن کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

رضا اور ثمرات

ایک عارف کو غیب سے آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول نہیں ہوتی انہوں نے اس پر بھی عبادت کو نہ چھوڑا! بلکہ بدستور اسی طور پر پھر بھی عبادت کرتے رہے کسی نے ان سے کہا کہ جب تمہاری عبادت قبول نہیں ہوتی تو پھر اس کے کرنے کی کیا ضرورت ہے انہوں نے کیا اچھا جواب دیا بھائی کہ اگر اور کوئی دروازہ ہوتا تو اس کو چھوڑ کر اس طرف چلے جاتے! جب دوسرا دروازہ ہی نہیں پھر اور کہاں جائیں! اور کیا چارہ کریں! ؎

توانی ازاں دل بپرداختن کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

بس معاً غیب سے آواز آئی کہ جب ہمارے سوا اور کوئی نہیں تو خیر جیسی کچھ ہے وہی قبول ہے: ؎

قبول است گرچہ ہنر نیست کہ جز ما پناہے دگر نیست

عبادت میں تو بجز رضائے خدا کے اور ثمرات کا طلب کرنا ہی اخلاص کے بالکل خلاف ہے وما امروا الا لیعبدوا للہ مخلصین لہ الدین ؎

از خدا غیر خدا را خواستن ظن افزونیست کلی کاستن۔
بدو دوصفا ترا حکم نیست دم درکش کہ انچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

میلانِ معصیت

اوپر جو بیان ہوا ہے کہ کامل لوازم بشریہ سے نہیں نکلتا اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوئی ہے کہ طبیعت کا میلان انسانی خواہشوں کی طرف یہ ایک امر طبعی ہے! سو طبیعت کا میلان اگر کسی معصیت کی طرف ہو یہ منافی

کمال نہیں، بعض لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ میلان کو بھی مقبولیت و تقویٰ کے خلاف سمجھتے ہیں اور پھر حیرت میں گر پڑتے ہیں اور قلب کی ساری توجہ اسی فکر و غم میں مصروف کردیتے ہیں مثلاً پہلے کسی کے ساتھ تعشق تھا، پھر اللہ نے توفیق توبہ کی عطا فرمائی اور وہ تعلق نہ رہا اب اگر حصول کمال کے بعد کبھی طبیعت کی رغبت اس طرف معلوم ہونے لگے تو پریشان ہوتے اور خیال کرتے ہیں کہ میلان بھی تقوے کے خلاف ہے، خوب سمجھ لینا چاہیئے، کہ خود معصیت تو خلاف تقویٰ ہے، میلان معصیت اس کے خلاف نہیں، میلان معصیت بعض اوقات بعد کمال کے بھی زائل نہیں ہوتا اس کے زوال کی فکر فضول ہے ہاں البتہ کاملین اور دوسرے میں یہ فرق ہے کہ کاملین کا میلان غیر ثابت اور مغلوب ہوتا ہے تھوڑے سے تذکر سے زائل ہوجاتا ہے جناب باری ارشاد فرماتے ہیں اذا مسھم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ھم مبصرون اور اس سے پہلے واما ینزغنك من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ اور متوسطین اہل سلوک کا میلان ذرا شدید ہوتا ہے دل کو بہت تنگی پیش آتی ہے اور مجاہدہ سے مغلوب ہوتا ہے اور محجوبین کا میلان ادھر غالب ہوجاتا ہے اور حقیقت میں اگر میلان نہ رہے تو معاصی سے بچنا کوئی کمال ہی نہیں اور میلان میں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے!

مجاہدہ اور ترقی اور مجاہدہ سے ترقی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ملائکہ کو ان مدارج میں ترقی نہیں ہے، کیوں کہ ان میں مجاہدہ متصور نہیں اور بشر میں مجاہدہ بوجہ میلان اور رغبت معاصی کے متصور ہے اس لئے ان کے مدارج میں سبیل لاتقف عند حد ترقی ہوتی رہتی ہے، حکیم ترمذی ایک بزرگ گذرے ہیں جوانی میں ان پر ایک عورت عاشق ہوگئی تھی اور ہر وقت ان کی تلاش اور جستجو میں رہتی، آخر کار ایک

ن موقع پر ایک باغ میں ان کو دیکھا اور وہ باغ چاروں طرف سے چاردیواری کی وجہ سے
بند تھا، وہاں پہنچ کر ان سے اپنے مطلب کی درخواست کی، یہ گھبرائے اور گناہ سے بچنے
ی غرض سے بھاگ کر دیوار سے کود پڑے، اس قصہ کے بعد ایک روز بڑھاپے کے زمانے
یں وسوسے کے طور پر یہ خیال آیا کہ اگر میں اس عورت کی دل شکنی نہ کرتا اور اس کا مطلب
پورا کر دیتا، اور پیچھے توبہ کر لیتا، تو یہ گناہ بھی معاف ہو جاتا، اور اس کی دل شکنی بھی نہ ہوتی

قرب عہد نبوت

اس وسوسہ کا آنا تھا کہ بہت پریشان ہوئے اور روئے، سے

بر دل سالک ہزاران غم بود　　گر خلالے از بہارش کم شود

اور اس پر قلق ہوا کہ جوانی میں تو میں اس گناہ اور کوشش سے بچ رہا اور آج بڑھاپے
یں یہ حال ہے اور یہ سمجھے کہ جو کچھ میں نے اعمال اشغال کیئے ہیں، وہ سب غارت اور
کارت گئے اس پر حکیم موصوف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، کہ
رماتے ہیں کہ اے حکیم کیوں غم کرتے ہو، تمہارا درجہ وہی ہے، اور جو کچھ تم نے کیا وہ ضائع
یں ہوا اور اس وسوسہ کی یہ وجہ تھی کہ یہ زمانہ وسوسے کا میرے زمانہ سے دور ہو گیا تھا۔
ر اس گناہ سے بچنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ زمانہ میرے زمانے سے قریب تھا اور قرب عہد نبوی
یں برکت ہے ایک بزرگ اسی وجہ سے باسی روٹی کو پسند فرمایا کرتے تھے کہ یہ رسول
للہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قریب ہے اور تازی میں کسی قدر بعد آگیا ہے سبحان اللہ
جب قرب عہد نبوت میں یہ برکت ہے تو ارشادات نبوت پر عمل کرنے میں کیسی برکت ہو
گی، ایک مولوی صاحب طبیب بھی تھے، مجھ سے اپنا قصہ بیان فرماتے تھے کہ میں بیمار ہوا
بخار تھا، ہر چند علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، آخر کار میں نے ایک حدیث کے مطابق
جس میں بخار کا علاج غسل سے آیا، نہر میں غسل کیا، ان کا بیان ہے کہ اس کے بعد مجھے

اور بیماریاں تو ہوئیں مگر بخار کبھی نہیں ہوا۔ ہر چند کہ بعض شراح اس علاج غسل کو غیر مادی بخار کے ساتھ مخصوص فرماتے ہیں مگر اہل عقیدت کے لئے سب اقسام کو عام ہے علاوہ ازیں یہ مسئلہ طبیہ ہے کہ دوا معین ہے فاعل نہیں، سو اہل عقیدت کی طبیعت میں اس عمل سے قوت ہوگی، اور وہ اپنی قوت سے فعل کرے گی، حکیم ترمذی کے اس قصہ سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ باوجود میلان کے ان کو میلان معصیت کا ہوا، اور انکے کمال کی تصدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رویائے صادقہ میں فرمائی اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ جو شیوخ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز تبلا دیجئے کہ کبھی ہم میں برے کام کی رغبت ہی پیدا نہ ہو، یہ بالکل غلطی ہے اور منشاء اس کا ناواقفی ہے

لوازم بشریہ

انسان جب تک زندہ ہے لوازم بشریہ سے چھوٹ نہیں سکتا، کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ وسوسہ اور خیال آہی جاتا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کسی عورت کے دیکھنے وغیرہ سے اس کی طرف میلان یا وسوسہ معلوم ہو تو اپنے گھر میں بیوی سے رفع حاجت کرے کیوں کہ ان الذین معہا مثل الذی معہا اس علاج سے وہ طبیعت کا میلان دور ہو جائے گا، اطباء نے بھی تعشق کا علاج زوج لکھا ہے اگر خاص معشوقہ سے ہو تو بہت ہی بہتر ہے ورنہ غیر جگہ سے نکاح کرنے سے دوسرے تعشق میں کمی آجاتی ہے، باقی تھوڑا بہت میلان تو تمام عمر رہتا ہے اگر اس کے مقتضی پر عمل نہ ہو تو اس کی فکر نہ کرنا چاہیئے، کیوں کہ اس کی طرف توجہ کرنے سے اور اس فکر میں پڑنے سے وہ اور بڑھے گا، اور تنگی پیش آئے گی اور سالک اس جھگڑے میں پھنس کر مطالعۂ محبوب سے غافل ہو جائیگا اور انسان صرف مطالعۂ محبوب ہی کے لئے پیدا ہوا ہے اس کو دوسری جانب اتنی توجہ ہی نہ کرنا چاہیئے، اگر ان باتوں کی طرف طبیعت کو

نہ لگایا جائے گا، یہ آپ سے آپ دور ہو جائے گی؛ بالخصوص وسوسہ کا علاج تو یہی ہے کہ اس کی طرف خیال نہ کرے اور اپنی توجہ ذکر کی طرف رکھے اس سے وہ وسوسہ خود بخود جاتا رہتا ہے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ وسوسہ کا آنا کوئی نقصان کی بات نہیں ہے اس کی وجہ سے جو تنگی پیدا ہوتی ہے، وہ موجب تصفیۂ قلب ہو جاتی ہے اور اس کے دور کرنے میں جو مجاہدہ ہوتا ہے، اس سے رفع درجات ہوتا ہے اور جو بیان کیا گیا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے اوپر بدگمانی کرے اور ان باتوں کی طرف زیادہ التفات نہ کرے؛ اور زیادہ موشگافی اور باریک بینی سے کہ بد کر بد عیوب کو نہ دیکھے؛ یہ خواص اہل طریق کے واسطے ہے کیوں کہ وہ اس طرف لگ کر مطالعۂ محبوب سے غافل ہو جائیں گے؛ باقی عوام کو بے فکر ہونا نہ چاہیئے، کیوں کہ اگر وہ اپنے عیوب کی نگہداشت اس مستعدی سے نہ کریں گے تو اور بڑے بڑے گناہوں میں گرفتار ہو جائیں گے؛

آدابِ تعلقات

اب ندائے یا ایھا المزمل کے بعد احکام کا بیان ہوتا ہے؛ حاصل احکام کا یہ ہے کہ تعلق دو طرح کے ہیں؛ ایک خالق کیساتھ دوسرا مخلوق کے ساتھ اور یہ تعلق دو قسم کا ہے موافق کے ساتھ اور مخالف کے ساتھ؛ اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے قم اللیل الا قلیلا۔ اس میں ایک تو قیام و طاعت ادب تعلیم کیا ہے، اور اس کے ساتھ اقتصاد (میانہ روی) کا ارشاد فرمایا ہے، ادب یہ کہ قیام لیل کے لئے وہ وقت مقرر فرمایا گیا ہے جو کہ نہ بھوک کی تکلیف کا وقت ہے اور نہ معدہ کی پُری کا وقت ہے کہ طبیعت میں گرانی اور بوجھ ہو اور قیام میں کدورت ہو، بلکہ ایسا وقت دونوں تکلیفوں سے خالی ہے اور طبیعت میں نشاط اور سرور ہوتا ہے اور اس میں تشبّہ بالملائکہ بھی ہوتا ہے کیوں کہ ان کی یہی شان ہے کہ نہ بھوک لگے نہ کھانے سے گرانبار ہوں اور نیز رات کے

وقت یکسوئی ہوتی ہے؛ اور اقتصاد یہ کہ ساری رات کے قیام کا حکم نہیں دیا! کیوں کہ اس میں سخت تعب ہوتا ہے؛ بلکہ کچھ حصہ سونے کے لئے بھی رکھا گیا ہے اور چونکہ ہر وقت ہر حالت اور ہر شخص کے لئے ایک مقدار متعین نہیں ہو سکتی اس لئے او تخیریہ سے نصف اور ثلث اور دو ثلث ہیں جو مفہوم ہے انقص منہ قلیلاً او زد علیہ کا جیسا دوسرے رکوع سے معلوم ہوتا ہے اختیار دے کر مخاطب کی رائے پر چھوڑا گیا کہ اگر زیادہ قیام نہ ہو سکے تو تھوڑا ہی سہی؛

تہجد کی حدود حدیث میں ہے دشیئی من الدلجہ اس اقتصاد میں ایک یہ بھی حکمت اور مصلحت ہے کہ توسط میں دوام ہو سکتا ہے اور افراط میں دوام نہیں رہ سکتا؛ اور پہلے یہ قیام لیل کے کہ مراد تہجد ہے؛ فرض تھا؛ بعد اس کے فرضیت منسوخ ہو کر مسنونیت باقی رہ گئی اور اقرب الی الدلیل تہجد کا سنت موکدہ ہونا ہے تہجد سے محروم رہنے والوں کو اکثر غلطیاں ہو رہی ہیں بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تہجد صرف آخر ہی شب ہوتا ہے اور اس وقت اٹھنا دشوار ہے؛ اس لئے انہوں نے چھوڑ رکھا ہے؛ یاد رکھو کہ اگر آخیر شب میں نہ اٹھ سکے تو اول شب میں بھی وتر سے پہلے تہجد پڑھنا جائز ہے؛ بعضے یہ سمجھ رہے ہیں کہ تہجد کے بعد سونا نہیں چاہیئے اور سونے سے تہجد جاتا رہتا ہے یہ لوگ اس لئے نہیں اٹھتے؛ یہ بھی غلطی ہے۔ تہجد کے بعد سونا بھی جائز ہے؛ غرض اہل سلوک کے لئے یہ عمل تہجد کا بھی ضروری ہے اور اگر کبھی قضا ہو جائے تو زیادہ غم میں نہ پڑے؛ تہجد کی قضاؤں میں کر لے اس آیت سے یہی مراد ہے وھو الذین جعل الیل والنہار خلفۃ لمن اراد ان یذکر الخ بعض لوگوں کا اگر تہجد قضا ہو جائے تو حد سے زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں اور کراہتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ ہمارا تہجد کبھی قضا نہ ہوا تھا؛

یہ کیا ہو گا، یاد رکھو انہی پریشانی کا انجام بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ بجائے مطالعہ کے محبوب اپنے مطالعہ میں مشغول ہو جاتے ہیں، حالانکہ اس غم میں لگ کر اصل ذکر سے جو کہ مقصود ہے رہ جاتے ہیں اور انسان مطالعۂ محبوب کے لئے پیدا ہوا ہے اس کو غیر میں مشغول ہونا چاہیئے، ع ماضی و مستقبلت پردۂ خدا است، غرض نفس کو پریشانی میں زیادہ مبتلا نہ کیا جائے اور تجربہ ہے کہ بعض اوقات آسانی رکھنے سے نفس خوشی سے کام دیتا ہے، اور تنگی اور بوجھ ڈالنے سے پہلا کام بھی چھوٹ جاتا ہے اس لئے بہت تنگی نہ کرو، کہ مزدور خوش دل کند کار بیش بعض محققین کا قول کہ ذاکر شاغل کو مرغن کھانا چاہیئے ورنہ ضعف ہو جائے گا، اور کسی وقت بے کار ہو جائے گا، خوب کھاؤ، پیو اور اس سے کام لو البتہ یہ یاد رہے کہ کھانے پینے میں ایسی زیادتی نہ ہو، کہ کسل ہو جائے یا بیماری ہو جائے۔ بیمار ہو کر اور خرابی میں پڑ جائے اسی لئے کلوا واشربوا کے ساتھ ولاتسرفوا بھی فرمایا ہے حضرات اہل بیت میں سے کسی بزرگ کا قصہ ہے کہ ان سے کسی نصرانی حکیم نے پوچھا تھا کہ قرآن کو کتاب جامع کہتے ہیں کہ اس میں طب کہ ضروری چیز ہے نہیں ہے۔ فرمایا اصل طب موجود ہے کلوا واشربوا ولاتسرفوا، وہ دنگ رہ گیا، بطور جملہ معترضہ کے یاد آگیا کہ غالب جو ایک آزاد شاعر ہے، اس نے اپنے مذاق پر یہ شعر کہا تھا، ؎

ہم توبہ جب کریں گے شراب و کباب سے
قرآن میں جو آیا کلوا واشربوا نہ ہو

کسی نے اس کا خوب جواب دیا، ؎

تسلیم قول آپ کا ہم جب کریں جناب
جب آگے واشربوا کے ولاتسرفوا نہ ہو

ایسا ہی روحانی تنگی قبض حزن وغیرہ سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیئے کیوں کہ اس میں بھی تزکیۂ نفس ہوا کرتا ہے،

توسط کی ضرورت

خاص کر وسوسہ کی طرف تو التفات بھی نہ کرنا چاہیئے؛ کیوں کہ درپے ہونے سے اس میں اور بھی ترقی ہوتی ہے محقق اس کی طرف تو التفات بھی نہیں کرتا؛ اور وسوسہ کے پیچھے پڑنے میں اس کے سوا اور بھی بہت خرابیاں ہیں اسی ایک وسوسہ سے اور شاخیں نکلنی شروع ہوتی ہیں اور رہا غم؛ سو وہ الگ ہے اور غم کی وجہ سے اصل ذکر و شغل کا فوت ہونا یہ الگ ہے ایسا ہی استغفار اور توبہ کے وقت معاصی کے تذکر و استحضار میں ایک قسم کا توسط ہونا چاہیئے یہ ضروری نہیں کہ سب گناہوں کی پوری فہرست پڑھنے بیٹھ جاؤ؛ صرف اجمالی طور پر سب گناہوں سے توبہ کرے ہر گناہ کا نام ضروری نہیں؛ حدیث میں ہے ما انت اعلم بہ منی اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے اس میں سب گناہ آگئے اگرچہ یاد نہ آئیں کیوں کہ اس سوچ میں وقت ضائع کرنا؛ مطالعۂ محبوب سے غافل ہونا ہے البتہ جو خود یاد آجائے اس سے بالخصوص توبہ کرلے ایک شخص کا ذکر ہے رمی جمار کے وقت وہاں جوتیاں مار رہا تھا اور ایک ایک گناہ گن کر شیطان کو گالیاں دیتا تھا اور مارتا تھا؛ سو یہ لغو ہے؛ ہر ایک گناہ کا نام لینا اور تلاش اور سوچ میں عمر عزیز کا جو دراصل مطالعۂ محبوب کے لئے تھی اس سوچ بچار میں کھونا نہ چاہیئے؛ ؎

عمر عزیز قابل سوز و گداز نیست　　　　این رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

اہل سلوک کو بالخصوص اس کا خیال بہت ضروری ہے کہ مطالعۂ محبوب سے غفلت نہ ہو؛ واقع میں عارف ہی کی نظر ان امور تک پہنچتی ہے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی خادم نے اس بات کا افسوس ظاہر کیا کہ اب کی بیماری کی وجہ سے مدت تک حرم میں حاضر ہونا نصیب نہ ہوا؛ آپ نے خواص سے فرمایا کہ اگر یہ شخص عارف

ہوتا تو اس پر کبھی افسوس نہ کرتا کیوں مقصود قرب حق ہے اور اس کے لئے جس طرح نماز حرم میں ایک طریق ہے اسی طرح اس کے لئے مرض بھی ایک طریق ہے تو بندہ کا کیا منصب ہے کہ اپنے لئے خود ایک طریق متعین کرے یہ مربی کے اختیار میں ہے ؛ طبیب کی تجویز مریض کی تجویز سے ہزار درجہ زیادہ بہتر ہے ۔ ؎

بدرد صاف ترا حکم نیست دم درکش

کہ ہر چہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

یہ سب بیان تھا قیام لیل اور اس کے آداب کا اقتصاد کے ساتھ

اہمیت تلاوت و نماز

اب دوسرا معمول اہل سلوک کا مذکور ہوتا ہے ورتل القرآن ترتیلا : ترتیل کے معنی ہیں تھام تھام کر پڑھنا ، صحابہؓ کے زمانہ میں ایک یہ بھی طریق حصول نسبت کا تھا کہ قرآن اور نماز پر مداومت اور محافظت کرتے ہیں چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خواب میں دریافت کرنا کہ آجکل کے صوفیہ کے طریقوں میں سے کون سا طریقہ آپ کے موافق ہے اور اس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد کہ ہمارے زمانے میں تقرب کا ذریعہ ذکر کے ساتھ قرآن اور نماز بھی تھا اور اب صرف ذکر پر اکتفا کر لیا ہے ؛ مشہور ہے اور اس تغیر کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ صحابہؓ کے قلوب بہ برکت صحبت نبویؐ اس قابل تھے کہ ان کو اور قیود کی جو بعد میں حادث ہوئیں ضرورت نہ تھی ؛ ان کے بہ صحبت نبویؐ کے فیض سے خلوص پیدا ہو چکا ہے ؛ وہ حضرات تلاوت قرآن اور کثرت نوافل سے بھی نسبت حاصل کر سکتے تھے ؛ ان کو اذکار کے قیود زائد کی حاجت نہ تھی ؛ برخلاف بعد کے لوگوں کے کہ ان میں وہ خلوص بدون اہتمام کے پیدا نہیں ہو سکتا ؛

اس لئے صوفیۂ کرام نے کہ اپنے فن کے مجتہد گذرے ہیں اذکار اشغال خاصہ اور ان کی قیود ایجاد کیں اس وجہ سے کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خلوت میں جب ایک ہی اسم کا بتکرار ورد کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ضرب و جہر وغیرہ قیود مناسبہ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے اور اس تاثیر نفس و قلب میں اذنیع داثبت ہوتی اور رقت و سوز پیدا ہو کر موجب محبت ہو جاتا اور محبت سے عبادت میں اخلاص پیدا ہو جاتا ہے اور اللہ عبادت خالص کا حکم فرماتے ہیں؛ وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین وامرت ان اعبد الخ وغیرہ من الآیات۔ پس معلوم ہوا کہ حضرات صوفیہ نے یہ قیود ذکر کے بطور معالجہ تجویز فرمائے ہیں اور اصل مقصد وہی اخلاص ہے پس اگر کسی شخص کو ان قیود سے مناسبت نہ ہو یا بغیر ان قیود کے کسی کو اذکار مسنونہ نوافل و تلاوت قرآن ہیں پورا اخلاص پیدا ہو سکتا ہے تو صوفیۂ کرام ایسے شخص کے لیئے ان قیود کی ضرورت نہیں سمجھتے پس اب معلوم ہو گیا کہ یہ تمام قیود اصلاح و تقویت کے واسطے علاجاً تجویز کیئے گئے ہیں؛ کوئی شرعی امر قربت مقصودہ نہیں سمجھا جاتا جو بدعت کہا جائے؛ الحاصل یہ دوسرا دستور العمل تھا؛ اہل سلوک کے واسطے یعنی تلاوت قرآن؛ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں انا سنلقی علیک قولا ثقیلا اس کو ما قبل سے اس طور پر ربط ہے کہ مراد قولا ثقیلا سے وحی ہے جو کہ ثقیل تھی؛ اور نماز اور تلاوت قرآن مجید کی مزاولت سے قوت احتمال انتقال وحی کی پیدا ہو گئی اس لئے پہلے نماز او تلاوت کا حکم فرمایا پھر انا سنلقی الخ میں وحی کا وعدہ کیا؛ اب اس کی تحقیق کہ نزول وحی کے وقت ثقل معلوم ہونے کا کیا سبب تھا؛ سو یہ امر عقول متوسط سے خارج ہے؛ باقی روایات سے ثقل ہونا ثابت ہے؛ چنانچہ نزول وحی کے وقت اونٹنی کا بیٹھ جانا اور ایک صحابی کا یہ قول کہ نزول وحی کے وقت وجب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ران ان کی ران

پر تھی) یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری ران بیٹھی جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت شدت سرما میں بھی نزول وحی کے وقت پسینہ آجاتا؛ اس ثقل کے آثار روایات میں وارد ہیں؛ اور ان آیات میں کہ الم نشرح لک صدرک و وضعنا عنک وزرک الذی انقض ظہرک یہ شرح صدر اور وضع وزر جو موجب نقض ظہر تھا میرے نزدیک اسی طرف اشارہ ہے؛ اور آیت لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل الخ اس معنی میں بھی بہت ہی صاف ہے اور نماز اور تلاوت اور ذکر کی مزاولت اور کثرت سے قوت کا پیدا ہونا اور ثقل وحی کے احتمال کی طاقت پیدا ہو جانا اس طور پر ہے کہ چونکہ ذکر وغیرہ سے واردات اور فیوض غیبیہ علمی و عملی قلب پر فائض ہوتے ہیں ان کے ورود سے قلب میں بتدریج قوت پیدا ہوتی رہتی ہے؛ جس کی وجہ سے شدت و ثقل کا مقابلہ اس کیلئے آسان ہو جاتا ہے چنانچہ اہل تلوین کا اضطراب اور اہل تمکین کا استقلال اسی وجہ سے ہے کہ پہلے قلب میں قوت تحمل کی نہ تھی پھر ذکر کی کثرت سے احتمال اثقال کی طاقت آگئی اور اسی شعر میں ان ہی واردات میں سے بعض کا ذکر ہے

بینی اندر خود علوم انبیاء   بے کتاب و بے معید و اوستا

اور یہ حالات وارد ہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں؛ کبھی ذوق شوق و سرور انبساط ہوتا ہے کبھی حزن و انقباض ہوتا ہے؛ بسط کے الگ فائدے ہیں اور قبض کے علیحدہ مصالح۔ اور سب محمود ہیں؛ کیوں کہ قبض میں بھی تزکیہ نفس و اصلاح عجب ہوتی ہے؛ ؎

چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں   تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں
چونکہ قبض آید اے راہرو   آں صلاح تست آتش دل مشو

تام توجہ الی اللہ

آگے ارشاد ہوتا ہے کہ ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطأ واقوم قیلا۔ اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ رات کو اٹھنے کے وقت۔

چونکہ شور وشغب سے سکون ہوتا ہے اور افعالِ معاش کا بھی وقت نہیں ہوتا؛ اس لئے قلب میں یکسوئی ہوتی ہے اور اس لئے اس وقت جو کچھ زبان سے پڑھا جاتا ہے دل کو اس سے بہت تاثیر ہوتی ہے اور جو کچھ کیا جاتا ہے اس کا اثر قوی ہوتا ہے تو گویا اس وقت آیات میں ان ناشئۃ اللیل الخ مضمون آیت قم اللیل اور رتل القرآن الخ کی تعلیل ہے کہ اس وقت بوجہ ان اسباب کے حضور قلب زیادہ ہوتا ہے؛ لہٰذا قیام لیل وترتیل کا فائدہ اس وقت پورے طور سے حاصل ہوگا؛ اور حضورِ قلب کے متعلق ایک طریقہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے وہ یہ کہ مبتدی ہر ہر لفظ پر تبکلف مستقل ارادہ کرے؛ اسی طرح الفاظ پر توجہ رہنے سے حضور حاصل ہو جاتا ہے اور بعد چندے ملکہ ہو جاتا ہے زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی اور منتہی کو ملاحظہ ذات سے حضور میسر ہو سکتا ہے ابتدا میں یہ مشکل ہے کیونکہ مبتدی کو غائب کا تصور جمنا نہیں اور منتہی ذات کا ملاحظہ رکھ سکتا ہے؛ اس کے بعد فرماتے ہیں ان لک فی النہار سبحا طویلا پہلے بطور حکمت کے بیان ہوا ہے کہ تہجد اور قرآن پڑھا جائے؛ کیونکہ اس وقت اس کا اثر زیادہ ہوگا؛ اب اس کے علاوہ ایک اور وجہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ کو دن میں اور کام بھی رہتے ہیں ان کی وجہ سے خاص قسم کی توجہ الی اللہ تام نہیں ہو سکتی؛ اس لئے یہ وقت شب کا کہ مصروفیت سے خالی ہے تجویز کیا گیا اور وہ کاروبار یہ ہے مثلاً تبلیغ دین۔ تربیت خلائق۔ حوائج ضروریہ لازمیہ بشریت ہر چند کہ تبلیغ دین اور تربیت خلائق خود بھی دین ہے لیکن چونکہ ان میں ایک قسم کا تعلق مخلوق سے ہوتا ہے؛ جو لہٰذا اس میں خاص قسم کی توجہ الی اللہ پورے طور پر نہیں ہو سکتی؛ جیسی خاص خلوت میں ہو سکتی ہے؛ یہاں سے بھی اس اوپر والی بات کی تائید ہوتی ہے کہ انسان باوجود

کمال کے بھی لوازم بشریہ سے بالکل نہیں چھوٹ سکتا۔ دیکھئے آیت صاف دلالت کر رہی ہے کہ نہار کا صبح طویل یکسوئی سے ایک درجہ میں آپ کو بھی مانع ہو جاتا ہے اور چونکہ آپ کے تمام احوال کامل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خلق کی طرف مشغول ہونا منافی کمال نہیں پس صاحب کمال پر بھی ہر وقت یکساں حالت نہیں رہتی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت حنظلہ رضہم کا قصہ حدیث میں ہے کہ حضرت حنظلہ رضؓ نے اپنے آپ کو اس بنا پر منافق کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ اور حالت ہوتی ہے اور پیچھے کچھ اور۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضؓ نے فرمایا کہ حالت تو ہماری بھی یہی ہے آخر یہ قصہ حضورؐ میں پہنچا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ولکن یا حنظلۃ ساعۃ وساعۃ ایک گھڑی کیسی۔ ایک گھڑی کیسی اور درحقیقت اگر ہر وقت وہی حالت تجلی کی رہے خود جسمانی ترکیب بھی ٹھیک نہ رہے اول تعطل ہو گا کیونکہ حالت علیہ میں انتظام تغذیہ وغیرہ کا ممکن نہیں پھر اس فنا کی نوبت آجائے گی ولنعم ما قیل

چو سلطان عزت علم برکشد | جہاں سر بجیب عدم درکشد

جدت اور لذت

دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ ذوق لذت جب ہی آتی ہے کہ اس حالت میں دوام نہ ہو۔ ورنہ دوام سے عبادت ہو جائے گی۔ اور لذت جو بسبب جدت کے معلوم ہوتی ہے نہ رہے گی کل جدید لذیذ اس کے علاوہ ایک اور حکمت بھی ہے وہ یہ کہ غلبہ استغراق میں قصد نہ رہے گا اور بلا مقصد کے اعمال کا اجر نہیں اور بلا اعمال قرب نہیں ملتا۔ اور اعمال ہی دنیا میں مقصود ہیں۔ دنیا میں انہیں اعمال کے واسطے بھیجا گیا ہے۔ ورنہ دنیا میں آنے سے پہلے روح کو خود ایسی حالتیں حاصل تھیں اور حضور دائم میسر تھا۔ مگر اعمال نہ تھے۔ ان کے

کے واسطے دنیا میں بھیجا گیا؛ لہٰذا اعمال اور ان کا اجراء مہتمم بالشان ٹھہرا اس لئے محققین صوفیہ نے فرمایا ہے کہ استغراق میں ترقی نہیں ہوتی؛ ان سب باتوں سے معلوم ہو گیا کہ تجلی میں جیسی حکمتیں ہیں؛ ویسی استتار میں بھی ہیں اور یہاں ایک فائدہ قابلِ غور معلوم ہوا، وہ یہ کہ باوجود یہ کہ تبلیغ دین و تعلیم احکام متعدی نفع ہے اور وہ نفع لازمی سے بڑھ کر ہے اس لئے منتہی کو اس کا زیادہ اہتمام ہوتا ہے؛ مگر بااین ہمہ یہ ارشاد ہے کہ چونکہ آپ کو دن میں بہت کام رہتے ہیں رات کو تہجد اور ترتیل سے قرآن پڑھا کیجئے اور ایک جگہ فرماتے ہیں کہ فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب اس سے یہ ثابت ہوا کہ کامل کو اپنے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے؛ اور بعد تکمیل بھی ذکر سے غفلت نہ چاہیئے؛ ورنہ از خود اس کا وہ حال رہے گا نہ دوسروں کو اس سے کامل نفع پہنچے گا؛ کیونکہ بدون خود کئے ہوئے تعلیم میں برکت نہیں ہوتی؛ یہی معنی ہیں قول مشہور من لا ورد له لا وارد له کی البتہ غلطی ہے کہ منتہی قطع تعلق کر کے دوام خلوت اختیار کرلے؛ سے

طریقت بجز خدمت خلق نیست ۔۔۔ بہ تسبیح سجادہ و دلق نیست

لیکن خود اپنے کو قابلِ ارشاد نہ سمجھنے لگے؛ البتہ جب شیخ اجازت دے دے؛ تو امتثالاً اس کام کو بھی شروع کر دے؛ اور پہلے سے اس کی نیت کرنا اور ذکر و شغل اس نیت سے کرنا بھی سخت مضر ہے اور اس نیت کے ساتھ کامیابی مشکل ہے

اشتغال بالخلق

وجہ یہ ہے کہ یہ نیت بڑا بننے کا شعبہ ہے؛ اب کامل کی توجہ الی الخلق میں ایک شبہ رہا، وہ یہ کہ اشتغال بالخلق اس کو یادِ حق سے مانع ہوگا؛ سو اس شبہ کی منتہی کامل کے حق میں گنجائش نہیں؛ کیونکہ منتہی کی لسبب

وسعت صدر کے یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کو شغل خلق یادِ حق سے مانع نہیں ہوتا؛ اور نیز خلق کے ساتھ اس کا مشغول ہونا بھی بامرِ حق ہوتا ہے اور اس کو مقصود اس سے امتثال امر اور رضائے حق جل وعلا ہی ہوتی ہے اور خلق کی طرف اس کی توجہ خدا ہی کے لئے ہوتی ہے اس لئے اس کو اشتغال بالخلق مانع عن الحق نہیں ہو سکتا؛ بلکہ یہ اشتغال خود حقوقِ خلق سے ہے؛ اور اس آیت میں سبحا طویلا۔ بطور جملہ معترضہ کے مخلوق کے اس حق کی طرف اشارہ ہے؛ اور مخلوق کا وہ حق یہ ہے؛ نصح عام۔ تربیت ارشاد لیکن اس حق خلق میں حق خالق کو نہ بھولنا چاہیئے؛ چنانچہ یہاں بھی مخلوق کے حقوق کے بیان سے پہلے قم الیل الخ میں حقوق اللہ بیان کئے گئے تھے؛ اور مخلوق کے حقوق کے بعد بھی واذکر اسم ربك فرمایا گیا ہے تو گویا یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اس شغل میں ہمیں نہ بھول جانا؛ اول آخر دونوں جگہ یاد دلایا گیا ہے اور واذکر اسم ربك میں اکثر مفسرین لفظ اسم کو زائد کہتے ہیں اور بعض زائد نہیں قرار دیتے اور اس اختلاف سے یہاں ایک عجیب مسئلہ مستفاد ہو گیا اور اختلاف امتی رحمة کا ظہور ہو گیا اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ اہم قول کا تو موافق حالت منتہی کے ہے اور عدم زیادہ کا قول موافق حالت مبتدی کے ہے کیونکہ مبتدی کو خود مسمیٰ اور مذکور کا تصور کم جمتا ہے اس کے لئے یہی کافی ہے کہ اسم ہی کا تصور ہو جائے؛ برخلاف منتہی کے؛ اس کو لحاظ ذات بلا واسطہ سہل ہے اور حدیث ان تعبد اللہ کانك تراہ میں مشہور توجیہ پر منتہی کا طریق اور اس کی حالت کا بیان ہے اور عام کے لئے حضور ایک سہل اور مفید طریق خدا کے فضل سے سمجھ میں آیا ہے؛ وہ یہ کہ آدمی یہ خیال کر لے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مثلاً فرمائش کی ہے اور میں اس فرمائش پر اس کو سنا رہا ہوں اس سے

بہت آسانی سے حضور میسر ہو جاتا ہے اس کے بعد ارشاد ہے وتبتل علیہ تبتیلا اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ تبتل کو صرف واذکر اسم کے متعلق کیا جائے تو اس صورت میں تبتل سے اشارہ ہوگا مراقبہ کی طرف یعنی ذکر کے ساتھ مراقبہ ہو اور ایک یہ کہ تبتل کو مستقل حکم کہا جائے، مطلب یہ ہو گا کہ علاوہ احکام مذکورہ کے یہ بھی حکم ہے کہ سب سے قطع تعلق کرو بایں معنی کہ سب کا تعلق اللہ تعالیٰ کے تعلق علمی اور حبی سے مغلوب ہو جائے اور اثر اس مغلوبیت کا تعارض مقاصد کے وقت معلوم ہوتا ہے مثلاً ایک وقت میں دو کام متضاد پیش آئے ایک کام تو اللہ تعالیٰ کے متعلق کا ہے اور دوسرا غیر اللہ کے متعلق کا اور دونوں کا جمع ہونا ممکن نہ ہو، تو ایسے وقت پر اللہ کے کام کو اختیار کرنا اور خلاف مرضی حق کو چھوڑ دینا بس یہی معنی ہیں قطع تعلق کے نہ یہ کہ کسی سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے ؎

تعلق حجاب است ذی حاصلے ... چو پیوندھا بگسلی واصلے

توکل کی ضرورت

البتہ اختلاط میں افراط کرنا مضر ہے، اس کے آگے فرماتے ہیں کہ رب المشرق والمغرب لا الہ الا ھو فاتخذہ وکیلا مطلب یہ کہ اللہ پر توکل کرو اس سے معلوم ہوا کہ اہل سلوک کے لئے توکل کی بھی ضرورت ہے اور یہ ان کا معمول ہونا چاہیئے، نکتہ اس توکل کی تعلیم میں یہ ہے کہ اعمال مذکورہ بالا کے اختیار کرنے کے بعد حالت میں تغیر تبدل قبض و بسط شروع ہو گا، اس میں ضرورت توکل کی ہو گی، اس لئے فرماتے ہیں کہ آخر مشرق و مغرب کا رب ہے اس لئے اس نے جو حالت تم پر وارد کی ہے اس میں کوئی حکمت ضرور ہو گی اور ثابت ہے کہ اکثر قبض میں تصفیہ اور تزکیہ خوب ہوتا ہے اس لئے تم کو تنگ دل نہ ہونا چاہیئے،

اور پھر خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے اس میں کچھ مصلحت رکھی ہوگی اور مشرق و مغرب کا ذکر قبض و لبسط کی حالت کے کس قدر مناسب ہے کہ اس میں ظہور ہوتا ہے واردات کا اور مغرب مناسب ہے حالت قبض کے، پس مشرق و مغرب کا نمونہ باطن انسان میں بھی پایا گیا؛ و لنعم ماقیل ؎

آسمانہاست در ولایت ہماں	کار فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست و بالاہاست	کوہ ہائے بلند و بالا ہاست

اور جس طرح مغرب میں آفتاب مستور ہوتا ہے، معدوم نہیں ہوتا اسی طرح قبض میں کیفیات سلب نہیں ہوتیں؛ بلکہ مستور ہوجاتی ہیں اور پھر بسط میں گویا طلوع ہوجاتی ہیں؛

معمول اہل تصوف

حاصل کُل یہ ہوا کہ اہل سلوک کے لیے یہاں چند ضروری معمول بیان کئے گئے؛ قیام لیل یعنی تہجد۔ تلاوت قرآن تبلیغ دین؛ ذکر و تبتل توکل اور چونکہ تعلق خلق کی دو قسم ہیں ایک موافقین کے ساتھ اس کا بیان اشارۃً ان لك فی النھار سبحا طویلا میں ہوا ہے؛ جس کا حاصل تبلیغ دین اور ارشاد و تربیت ہے چونکہ موافقین سے تعلق محبت ہے اس کے حقوق بوجہ اس کے کہ وہ حالت طبعی ہے؛ تقاضائے حب کی وجہ سے خود بخود ادا ہوجاتے ہیں؛ اس لئے اس میں زیادہ اہتمام کی ضرورت نہ ہوئی؛ البتہ مخالف کے معاملہ میں ممکن تھا کہ کچھ افراط تفریط ہوجاتی اس لئے اس کا بیان اہتمام سے فرماتے ہیں واصبر علی مایقولون واھجرھم ھجراً جمیلا۔ مطلب یہ کہ مخالف کی ایذا پر صبر کیجئے؛ اور ان سے علیحدہ رہیئے اچھے طور پر۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سختی سے ان کی آتش عناد اور بھڑک

اٹھے اور زیادہ تکلیف پہنچائیں، ہجر جمیل سے مراد قطع تعلق ہے۔ اس طرح پر کہ قلب میں تنگی نہ ہو، پھر جب صبر کی تعلیم دی گئی۔ تو اس تسہیل کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی اپنے انتقام لینے کی خبر سنا کر آپ کو تسلی بھی فرمائی جاتی ہے کہ ذرنی والمکذبین اولی النعمۃ و مھلھم قلیلا۔ یعنی مخالفین کے معاملہ کو ہم پر چھوڑ دیجیئے۔ ہم ان سے پورا بدلہ لے لیں گے۔ یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ اہل حق کے مخالفین سے پورا انتقام لیتے ہیں۔ اس لئے بھی مناسب یہی ہے صبر اختیار کیا جائے۔ کیوں کہ جب اپنے سے بالادست بدلہ لینے والا موجود ہے تو کیوں فکر کیجئے۔ خدا تعالیٰ کی اس سنت کے موافق مخالف کو آخرت اور دنیا دونوں میں رسوائی ہو جاتی ہے۔

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات ۔۔۔ با درد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد ۔۔۔ تا دلے صاحبدلے نامد بدرد

الغرض اہل تصوف کی معمول یہ چند چیزیں ہوئیں جن کا بیان اس مقام پر ہوا۔ قیام لیل یعنی تہجد۔ تلاوت قرآن۔ تبلیغ دین۔ ذکر و تبتل توکل۔ صبر۔ اس لئے اس مجموعہ بیان کو جو کہ اہل تصوف کے معمولات کو بفضلہ حادی اور شامل ہے سیرۃ الصوفی کے لقب سے ملقب کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور یا ایھا المزمل میں دو لطیفے معلوم ہوئے ایک یہ کہ جس طرح آپ بوجہ غایت حزن و الم اپنے اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ اسی طرح بعض اہل طریق کا معمول ہوتا ہے کہ چادر ایسے طور پر لپیٹ لیتے ہیں۔ کہ نظر منتشر نہ ہو اور اس کا قلب منتشر نہ ہو اور جمعیت کے ساتھ ذکر میں لگا رہے۔ دوسرا لطیفہ یہ کہ المزمل کے معنی عام ہیں کمبل اوڑھنا بھی ہوتا ہے تو یا ایھا المزمل میں اشارہ ہو گا لقب یا ایھا الصوفی کی طرف کیوں کہ لفظ صوفی میں گو اختلاف ہے۔ مگر ظاہر

یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد موٹا کپڑا کمبل وغیرہ مراد لیا جائے؛ پس صوفی اور مزمل متقارب المعنی ہوئے اور اہل تصوف نے یہ لباس اس لئے اختیار کیا تھا کہ جلدی پھٹتے نہیں؛ جلدی میلا نہ ہو اور بار بار دھونا نہ پڑے اور بعض اہل شفقت اس خاص وجہ سے بھی یہ شعار رکھتے تھے؛ مستور ہونے کی حالت میں بعض لوگ ان کو ایذا پہنچا کر مبتلائے وبال ہو جاتے تھے اس لئے انہوں نے ایک علامت مقرر کی؛ جیسے آیت ذالک ادنی ان یعرفن فلا یوذین اس کی نظیر ہے؛ پس یہ حکمتیں تھیں اس لباس میں اور اب تو محض ریا و سمعہ کی غرض سے پہنتے ہیں جو بالکل اس شعر کا مصداق ہے؛ ؎

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بیغش باشد — اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

اس لئے یہ اب قابل ترک ہو گیا ہے؛